

عصری ادب

No. 51



From "Seventh Man"

عصری ادب

۵۱

جنوری ۱۹۸۳ء

نگراں
محمد حسن

مدیران
بیگم روشن آرا محمد حسن، سید بہاء الدین احمد

زرِ سالانہ
تیس روپیے

یہ شمارہ
عام خریداروں کے لیے دس روپیے
سالانہ خریداروں کے لیے ساڑھے سات روپیے

ادارۂ تصنیف، ڈی ۷۔ ماڈل ٹاؤن۔ دہلی ۱۱۰۰۰۹

(سید بہاء الدین احمد ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نو دیپ آفسٹ پریس، سیتارام بازار میں چھپوا کر ادارۂ تصنیف، ڈی ۷۔ ماڈل ٹاؤن، دہلی ۹ سے شائع کیا اور ٹائٹل فائن آرٹ پریس میں چھپا۔)

تصویر سرورق: طفیل احمد مدیر نقوش، لاہور

سکوتِ وقت مورخ ہے لکھ لیا اُس نے

جو پتھروں نے کہا ہے خطا جبینوں سے

(شمیم کرہانی)

فہرست

حرفِ آغاز

"عصری ادب" کے پڑھنے والوں کو "عصری ادب" کی اشاعت کا تیرہواں سال مبارک ہو۔

اس سال ہماری پوری کوشش ہوگی کہ سہ ماہی وقت پر شائع ہو اور ہر شمارہ الگ الگ شائع ہو۔ اور معیار کو پست نہ کرنا پڑے۔ اس کے لیے ہمیں خاص طور پر اہلِ قلم کا تعاون اور بھرپور تعاون درکار ہوگا تاکہ معیاری مضامین، افسانے اور نظمیں، غزلیں ہمیں برابر دستیاب ہوتی رہیں اور رسالے کا معیار قایم رہے۔ ہر شمارے کو الگ الگ نکالنے کے لیے ہمیں ضخامت بھی کم کرنی پڑی ہے مگر اسی کے ساتھ قیمت بھی کم ہو گئی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے قارئین اِن تبدیلیوں کو پسند کریں گے، ہمارے ارادوں کی تکمیل میں مدد کریں گے اور ہر رسالے کے بارے میں اپنی رائیں، تبصرے اور تجاویز بھیجتے رہیں گے۔

نئے سال میں متعدد اہلِ قلم ہم سے جُدا ہو گئے۔ "عصری ادب" ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتا ہے، انھیں خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے اور ان کے غم میں سوگوار ہے۔ ان میں عہد ساز رسالے 'شاہراہ' دہلی کے مدیر پرکاش پنڈت اور اردو کے جواں فکر شاعر حرمت الاکرام اور رآز مرادآبادی شامل ہیں۔

ادارہ

۵

سیاسی صورت حال

آندھرا، کرناٹک اور تری پورہ کے انتخابات کے نتائج آگئے، دلّی اور آسام میں انتخابات ہونے والے ہیں۔ پہلی دو ریاستیں اندرا کانگریس کا گڑھ رہی ہیں۔ جب سارے ملک میں اندرا کانگریس کے خلاف ہوا چلی، طوفان اُٹھے تب بھی ان ریاستوں میں اندرا کانگریس ہی کا بول بالا رہا اور انھیں ریاستوں سے اندرا جی منتخب ہوکر پارلیمنٹ میں آئیں تیس برس میں پہلی بار ان ریاستوں میں کانگریس کو اتنی زبردست مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، وجہ اِس کی یہ نہیں تھی کہ کانگریس کو نظریاتی شکست ہوئی یا کوئی اور مخالف پارٹی عوام کو اپنے ساتھ لینے میں کامیاب ہوگئی۔ وجہ صرف اتنی ہے کہ ان علاقوں میں خود کانگریسی وزرائے اعظم اور منتخب نمایندوں کے ساتھ مرکز کا جو برتاؤ رہا اس نے سخت ردعمل پیدا کیا، رشوت ستانی اور کنبہ پروری کہاں نہیں یہ کچھ ہمارے نظام کا ایسا لازمی جزو بن گئی ہیں کہ اِن کو چارو ناچار قبول کرلیا گیا ہے مگر اہانت اُس وقت محسوس ہوئی جب ہر علاقے کے وزرائے اعلیٰ کا انتخاب دلّی میں ہونے لگا اور وزرائے اعلیٰ ہی کیوں اس کی کابینہ بھی مرکز ہی سے نامزد ہوکر آنے لگی۔ چنانچہ آئے دن وزیروں کی ادلا بدلی، وزرائے اعلیٰ کی برخاستی اور تقرری کے کھیل کھیلے جانے لگے اور عوام کو ریاستی حکومتوں کی کارکردگی پر اعتماد جاتا رہا، مرکز سے اور مرکز میں برسر اقتدار پارٹی سے نفرت اور بیزاری پیدا ہونے لگی۔

در اصل یہ انتخابی نتائج اندرا کانگریس کی شکست تو ہیں مگر کسی پارٹی کی جیت نہیں ہیں، حزب مخالف کوئی نظریاتی متبادل پیش کرنے میں ناکام رہا ہے اور اسی لیے

اسے ان کی فتح نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال صورت یہ بھی ہے کہ ملک کے نئے موڑ کے آثار ان نتائج سے ملتے ہیں ایک بار پھر ملک کے عوام نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ اپنے رہ نماؤں سے زیادہ بیدار بھی ہیں اور ان سے زیادہ غیرت مند بھی۔ جب ان کے رہ نما صرف کرسیوں پر نظر رکھتے ہیں، عوام اپنی ریاست کی عزت اور وقار کو بھی عزیز رکھتے ہیں اور جب اس وقار کو ٹھیس پہنچتی ہے تو تلملا اٹھتے ہیں وہ کیا وجہ ہے کہ صرف آندھرا ہی نہیں، کرناٹک میں بھی ووٹوں کا انداز ایک ہی رہا اور دونوں جگہ خلاف معمول ۰،۸ فی صد کے قریب ووٹروں نے اپنا حق استعمال کیا۔

کمال تو تری پورہ میں ہوا جہاں اندرا کانگریس نے مارکسی کیمونسٹ پارٹی کو شکست دینے کے لیے علیحدگی پسند تحریک 'تجس' سے معاہدہ کر لیا ان سے مل کر انتخاب لڑا اور دونوں مل کر بھی سی پی ایم کو ہٹانے یا اس کی اکثریت کو کم کرنے میں تقریباً ناکامیاب رہے۔ سی۔پی۔ایم کو تری پورہ میں مکمل اکثریت حاصل ہوئی۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ اکثریت محض بنگالیوں کے ووٹ سے نہیں مل سکتی قبائلی علاقوں میں اس کی گرفت خاصی مضبوط ہوئی ہے اور 'تجس' کی ساری دہشت پسندی کے باوجود قائم ہے۔ ملک کے لیے سی۔پی۔ایم کی یہ کامیابی قابل غور ہے۔ اب تک یہی ایک پارٹی ایسی رہی ہے جسے اقتدار پانے کے بعد عدم مقبولیت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور جس پر عوام کا اعتماد بحال رہا۔

انتخابات کے نتائج کو دیکھتے ہوئے شاید یہ قیاس بے جا نہ ہوگا کہ کوئی چاہے نہ چاہے پورا ملک وفاقی خود مختاری کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہر ریاست میں علاقائی پارٹیوں کا عروج ہو رہا ہے اور وہ اپنی اپنی علاقائی انفرادیت اور لسانیت کے معاملے میں خاصی حساس بھی ہیں۔ بنگال، پنجاب، تمل ناڈ، جموں وکشمیر اور اب کرناٹک، آندھرا اور تری پورہ بھی اسی روش میں چل رہے ہیں۔ ہر ریاست زیادہ طاقت چاہتی ہے، زیادہ احترام چاہتی ہے اور مرکز سے وابستگی کے باوجود زیادہ اختیارات کی طلبگار ہے۔ اس اعتبار سے یہ ہندوستانی سیاست کا نیا موڑ ہے جب انتہائی مرکزیت پسندی کے رد عمل کے طور پر وفاقی طرز فکر کے آثار ابھرتے نظر آ رہے ہیں۔ دیکھیے آگے حالات کا رخ کیا ہوتا ہے۔ مرکز بھی ہوا کے اس رخ کو پہچانتا ہے یا نہیں!

آڑے ترچھے آئینے

ہندوستان جنت نشان میں ہم ایک ساتھ کئی صدیوں سے رہتے ہیں بیسویں صدی کی برقی سہولیات، تجارتی بھاگ دوڑ، فلم اور ٹیلی ویژن نے ہماری زندگی کو اپنے سانچے میں ڈھال لیا ہے گویا روزی روٹی کے اعتبار سے کم سے کم ہمارے شہروں کی فراوان مخلوق بیسویں صدی کی کم سے کم دوسری دہائی کی مخلوق لگتی ہے۔ ہوائی جہاز، ریل گاڑی، ٹیلی فون اور تار برقی سے لے کر ہمارے کوٹ پتلون اور ٹرانسسٹر تک اس کی گواہی دیتے ہیں مگر ذرا غور سے دیکھیے تو ہمارا ذہن اور مزاج ابھی اٹھارہویں صدی سے بھی آگے نہیں بڑھا ہے۔ گاؤں میں نہیں شہروں میں بھی چھوت چھات عام ہے۔ ستی کی رسم ۱۸۳۵ء میں ختم ہوئی تھی اب اس نے جہیز نہ لانے کی پاداش میں بیویوں کو جلانے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ذات پات کی تفریق عام ہے۔ ہریجن زندہ جلائے جاتے ہیں، فرقہ وارانہ فسادات کی لعنتیں عام ہیں مذہب کی نہیں، مذہب کے نام پر توہم پرستی اور فرقہ پرستی کی وبا عام ہے۔ پنڈت اور جیوتشی مقبول ہیں۔ انسان نے ابھی تک نشاۃ ثانیہ کا دیا ہوا یہ ابتدائی سبق بھی ابھی نہیں سیکھا ہے کہ انسان خود اپنا خالق ہے اور عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی۔

اپنی تباہ حالی کے لیے وہ کوئی نہ کوئی عذر اور بہانہ ہی نہیں، کوئی نہ کوئی وجہ تراشتا رہتا ہے اور کبھی نہ کبھی تو دوسرا آدمی، یا حالات یا کوئی منتر جادوگر یا تقدیر صاف ظاہر ہے پورے ملک کی اقتصادیات بھی بیچ ایک سی ہے اور ملک کی سیاست کی نہج بھی اور یہ دونوں نہایت خطرناک ہے اور زیادہ خطرناک ہو سکتی ہے۔ مشین کو بھی کالکھوں یہ ہوا ہندوستان کا اس میں عمل

دخل ضرور ہوتا ہے کمپوٹر میں، عمل دخل کم سے کم ہے مگر ہے ضرور۔ مگر پورا دور صنعتی ہو جائے مشینوں سے گھر آنگن آباد ہو جائیں اور انسان کا ذہن قبائلی طرز ہی کا رہے تو اس دوئی میں پورا معاشرہ ٹوٹ پھوٹ سکتا ہے جدید تر نظام دقیانوسی طرزِ فکر کے انسان کے ہاتھ میں پھل پھول نہیں سکتا ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا۔

یہ صحیح ہے کہ ذہن اور مزاج کی تبدیلی بھی اقتصادی تبدیلیوں سے آتی ہے مگر اس کے دوسرے راستے بھی ہیں انھیں راستوں میں ادب بھی ہے۔ ہمارے اندر کی دنیا کو بدلنے کا وسیلہ بھی اور اس کے اندر چھپی ہوئی نازک اور پیچیدہ حسیت کا آئینہ بھی۔ ہماری بصیرت کی ساری پسماندگیاں ادب میں ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ اسی لیے جب اخبار والے غلط اندازے لگاتے ہیں اہلِ سیاست کے حساب ٹھیک نہیں بیٹھتے تو ادب کے احساس کے تار اسے وہ نغمے بھی سنا دیتے ہیں جو ابھی ناشنیدہ ہوتے ہیں غلام عباس نے 'آنندی' اور 'دھنک' جیسی کہانیاں لکھیں۔ اقبال نے کہا:

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ افکار میں
آنے والے دور کی ہلکی سی اک تصویر دیکھ

ہمارے اپنے ادب پر نظر کیجیے تو یہ ہلکی سی تصویر نظر آتی تو ضرور ہے مگر یہ تصویر آنے والے دور کی اتنی نہیں جتنی پیر تسمہ پا کی ہے جو ہنوز اپنی سوکھی ہوئی ٹانگوں سے ہندوستانی معاشرے کی گردن پر سوار ہے ایک عجیب گدلی گدلی، میلی میلی بیزاری اور بے اعتمادی کی چادر ہے جو چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے ناسٹلجیا سرگرم ہے اور بڑی گہری کلبیت ہے جو دل اور دماغ پر چھائی ہوئی ہے۔ ادیبوں کو یہ درس دینے کا کوئی فائدہ نہیں کہ وہ کلبیت اور اور بیزاری میں مبتلا سماج کو امید اور حوصلے کا پیغام دیں مگر سچ یہ ہے کہ ادب نے ہمارے معاشرے کے اقتصادی اور حسیاتی فاصلے کو کم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے۔

اھلِ سیاست کو ووٹ درکار ہیں اس لیے وہ جان بوجھ کر عوام کے تعصبات کو ہوا دے کر ان سے فیض یاب ہوتے ہیں گاہے گاہے نظام کو گالی گفتاری ایک دھم انقلابی نعرہ یا کوئی آگ اگلتی تحریر ـــــ لیکن سوال تو یہ ہے کہ ادب محض توہمات اور تعصبات

کے پیچھے چلنے کا نام تو نہیں وہ تو بقول پریم چند آگے آگے مشعل لے کر چلنے والی سچائی ہے فکر کو منور کرنے والی اور ذہن کو جلا بخشنے والی سچائی جو اٹھارہویں صدی بلکہ قبل تاریخ دور میں رہنے والے انسانی ذہن اور جذبے کو جدید تر حکیمانہ نظر دے سکے جو شخص اس کے پیچھے پیچھے نہ چلے، اس کی فکری تربیت میں بھی حصہ لے۔ ایسا نہیں ہے کہ ادیبوں نے ایسا کبھی کیا ہی نہ ہو انقلاب فرانس کے پیش رو انسائیکلو پیڈی تحریک والے مصنفین ہی تھے اور اسلامی علوم و فنون کی آبیاری کرنے والے اخوانُ الصفا کے مفکرین ہے۔ آج دانش وری کی روایت کی تجدید جتنی ضروری ہے کبھی نہ تھی۔

ہمارا کام محض نعرے بازی کا نہیں، نہ محض ہنگامی سیاست میں کسی گروہ کے پیچھے آنکھ بند کر کے لگ جانے کا ہے بلکہ ادبی تخلیق کو فکر و دانش سے منور کرنے کا ہے وہ حکیمانہ مزاج جو کھو یا گیا ہے جسے ہمارا معاشرہ روحانیت کی دھند، توہمات کے غبار اور ذاتی مصلحتوں اور شہرتوں کی دوڑ میں بھول گیا ہے، اسے پھر سے فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ یہ نسخے پیش پا افتادہ اور بیکار ہیں کہ ادب کو کیا اور کیسا ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ادیب جو کچھ دیکھے گا وہ لکھے گا جیسی روح ویسے فرشتے، مگر ادب کی اہمیت کا یہ ایک ایسا پہلو ہے جسے معاشرہ نظر انداز نہیں کر سکتا جب تک ذہنی اور جذباتی ساز و سامان آپ کے اپنے معاشرے کے حالات کے مطابق نہ ہوگا اُس وقت تک پورا معاشرہ اُلار اور بے ہنگم رہے گا اور اس کا توازن محض خارجی سے نہیں داخلی تمول کے بغیر بحال نہیں کیا جا سکتا۔

ھندوستان میں علم و دانش ہی نہیں پورا معاشرہ ایک خطرناک دور سے گزر رہا ہے۔ سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ عہد جدید کی حکیمانہ حسیت سے بہرہ اندوز ہونے کے بجائے ہمارے معاشرے کا رخ تجدیدیت کے نام پر دقیانوسیت اور ماضی پرستی کی طرف ہے اور اس جوش میں آگے بڑھنا تو کجا ہم اپنے معاشرے کی صدیوں کی اس کمائی کو بھی ہاتھ سے کھو رہے ہیں جو ہمارے آبا و اجداد نے مختلف ملتوں کے اشتراک سے حاصل کی تھی ہماری مشترکہ تہذیب کی وراثت نظر انداز ہی نہیں منسوخ کی جا رہی ہے، تنگ نظری نے فرقہ پرستی کو طرزِ فکر قرار دے لیا ہے اور اس جوش میں خود اپنی زبان کاٹے ڈال رہی ہے، اپنے کلچر کا

گلا گھونٹ ڈال رہی ہے اور اپنے اوپر ماضی کا اندھا غلاف اوڑھے لے رہی ہے ایک صورت حال کو خاموشی سے دیکھتا اور کچھ نہ کر پاتا یا محض کلبیت اور بیزاری سے چڑچڑے ہو کر رہ جاتا یا اس کے ردعمل کے طور پر خود اپنے فرقے کی فرقہ پرستی، دقیانوسیت اور تحدیدیت میں مقید ہو رہنا مناسب نہیں ہے۔ معاشرے کی صحت کا دارومدار نئے خون ہی پر نہیں ہوتا پرانے خون کے صحت مند عناصر کے تحفظ پر بھی ہوتا ہے۔ یہ کام اہل سیاست کی اکثریت کے لیے سود مند نہیں اسی لیے تو کسی نے کہا تھا کہ اہل سیاست کے ضمیروں کی نگہداشت بھی ایک فریضہ ہے جو ادیبوں اور دانش وروں کو ادا کرنا ہے۔ پورے معاشرے کی حسیات کو جدید اور حکیمانہ سطح تک لانا اور اس مشترکہ تہذیبی وراثت کی حفاظت کرنا جسے تنگ نظری سے زبردست اور مہلک خطرہ لاحق ہے۔ تاریخی فریضے ہیں جو اہل فکر کی توجہ کے منتظر ہیں۔

ہماری ایجنسیاں

احمد سہیل

یورپ کا سفّاک تھیٹر

ابتدا ہی سے فرانس یورپ کا ثقافتی مرکز رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر ادبی تحریکیں فرانس میں جنم لینے کے بعد ہی یورپ کے ادبی حلقوں میں پھیلیں۔ ۱۹ویں صدی کے آخری حصے میں فرانسیسی اسٹیج ایک بار تجرباتی کشمکش میں پھنسا ہوا تھا جہاں ہر ڈرامہ نگار ماضی کی تحریکوں سے رشتہ توڑنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ ڈاڈا ازم اور سرریلسٹ تحریک اسی کشمکش کا نتیجہ ہیں۔ ان دونوں تحریکوں کے علمبردار الفریڈ جیری اور اندرے بریتوں تھے جن کے ڈرامے فرانس کے متوسط طبقہ پر اپنی سخت تنقید سے انگلستانی ادب میں عہد تجدید سے جا ملتے ہیں۔ وہ اپنی تحریک کے ذریعے جس اصلیت کو پانا چاہتے تھے اسے حاصل نہیں کر سکے لیکن ۱۹۳۶ء میں فرانسیسی ڈرامے کو اس کشمکش سے نجات مل گئی اور اس نئی تحریک کا آغاز ہوا اس کے بانی انتونن آرطو[1] نے جسے انقلابی تھیٹر[2] کے نام سے موسوم کیا۔ انتونن آرطو (۱۸۹۶ء۔ ۱۹۴۸ء) اپنے ہوش سنبھالتے ہی ناٹک کا شوقین ہو گیا۔ وہ اپنے دور کے ڈرامائی ادب سے مطمئن نہیں تھا اور ڈرامے کی دنیا میں انقلاب لانے کا خواہش مند تھا۔ اس کی یہی جستجو اسے مختلف تھیٹروں میں لے گئی مگر وہ اپنے نظریات کی ندرت کے باعث جلد ہی ان تھیٹروں سے اکتا گیا۔ البتہ ان کی مدد سے وہ اپنی تصنیف[3] کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکا۔ تمام

---

[1] ANTONIN ARTAUD

[2] THEATRE OF CRUELTY

[3] THE THEATRE AND IT'S DOUBLES

نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ آخنکو کی یہ تصنیف اس کے بعد آنے والی تحریکوں پر گہرا اثر رکھتی ہے۔ وہ اپنے تھیٹر کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "سفاک تھیٹر کا مقصد انسانی لاشعور میں موجود ان خوفوں کا تزکیہ ہے جن کا اظہار عام زندگی میں نہیں ہوتا"۔ انہی نظریات کے حصول کی خاطر آخنکو مغربی تھیٹر کو معاون نہیں پاتا۔ ڈرامے کے بارے میں اس کے نظریات الفریڈ جیری کے ڈرامائی نظریات سے ملتے ہیں۔ ان دونوں کے جوہری ملاپ سے ۲۰ ویں صدی کا آوان گارد ڈرامہ تشکیل پاتا ہے۔ الفریڈ جیری کے ڈرامے خالص بغاوت ہیں اور اس کے وحشی دیوتا کا طربیہ پھتاوے کے بغیر زندگی کو کچل دینے کا عمل ہے۔ آوان گارد ڈرامہ نفیست اور یاسیت کا ڈرامہ ہے۔ الفریڈ جیری کا کھیل کنگ اوبو تباہی کی ایک ایسی قوت ہے جس نے تفریحی مقاصد کو ڈرامے سے ہمیشہ کے لیے باہر نکال پھینکا۔ آخنکو کے خیال میں ڈرامہ اور دیگر فنون میں خرابی، ثقافت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ثقافت سے آخنکو کی مراد کسی تہذیب کی خود ساختہ قدریں ہیں جو اس پر مسلط کر دی گئی ہیں اس طرح انسانی مزاج کا جوہر رسمی نقابوں کے پیچھے چھپ جاتا ہے اور یوں غیر حقیقی بن جاتا ہے جب کہ فن حقیقت ہے اور فن کار کا فریضہ حقیقت کا اظہار۔

آخنکو نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "فن ایک شخص کا اظہار ہے اور ثقافت تمام لوگوں کا"۔۔۔۔ اس کے نزدیک ثقافت نابود ہو جانی چاہیے اور فن کار کو انسان کی جبلی خواہشوں پر غور کرنا چاہیے۔ آخنکو کے یہاں ڈرامے کے دو مقاصد ہیں۔ ثقافت کی پیدا کردہ خود ساختہ درجہ بندی کے خلاف بغاوت اور انسانی روح اور اس کی صورتحال کی نقاب کشائی ۔۔۔۔۔ سو اس کے کردار جب تخیلی زندگی میں بڑے نظر آتے ہیں یا مکالمے سے عاری ہوتے ہیں تو اس میں زندگی کی خود ساختہ قدروں اور ابلاغ کی نفی مقصود ہوتی ہے۔ آخنکو کے نزدیک مکالمہ تھیٹر کی ضد ہے۔ اس طرح ایسا تناقض ظہور میں آتا ہے جس میں فن کار حقیقت کی نقاب کشائی چاہتے ہوئے ڈرامے کو مبہم کر کے لیے مشکل بناتا ہے۔ دراصل آخنکو کے نزدیک تھیٹر کی بنیاد مکالمہ نہیں ادب ہے۔

الفریڈ جیری کی تقلید کرتے ہوئے آختکو نے تھیٹر کو قدیم ترین ہئیت کی طرف لے جانے کی کوشش کی اس نے مغربی تھیٹر کو اس بنیاد پر رد کر دیا کہ مغربی ڈراموں میں دیو مالائی قصے کہانیوں کو حتی الامکان ان کے حقیقی رنگ میں پیش کرنا چاہیے۔ وہ اپنی کتاب میں مغربی ڈرامے کو مغربی[۱] اور مشرقی[۲] تھیٹر میں تقسیم کرتا ہے اس کے بقول مغربی تھیٹر تہذیب کی ملمع سازی تک محدود ہے۔ وہ انسانی جبلت کی گہرائیوں میں جھانک کر اس کے لاشعور کا مطالعہ نہیں کرتا جب کہ مشرقی تھیٹر انسانی لاشعور میں موجود زندگی اور خوف کے ان جذبات کو بے نقاب کرتا ہے جن کا عام زندگی میں کھلے عام اظہار نہیں ہوتا، یہی سبب ہے کہ وہ "سفاک تھیٹر" کی تفصیل بیان کرتے ہوئے اپنی تحریک کا رشتہ مشرقی مکتبۂ فکر سے جوڑتا ہے۔ آختکو محسوس کرتا تھا کہ تھیٹر جیسی مکمل ہئیت تہذیب کے تحت زوال پذیر ہو رہی ہے سو آختکو نے سب سے پہلے اپنے عہد کے تھیٹر کو تباہ کیا۔ اس نے ہر اس شے کی مخالفت کی جو اس عہد کے تھیٹر کی نمائندہ کہی جا سکتی تھی۔ مثلاً اس نے معاشرے، روایت، جدید فن ڈرامہ یہاں تک کہ تھیٹر کے معروضی ڈھانچے کی مخالفت کی اس کے ساتھ پیش کردہ مواد کے خلاف بھی قدم اٹھایا اور تھیٹر کو بنیادی عناصر کی جانب لے گیا جہاں سے اس کا آغاز ہوا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے آختکو کے ذہن میں یہ تھا کہ ڈرامہ انسانی صورت حال کا اظہار ہے۔ قدیم فن میں ڈرامہ انسان کی ازلی طاقت کا اظہار تھا اور کسی کے سامنے جھکنا ادب نہیں بلکہ نفرت کا اظہار تھا۔ آختکو نے اس بغاوت سے اپنے ڈرامے کا آغاز کیا۔

آختکو کا "سفاک تھیٹر" کیا ہے۔ اکثر ناقدین نے "سفاکی" سے جنسی ہیجانات کے اظہار، ظلم و تشدد کی نقشہ کشی مراد لی ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس سے انسانی زندگی میں ناکامیوں اور کامیابیوں کے پس پردہ جو عوامل کارفرما ہیں ان میں پنہاں درد کی تصویر کشی کرنا مقصود ہے[۳]

---

۱ OCCIDENTAL

۲ ORIENTAL

۳ THE PAIN OF ACHIEVEMENT IS CRUELTY

پیش کیا تو اس نے موسیقی مناظر اور روشنی سے وہ ماحول پیدا کیا کہ اکثر ناظرین ڈرامے کے اختتام سے قبل بے ہوش ہو گئے تھے۔ اسی طرح اسپین میں آخطو کا ایک کھیل پیش کیا گیا تو اس کے دو ناظرین خوف کے مارے موت کے آغوش میں چلے گئے۔ آخطو سے جب ایک نقاد نے یہ دریافت کیا کہ آپ اپنے ڈراموں میں خوف سے بھرپور مناظر کیوں پیش کرتے ہیں؟ تو اس نے کہا "تمام مغربی تھیٹر اپنے ناظرین کو بزدل بناتے ہیں جب کہ میں ان کے لاشعور سے خوف کو بے نقاب کر کے ان میں زندگی کی جرأت پیدا کرنا چاہتا ہوں۔"

آخطو دوسرے مغربی ڈرامہ نگاروں کی طرح روایت پسندی کا قائل نہیں، وہ اپنے ڈراموں کا مرکزی خیال میکسیکو کے غیر مہذب معاشرے سے لیتا ہے کیونکہ اس کے خیال میں تہذیب انسانی لاشعور کو خوف کی ایسی آماجگاہ بنا دیتی ہے جس سے باہر نکلنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ لہٰذا وہ اپنے کرداروں کو تہذیب سے اس قدر دور رکھتا ہے کہ اس کے لباس زبان اور طرزِ زندگی کو دیکھ کر ہر دیکھنے والا انہی ابتدائی نسلوں کی جانب دیکھنے لگتا ہے۔ وہ ان کرداروں سے ہر طرف تو ناظرین کو اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ درحقیقت انسانی زندگی کس قدر سادہ آزاد اور آسان ہے، دوسری طرف اس تلخ حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے کہ تہذیب اور تمدن کی دبیز تہہ نے انسانی ذہنوں پر ایسا جالا بُن دیا ہے کہ اسے حقیقت کو اس کے ابتدائی رنگ میں دیکھنے کی عادت ہی نہیں رہی۔ آخطو اپنے ڈراموں میں جن معاشرتی طاغوتی طاقتوں پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ ان میں مذہبی طبقہ، رئیسوں کا طبقہ اور دفتر شاہی کا طبقہ شامل ہیں۔

چونکہ آخطو اپنی مختصر زندگی کے باعث اپنے نظریات کو اپنے ہاتھوں عملی شکل نہ دے سکا۔ اس لیے ہم اس کے نظریات کی عملی صورت کو اس کے قریب ترین جانشین ژاں ژینے کے مشہور ڈرامے "دی بلیک" کی مدد سے پیش کریں گے۔

اس کھیل میں ژینے نے آخطو کے نظریات کو بھرپور طریقے سے عملی شکل دی۔ اس تمثیلچے میں ژینے نے سیاہ فام قوم اور سفید فام نسل کے اہم مسئلے کو پیش کیا ہے۔ ڈرامے کی ہیروئن ایک سیاہ فام طوائف ہے جو پوری سفید نسل کو اپنے دام میں گرفتار کر لیتی ہے اور سفید فام

آخطو نے انسان کو پاسکل کی نظر سے دیکھا اور اس نظریے پر پہنچا کہ تھیٹر کو انسان کی بنیادی صورت حال کا اظہار کرنا چاہیے یہیں سے سفاک تھیٹر کا آغاز ہوا۔

سفاکی اذیت پسندی نہیں، یہ ایک غیر شخصی اور غیر ذہنی سفاکی ہے جو ہر انسان کے اندر موجود ہے۔ کائنات اپنے تشدد پسند فطری مظاہر پر سفاک ہے اور انسان کو اس سفاکی سے آگاہ ہونا چاہیے۔ یہ سفاکی انسان کی کمزوریوں کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے لیکن یہ اس طرح پیش کیے جانے چاہئیں کہ ان سے تطہیر کا تصور پیدا ہو، یہ ناظر کی کسمپرسی کی طرف اشارہ کرے جو کائنات گیر اندھی قوتوں کے جبر سے پیدا ہوتی ہیں۔ تھیٹر کو جذبات کا استحصال کرنا چاہیے اور اسے سرشاری کی سطح تک آجانا چاہیے۔ اس میں سپردگی اور متصوفانہ وصال کا اظہار ہونا چاہیے، جس میں بغاوت کی آمیزش ہو۔ اس کا فطری نتیجہ یہ نکلا کہ تھیٹر غیر شعوری اظہار ہو گیا۔ آخطو کا تھیٹر لازماً قدیم رسوم کے گرد گھومتا ہے لہٰذا یہ ناظرین کو اداکاروں کے پیدا کردہ جذبے کے بھنور میں کھینچ لاتا ہے اس طرح تھیٹر صرف اس اعمال پر منحصر ہو گیا جو فوری جذبے کے تحت ابھرے ہیں۔

آخطو کا نظریۂ سفاکی دراصل اتنا دقیق ہے کہ عریانیت اور جنسیت کے ذریعے اس کا اظہار ممکن نہیں۔ اس کی رفاقت کا اندازہ ہم اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ آخطو نے سفاک تھیٹر میں الفاظ کی بھرمار کو گناہ تصور کیا ہے۔ اس کے نزدیک چونکہ لاشعور کی نمایندگی نہیں کر سکتے، اس لیے یہ خوابوں کی زبان کو ترجیح دیتا ہے۔ مقصد یہ کہ الفاظ سطحی ابلاغ کا ذریعہ ہیں اس لیے لاشعور تک پہنچنے کے لیے جس تہذیب کی خلا کو دور کرنا پڑتا ہے وہاں الفاظ سے زیادہ طاقتور راکٹ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آخطو حرکات و اشارات جسمانی کے استعمال کا قایل ہے۔ اس کے تھیٹر کو جو بات ممیز کرتی ہے اس میں تھیٹر کی تکنیک کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ مثال کے طور پر وہ موسیقی، روشنی، الفاظ مناظر تمام کو ڈرامے کے پلاٹ کا حصہ تصور کرتا ہے مگر حضرت عیسیٰ کی پیدائش کو ڈرامائی تشکیل مقصود ہو تو آخطو کے نزدیک تھیٹر کے ہدایت کار کو ان تمام خونی مناظر پر توجہ دینی چاہیے جن سے اکثر ہدایت کار گریز کرتے ہیں۔ آخطو نے خود بھی شیکسپیئر کے ڈرامے میکبتھ کو

اکثریت کے تمام عہدے داروں کو یکے بعد دیگرے نہایت ہی چالاکی اور سفاکی سے قتل کر دیتی ہے اور یوں سیاہ فام رفتہ رفتہ اپنا اثر و رسوخ بڑھا لیتے ہیں۔ ژینے نے پورے اس تمثیلچے میں تضاد کے ذریعے اس حقیقت کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے کہ سفید فام اندر سے جتنا سیاہ ہوتا ہے اس کے مقابلے میں سیاہ فام کی روح کا اُجالا اتنا ہی روشن اور تابناک ہے۔ اس نے جہاں جہاں اس تمثیلچے کو پیش کیا کہ وہاں اُس نے اس بات کا خیال رکھا کہ تمام اداکار سیاہ فام اور سامعین سفید فام تھے۔ اس طرح وہ سیاہ اور سفید کا کامیاب تضاد پیش کرنے میں کامیاب رہا۔ روشنی، موسیقی اور پس منظر وغیرہ بھی اس انداز سے تشکیل دیتا تھا کہ سیاہ اور سفید کا تضاد برقرار رہے۔ دوسری کامیاب تکنیک جو ژینے نے استعمال کی وہ سامعین کے لاشعور میں موجود ان خوفوں کا تزکیہ تھا جو عام زندگی میں ہر شخص کے عمل سے ظاہر نہیں ہوتا مثلاً سفید فام نسل کے اس خوف کو کہ سیاہ فام ہم پر قابض ہو گئے تو کیا ہوگا؟ ژاں ژینے نے اسٹیج پر سیاہ فام کی عارضی حکومت دکھا کر اس کو بڑی کامیابی سے پیش کیا ہے۔ اسی تمثیلچے میں ژینے ایک منظر میں سیاہ فام نسل کی کھوپڑیوں کا مینار دکھاتا ہے۔ ایک اور مقام پر بھوری سیاہ فام نسل کی نس بندی کا بھیانک منظر پیش کرتا ہے۔ ان مناظر سے اسٹیج کے گرد بیٹھے ہوئے ناظرین نہ صرف خوف سے لرز اٹھے بلکہ ان کے شعور میں موجود درندگی اُبھر کے سامنے آگئی۔ یہی تکنیک "سفاک تھیٹر" کی روح ہے۔

ژینے کے علاوہ فرانسیسی ہدایت کاروں ژاں لوئیس بارولت (JEAN LOUIS BARRAULT)، ژاں ویلر (JEAN VILAR) اور راجر بلین (ROGER BLIN) ہی نے نہیں بلکہ جرمنی میں ڈرامہ نگار پیٹر ویس (PETER WEISS) اور برطانیہ میں ایڈورڈ باونڈ (EDWARD BOND) نے لندن کی رائل شیکسپیئرین کمپنی میں "سفاک تھیٹر" کی تحریک میں بھرپور حصہ لیتے ہوئے کئی ڈرامے اسٹیج کیے۔

۱۹۳۶ء میں شروع ہونے والا "سفاک تھیٹر" علامتی تحریک، دادا تحریک اور میئر (MAYOR) کے روسی ڈرامے کا منطقی نتیجہ تھی۔ ایک طرف تو اس نے نوتشکیل تھیٹر اور

مغربی تھیٹر کی فرسودگی کو توڑا اور دوسری طرف مغربی ڈرامے میں موجود ان پوشیدہ خوبیوں کو بے نقاب کیا جن کی مدد سے ایک کامیاب اور ایک بھرپور اسٹیج کی تشکیل ممکن ہے۔ لیکن اس کا یہ مقصد قطعی نہیں کہ "سفاک تھیٹر" مشرقی تھیٹر کا جدید روپ ہے۔ دراصل "سفاک تھیٹر" مغربی اور مشرقی تھیٹر کے درمیان ایک ایسا راستہ ہے جس پر چلنے والا ڈرامہ نویس انسانی شعور کے سربستہ رازوں سے آگاہ ہو جاتا ہے۔



آغا جمیل احمد شاہ کاشمیری

آغا حشر

حیات اور کارنامے

(تصویر مصنف مضمون ہذا)

بنارس اور کشمیر کا رشتہ بہت پرانا ہے متعدد کشمیری خاندان بسلسلۂ تجارت وقتاً فوقتاً آئے اور یہاں آباد ہوگئے۔ انھیں خاندانوں میں سے ایک خاندان شیخ رحمان مرحوم کا تھا جو محلہ چاہ مہماں بنارس میں آباد تھا۔

اٹھارویں صدی کے نصف کے قریب سید احسن شاہ صاحب جن کو عرف عام میں "پیرجی" کہتے تھے، بسلسلۂ تجارت کشمیر سے بنارس آئے۔ کچھ دنوں کے بعد شیخ رحمان صاحب کی بڑی صاحب زادی سے ان کا عقد ہوا اور انھوں نے محلہ گوبند پورا کلاں میں سکونت اختیار کرلی۔ کچھ عرصے کے بعد "پیرجی" نے اپنے حقیقی بھانجے غنی شاہ اور اپنے بھتیجے سلام شاہ کو بھی بنارس بلالیا۔ ۳۰ر جولائی ۱۸۶۸ء کو انھوں نے اپنی سب سے چھوٹی سالی (دختر شیخ رحمان مرحوم) سے غنی شاہ کا نکاح کر دیا۔ نکاح نامے میں دیگر شرائط کے علاوہ ایک شرط یہ بھی تھی کہ عروس بنارس سے باہر نہیں جائے گی، اس لیے غنی شاہ اپنا بزنس الگ کرنے لگے ۱۸۶۹ء میں غنی شاہ کے یہاں بیٹا پیدا ہوا مگر کچھ دنوں کے بعد اس کا انتقال ہوگیا۔ اس

کے بعد ایک مدت تک غنی شاہ کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی جس کی وجہ سے وہ بہت مغموم رہا کرتے تھے۔ منتوں، مُرادوں اور دعاؤں کے بعد ۱۱ ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ مطابق ۳ اور ۴ اپریل ۱۸۷۹ء کی درمیانی شب میں دوسرے بیٹے کی ولادت ان کے مکان سی کے ۴۳/۱۳۶ ناریل بازار بنارس میں ہوئی۔ مولوی محمد جبار نے ۲۸ ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ فارسی میں نومولود کا منظوم زائچہ مرتب کیا اور خلیل احمد شاہ اور محمد شاہ دو نام تجویز کیے۔ والدین کی نگاہِ انتخاب نے محمد شاہ کو ترجیح دی لیکن آنے والے وقت نے اسے آغا محمد شاہ حشر کے نام سے پہچانا اور پھر رفتہ رفتہ آغا حشر کے نام سے شہرت کے بامِ عروج کا ایک چمکتا ہوا ستارہ بنا دیا۔

غنی شاہ طویل القامت اور مضبوط قویٰ کے مالک تھے۔ عبا اور قبا ہر وقت زیب تن رکھتے تھے۔ اس لیے اہلِ محلہ اُنھیں آغا صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ اس طرح لفظ "آغا" اُن کے نام کا جُز ہو گیا اور بعد میں ان کے دونوں صاحبزادگان محمد شاہ اور محمود شاہ کے ناموں کے ساتھ بھی منسلک ہو گیا۔ تاحیات غنی شاہ کا رابطہ کشمیر سے قائم رہا۔ اسی لیے آغا حشر نے اپنی وطنیت کو اپنی ذات سے علیحدہ کرنا پسند نہیں کیا اور خود کو ہمیشہ کاشمیری کہتے اور لکھتے رہے۔

خاندان پر چونکہ مذہبی رنگ غالب تھا اس لیے آغا حشر کی تعلیم کی ابتدا مکتب سے ہوئی بعد ازاں بنارس کے مشہور استاد مولوی حافظ عبدالصمد صاحب سے دینیات اور حفظِ قرآن کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی کے درس کی تحصیل کا آغاز ہوا۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ پیراکی، کشتی اور شطرنج بچپن میں حشر کے محبوب مشغلے تھے۔ ذہین طالب علم ۱۵ برس کی عمر میں تعلیم کے ابتدائی مراحل طے کر کے فارغ التحصیل ہو گیا مگر حافظہ سولہ سیپاروں سے زیادہ نہیں ہو سکا۔ حشر کو انگریزی تعلیم کا شوق تھا لیکن ان کے والد نے جنھیں میراث میں یہ جذبہ ملا تھا کہ انگریزی اور انگریزوں سے اجتناب کیا جائے ان کی اس خواہش کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ان کی تمنا تھی کہ ان کا لڑکا مذہبیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے عالمِ دین بنے۔ آغا غنی شاہ کو انگریزی وضع قطع سے بھی سخت نفرت تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ حشر نے بچپن میں ایک بار ہم عمروں کی نقالی میں انگریزی وضع کے بال

نزشوا بیٹھے تھے اور اتفاق سے آڑی مانگ نکالے ہوئے تھے۔ آغا صاحب انھیں راستے میں اس حالت میں دیکھ کر اس درجہ مشتعل ہوئے کہ ایک درزی کی دوکان سے قینچی لے کر وہیں کھڑے کھڑے حشر کے بال تراش دیئے۔

مغربی تہذیب اور انگریزی تعلیم سے تنفر کے باوجود کچھ دنوں کے بعد جے نرائنس اسکول کے استاد اور کئی مذہبی اور درسی کتابوں کے مصنف مولوی شہید الدین صاحب کے اصرار اور خاندان کے بعض افراد کے سمجھانے پر حشر کے والد نے ان کا داخلہ جے نرائنس اسکول کے مڈل کلاس میں کرایا۔ اسکول میں حشر کی ذہانت اور قابلیت کا یہ عالم تھا کہ مولوی شہید الدین کی عدم موجودگی میں اُن کے حسب ہدایت اسکول کے مختلف درجات میں فارسی کا درس دیا کرتے تھے اور ان کی ایک شاگردہ اور جے نرائنس اسکول کے پرنسپل ریورنڈ ڈیوڈ Rev.David کی صاحبزادی کو عربی صرف و نحو کا درس دیا کرتے تھے۔



(آغا محمد شاہ حشر کاشمیری۔ بمبئی ۱۹۱۰ء)

مولوی عبدالصمد صاحب سے حصولِ تعلیم کے زمانے میں حشر کو فارسی گوئی کا شوق ہوا چنانچہ اسی زمانے میں ملا غنی کشمیری کی غزلوں پر غزلیں کہیں۔ اردو میں شعر گوئی کی ابتدا جے نرائنس اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں ہوئی۔ ابتدائی غزلوں پر مرزا محمد فائز صاحب مدرّس اعلیٰ مشن اسکول اور بعدہٗ صدر شعبۂ اردو و فارسی بنارس ہندو یونیورسٹی سے اصلاح لی۔ اگرچہ فائز صاحب سے اصلاح لینے کی مدت بہت قلیل تھی پھر بھی حشر ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ دوسری طرف استاد کی محبت اور شفقت

کی انتہا یہ تھی کہ حشر کے بمبئی جانے کے دس برس بعد انھوں نے اپنے کلام کا کل ذخیرہ ان کے پاس بھیجا تھا اور لکھا تھا کہ تم انتخاب کر دو تاکہ دیوان طبع ہو جائے۔

جے نرائن اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں حشر کو اردو شاعری کے پہلو بہ پہلو ڈرامے سے بھی دل چسپی پیدا ہو گئی چنانچہ اسکول کے اوقات کے بعد وہ اکثر اپنے ہم جماعتوں کو ساتھ لے کر اسکول سے متصل جو قبرستان ہے پلنگ کی چادریں تان کر "اندر سبھا" اسٹیج کیا کرتے تھے۔ اتفاق سے اسی زمانے میں "جوبلی" کمپنی بنارس آئی۔ آغا حشر نے طلبا کے لیے رعایتی داموں پر ٹکٹ نہ دینے کی وجہ سے اس کمپنی کے ڈراموں کے خلاف "رفیع الاخبار" میں ایک مضمون لکھ ڈالا کمپنی کی جانب سے اس کا جواب شائع ہوا۔ حشر نے جواب الجواب میں اور بھی زیادہ سخت الفاظ میں تنقید کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مالکانِ کمپنی نے حشر کو مفت ڈراما دیکھنے کی دعوت دے کر مصالحت کر لی اس طرح روزانہ ڈراما دیکھنا حشر کے معمولات میں شامل ہو گیا۔ احسن صاحب اس کمپنی کے ڈراما نویس اور امرت لال ڈائرکٹر تھے۔ ان لوگوں سے روزانہ ملاقات ہونے لگی۔

احسن صاحب سے برابر کسی نہ کسی علمی یا مجلسی موضوع پر گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ ایک دن کسی موضوع پر احسن صاحب اور حشر میں بحث ہو گئی اور حشر یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے کہ جیسا ڈراما آپ لکھتے ہیں میں ایک ہفتہ میں ایسا ڈراما لکھ سکتا ہوں۔ اگرچہ احسن صاحب جیسے پختہ کار کے مقابلے میں حشر کا یہ دعویٰ بظاہر ایک طفلانہ تعلّی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا مگر اس واقعے کے فوراً بعد انھوں نے دوستوں کے کلب کے لیے اپنا پہلا ڈراما "آفتاب محبت" لکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ ان کی زبان سے نکلے ہوئے یہ الفاظ محض طفلانہ تعلّی نہیں تھے۔

"آفتاب محبت" جواہر اکسیر پریس بنارس سے ۱۸۹۷ء میں شائع ہوا تھا۔ ٹکسالی زبان ڈرامائی تکنیک کا کامیاب استعمال، بیان کی پختگی، کرداروں کی مناسبت اور شاعرانہ ندرت اس ڈرامے کی خوبیاں تھیں۔ ایک طرف شاعری کا ذوق دوسری جانب ڈراما لکھنے کا شوق دونوں نے مل کر حشر کو تعلیمی مشاغل سے بیگانہ کر دیا۔ ان کی اس روش کو دیکھتے ہوئے اُن کے والد نے بزنس کی جانب متوجہ کرنا چاہا، لیکن جب اس کوشش میں بھی کامیابی کی صورت نظر آئی تو انھوں نے حشر کے لیے بنارس میونسپلٹی میں ایک معقول ملازمت کا انتظام کر دیا۔

اس ملازمت کے لیے ضمانت کی رقم مطلوب تھی۔ ایک دن بڑے آغا صاحب ضمانت کی یہ رقم دے کر حشر کے ساتھ میونسپلٹی گئے مگر چند ضروری مشغولیات کے باعث وہ رقم حشر کے حوالے کر کے واپس آ گئے۔ اتفاقاً ضمانت اس دن جمع نہ ہو سکا اور جب حشر روپے لیے ہوئے گھر واپس آ رہے تھے تو راستے میں چند احباب مل گئے، جن کی خاطر تواضع میں آدھی جیب خالی ہو گئی۔ دریا دلی کے اس مظاہرے کے بعد والد کے سامنے جس شرمندگی سے دوچار ہونے کا خطرہ درپیش تھا اس کے تصور نے اُن کے قدم گھر کے بجائے اسٹیشن کی طرف موڑ دیے اور اس طرح حشر بنارس سے بمبئی جا پہنچے۔

حافظ مقبول احمد صاحب کوکب بنارسی کے چھوٹے بھائی عبداللہ جو بنارس میں حشر کے ہم نشیں رہ چکے تھے، آغا حشر نے بمبئی پہنچ کر ان کے یہاں قیام کیا۔ عبداللہ صاحبِ ذوق لوگوں میں تھے۔ اسی دن بمبئی میں کہیں مشاعرہ تھا۔ عبداللہ کے ساتھ حشر بھی اس مشاعرے میں شریک ہوئے۔ اور اس مشاعرے کی شرکت ہی کے نتیجے میں "بمبئی پنچ" کے ایڈیٹر مولوی فرح سے ان کی قلمی جنگ چھڑ گئی۔ مشاعروں میں کامیابی اور "پنچ" جیسے نامور اخبار میں تنقیدوں کی وجہ سے حشر نے جلدی ہی بمبئی کے ادبی حلقوں میں شہرت حاصل کر لی۔ کچھ دنوں کے بعد ایک دوست کی تحریک پر انھوں نے الفریڈ کمپنی کے مالک کاؤس جی کھٹاؤ سے ملاقات کی۔ کاؤس جی اس وقت چائے نوشی میں مشغول تھے۔ ان کی فرمائش پر چائے کے کپ کے زیر عنوان ایک فی البدیہہ نظم کہہ کر حشر نے انھیں استعجاب میں ڈال دیا۔ جس کے نتیجے میں کاؤس جی نے حشر سے دوسرے دن ملاقات کرنے کا وعدہ کیا۔ غلط فہمی کی بنا پر حشر نے اس وعدے کو دفع الوقتی سے تعبیر کیا اور وہاں سے مایوس ہو کر واپس چلے آئے۔ ناامیدی نے کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے مجبور کیا اور آخر کار بنارس کی مراجعت کا ارادہ پختہ ہو گیا۔ بنارس ٹیلیگرام دینے کے لیے جاتے ہوئے راستے میں امرت لال سے جو اس وقت کاؤس جی کی کمپنی میں ڈائرکٹر تھے، اُن کی ملاقات ہو گئی جنھوں نے یہ شکایت کی کہ کاؤس جی ان کے منتظر رہے اور وہ ان سے دوبارہ ملنے کیوں نہیں گئے۔

کاؤس جی سے دوسری ملاقات کے نتیجے میں حشر پارسی الفریڈ کمپنی میں ۳۵ روپے ماہانہ پر بحیثیت ڈراما نویس ملازم ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۲۰ برس کی تھی۔ انھوں نے اس کمپنی کے

لیے ۱۸۹۹ء میں ڈراما "مرید شک" لکھا جو ۹ ماہ کی مختصر مدت میں اسٹیج پر ساٹھ مرتبہ کھیلا گیا۔ "جام جمشید" "قیصر ہند" "راست گفتار" "فرصت" جیسے اخبارات نے اس کی تعریف میں رپورٹیں شائع کیں۔ پانچ ماہ بعد اسی کمپنی کے لیے آغا حشر نے "مار آستین" لکھا۔ یہ ڈراما بھی اسٹیج پر بہت کامیاب ہوا۔



(آغا حشر کاشمیری کے چھوٹے بھائی آغا محمود شاہ نشتر کاشمیری۔ کلکتہ ۱۹۲۰ء)

اب حشر کی مانگ ہر ایک کمپنی والوں کی طرف سے بڑھنے لگی۔ نوروز جی پری کی کمپنی میں وہ ڈیڑھ سو روپے ماہانہ پر بحیثیت ڈراما نویس ملازم ہو گئے جہاں ۱۹۰۱ء میں انھوں نے "اسیر حرص" لکھا۔ حشر کی بڑھتی ہوئی مقبولیت دیکھ کر کاؤس جی نے اُن کو پھر اپنی کمپنی "پارسی الفریڈ کمپنی" میں ۳۰۰ روپے ماہانہ پر واپس بلا لیا جہاں ۱۹۰۲ء میں انھوں نے "شہید ناز" لکھا۔ بمبئی کے قیام میں ۱۹۰۳ء سے لے کر ۱۹۰۹ء تک اڈیسر بھائی ٹھوٹھی کی کمپنی کے لیے "صید ہوس" "سفید خون" سہراب جی اگرا کی کمپنی کے لیے "خواب ہستی" "خوب صورت بلا" ڈرامے لکھ کر انھوں نے اپنی شہرت میں چار چاند لگائے۔

حشر کی گوناگوں صلاحیتیں ڈراما نویسی کی مشغولیت کے باوجود دیگر اصناف ادب سے بے تعلق نہیں تھیں۔ اپنے قریب ترین دوست ڈاکٹر امرت لال جن کی وساطت سے وہ دوسری بار کاؤس جی سے ملنے گئے تھے، کے انتقال پر انھوں نے جو فارسی میں مرثیہ لکھا ہے

وطن کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے آپ اپنی مثال ہے۔ یہ مرثیہ رسالہ شیکسپیر بمبئی میں ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا تھا۔ علمی اور ادبی نشستوں کی شرکت کے علاوہ مزید تحصیل علم کے شوق سے وہ بے پروا نہیں رہے۔ کوبیہ لائبریری بمبئی کے لائبریرین نے ایک تقریر میں ان کے شوقِ کتب بینی کے متعلق یوں اظہارِ خیال کیا تھا کہ آغا صاحب کا شوقِ مطالعہ دیکھ کر میں یوں محسوس کرتا ہوں کہ گویا یہ لائبریری شہر سے دور اور الفریڈ تھیٹر سے قریب صرف آغا صاحب کی علمی تشنگی کی سیرابی کے لیے بنائی گئی ہے۔ بمبئی کے زمانۂ قیام میں حشر انجمن ضیاء الاسلام کے جلسوں میں برابر شریک ہوتے تھے۔

۸ فروری ۱۹۰۷ء کے جلسے میں جس کی صدارت عالی جناب منشی محمد حسن صاحب قصبہ جے پی، رئیس اعظم بمبئی کر رہے تھے حشر نے "معجزات القرآن" کے عنوان پر ایک مبسوط لکچر دیا۔ انجمن کے سکریٹری کی رپورٹ کے مطابق "حشر کی تقریر کے وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ انجمن کی فضا میں فصاحت اور بلاغت کے بادل چھائے ہوئے ہیں جن سے درد، جوش اور تاثیر کے دریا برس رہے ہیں۔" تقریر کے آخری حصہ نے حاضرین کے دلوں میں جوہرِ فیاضی کو جنبش دی۔ لوگ انجمن کی امداد پر آمادہ ہوئے اور ایک معقول رقم چندہ میں جمع ہو گئی — ۹ فروری ۱۹۰۷ء کے جلسے میں صدارت عالی جناب سیٹھ عبدالحسین صاحب صاحبزادہ سر آدم جی پیر بھائی کر رہے تھے حشر نے "مکارمِ اسلام" کے عنوان پر تقریر کی۔ تقریر کا آخری حصہ چندے کی تمہید تھی جس نے لوگوں میں عام جوش پیدا کر دیا یہاں تک کہ مولوی سجاد حسین صاحب احمد آبادی نے اپنا بیش قیمت جبہ اتارا اور "برگِ سبز است تحفۂ درویش" کہہ کر انجمن کو نذر کر دیا۔ ۱۱ فروری ۱۹۰۷ء کے جلسے میں جس کی صدارت سیٹھ فاضل بھائی صاحبزادہ سر کریم بھائی ابراہیم صاحب رئیس اعظم بمبئی کر رہے تھے حشر نے "اب ہم کو کیا کرنا چاہیے" کے عنوان پر ایسی تقریر کی کہ بحوالہ سکریٹری انجمن "اس وقت کمال گویائی آپ کی لطف آفرینی سے متعجب اور حیران ہو رہا تھا" حشر کی تقریر کے بعد صدارتی تقریر میں صرف اتنا کہا گیا "آپ کی تقریر پر بطور تتمہ کے اضافہ کرتا ہوں —" ۱۲ فروری ۱۹۰۷ء کے جلسے میں صدارت حشر نے کی اور اپنی صدارتی تقریر میں دیگر اصحاب کی تقریروں پر بحوالہ سکریٹری جلسہ "ٹکڑوں کی تائید و توضیح میں

ایک مبسوط تقریظ بیاں فرمائی اور اپنی وسیع معلومات کے خزانے سے ایسے جواہر نثار پیش کیے جن سے اِن نکھروں کے کمال کی پیشانی زیادہ آب و تاب سے جگمگا لے گی! اسی سال ہز مجسٹی امیر حبیب اللہ خاں والیٔ افغانستان کی ہندوستان بطور مہمان تشریف آوری سے قبل جو جلسہ انجمن ضیاء الاسلام کا اس سلسلے میں ہوا تھا اس کی صدارت جناب مولوی رفیع الدین احمد بیرسٹرایٹ لا نے کی تھی۔ اس جلسے میں آغا حشر نے جو تقریر کی تھی اس کی تعریف میں بحوالہ سکریٹری انجمن؎ اتنا ہی کافی ہے "خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست" اور جب ہز مجسٹی ہندوستان تشریف لائے تو ان کی خوش آمدید میں حشر نے فارسی زبان میں ایک قصیدہ لکھا جو بعد میں؎ البرید کانپور میں شائع ہوا تھا۔ اس کی تشبیب کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے،

صبحدم دیدم بیامد نازنینے مہ رخے — خندہ برلب، جام برکف، جلوہ پاش و برق بار
ماہروئے مشکبوئے، دلبرے، جاں پرورے — خوش نظر، والا گہر، لیلےٰ ادا، شیریں وقار
ناز پرور، ناز گستر، نازنیں، ناز آفریں — گلبدن، گل پیرہن، گلگوں قبا، گلگوں عذار
عنبریں مو، یاسمیں بو، شعلہ خو، آئینہ رُو — جلوہ بخشِ شامِ غم، صبح آفرینِ روزگار
غمزۂ بیباک او صد نخوتِ دارا شکن — عشوۂ چالاک او پنجہ کشِ اسفندیار
طُرّہ ہائے عنبریں‌ش زور آور زور وَر — خنجرِ چینِ جبینش ضرب زن، ضربش گذار
جستم و در برکشیدم، بوسہ دادم پے بہ پے — باز پرسیدم کہ اے جاں در لبم بر تو نثار
کیستی چوں آمدی بخندید و باصد ناز گفت — اے فصیح کاشمر، اے شاعرِ معجز نگار
آنم از مشرق بہ مغرب نور افشانی کنم — آنم اندر عالمِ ایجاد چوں شمس النہار
از شمیم جودِ ما گلشن بہ داماں ہر ختن — از نسیمِ لطفِ ما فردوس در ہر کوہسار

آغا حشر نے مغربی ڈرامے کے پیکر کو ہندوستانی ملبوس پہنا کر زبان و بیان کے زیورات اور آتش نوا خطابت سے آراستہ کر کے شائقین کو ڈرامے کی افادیت کی جانب متوجہ تو کر لیا تھا، مگر وہ مقصد حیات جس سے معاشرے میں زندگی، خیال میں وسعت، اور روح میں بالیدگی پیدا ہو۔ مالکان کمپنی کی ترمیش خواہش اور ڈرامے کے پلاٹ، زبان اور بیان میں بیجا مداخلت سے اس نقطۂ عروج تک نہیں پہنچ سکتا تھا جہاں تک حشر اسے لے جانا چاہتے تھے

اس کے بعد انھوں نے ملازمت کی قید سے آزادی حاصل کر کے حیدرآباد کے ایک تعلقہ دار راجہ دھونڈی راؤ کی شرکت میں انڈین شیکسپیر تھیٹریکل کمپنی کی بنیاد ڈالی اور ۱۹۱۰ء میں اپنا پہلا جلسی ڈراما "سلور کنگ عرف نیک پروین" اسٹیج کیا۔ کمپنی حیدرآباد، گجرات، سورت اور مدراس میں جب اپنے ڈرامے کھیل رہی تھی اسی زمانے میں حشر نے "مشرقی حور عرف یہودی کی لڑکی" ڈراما لکھا اور اسٹیج کیا۔ "یہودی کی لڑکی" میں عذرا کا پارٹ منصف نامی ایک ایکٹر کیا کرتے تھے جب کمپنی ۱۹۱۱ء میں دہلی گئی اور جس دن وہاں یہ ڈراما اسٹیج ہونے والا تھا منصف نے عذرا کا پارٹ کرنے سے اس وقت انکار کر دیا جب تماشہ شروع ہونے میں چند گھنٹے باقی رہ گئے تھے یہ بڑا نازک وقت تھا اس وقت حشر کے سامنے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ خود عذرا کا پارٹ ادا کریں۔ جب وہ ڈریس روم میں میک اپ کرنے جا رہے تھے اُن کے چھوٹے بھائی میرے والد محترم جناب آغا محمود شاہ نے انھیں روکا، اور خود ڈریس پہن کر عذرا کا کردار ایک نئے انداز میں پبلک کے سامنے پیش کیا کہ 'منصف' کی اداکاری سب لوگ بھول گئے اور اسی دن سے وہ اس کمپنی میں عذرا کے کردار کے علاوہ "سلور کنگ" میں "افضل" کا کردار بھی ادا کرنے لگے۔ ان کی اس اداکاری نے مستقبل میں ہندوستان گیر شہرت حاصل کی۔ باوجود اس کے کہ حشر ڈراما نگاری کے ساتھ ساتھ اب کمپنی کے انتظامات میں جس کے وہ تنہا مالک ہو چکے تھے انتہائی مشغول رہتے تھے مگر سوامی مرار دیو، پنڈت جگ نرائن دو مناظرہ پسند دوستوں کے مذہبی اعتراضات کی مدافعت اور مشنیری پادریوں سے مذہبی مباحثے کرنے کے لیے ان کا دماغ ہر وقت حاضر رہتا تھا۔ دہلی میں ایسے کئی معرکے ہوئے جس میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی حشر کے ساتھ تھے۔

انڈین شیکسپیر تھیٹریکل کمپنی دہلی اور پنجاب کے مختلف علاقوں کا دورہ کرتی ہوئی مارچ ۱۹۱۳ء میں لاہور پہنچی۔ وہاں انجمن حمایت اسلام کے دعوت نامے پر ۲۱ مارچ ۱۹۱۳ء کو انجمن کے سالانہ جلسے میں حشر نے ایک نظم پڑھنے کا وعدہ کر لیا۔ مگر جلسے کے ایک دن قبل تک کمپنی کے انتظامات نے نظم لکھنے کی فرصت نہیں دی۔ شب میں حکیم فقیر محمد چشتی نے اُن کو نظم پڑھنے کا وعدہ یاد دلایا۔ آغا صاحب اسی وقت لحاف اوڑھ کر بیٹھ گئے اور حکیم صاحب کی

موجودگی میں منشی فضل الٰہی مرغوب رقم کو نظم "شکریہ یورپ" لکھوانی شروع کر دی جس کی راتوں رات خواجہ حسن نظامی کے مقدمہ کے ساتھ کتابت اور طباعت ہوئی۔ اس جلسے کی روداد محمد علم الدین سالک پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور یوں لکھتے ہیں :-

"جب جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی تو لوگوں نے دیکھا کہ ایک دُبلا پتلا سرخ و سپید انسان آنکھوں پر چشمہ لگائے، سر پر ترکی ٹوپی رکھے سیاہ سوٹ پہنے اسٹیج کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہر طرف سے انگلیاں اٹھنی شروع ہوئیں اور معلوم ہوا کہ آغا حشر آ گئے۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری اس وقت صدر جلسہ تھے۔ آغا صاحب اُن کے پاس جا کر بیٹھ گئے جب آپ کے نظم پڑھنے کا وقت آیا تو سب سے پہلے آپ نے نہایت موزوں الفاظ میں اس بات کا شکوہ کیا کہ انھیں بہت کم وقت دیا گیا۔ اس کے بعد حمایت اسلام کے اراکین کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کر دی کہ وہ کشمیری نہیں کاشمیری ہیں۔ یہاں اس کاشمیری کی تشریح کرتے ہوئے ختم پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد موتوا قبل ان تموتوا پیش کیا اور اس پر تقریر کرتے ہوئے علم و معارف کے دریا بہائے۔ تمام حاضرین پر وجد کا عالم طاری تھا۔ علمائے کرام کی وہ جماعت جو اس سے قبل اراکین انجمن پر اس وجہ سے ناراض ہو رہی تھی کہ انھوں نے ایک ناٹک والے کو اسٹیج پر کیوں بلایا، اب سر جھکائے بیٹھی تھی۔ آخر آغا صاحب نے اپنی تقریر ختم کی اور دیکھنے والی آنکھوں نے دیکھا کہ علما نے اُٹھ اُٹھ کر نہایت عقیدت مندی سے آغا صاحب کے ہاتھ چومے۔ اُس کے بعد آغا صاحب نے اپنی نظم شروع کی، اس وقت محفل کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ اہل درد رو رہے تھے۔ ملت بیضا کے شیدائی سسکیاں لے رہے تھے، بوڑھے آہیں بھر رہے تھے، نوجوان جوش کی وجہ سے بے قابو ہو رہے تھے۔ عوام پر سکتہ کا عالم طاری تھا۔ بچے تک بت بنے سناٹا

کھینچے بیٹھے تھے۔ آخر مناجات والا بند آیا۔ آغا صاحب نے آستین چڑھاکر اثر میں ڈوبے ہوئے انداز میں پہلا شعر پڑھا۔ ؎

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لیے
بادلو ہٹ جاؤ دے دو راہ جانے کے لیے

محفل تڑپ اٹھی۔ بے خودی اور اضطرار کی حالت میں ہزاروں ہاتھ دعا کے لیے درگاہ ایزدی میں بلند ہوئے اور آمین آمین کی آواز نے آسمان میں گونج پیدا کر دی۔ اس نظم کو اس درجہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس کے مطبوعہ نسخے جو ایک ایک آنے پر فروخت ہونا شروع ہوئے تھے اس جلسے میں ایک ایک پاؤنڈ پر بھی دستیاب نہ ہو سکے۔"

دراصل اس نظم میں حشرؔ نے اپنے ذہن کے کوہ آتش فشاں سے ابلتے ہوئے آتشیں الفاظ میں مشرق کے محو استراحت سیاسی شعور کو جگایا ہے تاکہ ایشیا بے جان ہونے کے بجائے زندگی سے ہمکنار ہو کر یورپ کا مدمقابل ہو جائے۔ آغا حشرؔ نے یہ پیغام اُس وقت دیا تھا جب ہندوستان آزادی کے شعور کی ابتدائی منزل میں تھا۔ آج بھی تصور سیاسی شعور پر چھایا ہوا ہے۔ نظم کے اس بند کے لیے حکومت کی جانب سے حشرؔ کے خلاف نوٹس جاری ہوا اور اسے ضبط کر لیا گیا۔ ؎

اے زمین یورپ! اے معراض پیراہن نواز
اے حریف ایشیا! اے شعلۂ خرمن نواز

چارہ سازی تیری بنیاد افگن کاشانہ ہے
تیرے دم سے آج دنیا ایک ماتم خانہ ہے

اشک حسرت زا سے چشم حریت نمناک ہے
خونچکاں روداد اقوام گریباں چاک ہے

صرف تصنیف ستم ہے فلسفہ دانی تری
آدمیت سوز ہے تہذیب حیوانی تری

عظمتِ دیرینہ نالاں ہے ترے برتاؤ سے
ڈھل گیا حسنِ قدامت خون کے چھڑکاؤ سے
جلوہ گاہِ شوکتِ مشرق کو سُونا کر دیا
جنّتِ دنیا کو دوزخ کا نمونا کر دیا
اُٹھ رہا ہے شورِ غم خاکسترِ پامال سے
کہہ رہا ہے ایشیا رو کر زبانِ حال سے
" بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گُلے
نے پرِ پروانہ سوزد، نے سرایدِ بلبلے"

کمپنی پنجاب سے ہوتی، شمالی ہندوستان کا دورہ کرتی، ۱۴ ۱۹ء میں کلکتہ آئی اور مندر اسٹریٹ میں کمپنی کے تماشوں کے لیے کچا منڈوا بنوایا گیا۔ سر عبدالرحیم کے یہاں ایک دعوت سے واپسی میں حشر اسٹیشن پر ٹرین کے انتظار میں کسی مصرع پر غور کرتے ہوئے ٹہل رہے تھے۔ محویت کے عالم میں پلیٹ فارم کے نیچے گر گئے اور اُن کے داہنے پیر کی پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی، نتیجے میں اسپتال داخل کیے گئے۔ اسی زمانے میں لیٹے لیٹے انھوں نے اپنا سب سے پہلا ہندی ڈراما "بلوا منگل عرف بھگت سور داس" لکھوایا جس کو آغا محمود شاہ نے ڈائرکٹ کر کے کلکتہ میں پہلی بار اسٹیج کیا۔ اور خود بلوا منگل کا پارٹ ادا کیا۔ مناظرہ کے سلسلے میں ہندو الٰہیات اور ہندو علم و ادب کی کتابوں کے پڑھنے اور جمع کرنے کا شوق حشر کو پہلے سے تھا جو "بلوا منگل" لکھتے وقت اور آئندہ ہندی ڈراموں کی تصنیف میں کام آیا۔ کمپنی کلکتہ سے کھڑک پور، مظفر پور، پٹنہ ہوتی ہوئی بنارس آئی جہاں ۲ر ستمبر ۱۹۱۴ء کو حشر کے یہاں بیٹا پیدا ہوا جس کا نام نادر شاہ رکھا گیا۔ مگر تین ماہ بعد جب کمپنی لکھنؤ میں تھی اس کا انتقال ہو گیا۔ کمپنی یو۔ پی اور پنجاب کے دیگر اضلاع سے سفر کرتی ہوئی، ۱۹۱۷ء میں ایک بار پھر لاہور پہنچی۔ اسی زمانے میں حمایتِ اسلام کا سالانہ جلسہ ہونے والا تھا جس کے لیے انجمن کی جانب سے حشر کو نظم پڑھنے کے لیے مدعو کیا گیا۔ ۲ر جون ۱۹۱۷ء کو انھوں نے اپنی نظم "موجِ زمزم" اس جلسے میں پڑھی۔ اس نظم میں خودی کا والہانہ تصور ہے۔ جس میں خودی کا نام تو نہیں لیا گیا

ہے مگر ملت کو خود شناسی اور خود اعتمادی کا درس دیا گیا ہے۔

اسی زمانے میں ان کی اہلیہ سخت علیل تھیں۔ اہلیہ کی مسلسل علالت سے حشرؔ کی پریشانیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں ان کی اہلیہ کا لاہور میں انتقال ہو گیا۔ دل برداشتہ ہو کر وہ کمپنی کے سامان کو سیالکوٹ میں بند کر کے بنارس واپس چلے آئے اور کچھ دنوں بنارس میں غم غلط کر کے رستم جی کی دعوت پر کلکتہ چلے آئے۔ جہاں وہ بحیثیت ڈراما نویس تھے۔ ایف مڈنس اینڈ کو کے وہاں ایک ہزار روپے ماہانہ پر ملازم ہو گئے۔ پہلے انھوں نے الفریڈ تھیٹر ہال کے قریب ایک کمرہ میں قیام کیا، بعد کو نمبر ۲ سکھیا اسٹریٹ اور اس کے بعد ۵ نمبر سکھیا اسٹریٹ میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور کمپنی کے لیے ڈراما لکھنے میں مشغول ہو گئے۔

۱۹۱۸ء میں کمپنی کے لیے انھوں نے "مشرقی ستارہ عرف شیر کی گرج" ڈراما لکھا۔ کلکتہ کی مارواڑی پبلک جو ڈراما دیکھنے کی زیادہ شائق تھی ہندی نواز تھی اس لیے حشرؔ نے اپنے قلم کو موڑا اور ہندی زبان میں ڈراما لکھنے کی تجدید کی۔ ۱۹۱۹ء میں "مدھر مرلی" "بھارت رمنی" ۱۹۲۰ء میں "بھگیرت گنگا" ۱۹۲۱ء میں "پراچین اور نوین بھارت" (جس کا ہر ایکٹ الگ الگ دیوں ہے: (۱) شروَن کمار (۲) اکبر (۳) آج) ۱۹۲۲ء میں اردو میں "ترکی حور" اور ہندی میں "سنسار چکر عرف پہلا پیار"۔ اسٹار تھیٹریکل کمپنی کے لیے بنگلہ زبان میں "اپرادھی کے" اور "مصر کماری" ڈرامے لکھے۔ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۳ء تک کی مدت میں مڈنس لمیٹڈ کی خاموش فلموں میں اداکاری کے جوہر بھی دکھائے جو آپ اپنا شاہکار تھے۔ "بھارت رمنی" فلم میں آغا حشرؔ کا ناسک کا کردار شالی ہو کر رہ گیا تھا۔ ۱۹۲۳ء میں "بھیشم پتامہ" اور ۱۹۲۴ء میں "آنکھ کا نشہ" مڈنس اینڈ کو کے لیے لکھا۔ یہ ہندی ڈرامے بڑے دن کے موقع پر دھرم تلہ اور الفریڈ کے اسٹیج پر دسمبر کے مہینے میں کھیلے جاتے تھے۔

حشرؔ کی آزاد طبیعت نے پھر اپنی کمپنی بنانے کا ارادہ کیا اور ۱۹۲۴ء میں بنارس سے "دی گریٹ نیو الفریڈ تھیٹریکل کمپنی آف کلکتہ" ہو کر دورہ پر نکلی۔ یہ کمپنی جب بہار اور یوپی کے اضلاع کا دورہ کرتی ہوئی ۱۹۲۶ء میں الہ آباد پہنچی مہاراجہ چرکھاری نے جو الہ آباد آئے ہوئے تھے آغا صاحب سے "سیتا بن باس" ہندی ڈراما لکھنے کی فرمائش کی جس فرمائش

کو انھوں نے بنارس میں بیٹھ کر پورا کیا۔ اور جب کمپنی پلٹنہ میں تھی آٹھ ہزار روپے پر مہاراجہ چرکھاری کے ہاتھ فروخت کیا۔ ۱۹۲۸ء میں مہاراجہ نے حشر کو مع کمپنی اپنے یہاں آنے کی دعوت دی اور کمپنی کو خرید کر مزید روپے آغا حشر کی نذر کیے اور ساتھ ہی ساتھ خود شاگرد ہو کر ان کو کمپنی کا نگراں مقرر کیا۔ آغا صاحب بحیثیت مہمانِ خصوصی رنگ محل میں رہنے لگے اور ان کے چھوٹے بھائی آغا محمود شاہ کمپنی کے انتظامات میں ان کے معاون کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ حشر نے اپنے ہندی ڈرامے "سیتا بن باس" کا پہلا ایڈیشن ناگری رسم الخط میں ولسن پریس چرکھاری سے ۳۰ مئی ۱۹۲۹ء کو شائع کیا جو ۲۹ مئی ۱۹۲۹ء کو "رجسٹریشن آف بکس" کے قانون کے تحت نمبر ۲۸ پر رجسٹرڈ ہوا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد ۱۹۲۹ء میں مہاراجہ چرکھاری نے آغا صاحب کو کمپنی واپس بخش دی اور کمپنی چرکھاری سے کانپور آئی۔

کانپور میں کمپنی کو اپنے چھوٹے بھائی آغا محمود شاہ کے سپرد کر کے مڈنس تھیٹرز لمیٹڈ کی دعوت پر وہ کلکتہ آئے اور انھوں نے نمبر ۳ حیات لین میں قیام کیا اور اس لمیٹڈ کی "دی ..... امپیریل تھیٹریکل کمپنی آف بامبے" کے لیے اردو میں "رستم سہراب" ڈراما لکھا جو ۱۹۲۹ء میں بمبئی میں اسٹیج ہوا۔ بمبئی سے واپس آکر کلکتہ میں مڈنس تھیٹر کے لیے ۱۹۲۹ء میں "دھرمی بالک عرف غریب کی دنیا" ۱۹۳۰ء میں "بھارتی بالک عرف سماج کا شکار" اور ۱۹۳۱ء میں "دل کی پیاس" ہندی ڈرامے لکھے جو ڈرامے کی دنیا میں انقلاب ثابت ہوئے اور جن کے اثر سے ہندوستان کے معاشرے کی پستی اپنی حالتِ زار پر آنسو بہاتے ہوئے زندگی کے ایک ایک گوشے کے لیے دادخواہ ہوئی۔

۱۹۳۱ء میں "مڈنس" کی نوکری سے دست بردار ہو کر چند دنوں کے لیے وہ بنارس آئے جہاں پر اوپر سے بندر نے ان کے پیر پر ایک پتھر گرا دیا۔ پیر چوٹ کی وجہ سے سوج گیا۔ دیسی دواؤں کا استعمال ہوا۔ جب چوٹ میں کچھ افاقہ ہوا تو وہ کلکتہ واپس آئے مگر پیر کی تکلیف کم نہیں ہوئی۔ اس تکلیف کے ساتھ ساتھ دیگر امراض کے وہ شکار ہو گئے۔ ڈاکٹروں کا بورڈ بیٹھا اور ڈاکٹر سونیل بوس جو ماہر قلب تھے علاج شروع ہو گیا۔ نمک سے بالکل پرہیز اور صرف اراروٹ کی کھیر، ڈبہ بند میٹھے پھلوں کے استعمال کی اجازت

تھی۔ کلکتہ میں ناطق فلموں کا رواج بڑھتا جا رہا تھا۔ فرام جی نے جو اس وقت مدن تھیٹرس لمیٹڈ کے منیجنگ ڈائرکٹر کے علاوہ "پائنیر فلم کمپنی" کے مالک تھے آغا صاحب سے فلمی ڈراما لکھنے کی خواہش کی۔ آغا صاحب نے "شیریں فرہاد" مدن تھیٹرس لمیٹڈ کے لیے لکھا۔ اس فلم میں ماسٹر نثار نے ہیرو اور مس کجن نے ہیروئن کے کردار ادا کیے تھے۔ اس فلم کی مقبولیت دیکھ کر دوسری فلم ساز کمپنیاں آغا صاحب کی جانب مائل ہوئیں اور فرمائشوں پر فرمائشیں ہونے لگیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے "عورت کا پیار" فلمی ڈراما انھوں نے لکھا۔ اس فلم میں بجھن لکھنوی نے جو پہلے آغا صاحب کی کمپنی میں بطور ایکٹر رہ چکے تھے ہیرو کا کردار ادا کیا تھا اور ہیروئن مختار بیگم تھیں یہ فلم کافی مقبول ہوئی۔ اسی زمانے میں آغا صاحب نے نمبر ۲ حیات خاں لین سے اپنی سکونت نمبر ۳ ہندو سرکار لین، کریک رو میں تبدیل کر دی اور فرام جی کی پائنیر فلم کمپنی کے لیے "دل کی آگ" اور "شہید فرض" ڈرامے لکھے جو فلمائے نہیں جاسکے۔ ۱۹۳۲ء میں نیو تھیٹرز لمیٹڈ کے لیے انھوں نے "یہودی کی لڑکی" لکھا، ڈرامے کی قیمت کے علاوہ بارہ فی صدی منافع طے ہوا۔ ۱۹۳۳ء میں "چندری داس" فلمی ڈراما نیو تھیٹرز کو دیا۔ یہ سب فلمیں ہٹ فلمیں تھیں۔ اسی زمانے میں مدن تھیٹرس لمیٹڈ کو "بھگت سورداس" "شرون کمار" "آنکھ کا نشہ" ہندی میں اور "ترکی حور" "قسمت کا شکار" اردو میں فلمی ڈرامے دیئے جو فلمائے گئے۔

۱۹۳۴ء میں نواب نصیر حسین خیال نے فردوسی کے شاہنامہ پر ایک مقالہ لکھا۔ اس کے لیے کلکتہ میوزیم میں ایک جلسہ ہونے والا تھا۔ نواب صاحب نے حشر سے اس جلسے کی صدارت کے لیے درخواست کی۔ پہلے اپنی علالت کی وجہ سے انکار کیا۔ جب دوستوں نے بہت مجبور کیا حشر نے صدارت کا وعدہ کر لیا۔ کلکتہ میں حشر کی یہ آخری تقریر تھی جس کی روداد ۱۹۳۴ء کے "عصر جدید" اور "ہند" میں کئی دنوں تک شائع ہوتی رہی اور مہینوں ان کی تقریر پر تبصرے ہوتے رہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے اپنی فلم کمپنی بنا کر "رستم سہراب" کو فلمانا چاہا جب کرداروں کا انتخاب ہو گیا اور ریہرسل شروع ہو گئی تو انھیں ایک مقدمے کے سلسلے میں لاہور کا سفر کرنا پڑا اس لیے "رستم سہراب" فلمایا نہیں جاسکا۔ لاہور میں انھوں نے اپنے دیرینہ عزیز ترین دوست حکیم فقیر محمد چشتی سے اپنا علاج کرانے کے لیے نمبر ۲ ریس کورس میں قیام کیا اور

دوستوں کے مشورے پر وہیں "حشر پکچرس" کی بنیاد ڈالی اور "بھیشم پتامہ" کی ریہرسل اور شوٹنگ شروع کر دی۔ شوٹنگ کے سلسلے میں کئی بار ان کو جموں اور سری نگر بھی جانا پڑا۔ مسلسل محنت نے حشر کی صحت کو خراب سے خراب تر کر دیا۔ اور "ما ابجن" کا وہ علاج جو حکیم صاحب کرنا چاہتے تھے اور جس کی تیاری ہو چکی تھی نہیں ہو سکا۔

۲۸ر اپریل کو دن کے دس بجے حشر کی والدہ کو تار کے ذریعہ بنارس میں ان کی تشویشناک حالت کی خبر ملی۔ چنانچہ اسی روز ایک بجے دن کی ٹرین سے میں اور میرے ماموں جناب شمس الدین احمد صاحب جو حشر کے حقیقی ماموں زاد بھائی ہیں لاہور کے لیے روانہ ہو گئے۔
۲۸ر اپریل ہی کو ۴ بجے شام کے وقت جب مولانا ظفر علی خاں نے ٹیلی فون پر آغا صاحب کی عیادت کی تو جواب میں انھوں نے یہ شعر پڑھا۔ ؎

کھو چکا جو جوش طاقت پھر ملے دشوار ہے
حشر اب صحت مری گرتی ہوئی دیوار ہے

اسی دن شام کے ۶ بجے آغا صاحب اس عالم فانی سے رخصت ہوئے۔ حکیم فقیر محمد چشتی نے ٹیلی فون پر میرے والد جناب آغا محمود شاہ سے جو اس وقت کلکتہ میں تھے اور جن کو انتقال کا تار کلکتہ میں تاخیر سے موصول ہوا تھا حشر کو لاہور ہی میں دفن کرنے کی اجازت لی۔ حکیم صاحب جامع مسجد لاہور کے صدر پھاٹک پر حشر کو اس جگہ دفن کرنا چاہتے تھے جہاں اب علامہ اقبال کا مزار ہے مگر آغا صاحب کی وصیت کے مطابق وہ ۲۹ر اپریل کو دن میں "میانی صاحب" کے قبرستان "چار برجی" میں اپنی اہلیہ کی قبر کے پہلو میں دفن کیے گئے۔ میں اور میرے ماموں ان کے دفن ہو جانے کے بعد اس دن شب کو ۱۰ بجے لاہور پہنچے اور جناب آغا محمود شاہ ہم لوگوں کے پہنچنے کے تیسرے دن وہاں پہنچے۔

وہ داستان جو ۱۸۷۹ء سے شروع ہوئی تھی ختم ہو گئی۔ اب صرف اس کی یاد باقی ہے۔

ظہیر علی فاروقی

لاؤنی

۱۲۰۶ء میں دلّی سلطنت کی بنیاد پڑ چکنے کے بعد جب مسلمان یہاں رہ بس گئے خواہ وہ افغانی ہوں یا ایرانی یا ترکی اور ہندوستان کو اپنا وطن سمجھنے لگے اور ایسی حالت میں بیرونی مسلمانوں اور ہندوستانیوں میں اختلاط اور ارتباط پیدا ہونے لگا تو ایک دوسرے کے رسم و رواج اور روایات کا اثر بھی پڑنے لگا اور زندگی کا ہر شعبہ ایک دوسرے سے متاثر ہونے لگا، خواہ کم و بیش ہی سہی۔ چنانچہ بھارتی سنگیت کلا بھی اس تاثر سے نہ بچ سکی اور ہندوستانی موسیقی نے نئے نئے موڑ اختیار کرنا شروع کیے۔ اس ضمن میں خاص الخاص نمایندگی کا شرف امیر خسروؔ (۱۲۳۵ء - ۱۳۲۵ء) کو ہے۔ وہ نہ صرف ایک عظیم شاعر تھے بلکہ الحانی اور آلاتی موسیقی کے ایک زبردست ماہر اور ایک بہت بڑے مخترع فن کار بھی تھے۔ انھوں نے ہندوستانی اور ایرانی موسیقی میں ایک خوشگوار امتزاج پیدا کیا۔ "خیال گائیکی" کا وجود بھی اسی عظیم ہستی کی دین ہے۔ ہمارے یہاں "دُھرپد" کا بول بالا تھا خیال کا وجود "دھرپد" پر ایک طرح کا ردِ عمل ضرور تھا مگر اس پر دھرپد کی چھاپ باقی تھی جس پر بہت بعد میں شاہ جہاں بادشاہ اور جہانگیر کے دور میں سدا رنگ (نعمت خاں) نے اور سلطان حسین شرقی والی جون پور نے بہت کچھ ترمیموں کے ساتھ اضافے کیے۔

"دھرپد کے اصولوں میں کچھ ایسی پابندیاں ہیں کہ موسیقار دھرپد گاتے وقت الاپ میں تو ضرور اپنے آپ کو شامل کر سکتا تھا لیکن اس کے علاوہ وہ دھرپد کے قیود میں گھرا رہتا تھا۔ 'خیال' میں مُرکی، چھندوں اور تانوں کا استعمال بکثرت ہوتا ہے اور تانیں ہی اس راگ کی زینت ہیں جب کہ دھرپد میں یہ چیزیں ممنوع ہیں۔ خیال کے اصول بھی ہیں اور پابندیاں بھی، لیکن اس کے اصولوں اور پابندیوں میں دھرپد کے مقابلے میں لچک ہے اور اس وسعت اور لچک کی بنا پر

گو تبے کو دصرف فنی حیثیت سے اس میں اپنی مہارت دکھانے کے زیادہ مواقع حاصل ہو جاتے ہیں بلکہ انسانی جذبات کی ترجمانی کرنے میں بھی کچھ زیادہ سہولیات مل جاتی ہے، خواہ وہ صوت زیرو بم کے ذریعے ہو یا حرکات وسکنات سے ہے۔ یہی وجہ ہوئی کہ رفتہ رفتہ یہ راگ مقبول ہوتا اور اس کی رسائی راج درباروں تک ہوگئی اور سترہویں صدی عیسوی تک پہنچتے پہنچتے اس کی رسائی لونٹر (نمکستان) یعنی ریاست الور کے قریب وجوار تک ہوگئی اور بے پناہ مقبولیت حاصل ہوگئی اور ہندو سنتوں نے اس کا نام بدل دیا۔ خیال اور ٹپہ (جس کو عوام ٹپے کہتے ہیں) کی جگہ لاونٹری یا لاونی کا نام دیا:

لاونٹری بن جو گیا، جنگی آہنگ سہاونا کول بکا

اور اس کا شمار دیسی راگوں میں کیا جانے لگا:

دیشے دیشے بھن نام   تد دیشی گان مچ تیے

خاص موسیقاروں نے اس راگ کو نہیں اپنایا۔ ویسے کہا تو جاتا ہے کہ عظیم موسیقار تان سین نے جن راگوں کو فنی کسوٹی پر پرکھا ہے، ان میں لاونی بھی ایک راگ ہے۔

لاونی کا شمار بجائے خود ایک عروضی بحر کے طور پر ہونے لگا ویسے لاونی کاروں نے اس میں بائیس ماتراؤں کی شرط لگائی اور بائیس حرفی بحر بنائی:

کیا شیام گور گل بدن مدن کا جوڑا

۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶ ۷ ۸ ۹ ۱۰ ۱۱

جن شیو شنکر کا کٹھن راستان توڑا

۱۲ ۱۳ ۱۴ ۱۵ ۱۶ ۱۷ ۱۸ ۱۹ ۲۰ ۲۱ ۲۲

اے پیارے نبی آپ کی ہر سعی بخدا بے سہاروں کے کام آگئی

۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶ ۷ ۸ ۹ ۱۰ ۱۱ ۱۲ ۱۳ ۱۴ ۱۵ ۱۶ ۱۷ ۱۸ ۱۹ ۲۰ ۲۱ ۲۲

کوششیں آپ کی بخششیں آپ کی شکر ہے غم کے ماروں کے کام آگئی

۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶ ۷ ۸ ۹ ۱۰ ۱۱ ۱۲ ۱۳ ۱۴ ۱۵ ۱۶ ۱۷ ۱۸ ۱۹ ۲۰ ۲۱ ۲۲

(شکور خلیف الدا)

عروضی بحری زحاف کے طور پر ایک بار ماتراؤں یا حرفوں کی کمی زیادتی کی اجازت بھی رہی۔
یہ ماترائی یا ۲۲ حرفی بحر مراٹھی زبان کی ایک بحر "رادھا وشی کرن" سے ماخوذ معلوم ہوتی ہے۔
تکنیکی ساخت کے لحاظ سے لاؤنی کو ایک طرح کا مسدس سمجھنا چاہیے مگر لاؤنی کے
خاص پہلے چار ہم ردیف و قافیہ مصرعوں کو رُبع یا چوپائی کے بجائے "چوک یا چوکا" کہتے ہیں۔
پانچواں مصرعہ "اُڑان" اور چھٹا مصرعہ "ٹیک" کہا جاتا ہے۔ کم از کم چار چوکوں (بندوں) پر مشتمل
لاؤنی ایک طرح سے مکمل لاؤنی سمجھی جاتی ہے۔

عروضی ہئیت میں تبدیلی

لاؤنی بنانے والوں اور گانیوں نے بائیس حرفی بحر میں کچھ وسعت پیدا کر کے اس میں بڑی تبدیلی پیدا کر دی۔ خواندہ لاؤنی بنانے والوں نے فارسی بحریں اختیار کریں ہندی میں بھی یہی ہوا کہ مروجہ چھندوں میں لاؤنیاں بنائی جانے لگیں۔

صرف یہی نہیں ہوا، بلکہ لاؤنی کاروں نے اپنے تخیل اور ذہانت سے کام لے کر اپنی ضرورت کے مطابق بہت سی بحریں بنالیں یا پھر فارسی کے مروجہ نام بدل دیے۔ برج اور اودھی یا اردو میں لاؤنی بنانے والوں نے اپنی بحروں کو چھند یا بحر کے بجائے رنگت یا رنگ کا نام دیا اور یہ وہ "رنگ" ہیں جن کا ذکر نہ اردو عروض میں ہے اور نہ ہندی پنگل میں۔

انھیں رنگتوں کے لحاظ سے کچھ ایسی "رنگتیں" ہیں، جو لاؤنی کی قسمیں بن گئیں۔ مسلمان لاؤنی کہنے والوں نے رنگت حقانی، رنگت قال (اس کو رنگ شریف بھی کہا جاتا ہے جو بہت عام ہے) الگ الگ بحریں بنالیں اور لاؤنی کی قسم بھی بن گئیں۔ قوالی کو بھی آپ اسی ضمن میں رکھیے۔

چند رنگتوں یا رنگوں کے دلچسپ نام

ان کے ساتھ ہم رنگت کا لفظ چھوڑے دیتے ہیں۔ آپ ہر ایک کے ساتھ شامل کر لیجیے یا یوں ہی سمجھ لیجیے:

کھڑی، سنگڑی، سنگیت سنگڑی، بچی، دیش، نویلی، شیتل، برہنی، نیرنگ، حقانی، قال، ڈیٹر (مستزاد)، دوکڑیا (دوبیتی)، تکڑیا (مثلث)، چوکڑیا (مربع)، چھ کڑیا (مسدس)، طویل (بحر طویل)، طویل مکھڑا (طویل مخمس)، شکستہ اور بہت سی۔

یوں تو بظاہر لاؤنی کے کوئی بندھے ٹکے اجزا یا عناصر نہیں ہیں لیکن عام طور پر لاؤنی کا آغاز "سکھی دوڑ" (دور ساقی) سے ہوتا ہے اور یہ اصطلاح سنتوں اور درویشوں دونوں میں یکساں طور پر رائج ہے۔ اس کے دو حصے ہوتے ہیں،

۱۔ مناجات، نعت یا منگلا چرن ۲۔ ذاتی تعارف جس کو اصطلاح میں نام گاؤں کہا جاتا ہے۔ مسلمان لاؤنی بنانے والے عام طور پر خدا کی حمد اور رسول ؐ کی نعت اور ہندو زیادہ تر گنیش شیو کی بندنا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مسلمان لاؤنی بنانے والا ہندو دیوی دیوتاؤں کی بندنا اور خراج عقیدت پیش کر کے اپنی وسعت قلبی، فراخدلی اور باہمی اتحاد کی مثال پیش کر دیتا ہے۔ ایک لاؤنی جو مسلمان دھوبیوں میں بہت رائج اور مقبول ہے، علم و فن کی دیوی سرسوتی کی بندنا کرتا ہے:

خدا تیری بڑی خدائی کل عالم کیا پیدا
ربا! تجھ سے لگا میرا دھیان
سُمروں ماتا سرسوتی پھر روشن کا کروں بیان
وہ روشن درویش بڑے اللہ کے پیارے
خدا تیری بڑی خدائی سب کام ترے ہیں نیارے

سکھی دوڑ کا ایک نمونہ گنیش بندنا میں پڑھیے:

لاڈلے گرجا کے دیجے آن سنکٹ ٹال جی
لاج رکھ لیجے گیان گن شنکر لال جی
لال چندن کا تلک یک دنت جڑ لیے لال جی
لال رنگ ہے انگ جن کا ناچتے دے تال جی

دوڑ:

لال گرجا کے کرے نہال لگا ہے چندن بیش مال
بھگتی چلے گمن ہی چال لیا ہی رن کا بار گلے میں ٹال
لے کر بھاڑا ایک ڈھال لال ساہستہ کریں تت کال
ٹیک لاڈے گرجا کے لال لاج رکھ لیجے گھان فنکر کال

اب ایک مسلمان لاونی کار تجمل کی ایک لاونی پڑھیے جو سکھی دوڑ" کا نمود ہونے کے ساتھ ساتھ "نام گاؤں" کا بھی ایک اچھا نمونہ ہے:

سکھی رام رحیم تیرے دونوں ہیں جس نے اس کا نام رٹا
رہا شاد دونوں جگ میں دکھ دور ہوا اور پاپ کٹا
بھگتوں کا ہوکر سہائے بھگتی دی اور بھگون بنا
رحم کیا ظالم پہ اس سے رحیم اور رحمان بنا
دوڑ وسال گبری استاد دیال چند کی راہیں بتلائیں
بادل عبدالغفور نے مطلب کی ان سے باتیں پائیں
قادر بخش کا بچن سدا یا، رجب خاں نے یوں فرمایا
محمد ہادی نے بتلا یا رام رحیم محمد گایا
ٹیک کہیں تجمل ہاتھ اٹھا
رام رحیم تیرے دونوں ہیں جس نے اس کا نام رٹا

۲۔ نام گاؤں (تعارف) اس میں لاونی بنانے والا، اپنا نام ونشان، اپنے خلیفہ استاد، اپنی جماعت وغیرہ کا نام لیتا ہے جیسا اوپر کے نمونے سے ظاہر ہے۔

اس نام گاؤں کے ضمن میں کبھی کبھی "پھبتی بازی" یعنی طنز کی نوبت آجاتی ہے۔ ایک لاونی گاتک اپنا نام گاؤں اس طرح بتاتا ہے جس کو آپ کسی نہ کسی طرح رجز بھی کہہ سکتے ہیں:

آیا ہوں بجنور سے، رجب میرا نام
درویشوں کے ساتھ پھروں یہی ہے میرا کام
درویش صفت ہیں ایک ہٹیلے شاہ

اُڑ جائیں جس بات پر اسی پہ کریں نباہ
کریں اسی پہ نباہ شکور خلیفہ ان کے متوالے
رحیم استاد ہمارے جن کے وہ رکھوالے
ہرا جھنڈا لہراتا میرا کلغی میری چھاؤں
بول سنانے پر آ جاؤں کتنے دکھاؤں داؤں

دوسرا گائک اس کو ایک طنز سمجھ کر اس کا جواب اس طرح دیتا ہے:

دیکھ لیے سب داؤں رجب بھائی میرے
یک ادنیٰ شاگرد حسن بیچ اکھاڑے للکارے
نا کر ایسی بات جو ٹھن جائے تیرے میرے
تم کو وہ للکارے اور شیر نمدا دہاڑے
خلیفہ نور محمد عالی جن کی شان
طرّا کلغی دونوں تو ایک سمجھ لے نشان
خلق خدا میں مشہور صمد استاد ہمارے
دکھا اپنے داؤں کچھ دیکھوں تو پیارے

اس کے علاوہ دوسرے طریقے سے بھی اپنے استاد اور اپنی پارٹی کے ممبروں کے نام لینے کا رواج رہا ہے۔ لاونی اُپ راگ پر گایا جانے والا سندر گوری اور پسر مالی کا قصہ دھولیہ میں بہت مقبول ہے اور بہت طویل ہے۔ اس کے دو چوک (بند) ملاحظہ فرمائیے:

سندر نے پکڑ لیا ہاتھ دلاسا دے کے لگی سمجھانے
کہے تُرنا اُستاد پوچھتے کیا کیا ہیں دلوانے
کہو کیا ٹھہری ان دونوں کی بتلانے تُرنا استاد گن جانے
رہی سندر پڑی باغوں میں یا پہنچی اپنے ٹھکانے

رُستم، دیا رام کھٹ رَتیے عشقوں کے کٹھن چھپیٹے

بھوپال سنگھ بھینٹے ، یہ نقیر کش کی چال
چال پر خیال کہا بھرے رس کا
نادر حسین پردیس سندر کو بڑا باغ کا چسکا

کبھی دونوں یا کسی دوسرے موقع پر اگر گائکوں میں چھٹکے بازی یا طنز کی نوبت آجاتی ہے، تو یہ صرف دنگل اور اکھاڑے تک ہی رہتی ہے۔ اس کے بعد اس کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا اور سب دوست کے دوست ہی رہتے ہیں اور اگر سوء اتفاق سے کدورت کی نوبت آجاتی ہے تو اکھاڑے کا خلیفہ یا استاد بیچ بچاؤ کرا دیتا ہے اور فریقین میں مصالحت ہو جاتی ہے اور وہی خلوص عود کر آتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

ان اجزا کے علاوہ اڑان اور توڑ دو ایسے جزو ہیں جو گاتے وقت سنائی دیتے ہیں کسی ایک بند کے بعد ٹیک (ٹیپ) کا مصرعہ جلد جلد تیزی سے گایا جاتا ہے، اسے "اڑان" اور اسی طرح دوسرے بند میں ٹیک (ٹیپ) کا مصرعہ ذرا ہلکی آواز اور مُدرائی انداز میں گایا جاتا ہے اس کو "توڑ" کا نام دیا جاتا ہے۔

لاؤنی کے مضامین

لاؤنی کے مضامین میں بڑی وسعت ہے۔ حمد، نعت و ثنا سے لے کر عام واردات یہاں تک کہ مروجہ کھیلوں (تاش، شطرنج وغیرہ) ریل گاڑی اور ہوائی جہاز تک پر بھی طبع آزمائی کی گئی ہے۔ عوام ان پڑھ سہی مگر اپنے سینوں میں وہ بھی ایسے دل رکھتے ہیں جہاں طرح طرح کے جذبات انگڑائی لیتے ہیں۔ ان کی زندگیاں کتنی سادہ اور بے حس اور بے کیف سی نظر آئیں، مگر وہاں بھی جذبات اور احساسات موجزن رہتے ہیں۔ قدرت نے انھیں بھی قوتِ تخیل سے نوازا ہے اور وہ جس طرح سوچتے ہیں اپنی افتادِ طبع کے مطابق الفاظ کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ چنانچہ مذہب، موسم، عشق و محبت، رقابت، ہجر و وصل، طنز و ظرافت، روزانہ زندگی کی وارداتیں، اور ان پر ان سب کا ردِعمل وغیرہ وغیرہ سبھی لاؤنی شاعروں کے پیش نظر رہتے ہیں۔ اور سب لاؤنی کے مضامین بن جاتے ہیں۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ صوفیاء اور سنتوں نے مذہب کے وہ پہلو پیش کیے ہیں جو عوامی زندگی اور ان کے رجحانات سے بہت قریب تھے اور ان کے لیے قابل قبول۔ انسانی اخوت اور محبت کے وہ جذبات پیش کیے جو مذہبی کٹرپن کی پابندیوں سے آزاد ہیں۔ اس مذہبی منافرت کو دور کرنے کی جس سے ہمارا سماج پریشان تھا اور آج تو اس سے کہیں زیادہ پریشان ہو رہا ہے۔ ۱۹ ویں صدی کے آخری دور کے ایک لاوُنی گو تجمل کی ایک لاوُنی آپ پڑھ چکے ہیں جس میں مذہبی منافرت دور کی گئی ہے اور رام اور رحیم کو ایک ساتھ بٹھایا ہے۔ سنت کبیر نے جس نقطۂ نظر سے ہندو مسلمان دونوں ہی پر طنز کی ہے اس کی پرچھائیاں بھی لاونیوں میں ملتی ہیں:

یوں ہی بھاگے برہمن و شیخ پھرے کوئی سوئے حرم کوئی سوئے کنشت
ذرا غور تو کیجے حصول ہے کیا انھیں غیر نظارۂ سنگ و خشت

نَحۡنُ اَقۡرَبُ مِنۡکُمۡ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡد کی ترجمانی پڑھیے:

ہے پاس دلدار ڈھونڈتا پھرے ہے دشت و جبل کے اندر
وہی مثل ہے ڈھنڈورا ملکوں میں لڑکا اپنی بغل کے اندر (. . .)

نہ دوڑ کعبے کی سمت شکلِ شیخ و برہمن جائیں گے ہم
خدا کو خود ہی میں دیکھ لیں گے، خودی یہ جس دن مٹائیں گے ہم (سوامی محمد گری)

نہ سنکھ باجے نہ سنکھ ہووے مڑھی میں سنسان ہو رہا ہے
جگا لے اے من الکھ پُرش کو گپھا میں جو سو رہا ہے (. . .)

یوں ہی دیر و حرم میں پھرے بھٹکتے، جہاں جانا ہے وہاں کی خبر ہی نہیں
وہ گھٹ ہی کے پٹ میں نہاں ہے میاں! ولے اندھوں کو آتا نظر ہی نہیں (مہاتما انت گری)

راز بریلوی بھی یہی جذبہ پیش کرنے کے علاوہ "اونچ نیچ" کو بھی کچھ نہیں سمجھتے اور سنت کبیر کی "جات پات پوچھے نا کوئی ہر کو بھجے سو ہر کا ہوئی" کی ہمنوائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ہر کو ہردے دیکھ رے مورکھ ہر دیکھے توئی
دیکھ دکھاؤں دیکھ رہی کا دیکھے کوئے

نینن بیچ جوت د باؤں   کانن بچ رس
نیچ اونچ رآز نہ جانے   ہردے بچ کا بھائی

ویدک اور پورانک کتھائیں بھکتی۔ کبیر پنتھی ہٹ پنتھی تصوف وغیرہ کے نظریات اور خیالات کی بہتیری جھلکیاں نظر آجاتی ہیں۔ ہندو لاؤنی کاروں نے دھارمک انتر کتھاؤں (مذہبی تلمیحات) مثلاً دروپدی چیر ہرن، سیتا ہرن، مرگ کا شکار، رام چندر کا ولاپ، راون کا چھل کپٹ، اوتاروں کے مختلف روپ لکا راہن، رام چرن رج (خاک پائے رام چندر) اور اس کے اثرات، بھاسکر بھگوان (سورج دیوتا) اور کنتی راجکماری کی کتھا، وشنو بھگوان کا قدرا ون، انگل کا ہوجانا وغیرہ پر بھی لاونیاں کہی ہیں۔ اسی طرح مسلمان لاونی شاعروں نے اکثر وبیش تر قرآنی قصوں خصوصیت سے حضرت یوسف اور زلیخا کا عشق بھائیوں کی بے وفائی، معراج، حضرت موسیٰؑ کا آگ لینے جانا، واقعۂ کربلا وغیرہ پر لاونیاں کہی ہیں حضرت عبدالقادر جیلانیؒ، خواجہ معین الدین چشتی، سید سالار مسعود غازی وغیرہ کے علاوہ بہتیرے ایسے غیر معروف اولیا اور پیروں کی کرامتیں بیان کی ہیں جن کی شہرت محض ہنگامی اور مقامی رہی ہے۔ جس طرح ہندو لاونی کار نے خاک پائے رام کی کرامات دکھائی ہے کہ گوتم رشی (مہاتما بدھ نہیں) کی بیوی اھیا جو اپنے شوہر کی بد دعا سے پتھر کی مورت بن گئی تھیں، رامچندر کے پیروں کی خاک پڑ جانے سے اپنی اصل حالت پر ایک حسین عورت بن گئیں، اسی طرح ایک مسلمان لاؤنی کار عبدالرزاق (۱۹۱۰ء - ۱۹۶۵ء) خاک پائے محمد کا معجزہ اس طرح دکھاتا ہے کہ ایک اندھا یہودی اس خاک کے اثر سے بینائی حاصل کر لیتا ہے۔ رُخسار نے مہ کامل کے ٹکڑے کر ڈالے (شق القمر)، بہ شان حیدری تھی ہاتھوں سے اکھاڑ پھینکا در خیبر (زور بازوئے جناب حیدری)، زمین کربل پہ راہ حق میں کٹائی گردن۔ سر کو کٹا بازوے قاتل کے ٹکڑے کر ڈالے (شجاعت حضرت امام حسین)، دریا بُرد شدہ باراتیوں اور دولہا دولہن کا دریا سے برآمد ہو جانا (کرامات حضرت عبدالقادر جیلانیؒ)، جلتی ریگ میں کسی عورت کا اپنا بچہ پھینک دیہ اور بچے کو کوئی ضرر نہ پہنچنا (کرامات حضرت خواجہ معین الدین چشتی) وغیرہ وغیرہ ایسی لاونیاں ہیں جن میں سے بعض تو فقیروں کو ازبر ہیں اور دست پناہ بجا بجا کر گلتے پھرتے ہیں۔ کچھ

ریکارڈ بھی ملتے ہیں۔ تلمیحات کے سلسلے میں لاونی پڑھے لاونی بہت طویل ہے اور شمس الدین (۱۸۶۵ء۔ ۱۹۴۰ء) بیدن ٹولہ۔ الہ آباد کی بنائی ہوئی ہے:

صدہا پیمبر گزرے پر اس رتبے کا پانا مشکل ہے
بجز محمدؐ کسی نبی کا عرش پہ جانا مشکل ہے
برق خوش رفتار در دولت پہ بھیجنا مشکل ہے
خدا سے باتیں کر کے اپنی امت کا بخشنا مشکل ہے
بت خانوں کو توڑ بتوں کو کلمۂ وحدت کا پڑھانا مشکل ہے

مثال موسیٰؑ طور کے اوپر آنا جانا مشکل ہے
جمال حق کو دیکھ کے فوراً غش کھا جانا مشکل ہے
بجز حضرت عیسیٰؑ کے مردوں کو جلانا مشکل ہے

مُردے جلانا سہل ہے لیکن پتھر کو بُلانا مشکل ہے
بجز محمدؐ کسی نبی کا عرش پہ جانا مشکل ہے

.. ..

مثل شمس تبریز کسی کا یہ فرمانا مشکل ہے
قُم باذنی کہہ کر اپنی کھال کھنچانا مشکل ہے
یہ سب سہل ہے مگر قلب منصور میں آنا مشکل ہے
دار کے اوپر چڑھ کے انا الحق چلانا مشکل ہے

حسین کے مانند کربل میں تیغ چلانا مشکل ہے
نانا کی پیاری اُمت کی خاطر گردن کٹانا مشکل ہے
راہ خدا میں شمس الدین گھر بار لٹانا مشکل ہے
کہ بجز محمدؐ کسی نبی کا عرش پہ جانا مشکل ہے

مجازی عشق و محبت کے بہتیرے جذبات اور واردات لاونیوں میں ملتے ہیں۔ جاگیردارانہ دور کی لکھنوی اسکول کی غزل گوئی کا پورا پورا اجر با لاونیوں میں ملے گا۔ فرق صرف انداز شعر

خوانی کا ہے۔ غزل کا موسیقی خیال لاؤنی کے موسیقی خیال سے مختلف ہے۔ وہاں خیال نہیں اس کی تبدیل شدہ صورت لاؤنی آپ پائیں گے۔ ہجر میں عاشق کی حالت ملاحظہ فرمایئے،

آنکھ لگی پھر نیند کہاں اور سب جانیں یہ سوتے ہیں
منہ پر اپنے لال ڈوپٹا چپکے چپکے روتے ہیں
کبھی عشق میں نیند آوے کبھی بے خبر سوتے ہیں
مستانوں کا حال یہی ہے کبھی ہنستے ہیں کبھی روتے ہیں (رسوای محمد گری)

اور کہیں یہ حالت ہو رہی ہے:

پنگھٹ پہ ہائے پیا کینو چترائی
بہیاں پکڑ کے موری چوریاں کرکائی
گگری ڈور موری چھین لئی موسے
بنیا بھرت موری ہے سر ار جھائی
۱۴ ڈیٹھ سٹیاں موہے پانی بھرن نا ریت
بنیا بھرت موری گگری ڈھرکائی

موسمی فضاؤں اور تیوہاروں میں بسنت کا مضمون لاؤنی کو شاعروں کے لیے بہت عام اور مقبول رہا ہے۔ اس لیے کہ اسی تقریب پر لاؤنی کے جلسے بڑی شان سے منعقد ہوا کرتے تھے اور اسی لیے منّی لال گری لاؤنی گو اور گویا کو یہ بول سنائی دیتے ہیں:

۱ زبان پہ ہر ایک مرد و زن کی یہ خوش صدائے بسنت آئی
جدھر کو دیکھو نظر اُٹھا کر نظر اُدھر ادائے بسنت آئی

اور پھر صدائے بسنت کے آتے ہی:

آئی بسنت کھلے سرسوں کے پھول
پیلے پیلے اور انگاروں سے ڈھاک کے پھول
باغوں میں آگ لگی ہے جب سے پھلی ہیں نارنگی
اور لیمو ڈالوں پر ناچ رہے کھلاتے نیرنگی

دکھلائی اپنی نیرنگی اُدھر کچنار پکارے
سیمر میں پھول کھلے لال لال کیسے لگتے پیارے
سرسوں کے کھیت بنے سب کیسر کیاری
آموں کا بور دکھاوے خوشبو نیاری
کھلی چمپا اور بن ٹھن کر آئی رات کی رانی
بسنت بسنت گا گا کر ناچے میری رانی

. . . .

آؤ بھائی ہم سب بھی بسنت منائیں
پیلا نورانی جامہ پہن سب کو دکھلائیں (سوامی محمد گری)

کتنا پیارا اور تفصیلی بیان ہے اور کس درجہ ہندوستانی ہے۔ اس کے علاوہ کتنا عمیق مشاہدہ ہے۔ سیمر اور ڈھاک بے چارہ شہری شاعر کیا جانے، یہ تو دیہاتی فضا میں رہنے والے سوامی اور سنت ہی جان سکتے ہیں پھر اس کی بحر اور زبان بھی بڑی موزوں اور مناسب ہے۔

راز بریلوی کو بسنت کا رنگ بڑا چوکھا لگتا ہے اور اسی لیے وہ کہتے ہیں:

مورے مکھ مل دینو رنگ بسنتی
کاہے سراج پیا یہ کا کینو کر دینو مورا رنگ بسنتی
سرسوں پھولی موری انکھین موں چوکھا لگے موہے رنگ بسنتی
راز پیا کے تیرے آؤ پربھو پہنو تم چولا رنگ بسنتی
مورے مکھ مل دینو رنگ بسنتی

زیڈ رحمی رنگت (مستزاد) میں برسات کی بہار دیکھیے:

گھر رہی گھٹا گھنگور
شور کرے مور جل گرے گھوڑ نا ساجن موڑ بس یوں گھوڑ

۱؎ بہت ۳؎ میرے
۲؎ کھول اودھی، بیواری اور برج بولیوں کے بعض اضلاع میں ل اور ڑ کا تلفظ ر سے کرتے ہیں۔

بن بہنگ پہے بہو بول
گھر رہی گھٹا گھنگھور
بول بول کرتے کلول رت پاوس کی رہی پون ڈول
گھر رہی گھٹا گھنگھور
چھائی رہی با دریا گھنگھور (ست ناتھ گرو)

مستزاد اور ڈیڑھ مصرعی ہیئت میں یہ فرق ہے کہ لاؤنی گانک پہلے چھوٹا مصرعہ گاتا ہے اس کے بعد طویل اور مستزاد میں اس کے برعکس ہوتا ہے:

دنیا کی طلب میں دیں کھو کر بیٹھے ہو کر گمراہ
کرنا ہی دتھا جو کام سو کر بیٹھے اے عقل تباہ (مرزا سودا)

از خونِ جواناں کہ شدہ کشتہ دریں راہ رنگین طبق لالہ
خونیں شدہ صحرا و تل و دشت و دمن وائے اے وائے وطن وائے! (اشرف رشتی)

ہولی میں ساجن کی یاد کسک کا اندازہ کیجیے:-

پیا بن کیسے کھیلوں کی ہوری توہے بتا دے موہے سکھی ری
کوئی پھولن سیج بچھاوے ری مورے پیا سے ہکو ملاوے ری
اپنے پیا سنگ کھیلت ہوری وا ہی کے رنگ میں سگری بوری

پیا کی ڈھٹائی اور شرارت ملاحظہ فرمایئے:

ہوری اکیلے کھیلت مورے سنگ مورے نیین بچ بھر دینو رنگ
راہ چلت تیکو چھورت ناہیں مورے پیا کے یا ہی عجب ڈھنگ

اسی طرح آپ کو دوسرے موسموں اور تیوہاروں پر لاونیاں مل سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں اتنی بات ضرور ہے کہ بجز چند لاؤنیو' کے آپ کو نظم کے مثل کوئی لاؤنی ان مضامین پر مرتب مسلسل اور مربوط نہیں ملے گی۔ سوامی ۔ ری جن کی ایک لاؤنی آپ پڑھ چکے ہیں۔ بادل

۱ پرندے ۲ بہت بازو سے ۳ برسات ۴ ہوا ۵ پوری طرح ڈوبی۔

ان گری، سنت اناتھ گری کی لاونیاں البتہ نظم کے مثل مسلسل اور مرتب ہوتی ہیں۔
عوامی دل چسپی کے کھیلوں پر بھی طبع آزمائی کی گئی ہے اور کھیل بھی لاونیوں کا ایک مضمون بن چکے ہیں۔ الہ آباد کے لاونی گو عبدالرزاق (۱۹۱۰ء - ۱۹۶۵ء) شطرنج کھیلنا اس طرح سکھاتے ہیں:

عقل سے لو کام کھیلو شطرنج، پیدل یک یک قدم چلے
غلط نہ ہو چال کوئی بھائی، گھوڑا اڑھائی قدم چلے
فیل چلے آڑا ترچھا چاہے جتنے قدم چلے
کھیل میں وزیر چاہے جس منزل کے ٹکڑے کر ڈالے
لے لو خبر شاہ کی ہوا لولا لنگڑا بے چارہ
مات ہوئی گھوڑے کی شہ پر نہ رہا اب کوئی چارہ
نام سے محمد شکور کے حاسدوں پر چلتا ہے آرا
واہ میاں شہزادے اور منا سناؤ دُھن پیارا پیارا
ہمت نے تری رزاق ہر اک مشکل کے ٹکڑے کر ڈالے

ایسی لاونیاں محض تفریحی معلوم ہوتی ہیں ورنہ اس لاونی میں شطرنج کے ایک مُہرے رخ کی چال نہ چھوٹتی۔ اسی طرح پیارے دھوبی، گوٹیا تالاب، رام پور کی ایک کنڈلی ہے مگر انھوں نے مجھے لاونی راگ میں سنائی اور لکھائی تھی اور وہ کہتے بھی رہے اس کو لاونی! اندازہ ایسا ہوتا ہے کہ ہوائی جہاز پران کے یہ خیالات اس وقت بیدار ہوئے ہوں گے، جب کبھی پھٹکے بازی کی نوبت آگئی ہو اور ان کے حریف نے ریل گاڑی کی ستائش کی ہوگی۔ کنڈلی بہت طویل ہے ہم محض تھوڑا سا لکھے دیتے ہیں:۔

ریل کو تیری فیل کیا دنگل کے درمیان
جہاز چلا جو ولایت سے آیا بیچ ہندوستان
آیا ہندوستان جی اس کو دیکھ ہوئے حیران
بندش اس کی باندھ لی میں نے تم سنو لگا کے کان

کرتا جہاز کا بیان اسی ڈھنگ کے درمیان
میری تکون کو پیارے تو پہچان
اب میں کہتا سبھا کو سنائی رے

اس کے بعد وہ جہاز کے کل پرزوں کا بیان (اپنی ذہنیت کے مطابق) دیتے ہیں اس کی تیز رفتاری کی داد دیتے ہوئے چیلنج پر آجاتے ہیں:

ایسا کوئی تو بھی گا کے سنا رے
اب میں کہتا سبھا کو سنا رے

ان بیانات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اردو کی صنف شاعری، مثنوی اور نظم کے مثل لاؤنی کے مضامین میں بڑی وسعت ہے اور زندگی کا ہر واقعہ اور ہر چیز لاؤنی گو کے لیے ایک مضمون کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور تمام جذبات اور احساسات اس کے مضامین بن جاتے ہیں۔

لاؤنی شاعروں اور گائکوں کی تنظیم

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ لاؤنی قسم کی ٹنک بندیوں کا نام کس طرح پچدا (بچرا) یا خیال سے لاؤنی ہو گیا۔ اب اس کی تنظیم اور جماعتوں کا حال جاننے کے لیے ایک بار پھر اونٹر پردیش یعنی ملکستان کی طرف لوٹیے اور مرہٹہ راجا الور کے دربار تک رسائی حاصل کیجیے:۔

بتایا گیا ہے کہ پندرہویں صدی عیسوی میں مہاتما ترکن گری اور سنت شاہ علی خیال بنانے میں بڑے ماہر استاد سمجھے جاتے تھے۔ وہ دونوں گہرے دوست بھی تھے۔ ایک بار دونوں راجا الور کے دربار میں پہنچے اور وہاں موسیقی جلسہ ہوا۔ دونوں نے اپنا کمال دکھایا اور راجا مذکور نے خوش ہو کر مہاتما ترکن گری کو طرّا اور شاہ علی درویش کو کلغی اعزازی انعام کے طور پر عطا کی اور یہیں سے دو جماعتیں طرّا اور کلغی بن گئیں۔ ان کے جھنڈوں کے رنگ بھی الگ الگ بن گئے۔ طرّے والوں کے جھنڈے کا رنگ بھگوا (گیروا) اور کلغی والوں کے جھنڈے کا رنگ سبز ہوتا ہے۔

اس اختلاف کے باوجود دونوں میں کسی قسم کی کوئی کدورت اور عناد نہیں رہا ہے، بلکہ خلوص اور محبت کا ایک بہتر نمونہ۔ رقابت کی جگہ اخوت، دشمنی کی جگہ دوستی اور مروت و محبت۔

چند مصطلحات

لاؤنی ایسوسی ایشن یا کلبوں کو "اکھاڑا" کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ کچھ پہلوانوں، گڑیوں دھوبیوں اور اسی قسم کی دوسری ذاتوں میں مستعمل ہے۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اکھاڑوں کے نام "دس نام سنتوں" کے ناموں سے معروف کیے جاتے ہیں۔ یہ دس نام قدرتی اشیاء کی مناسبت سے اس طرح رکھے جاتے ہیں:۔

گری (پہاڑی)، بن، پربت، ساگر، وایو، جل، سرسوتی، بھاسکر (سورج)، پرتھوی یا بھوم اور آکاش۔ مگر اندازہ ایسا ہوتا ہے کہ گری، بھاسکر زیادہ مقبول اور پسندیدہ سمجھے گئے ہیں۔ ہمیں پانچ سات جو ملے، وہ "گری" ہی اکھاڑا بتاتے تھے اور ایک ہندو سنت سنگم پر ملے، جو نیم مجنوں سے تھے انھوں نے البتہ "بھاسکر" بتایا اور ہماری استدعا پر کچھ ایسی عجیب حرکات کر کے ایک لاؤنی گائی جس کو ہم سمجھ ہی نہ سکے اور ان سے مزید التجا کرنے کے معنی یہ تھے کہ کسی آفت ناگہانی کو دعوت دینا ہے۔

پھر ان اکھاڑوں کی دو جماعتیں (۱) طرّا اور (۲) کلغی بن گئیں۔ کس طرح اس کے بارے میں ایک دنت کتھا مشہور ہے۔ غالباً مغل شہنشاہ اکبر اعظم کے آخری دور میں لاؤنی گانے اور لاؤنی بنانے والوں کی دو قدآور شخصیتیں ہوئی ہیں۔ مہا تما ترکن گری اور درویش شاہ علی گری۔ یہ دونوں گہرے دوست بھی تھے۔ ایک بار راجا الور کے دربار میں دونوں ایک ساتھ پہنچے اور دونوں نے اپنے فن اور کمال کا مظاہرہ کیا۔ راجا موصوف نے خوش ہو کر مہاتما ترکن گری کو طلائی طرّا اور درویش شاہ علی کو طلائی کلغی اعزاز میں عطا فرمائی۔ اس طرح دو جماعتیں بن گئیں اور اپنے اپنے اکھاڑے کے لحاظ سے اپنی اپنی پگڑیوں پر طرّا اور کلغی لگاتے ہیں۔

لاؤنی کی ہر انجمن (اکھاڑے) میں دو چار شاعروں کا ہونا ضروری ہے۔ ایسے شاعر زیادہ تر بالکل ابجد خواں یا کم سواد ہی ہوا کرتے تھے جن کے پاس تخیل تو تھا اور الفاظ و بندشوں کا

شنیدہ ذخیرہ بھی، لیکن گرامر اور عروض کے اصولوں کی پابندی سے بے نیاز۔ الفاظ کی صحت اور تلفظ کی درستی کی طرف ان کی کوئی خاص توجہ نہیں رہتی تھی۔ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ کبھی کبھی عربی اور فارسی الفاظ کا برمحل اور موزوں لائق ستائش استعمال بھی نظر آجاتا ہے۔ ایک لاؤنی گو گوپی ناتھ گری (۱۸۶۵ء) کی ایک فلسفی ٹیک میں عربی لفظ نمط کا استعمال ملاحظہ فرمائیے:

پڑھے لکھے کچھ نہیں پھر شاعری سے کیوں کام لیا

غدو خال لنگور نمط اور نام رکھ گل فام لیا

* طرّا اور کلغی کے علاوہ ہر جماعت کے جھنڈے کا رنگ بھی الگ الگ ہوتا ہے۔ طرّے والوں کے جھنڈے کا رنگ بھگوا (گیروئی) اور کلغی والوں کا جھنڈا سبز رنگ کا ہوتا ہے۔

سنت ترکن گری اور درویش شاہ علی کے عہد میں اختلاف ہے۔ ہماری رائے میں یہ دوسرا قول درست ہے کہ یہ دونوں اکبر اعظم کے عہد کے نہیں بلکہ مغل بادشاہ محمد شاہ کے عہد میں ہوئے یعنی وسط اٹھارہویں صدی ترکن گری متھرا میں اور شاہ علی مکن پور ضلع کانپور میں پیدا ہوئے تھے مگر دونوں کی زندگیوں کا دورہ زیادہ تر راجستھان اور مدھیہ پردیش میں ہوتا رہا ہے۔

* خلیفہ اور استاد، ہر اکھاڑے کا ایک خلیفہ اور ایک اس کا نائب استاد رہتا ہے۔ خلیفہ کو تمام اختیارات (خواہ وہ کسی قسم کے بھی ہوں) حاصل ہیں اور اس کی عدم موجودگی یا اس کی اجازت سے سارے اختیارات استاد کی طرف منتقل ہوجاتے ہیں۔ لاؤنی گائک گانے سے پہلے خلیفہ کے بجائے استاد سے اجازت لیتے ہیں اور اس کی اجازت کے بعد گانا شروع کرتے ہیں۔ لاؤنی اور خیال اور بھری گوتوں کے دوستانہ مقابلے ہوتے رہتے تھے اور آج بھی کہیں کہیں ان کا رواج ہے۔ اُن کی اصطلاح میں اِن کو "دنگل" کہتے ہیں۔ یہ دنگل پہلے زیادہ تر بسنت کی تقریب کے اردگرد ہوا کرتے تھے اور ان کے لیے بڑا اہتمام ہوا کرتا تھا، مگر آجکل برسات کے موسم میں بھری یا کجلی دنگلوں کے وقت ساون بھادوں کے مہینوں میں ہوجاتے ہیں۔ الٰہ آباد میں محلہ اٹالا، بنارس میں محلہ اردلی بازار علی پورا، مرزا پور میں محلہ واصلی گنج، چنار موضع وجے پور وغیرہ وغیرہ میں ہوجایا کرتے ہیں۔ ان کا زور شور روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے۔

کسی اکھاڑے کا نیا ممبر بننے کے لیے نہ تو ماہانہ چندہ دینا پڑتا ہے اور نہ سالانہ، جیسا کہ بعض دوسری انجمنوں کا رواج ہے۔ بلکہ ہر نئے ممبر کو اتنی مٹھائی لانا پڑتی ہے کہ شہر کے تمام اکھاڑوں کے ممبروں تک پہنچ جائے اور اصطلاح میں اس کو "بَینا" کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ اودھ کے قصبات خاص کر بہانی میں عورتوں میں اب تک رائج ہے مگر اس کا مفہوم "تحفہ" لیا جاتا ہے "اُن کا لہنا مَینا کُئی سا، کا بَینا کھائے ہیں" (ان کا طعنہ کیسا! کیا ان کے وہاں کی شادی بیاہ کا بینا (تحفہ) کھائے ہیں)۔

تام گاؤں (تعارف)، پھبتکے بازی (طنزیہ حملے) اور چھاپا (تخلص) کے بارے میں ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ عام طور پر لوک گیتوں میں چھاپا یا تخلص کا ذکر نہیں ہوتا ہے، لیکن دھوبیوں کے شُمروں (مناجات)، ڈفالیوں کے سہلوں (غازی میاں کی مدح)، گھوسیوں کے عشقیہ اور داستانی گیتوں میں اس کا رواج ملتا ہے اور اب تو لوک گیت بنانے والے، والیاں نہیں، س کے مدعی ہیں کہ جب شاعر تخلص (چھاپا) ڈالتے ہیں تو ہم اپنا چھاپا کیوں نہ ڈالیں۔ ایسی تنظیموں کا وجود دن بدن کالعدم ہوتا جا رہا ہے، لیکن جہاں کہیں بھی ہے وہاں مذکورہ بالا ،صولوں کی پابندی بڑی سختی سے ہے۔

سنگت کے موسیقی آلات

لاؤنی گاتے وقت سنگت کا آلاتی ساز پکھاوج اور چنگ رہا ہے، جو اب ناپید ہے البتہ دوسرا آلاتی ساز رباب رہا ہے جو ڈفالیوں اور مجاوروں کے وجود سے اب تک قائم ہے اور وہ اسی کو استعمال کرتے ہیں۔ یک تارہ بھی آلاتی ساز رہا ہے، لیکن اب (ڈفالیوں اور مجاوروں کو چھوڑ کر) سبھی ڈھولک سے کام لیتے ہیں اور اپنی اپنی ذہانت اور فنی صلاحیت کے مطابق اپنا اپنا ہنر دکھاتے ہیں۔

ان کے فقدان پر کسی موٹی چکنی لکڑی میں لوہے کے چند موٹے موٹے کڑے ڈال لیے جاتے ہیں اور انھیں جھٹکا دے کر فنی انداز میں بجا کر گویّے کا ساتھ دیا جاتا ہے۔ چخ چخی کرتار اور جھانجھ بھی بجائی جاتی ہے مگر اس کا رواج شاذ و نادر ہی کہیں کہیں دیکھنے میں آیا ہے۔

دست پناہ (چمٹا) کے موڑ پر ایک موٹا کڑا ڈال کر بھی بجایا جاتا ہے جس کو چلا کہا جاتا ہے اور ساز کے طور پر اس کا استعمال فقیر زیادہ کرتے ہیں۔

دو اور بھی لطف ساز ہیں جو زیادہ تر اسکاؤٹوں کے ساتھ یا پھر گنڈیوں کے نوجوان جھکڑا گانے والوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ صرف دو لکڑیوں کو ایک دوسری پر مارنے سے طبلے کی سی آواز پیدا ہو جاتی ہے اور بعض بعض تو بڑی خوبی سے بجا لیتے ہیں۔ دوسرا ساز ہے گھڑا، بائیں ہاتھ کی کلمے والی انگلی میں لوہے کا موٹا سا ایک چھلا پہن لیا جاتا ہے اور داہنے ہاتھ سے گھڑے کے منہ گڑھ کو مارا جاتا ہے اور چپکے چپکے طبلے کے بول کہتے جاتے ہیں۔ یہ بھی اسکاؤٹ لڑکوں کے ساتھ مخصوص رہا ہے۔ آلاتی موسیقاروں کے درمیان ہم نے صرف ایک بار بانس کا پھاٹک والے سنیما اسٹیج پر "آلاتی موسیقی سولو" کی نمائش میں دیکھا ہے اور (اللہ معاف کرے) وہ گھڑا بجانے والا میں تھا۔ اقرار گناہ سے امید کی جاتی ہے کہ اللہ ضرور بخش دے گا۔

زبان اور انداز ترسیل

جو لاؤنیاں سوچ سمجھ کر بتکلف شاعرانہ انداز میں کہی گئی ہیں، ان کی زبان نہ صرف اردو بلکہ فارسی الفاظ آمیز اردو ہے، جہاں لاؤنی گو اپنے احساسات اور جذبات کی ترسیل میں ان تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کا بھی سہارا لیتا ہے جو عام طور پر اس وقت شعرا استعمال کرتے تھے اور یہ رنگ مذہبیات سے وابستہ مضامین میں خاص طور پر نکھر آتا ہے۔ پہلی صورت میں درویشوں اور سنتوں کی کہی ہوئی لاؤنیوں کی زبان میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا، خواہ وہ سوامی محمد گری کی کہی ہوں یا سنت ناتھ گری کی؛ البتہ کہیں کہیں مذہبیات سے یہ وابستگی زبانوں میں نہ صرف فرق پیدا کر دیتی ہے بلکہ دو زبانیہ بنا دیتی ہے۔ آپ ایک گنیش بندنا پڑھ چکے ہیں جس کے بول ہیں:

لاڈلے گرجا کے، دیجے آن سنکٹ ٹال جی
لاج رکھ لیجے گجانن گن شنکر لال جی

اور ایک نعتیہ لاؤنی کے یہ بول بھی پڑھ چکے ہیں:

اے پیارے نبی آپ کی ہر سعی بخدا بے سہاروں کے کام آگئی

زبان کے اس فرق اور امتیاز سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیے کہ اس نے سنتوں اور درویشوں کے دلوں میں بھی کوئی فرق پیدا کر دیا ہو۔ ایسا کچھ ہرگز نہیں ہوا، بلکہ ہمیں بتایا گیا ہے کہ مسلمان درویشوں میں بادل خاں (۱۸۱۰ء - ۱۸۷۵ء) اور سوامی محمد گری (۱۸۳۰ء - ۱۸۷۰ء) نے اپنی لاؤنیوں میں وَیشنو بندنا کی ہے۔ افسوس بہت تلاش کے باوجود ہم ایسی کوئی لاؤنی حاصل نہ کر سکے، البتہ وِدّیا کی دیوی سرسوتی کی بندنا میں یہ مصرع پڑھ چکے ہیں جو ایک مسلمان دھوبی نے بنایا ہے۔ مسلمان لوک گیت کاروں نے اس معاملے میں بڑی فراخدلی سے کام لیا ہے اور فرقہ وارانہ یک جہتی اور یک پارچگی کا زبردست نمونہ پیش کیا ہے:

پہلے سمروں ماتا سرسوتی پھر روشن کا کروں بیان

ویسے عام طور پر لاؤنیوں کی زبان وقتی مروّج اردو ہی رہی ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ گاتے وقت صوتی تلفظ کی سہولت کی بنا پر "خشت" کو "کھسٹ" کہہ جاتے ہوں۔ خالص اردو میں سنتوں کی لاؤنیوں کے چند مصرعے پڑھیے اور نَحنُ اَقرَبُ مِنکُم مِن حَبلِ الوَرِید کی ترجمانی کے خوب صورت انداز ترسیل کی داد دیجیے:

یوں ہی بھاگے برہمن و شیخ پھرے کوئی سوئے حرم کوئی سوئے کنشت
ذرا غور تو کیجیے حصول ہے کیا انھیں غیر نظارۂ سنگ و خشت

ہے پاس دلدار ڈھونڈتا پھرے ہے دشت و جبل کے اندر
وہی مثل ہے ڈھنڈورا ملکوں میں لڑکا اپنی بغل کے اندر (سنت تھا گری)

یوں ہی دیر و حرم میں بھٹکتے پھرے جہاں جانا ہے واں کی خبر ہی نہیں
وہ گھٹ کے پٹ ہی میں نہاں ہے میاں اوّلے اندھوں کو آتا نظر ہی نہیں

(مہاتما اننت گری)

د دوار کعبے کی سمت شکل شیخ و برہمن جائیں گے ہم
خدا کو خود ہی میں دیکھ لیں گے خودی یہ جس دن مٹائیں گے ہم (سوامی محمد گری)

یہی جذبہ ایک مسلمان صوفی راز بریلوی کے لفظوں میں پڑھیے۔ اس زبان کا نمونہ دیکھیے جس کی ابتدا حضرت امیر خسروؒ نے کی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی ترجمانی بھی دیکھتے چلیے۔ لا فضل لعربی علی عجمی ولا فضل للابیض علی الاسود.....:

ہر کو ہر ذرے دیکھو رے مورکھ ہر دیکھے توئے
دیکھ دکھاون دیکھ رہی کا دیکھے موئے
نین بیچ جوت نہ پاؤں کانن کے بیچ رس
بیچ اونچ راز نہ جانے ہرنے بیچ کا ہوئے (راز بریلوی)

زبان اور انداز ترسیل کے سلسلے میں ایک بات بڑی حیرت انگیز نظر آتی ہے کہ لاؤنی کہنے والے لوگوں نے صنائع معنوی جیسے ایہام مراعات النظیر حسن تعلیل مبالغہ وغیرہ وغیرہ سے زیادہ صنائع لفظی کی طرف توجہ کی اور "لزوم مالایلزم" کے تحت جو جو صنعتیں ان کی دسترس میں آئیں استعمال کر ڈالیں۔ وجہ شاید کیا، بلکہ یقیناً یہ رہی ہوگی کہ لاؤنیاں کبھی تحریری نہیں رہیں بلکہ محض زبانی اور وہ بھی سینہ بسینہ ایک پشت سے دوسری پشت تک چلتی رہیں۔ ان کا تعلق قارئین سے زیادہ سامعین سے رہا ہے اور سامعین ایسے صنائع سے زیادہ سے زیادہ متاثر اور محظوظ ہوتے رہے۔ ہمیں جو بات سب سے زیادہ پسند آئی کہ صنائع و بدائع کی عربی کتابوں میں جو ثقیل مصطلحات رائج چلے آتے تھے لاؤنی بنانے والوں نے انھیں اپنی فراست اور ذہانت کی مدد سے آسان اور اپنی زبان میں بدل دیا۔ اس طرح "لزوم مالایلزم" تلازمہ بن کر ہمارے سامنے آیا اور اس تلازمہ نے مختلف روپ بدلے۔ ہم عربی مصطلحات کے سامنے لاؤنی کاروں کے مصطلحات لکھ کر ان کی کچھ وضاحت کیے دیتے ہیں:

صنعت مقطع :- اماترا جس میں حروف الگ الگ ہوتے ہیں:

درد و داغ، رخ زرد اور وہ دل

صنعت موصل:۔ ماترا دار۔ جس میں حروف ملے ہوتے ہیں:

بھولی بھالی تو تیری پیشانی ہے　　　　تو خوبی خاصان میں لاثانی ہے

سی حرفی:۔ لکھرا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک مصرع ک سے شروع ہوتا ہے تو دوسرا مصرع کھ سے اور تیسرا گ سے، علیٰ ہذا القیاس سب حروف تہجی پر مشتمل لاوَنی ہوگی۔ ہم مثال اردو کی دے رہے ہیں:

ا۔　　آہ کی جو میں نے تو اس دل کے ٹکڑے کر ڈالے

ب۔　　بات زبان سے نکل کر تن بسمل کے ٹکڑے کر ڈالے

سی حرفی معکوس:۔ الٹا لکھرا۔ ابتدا، آخری حرف تہجی سے اور انتہا پہلے حرف تہجی پر۔

غیر منقوطہ:۔ بے لفظ یا بے نکت۔ جس میں نقطے نہ ہوں:

ملال ہو دور سارا، اگر دم وصل آئے گا

مراد کا گل ہرا ہمارا ادا دکھا کر کھلائے گا

صنعت معکوس یا قلب۔ گتاگت، اور اسی طرح بہت سی صنعتیں۔ بعض عربی مصطلحات پر اپنے تلفظ کا میک اپ کر دیا ہے مثلاً صنعت رقطا کو رکتا، صنعت خیفا کو کھیپا بنا لیا۔

اس سلسلے میں ایک وصف اور نظر آتا ہے کہ لاوَنی گو صنعت ترصیع سے بھی کام لیتے ہیں اور لاوَنیاں دو زبانیہ، سہ زبانیہ، چہار زبانیہ بناتے چلے جاتے ہیں۔ ایک مصرع ایک زبان کا دوسرا مصرع دوسری زبان کا:

نگار زیبا بباغ دیدم　　　　سروپ سندر، انوپ جوبن

نام پری گشتہ حور نادم　　　　بجت رتی بہت نرکھ سو بھگ تن

گوپال سنگھ لاوَنی گو اور کانک کی ایک لاوَنی چار زبانوں میں پڑھیے:

کم سُون کم سُون مائی ڈیر　　　　آئی سی لو یو، ویلکم ہیر

مائی ونڈر فل ڈیر ناٹ کم ہیر　　　　یُو ویل گو اِنگ سو فار

اران فارسی میں فرماتے ہیں:

ظلم مکن ہر بار نزد من بیا دلدار

اپنی حالت پنجابی میں پیش کرتے ہیں۔

رہ رہ ساڈا دل گھبراڈا   مینو پیا کہیں نظر نہ آندا
کیڈی جدائی وِچ جیا جاندا

ساڈے دل وچ چاہ تو جوڑی   میڈی کال آجا یک بار
ظلم مکن ہر بار نزد من بیا دلدار

جب کوئی اثر ہوتا نظر نہیں آتا ہے تو سیدھی سادی زبان میں التجا کرتے ہیں:

گوپال سنگھ کہے آ دل جانی   تیرے عشق میں ہے حیرانی
خیال بنایا   چار زبانی

حرف آخر

اب آخر میں ہم آپ سے کچھ اور فیصلہ کن تکنیکی باتیں کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ ان بیانات سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ لاونی عوام کے وہاں کئی حیثیتوں سے پہنچی ہے۔ ایک سنگیت اور اُپ سنگیت راگ! آیئے پہلے اسی کے بارے میں کچھ باتیں ہو جائیں۔ ہم نے اپنی کتاب اُتر پردیش کے لوک گیت لکھتے وقت اس سلسلے میں کئی چھوٹی بڑی کتابیں پڑھیں۔ سنگیت اکاڈمی۔ الٰہ آباد کے ایک لیکچرر ہریش چندر سری واستو ایم۔ اے (فلاسفی) اور سنگیت پربھاکر، وامن نرائن ٹھکار۔ ایم۔ اے سنگیت پربھاکر سے تبادلہ خیال کیا تو ان دونوں نے لاونی کو سنگیت یا اُپ سنگیت کی حیثیت نہیں دی، البتہ موسیقی کا ایک اسٹائل ضرور بتایا ہے وہ بھی عوامی اور لوک جنوں کا۔ سنگیت راگ درشن اور اس قسم کی کئی کتابوں کی ورق گردانی کی مگر راگوں کے بیانات میں کہیں لاونی راگ کا ذکر ہی نہیں ہے البتہ ایک کتاب سنگیت وشارد صفحہ ۱۶۸ پر راگوں کے ضمن میں لاونی کا ذکر ہے:

"لاونی کی سنگت پکھاوج اور مردنگ سے کی جاتی ہے، اس کو ایک آدمی یا چند آدمی مل گرگاتے ہیں۔" بس اس کے آگے نہ اس کے بول لکھے ہیں اور نہ کوئی تحلیل موسیقی دی ہے یہ کتاب "بسنت" جی کی لکھی ہے اور درسیات میں داخل ہے۔

بہرحال اگر ہم اسے ایک راگ یا آپ راگ تسلیم کرلیں تو اس کے بولوں کی موسیقی تحلیل اس طرح ہوگی۔ مثلاً سُمرن کر من رام نام کی، جو کچھ ہووے بھلا ہووے بندے

استھائی

دھ ن دھ پ ما گا رے گا پ ما   گا ی رے سا رے گا ما پ ما گا رے گا
س می ر ن ک . ر . م ن   ر ا م نا ...... م کی

اور اس کی سنگت میں اگر پکھاوج مردنگ یا طبلا ہے تو دلمپت (تیز تیز) تین تال یا کہروا ساتھ دے گا جس کے بول یوں ہوں گے :۔

ماترائیں ۱۶ ٹکڑے چار چار ماتراؤں کے چار۔ تالی ۱، ۵، ۱۳ پر اور خالی ۹ پر رہے گی۔

بول: دھا تِرکِٹ دھی ی دھی نا نا ت ت تا تِرکِٹ دھی ی دھی نا نا دھی دھی
ماترا ۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶ ۷ ۸ ۹ ۱۰ ۱۱ ۱۲ ۱۳ ۱۴ ۱۵ ۱۶

تالی   تالی   خالی   تالی

ہمارا ذاتی خیال ہے کہ سنت ترکن گری اور درویش بادل خاں کی بات چھوڑیئے، باقی اواخر ۱۹ ویں صدی اور اوائل ۲۰ ویں صدی کے گائک، چنگ، پکھاوج، مردنگ بجانا تو درکنار اس کی صورت سے بھی واقف نہیں ہیں یہاں تک کہ وہ طبلا بھی سنگت میں نہیں رکھتے ہیں، بلکہ اس کی جگہ ڈھولک سے کام لیتے ہیں۔ ڈھولک کے بارے میں میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے بول طبلے کے بولوں سے کہاں تک مماثلت رکھتے ہیں، لیکن اندازہ ایسا ہے کہ لاوَنی گائک اور اس کے ساتھ سنگت کرنے والا ڈھولکیا سہل پسندانہ انداز میں گاتا بجاتا چلا جاتا ہے اس لیے اس کے سامعین زیادہ تر اَن پڑھ، کم سواد، موسیقی کی باریکیوں سے نابلد سے ہوتے ہیں۔ وہ تو صرف آواز اور زیادہ سے زیادہ الفاظ کا لحاظ کرتے ہیں اور شاید اسی لیے لاوَنی بنانے والے الفاظ کی صنعت گری کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ بہرکیف ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ لاوَنی کا شمار نہ سنگیت راگ میں ہے اور نہ آپ راگ میں۔ صرف موسیقی خیال کی ایک بگڑی صورت ہے جس کو حضرت امیر خسروؒ نے عوام کے لیے اختراع کر دیا۔

سنگیت راگ کے علاوہ اس کی ایک اور حیثیت سامنے آتی ہے یعنی عوامی شاعری! یہ بات مسلم ہے کہ لاؤنی کی دوسری اصناف شاعری کے مثل، تکنیکی ہئیت اور ساخت ہے۔ ہم مطلع یا حسن مطلع کی خوبی کی داد دے کر واہ وا! سبحان اللہ کے نعرے لگائیں، یہ بات الگ ہے اور لاؤنی کی "دوڑ" سکھی "کو مطلع اور حسن مطلع نہ کہیں، مگر ان کی حیثیت وہی ہے ہم ان کے "چھاپا" کو تخلص اور "اڑان" کو آخری شعر کہیں۔ یہ اپنا اپنا خیال ہے۔ لاؤنی بنانے والوں کے پاس شگفتہ الفاظ، خوب صورت بندشیں، صنائع لفظی کا ایک انبار ہے اور ہم اس انبار کو کرید کر خوب صورت چیزیں نکالنے کی کوشش نہ کریں، تو اسے اپنی کمزوری سمجھنا چاہیے۔ اگر ہم لاونیوں کا بغور مطالعہ کریں اور مذکورہ بالا اوصاف کو پیش نظر رکھیں تو لاونیوں کو شاعری کے دائرے میں رکھ سکتے ہیں خصوصاً وہ لاونیاں جو فارسی آمیز اردو اور شاعری کی مروجہ بحروں میں ہیں، مگر ان کی تعداد بہت کم ہونے کے ساتھ ساتھ ایسی لاؤنیاں تحریری صورت میں نہیں ملتیں۔ اس لیے ثبوت میں پیش کرنے سے ہم مجبور ہیں اور پھر راگوں کے اقسام کے مثل اصناف شاعری میں اس کا کوئی ذکر تو کیا نام و نشان بھی نہیں ملتا، اس لیے ہم شاعری کی صدوں میں لانے سے مجبور ہیں۔ اور وہ خود بھی اس کو محض "خیال" سے تعبیر کرتے ہیں۔ پیارے دھوبی، گوئیا تالاب، رام پور کا ایک خیال ہوائی جہاز پر اور گوپال سنگھ کی چار زبانیہ لاؤنی آپ پڑھ چکے ہیں۔

"خیال" بنایا چار زبانی

اگر آپ ہماری کتاب "اتر پردیش کے لوک گیت" صفحہ ۴۳۸۔ ۴۳۹ پر شمس الدین خاں بیڈن ٹول۔ الہ آباد کی لاؤنی پڑھیں جس کی "دوڑ" کے بول ہیں:

صدہا پیمبر گزرے ہیں پر اس رتبے کا پانا مشکل ہے
بجز محمدؐ کسی نبی کا عرش پہ جانا مشکل ہے

اور اڑان (انترا) کے بول ہیں:

بت خانوں کو توڑ بتوں کو کلمہ وحدت کا پڑھانا مشکل ہے
بجز محمدؐ کسی نبی . . . .

تو یقیناً اسے آپ شاعری کہنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ بہرحال لاؤنی شاعری اور عوامی شاعری کے دوراہے پر بےبسی کے عالم میں منتظر ہے کہ ہم کدھر جائیں۔

اسی دوراہے کے سامنے کچھ الگ لاؤنی کے کانوں میں یہ آواز سنائی دی

گاجن میاں توروا وکچو جوترا، موسے چڑھل نا جائے

اور اس نے یہ کہہ کر کان بند کر لیے، کتنے خراب اور بھدے الفاظ ہیں اور ہمارے پاس کتنے خوب صورت الفاظ، حسین بندشیں، تلازمات ہیں۔ صنائع لفظی، ککھرا، الٹا ککھرا، گت اگت (صنعت قلب) اور کیا کچھ نہیں ہے۔ یہ تو لوک گیتوں کی زبان ہے ہم اس کے ساتھ کیسے میل کھا سکتے ہیں۔ ہم وہاں نہیں جائیں گے۔ یہ تو گنواروں کے گیت ہیں۔ اب آپ خود سوچیے ان کا شمار لوک گیتوں میں کس طرح کیا جائے؟ جب کہ لوک گیت برجستہ اور ارتجالاً بنائے جاتے ہیں اور نسل در نسل ایک حالت میں اسی طرح الفاظ کے ادنیٰ تغیر کے ساتھ سینہ بسینہ چلتے چلے آرہے ہیں۔ ان میں سادگی ہے اور ایک لطیف حسن اور لاؤنیوں کے انداز ترسیل میں تکلف ہے اور تصنع! لوک گیتوں میں تلازمہ، بندش الفاظ اور نام گاؤں وغیرہ قسم کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی، وہاں تو جذبات اور کیفیات کی ترجمانی سیدھے سادے وہ بھی مقامی الفاظ میں کی جاتی ہے! اس لیے ہم تذبذب میں پڑ جاتے ہیں کہ کس طرح لوک گیتوں کی سرحد میں لے جایا جائے، مگر لاؤنی سے عوام اور لوک جن کی دل چسپی اور انہماک، اور خواص کی عدم دل چسپی اور انحراف ایسا جذبہ ہے جو ہمیں اشارہ کرتا ہے کہ لاؤنی لوک جنوں کی چیز ہے اور اسے لوک گیتوں کی سرحد میں کھینچ کھانچ کر لے آنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اشفاق حسین (کناڈا)

اے شام مہرباں ہو

ساعتوں کے بحران میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ الفاظ اپنے بدن سے معنویت کا لباس اُتار دیتے ہیں اور تب آنکھوں کو وہ کچھ نظر نہیں آتا جو کچھ کہ وہ دیکھنا چاہتی ہیں۔ سیاست کا لفظ بھی اسی بحران کا شکار ہے۔ آنکھوں کے بند دریچوں سے جھانکنے کی کوشش کیجیے تو سیاست زیادہ سے زیادہ اقتدارِ اعلیٰ کے منصب تک پہنچنے کا نردبان یا حکمرانوں کا پسندیدہ مشغلہ نظر آئے گا۔ خود فیضؔ کے نزدیک سیاست کے دو دائرے ہیں، ایک وہ جو معاشرے کے ظاہر و باطن پر محیط ہے اور جس کی رُو سے ہر وہ سرگرمی جس سے معاشرتی زندگی متاثر ہوتی ہو، مذہبی ہو یا غیر مذہبی، ادبی ہو یا تہذیبی، انتظامی ہو یا قانونی، اخلاقی ہو یا معاشی، کاروبارِ سیاست کا حصہ ہے۔ دوسرا دائرہ سیاست کا محدود دائرہ ہے، جس کا تعلق معاشرے کے صرف آئینی، قانونی اور معاشی نظم و نسق سے ہے، عام طور سے سیاست کے لفظ کو انھیں محدود معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ حالانکہ بساطِ اقتدار پر سازشوں کے مُہرے آگے پیچھے کرنے سے نہ تو عام انسانوں کا براہ راست تعلق ہے اور نہ اس کی کوئی اخلاقی اساس ہے، بلکہ یہ تصورِ سیاست کی معنوی سرحدوں کو بہت کمزور اور حقیر بنا دیتا ہے لیکن اس کے برخلاف آج صورت حال شاید یوں نہیں ہے۔ اب یہ لفظ ایک نظریۂ اخلاق کے ساتھ ساتھ انسان دوستی، ظلم کے خلاف جدوجہد اور حق پسندی کی رہ گزار پر چلنے کا ایک خوب صورت استعارہ بھی بن گیا ہے۔ فیضؔ کی شاعری اسی خوب صورت استعارے سے مزیّن ہے۔

اُن کی شاعری منزل تک پہنچنے کا ذریعہ نہ سہی لیکن حصولِ منزل کے لیے راستے کا

چناؤ کرنے میں ضرور مدد دیتی ہے ــــــــ اور اگر یوں بھی نہیں تو کم از کم دلوں کے برف زار میں ایسی گرم ہواؤں کا پیغام ضرور لاتی ہے جسے منزل کی لگن کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ایک شاعر سے اس سے زیادہ اور کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ چاروں طرف پھیلی ہوئی تاریکی اور تیز ہواؤں کی زد میں آشاؤں کے چند دیئے روشن کرنے کی سعی کرے اور پھر فیض کی شاعری تو ایسی ایک دو نہیں بلکہ سینکڑوں مثالوں سے بھری پڑی ہے۔

اس صدی کے پانچ یا چھ عشروں پر محیط فیض کی شاعری سیاسی حوالوں سے جنوبی ایشیا کی معاشرتی زندگی پر پڑنے والے مختلف اثرات کے نقوش اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ ان کی شاعری کا ابتدائی زمانہ وہ ہے جب دنیا ایک بڑی جنگ کے شعلوں سے گزر چکی تھی اور ایک نئے جنگی جنون کے آتش فشاں کے پھٹنے کی منتظر تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران ہی فیض کا پہلا شعری مجموعہ "نقش فریادی" شائع ہوا، جسے خود فیض نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ اُس دور کی کیفیات کا آئینہ دار ہے جسے رومانی اور جذباتی دور کہنا چاہیے۔ یوں بظاہر طبیعت کی رومانیت یا شعور پر جذبے کی گرفت کا نام بھی دیا جاسکتا ہے لیکن اس کی بھی ایک خاص وجہ ہے جس کی فیض نے "دستِ تہہ سنگ" کے دیباچہ میں یوں وضاحت کی ہے کہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک کا زمانہ ہندوستان میں معاشی اور سماجی طور سے کچھ عجیب طرح کی بے فکری، آسودگی اور ولولہ انگیزی کا زمانہ تھا جس میں اہم قومی اور سیاسی تحریکوں کے ساتھ ساتھ، شعروادب میں سنجیدہ فکر و مشاہدے کے بجائے کچھ رنگ رلیاں منانے کا سا انداز تھا۔ چنانچہ "نقشِ فریادی" کی ابتدائی نظمیں اسی ماحول کے زیر اثر لکھی گئیں۔

مصنوعی خوشحالیوں اور فارغ البالی کے پودے زیادہ دن تک ہرے بھرے نہ رہ سکے، عالمی کساد بازاری کی امر بیل ان پودوں سے ایسی لپٹی کہ زندگی موت سے زیادہ بھیانک نظر آنے لگی۔ فیض نے اس دور کو بچوں کے ہونٹوں سے اچانک ہنسی بجھ جانے سے تشبیہ دی ہے۔ یہ دور تلخی کا، غم و غصے کا، احتجاج اور بغاوت کا دور تھا۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جب ہندوستان میں ترقی پسند تحریک نے شعروادب کے ایوان میں داخل ہونے کا باضابطہ اعلان کیا۔ وہ ادبی دیوان خانے جہاں ہر وقت سفید چاندنی بچھی رہتی تھی اور جہاں صف

شرفا کے طبقے داخل ہو سکتے تھے، اب ان لوگوں کے لیے بھی کھل گئے جن کے پاؤں کیچڑ میں سنے ہوئے تھے اور جنہیں ان کے آبا و اجداد نے تہذیب و شرافت کی محفلوں سے بہت دور رکھا تھا۔ اس نئے شعری افق کو فیض نے گلشن میں ایک دلستان نو کے کھل جانے سے تعبیر کیا ہے انھوں نے اس دلستان سے پہلا سبق یہی سیکھا کہ اپنی ذات کو باقی دنیا سے الگ کر کے سوچنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے اور تب فیض کو یہ بھی احساس ہوا کہ نظام زندگی کسی حوض کا ٹھہرا ہوا سنگ بستہ، مقید پانی نہیں ہے جسے تماشائی کی غلط انداز نگاہ احاطہ کر سکے، بلکہ یہ تو جھرنوں اور آبشاروں سے بہتا ہوا وہ پانی ہے جو ہر لمحہ ایک نئی صورت اور نئی معنویت کا پیغام لاتا ہے۔

یہی وہ منزل ہے جہاں سے نظامی کی زبان میں 'دلے بفروختم جانے خریدم' کہہ کر فیض کی شاعری، نظری سیاست کی اخلاقی قدروں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے نظر آتی ہے جس کی طرف اس مضمون کے شروع میں انسان دوستی، ظلم کے خلاف جدوجہد اور حق پسندی کی رہگزار پر چلنے کا استعارہ کہہ کر اشارہ کیا گیا تھا اسی جذبے نے فیض کو رقیب سے گفتگو کرنے کا ایک نیا انداز اور محبوب کو ڈھارس دینے کے ایک نئے سلیقے سے روشناس کرایا۔ ان کے سیاسی شعور کی پختگی اور آنے والے کل کے تصور نے فیض کو نیا لہجہ عطا کیا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران فاشزم کے بڑھتے ہوئے خطرات کے پیش نظر، ترقی پسند مکتب فکر کے حامی، نسل انسانی کے محفوظ مستقبل کی خاطر، عالمی سطح پر فاشزم کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔ اس جدوجہد میں فیض بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ شریک تھے، فوجی وردی میں ملبوس، ان کی شخصیت اسی جدوجہد کی یاد دلاتی ہے۔ اخلاق کا کوئی بھی صحیفہ ہو، کوئی بھی اساطیر ہو، اُس کی رو سے اس بات کو کبھی پسند نہیں کیا گیا کہ انسان جو کچھ کہے اُس پر عمل نہ کرے۔ قول و عمل کا یہ تضاد شخصیت کے بودے پن کی چغلی کھاتا ہے۔ فیض نے اگر ایک جانب فاشزم کے خلاف جنگ میں حصہ لے کر نظری سیاست کے عملی پہلو کی طرف قدم بڑھایا تو دوسری جانب ایک استاد، ایک فوجی افسر، ایک ٹریڈ یونین لیڈر اور ایک صحافی کی حیثیت سے، زندگی اور شاعری کو علیحدہ علیحدہ نہیں برتا بلکہ دونوں کو ہم آہنگ

کرکے ایک نئی شکل وضع کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں زندگی بے معنی سرابوں میں بھٹکنے کا نام نہیں بلکہ مقصدیت کو اپنے دامن میں سمیٹنے کا عمل ہے۔

فیض کی شاعری کا سیاسی پہلو قیام پاکستان کے بعد اور بھی نکھر کر سامنے آیا۔ یوں لگتا ہے جیسے ان کی شاعری، آمریت اور جبر کے شکنجے میں جکڑے ہوئے غریب عوام کا مرثیۂ غم بھی ہے اور تاریخ بھی ہے۔ آزادی کے بعد وہ پاکستان ٹائمز اور امروز کے مدیر کی حیثیت سے صحافت کے میدان میں ارباب اقتدار کو آئینہ دکھاتے رہے، ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے اور جذبات و ذہن کی سطح پر، مقصدِ آزادی کے حصول کے لیے لوگوں کو متوجہ کرتے رہے۔ تاریخِ پاکستان کا یہ ابتدائی زمانہ، خوابوں کے بکھرنے کا زمانہ تھا۔ مطلعِ آزادی پر سحر ضرور نمودار ہوئی لیکن اس کا اُجالا شب گزیدگی کے زخموں سے چور چور تھا۔ اہلِ درد کا دستور وہی پہلے جیسا رہا اور ہر آنکھ میں یہی ایک سوال تھا۔ ع

کہاں سے آئی نگارِ صبا کدھر کو گئی

یہ صورت حال ایک بہت بڑا سانحہ تھی لیکن فیض نے ایسے بے آسرا لمحوں میں بھی آس کی شمعیں جلائیں۔

ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدۂ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

مسندِ اقتدار پر بیٹھی ہوئی شیروانیوں کو یہ بات ایک آنکھ نہ بھائی اور سازشوں کے جال پھیلائے جانے لگے۔

اور تب ایک دن آزادیٔ فکر کے اس علمبردار شاعر کو وطن دوستی کے جرم میں پابہ زنجیر کر دیا گیا۔ وہ ہاتھ جو عظمتِ لوح و قلم کے امین تھے ان کو ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں لیکن یہ روح فرسا حالات بھی فیض کے رجائی لہجہ کو نہ چھین سکے۔

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے وہ گزری
تنہا پسِ زنداں، کبھی رسوا سرِ بازار

گر ہے ہیں بہت شیخ سرِ گوشۂ منبر
کڑکے ہیں بہت اہلِ حکم بر سرِ دربار
چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت
اس عشق نہ اس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت

صدیوں سے ظلم کی چکی میں پسنے والے انسانوں کا حوصلہ کسی فصیل جبر کے ذریعہ قید نہ کیا جاسکا انقلاب آمریت کی دسویں سالگرہ کا جشن منانے والوں کو ایک بار پھر عوامی تحریک کے غیظ و غضب کا نشانہ بننا پڑا، لیکن ہاری ہوئی بازی کو جیت میں تبدیل کر دینے کی ہوس نے ملک کو آمریت کے ایک اور کفن میں لپیٹ دیا۔ فیض کے عوام دوست قلم نے اس تاریک دن کا بھی مرثیہ لکھا،

آج کے دن نہ پوچھو مرے دوستو
دور کتنے ہیں خوشیاں منانے کے دن

زخم کتنے ابھی بختِ بسمل میں ہیں
دشت کتنے ابھی راہِ منزل میں ہیں

کب تمہارے لہو کے دریدہ علم
فرقِ خورشیدِ محشر پہ ہوں گے رقم
آج کے دن نہ پوچھو مرے دوستو

تمام احتجاجوں کے باوجود تاریخ پاکستان کا کارواں آمریت اور بربریت کے کجاوے سجائے ذلت آمیز منزلوں کی طرف رواں دواں رہا۔ تھکی ہوئی آنکھوں سے فیض اس کارواں کی گردِ راہ دیکھتے رہے۔

کہیں تو کاروانِ درد کی منزل ٹھہر جائے
کنارے آلگے عمرِ رواں یا دل ٹھہر جائے
اماں کیسی کہ موجِ خون ابھی سر سے نہیں گزری
گزر جائے تو شاید بازوئے قاتل ٹھہر جائے

اپنے دیس کے علاوہ بھی، جہاں کہیں کوئی عوامی تحریک اٹھی ہے یا آزادی کی کوئی جنگ لڑی گئی ہے، فیض کا قلم ہمیشہ اُن کی حمایت میں اٹھا ہے۔ ایران کے طالب علموں کی جدوجہد ہو یا ویت نامی اور فلسطینی عوام کے حقوقِ آزادی کی جنگ ہو، فیض نے اپنی شاعری کے ذریعہ ان سب کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اس لیے کہ ان کی شاعری آزادی اور امن کی شاعری ہے، امن جو گندم کے کھیت، سفیدے کے درخت، دُلہن کا آنچل، بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھ، شاعر کا قلم اور مصوّر کا موئے قلم ہے اور آزادی اُن کے نزدیک ان سب صفات کی ضامن ہے۔

فیض کی سیاسی شاعری میں رنگ، خوشبو، حسن اور خوبی کے تمام استعارے وطن سے ماخوذ ہیں۔ وہ اپنے دل کو جراحتِ قاتل سے بخشوالانے کا تو حوصلہ رکھتے ہیں لیکن اسے سیاستِ چارہ گراں کی نذر ہونے سے نہ بچا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ذرّۂ بے نشاں ذات اور نغمۂ بے صدا درد کو زبان دینا ہی اُن کے نزدیک کائنات کی سروری ہے۔ ان کی شاعری زرد پتوں کے اُس بَن کے نام ہے جو درد کی انجمن ہے اور جہاں کلرک ہیں، پوسٹ مین ہیں، تانگے والے ہیں، کارخانوں کے بھوکے جیالے ہیں، اناج اُگانے والے کسان ہیں، دُکھی مائیں ہیں، بیاہتائیں ہیں، حسینائیں ہیں اور طالب علم ہیں لیکن المیہ یہ ہے کہ ان کے درد کی انجمن میں مہرباں شامیں بہت کم ہیں۔ فیض اسی شام کی دعا کرتے ہیں:

اے شام مہرباں ہو　　اے رفیقِ دل فگاراں　　اے شامِ شہریاراں
اے مہِ شب نگاراں ہو　　اے شام ہم زباں ہو　　ہم پر بھی مہرباں ہو
اے شام مہرباں ہو

دیکھیں اُس دیس پر جو فیض کے شہریاروں کا دیس ہے، وہ مہرباں شام کب طلوع ہوتی ہے جس کا نہ صرف انھیں بلکہ ہم سب کو انتظار ہے۔

لطیف الزماں خاں

محمد نقوش

"آیندہ فروری میں غالب کا صد سالہ جشن ہوگا۔ آپ نقوش کا غالب نمبر تو یقیناً شائع کریں گے؟"

"جی نہیں۔"

"آپ نے بے حد اہم نمبر شائع کیے ہیں۔ غالب نمبر کیوں نہیں؟"

"جس سے مضمون لکھنے کے لیے کہتا ہوں وہ اپنی مصروفیت کا اظہار کر دیتا ہے۔ "میں یہ کام کر رہا ہوں" "میں وہ کام کر رہا ہوں" نہیں جناب میں غالب نمبر نہیں چھاپوں گا۔"

کچھ دیر سکوت کے بعد میں نے کہا "میرے پاس چند غیر مطبوعہ اور کئی ہزار مطبوعہ مضامین ہیں ان کا انتخاب کر لیجیے، نقوش کا غالب نمبر ضرور چھاپیے۔"

سرخ و سپید رنگ، گھنی بھنویں جو چہرے پر سب سے زیادہ نمایاں ہیں، ناک لانبی لیکن نتھنے جیسی پھلوری رکھی ہو، آنکھیں متجسس و متلاشی، سیاہ بال (بعد میں معلوم ہوا کہ خضاب حد درجہ سلیقہ سے استعمال کیا گیا تھا)، لمبے لمبے ہاتھ پاؤں۔ ایک شانہ جھکا ہوا، نگاہ نیچی، نہایت اعلیٰ درجہ کا سوٹ پہنے ہوئے، باتوں میں بے حد اختصار ــــ

"میں آپ کے ساتھ ملتان چلوں؟"

یوں غالب نے طفیل صاحب سے میرا تعارف کرایا۔

جب تک میں ان سے ملا نہیں تھا، میں ان سے سخت برہم تھا۔ میں نے انھیں کئی خطوط

لکھے تھے مگر جواب نہیں آیا تھا یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اکثر خطوط کا جواب نہیں دیتے اور نقوش میں کیا چھپنا چاہیے اور کیا نہیں چھپنا چاہیے اس کا فیصلہ تحریر کو پڑھ کر وہ خود کرتے ہیں. کوئی شخص اس سلسلہ میں دخیل نہیں ہو سکتا۔ دوسرے دن جب وہ میرے ہمراہ چلنے کے لیے لاہور اسٹیشن پر پہنچ گئے تو میری برہمی اور غصہ فرد ہو گیا۔ طلب ادب کی لگن، شوق اور حوصلہ، خلوص، مقصد سے لگن اور حقیقت پسندی کی روشن مثال میرے سامنے آئی۔ محض لکھ دینا ہی کافی نہیں ہوتا، ادبی پرچے کے معیار کو بلند رکھنے کے لیے سفر کر لینا بھی کافی نہیں، اس میں کئی سخت مقام بھی آتے ہیں۔

غالب کی عظمت اور اہمیت کو ہمہ وقت اور ہر جا ذہن میں رکھنے والوں کی تعداد کم نہیں لیکن متعلقہ مواد کو یکجا، اسے سلیقہ سے چھاپنا، حقیقت یہ ہے کہ عظمتِ رفتہ کی بازیافت کے مترادف ہے۔

چونکہ میں فرسٹ کلاس میں سفر کرنے پر نہ قادر تھا نہ آمادہ، طفیل صاحب فرسٹ کلاس کا ٹکٹ ہوتے ہوئے بھی تھرڈ کلاس میں آبیٹھے تھے۔

غالب میرا پہلا اور آخری عشق ہے۔ رشید احمد صدیقی صاحب میرے لیے انتہائی محترم ہیں اور محمد طفیل ــــ میرا بھائی بھی، میرا محسن بھی میرا دوست بھی۔ غالب کو نہ پڑھا ہوتا تو انسانیت کے مفہوم سے ناواقف رہتا، رشید صاحب کی تحریروں کو نہ پڑھتا تو علی گڑھ کی اہمیت کو نہ جان پاتا۔ طفیل صاحب سے نہ ملا ہوتا تو دوستی کے معنی و مفہوم سے بیگانہ محض ہوتا۔ یہ تینوں نر ہیں حقیقت یہ ہے کہ غالب جیسا نر شاعر اردو شاعری تو کیا دنیا کی کسی زبان نے پیدا ہی نہیں کیا، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا اچھا بھی بُرا بھی، لیکن جس پامردی کے ساتھ رشید صاحب نے سرسید احمد خاں اور مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے لیے اپنے قلب و ذہن، قلم اور تحریر کو استعمال کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ ان کے نر ہونے کا یہی ثبوت ہے کہ اصل ایمان وفاداری بر شرط استواری ہوتا ہے۔ میں تو رشید صاحب کی نثر کو غالب کی نثر کے بعد سب سے اچھی نثر سمجھتا ہوں۔

نقوش پر بھی ہر طرح کا وقت آیا لیکن جس استقامت کے ساتھ طفیل صاحب نے اسے جاری رکھا اور ہر شمارے کو خاص شمارہ بنا دیا۔ یہ کام ایک نر ہی کر سکتا تھا کہ حریف مئے مردافگن

شق ہونا ہرایک کو نصیب نہیں۔ اردو رسائل کے جو ایڈیٹر گزرے ہیں یا خود موجود ہیں ان میں سے اکثر مصلحت یا تنگ نظری کا شکار رہے ہیں۔ طفیل صاحب نے نقوش کا ایک معیار تعین کیا۔ اس بلندی سے یہ کبھی نیچے نہیں اُترتے، ایک راستہ ایک منزل، ایک طریق فکر ایک طرزِ استدلال جو خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہے۔

ان حضرت کو نقوش سے کس درجہ عشق ہے اس کی ایک مثال ملاحظہ کیجیے: میں لاہور جاؤں تو قیام انہی کے یہاں ہوتا ہے۔ میں جاتے ہی یہ اعلان کرتا ہوں کہ میں فلاں ٹرین سے واپس جاؤں گا لیکن طفیل مجھے کبھی اس ٹرین سے نہیں آنے دیتے۔ ایک مرتبہ یہ ہوا کہ صبح سے شام اور شام سے رات ہوگئی طفیل صاحب نے بول کر نہ دیا۔ جب رات کے دو بج گئے تو رام پور سے آمدہ ایک پوسٹ کارڈ میرے سامنے رکھ دیا۔ ایک خود ساختہ ماہر غالبیات نے لکھا تھا کہ اگر نو دریافت دیوانِ غالب شائع کرنا چاہتے ہو تو فلاں حکیم صاحب کے پاس شرائط نامہ ہے اسے پڑھ لو۔

ہم دونوں رام پوری حکیم صاحب کے پاس شرائط نامہ پڑھنے پہنچے۔ بڑے میاں نے کاغذ ہمارے ہاتھ میں نہ دیا، دور سے پڑھا۔ میرا خیال ہے کہ جو سرمایہ کسی بھی شکل میں اس زمانے میں تھا یا آج ہے وہ اگر سارا بھی دے دیتے تو شرائط پوری نہیں ہوسکتی تھیں۔ یہ حضرت اس بات پر آمادہ تھے کہ سب کچھ فروخت کر دیا جائے اور نقوش کا انتہائی شاندار اور دیدہ زیب غالب نمبر چھاپ دیا جائے۔ میں نے کہا:

"ہم ایک آزاد ملک کے آزاد شہری ہیں۔ ہمیں کسی شرائط نامہ کی ضرورت نہیں۔ اگر غالب کے نام بیاض غالب کا ترکہ چھوڑ جاتے تو اور بات تھی۔"

خدا نے ایسا سامان پیدا کر دیا کہ نو دریافت کلام غالب کا فوٹو اسٹیٹ ہاتھ آگیا۔ برصغیر میں ہم دونوں کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا کہ نقوش میں "بیاض غالب بہ خط غالب" شائع ہو رہی ہے۔ میں نے کہا۔

"طفیل بھائی! اس بیاض کو کتابی شکل میں کیوں نہیں چھاپ دیتے؟

بڑی متانت اور سنجیدگی سے بولے" لطیف صاحب، اگر اللہ تعالیٰ مجھ پر قرآن نازل

فرماتا تو میں اسے بھی نقوش میں چھاپتا۔" یہ ہے نقوش سے عشق کا حال۔
نقوش غالب نمبر ایک جس کے بارے میں مالک رام صاحب نے دہلی سے لکھا تھا کہ "ہندوستان نے لاکھوں روپیہ غالب صدی پر صرف کیا مگر نقوش جیسا غالب نمبر شائع نہیں ہو سکا۔" بیاض غالب دریافت ہوئی ہندوستان میں لیکن اسے پہلے شائع کیا طفیل صاحب نے۔ انہی دو باتوں سے ان کی شخصیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، بعد میں ہندوستان میں بیاض چھپی لیکن قیمت تین سو روپے تھی۔ نقوش میں بیاض کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تھا اس کی قیمت صرف تیس روپے تھی۔ تجارت اور خدمت میں فرق تو ہونا ہی چاہیے تھا۔ ہندوستان اور پاکستان میں دیگر رسایل نے بھی غالب نمبر شائع کیے ہیں مگر مولوی مدن کی سی بات کہیں نہیں پائی جاتی، ایسی ہی باتیں طفیل صاحب کی سیرت کو اُجاگر کرتی ہیں۔ غالب پر جو کچھ شائع ہو میں یہ سمجھتا ہوں کہ لکھنے والے نے مجھ پر احسان کیا۔ نقوش کے غالب نمبرون پاکر جو خوشی میں نے محسوس کی اس کے اظہار کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ ان غالب نمبروں کو اولیت اور اہمیت اس لیے دیتا ہوں کہ اول تو معاملہ غالب سے عشق کا ہے دوم یہ کہ جن حضرات نے غالب صدی پر چھپنے والے رسائل کے غالب نمبر پڑھے ہیں وہ گواہی دیں گے کہ نقوش ہی کا پلڑہ بھاری ہے۔
طفیل صاحب اور نقوش دونوں نے بڑے حاسد پیدا کیے ہیں۔ حاسدوں کو جہان میں راحت نہیں ہوتی اور جب تک جان میں جان ہے رنج حسد رہتا ہی ہے۔ لیکن حاسدوں کے لیے شاید ہی کبھی انھوں نے زبان سے ناشائستہ لفظ ادا کیا ہو۔ ایک مہذب اور معقول انسان کا لہجہ نہ اشتعال انگیز ہو سکتا ہے اور نہ ہی وہ شائستگی کو ہاتھ سے جانے دیتا ہے۔
اکثر لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ طفیل صاحب خطوط کا جواب نہیں دیتے۔ اول تو ہر خط اس قابل ہوتا کہاں ہے کہ اس کا جواب دیا جائے، وہ یہ کہ لکھنے والا بھول جاتا ہے کہ اگر ایک رسالہ کا ایڈیٹر اسلوب، الفاظ اور آواز کو نہیں پہچانتا تو وہ ایڈیٹر کیا ہوا۔ کچھ لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ ان کی تحریر نقوش میں نہیں چھپتی، ایسے لوگ نہیں جانتے کہ ادبی لطائف، موضوع و نفس مضمون، تحریر کی شستگی اور پاکیزگی اور اس کے کلاسیکی حسن کو طفیل صاحب ایک نگاہ ڈال کر جان لیتے ہیں، اس کے مرتبے کو پہچان لیتے ہیں۔ وہ ہر تحریر کو دو مرتبہ ضرور پڑھتے ہیں

انہماک کی ایک صورت وہ ہوتی ہے جب ٹی۔وی پر کرکٹ ٹیسٹ میچ دکھایا جا رہا یا ریڈیو پر کمنٹری نشر ہو رہی ہو۔ جب پاکستانی ٹیم کھیل رہی ہو تو ان کا چہرہ گلنار ہو جاتا ہے۔ انھیں کرکٹ کی ہر اصطلاح کا علم ہے۔ ظہیر عباس بیک فٹ پر اسکوائر کٹ اور ماجد خاں کور ڈرائیو پر لاجواب شاٹ کھیلتے ہیں۔ جاوید (میاں داد اس کے والد مرحوم کا نام ہے) پوائنٹ پر بہترین کھیلتے لیکن آؤٹ بھی وہیں ہوتے ہیں۔ عمران خان کے سٹرائڈز دیکھ کر اس کی گیند کی تیزی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مڈ آن، مڈ آف، ڈیپ فائن لیگ، ان سوئنگ اور آؤٹ سوئنگ، لیٹ کٹ، آؤٹ سائڈ دی لیگ اسٹمپ، غرض ہر اصطلاح کا ذکر اس خوبی سے کریں گے کہ سننے والا حیران ہو جاتا ہے۔ کرکٹ کمنٹری سنتے ہوئے یا ٹی وی پر میچ دیکھتے ہوئے یہ کسی کی دخل در معقولات برداشت نہیں کر پاتے۔ گھر پر ہوں تو ایسے مواقع پر کمرے میں بند ہو جاتے ہیں۔ بھابی جان یا بہوئیں چائے بنا کر لا دیں تو احساسِ شکر گزاری سے ان کے چہرے پر شفق پھوٹ پڑتی ہے۔ ایک روزہ میچ ہو تو پھر ان کی بھنویں اور زیادہ کھنچ جاتی ہیں، یہ تن کر بیٹھ جاتے ہیں، پیشانی پر شکنیں پڑ جاتی ہیں اور خون کا دوران بڑھ جاتا ہے۔ مدِ مقابل اگر اچھا کھیل رہا ہو تو اسے بھی داد دیں گے۔ ان کا خیال ہے کہ کھیل خواہ کوئی کھیلے اس سے لطف اندوز ہونا چاہیے۔

جب کوئی صاحب دفتر میں داخل ہوتے ہیں تو یہ پوچھیں گے "چائے؟" موسم گرما ہو تب بھی کہیں گے "چائے؟" جواب خواہ کچھ ہو دوسرے کے لیے کولڈ اور اپنے لیے چائے منگالیں گے۔ بات دراصل یہ ہے کہ چائے بہت پیتے ہیں، اچھی بری کی قید نہیں۔ جب مل جائے اور جہاں مل جائے چائے نہیں چھوڑیں گے۔ جب دفتر کی اوپر والی منزل میں قیام تھا بھابی جان اس وقت ضرور یاد دلاتیں جب یہ زینے سے اترتے "نسی بجا رہی جائیں بینی چے" وہ دو چار مرتبہ چائے بنا کر بھیج دیتیں لیکن یہ "بجار" کی چار پٹے بغیر باز نہ آتے۔

ڈاکٹر سلیم اختر بتاتے ہیں کہ اکثر ادیبوں کا یہ خیال ہے کہ یہ طفیل صاحب ہوٹلوں میں نہیں جاتے اور عصر جدید کے ادبا و شعرا کے ساتھ وقت نہیں گزارتے وہ اس لیے کہ یہ روپیہ خرچ نہیں کرنا چاہتے۔ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ایک مرتبہ ہم دونوں

ایک اُس وقت جب وہ نقوش میں اشاعت کے لیے منتخب کرلی جائے، دوسری بار اس وقت جب کتابت ہو جائے۔ انتشار اور بدنظمی ادب میں ہو یا کسی اور شعبہ میں انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ ایسے بدمذاق لوگوں سے کٹ کر بقول منٹو وہ "باجو کی گلی" میں مڑ جاتے تاکہ بداخلاقی اور بدمذاقی کے چھینٹوں سے خود کو بچا سکیں۔

یہ جب گڑھی شاہو میں رہتے تھے تو صبح ہی چل پڑتے۔ تانگہ میں سوار ہوتے اور نقوش کے دفتر میں آبیٹھتے۔ سوائے ضروری کام کے ہرگز دفتر نہ چھوڑتے۔ دفتر اس انداز سے ترتیب دیا گیا ہے کہ منہ ان کا مغرب کی جانب رہتا ہے، کعبہ کی طرف پیٹھ نہیں کرنا چاہتے۔ سیدھے ہاتھ پر ایک دقیانوسی کا بک ہے جس میں نہ جانے کب کب کے مسودات، کتابت شدہ اور غیر کتابت شدہ بھرے پڑے ہیں۔ جنوب میں آنے والے رسایل اور کتب کے ڈھیر پڑے رہتے ہیں اور اکثر ادیب اس ڈھیر میں سے اپنی پسند کی کتاب یا رسالہ اٹھا لیتے ہیں اور وہ ٹک ٹک دیکھتے رہتے ہیں، کچھ نہیں کہہ پاتے۔ خود میں نے اس ڈھیر سے کتابیں اٹھالی ہیں۔ ان کی پشت پر شرق ہے وہاں بھی اخبارات و رسایل جمع رہتے ہیں۔ ان کے سامنے ایک میز پر خطوط، مضامین، نظمیں، غزلیں اور مقالات کے علاوہ خدا جانے کیا کیا جمع رہتا ہے۔ اس میز کو میں نے کبھی سلیقہ سے سجا ہوا نہ پایا مگر کمال یہ ہے کہ جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے یہ کابک یا میز سے نکال لیتے ہیں دوسرا شخص خواہ کتنا ہی تلاش کرے اسے مطلوبہ چیز نہ ملے گی۔ کمرہ تاریک ہے، روشن دان تک نہیں آتے ہی بلب روشن کریں گے اور کرسی پر بیٹھتے ہی ویسٹ پیپر باسکٹ میں تھوکنا شروع کردیں گے اور یہ عمل دن بھر جاری رہے گا۔ ہر آنے جانے والے کو دیکھتے رہیں گے جیسے جین آسٹن دیکھتی تھی۔ خطوط اور خاکے اسی دفتر میں بیٹھ کر لکھے گئے ہیں۔ میرزا ادیب آگئے تو ان سے ڈراموں پر گفتگو ہو رہی ہے، اسلم کمال آگئے تو جدید مصوری پر تبادلۂ خیال ہو رہا ہے، پریس کا مشین مین آگیا "باؤجی" تو باؤجی اسے بھی جواب دے رہے ہیں۔ کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ کتنے ہی لوگ جمع ہو جاتے ہیں یہ ہر ایک سے اس طرح باتیں کریں گے کہ موجود ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ مخاطب وہی تھا۔ ناک پر عینک رکھے یہ لکھتے بھی رہیں گے کوئی جانے لگے گا تو کھڑے ہوکر ہاتھ بھی ملائیں گے اور پھر لکھنے لگیں گے۔

مجنوں گورکھپوری صاحب سے ملنے گئے۔ دوران گفتگو مجنوں صاحب نے فرمایا "میں ہندوستان سے بیک بینی و یک بیوی آیا تھا، لاہور میں اگر طفیل نے میری جیب میں پانچ سو روپے دھونس دیئے ہوتے تو میں کراچی نہیں پہنچ سکتا تھا" یہ سنتے جاتے ہیں اور شرما رہے ہیں۔ فوراً بات کا رخ موڑنا چاہا لیکن مجنوں صاحب کو کون روک سکتا تھا "میں نے سوچا تھا نقوش کے لیے لکھتا رہوں گا لیکن میری بدتوفیقی کہ اب تک کچھ نہیں لکھ سکا ہوں" طفیل چند لمحوں کے بعد اُٹھ کھڑے ہوئے "پھر حاضر ہوں گے ایک ضروری کام یاد آگیا ہے"

ایک روز ہم دونوں نقوش کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ ایک صاحب آئے۔ بدن پر چیتھڑے آنکھیں چڑھی ہوئیں، ہاتھ پاؤں پر میل، ٹانگوں پر غلاظت لتھڑی ہوئی "آئیے آئیے ساغر صاحب!" ہاتھ ملاتے ہوئے ان کے ہاتھ میں کچھ نوٹ تھما رہے تھے۔ میں نے پہلی اور آخری بار ساغر صدیقی کو دیکھا تھا۔ طفیل صاحب کہنے لگے "شراب کی طلب ہو تو آجاتے ہیں۔ کلال نہ ان کے مرتبہ سے واقف ہیں نہ منٹو کی عظمت سے آشنا تھے۔ خدمت تو کرنی ہی پڑتی ہے"

طفیل صاحب کے ایک استاد ہیں۔ انھیں بھی میں نے نقوش کے دفتر ہی میں دیکھا مجھے تو یوں محسوس ہوا جیسے منٹو کا کردار ایشر سنگھ سامنے کھڑا ہو" ایوب خاں دی بڑ بڑ نہ جانے کیا کہتے تھے۔ طفیل اپنے استاد کے سامنے مودب بیٹھتے ہیں اور خدا جانے کب سے ان کی ہی نہیں ان کے سارے گھر کی ضرورت کا خیال کرتے ہیں۔

بمبئی سے عصمت چغتائی آئیں۔ میں ٹیلیفون سے کہہ رہا تھا "آپ جلد آئیے"

"ارے بھائی کیسے آؤں۔ کسی پبلشر سے کہو کہ میری کتابیں بغیر اجازت چھاپتے رہتے ہو۔ کچھ رقم دلواؤ تو لاہور اور اسلام تک ہو آؤں"

مجھے معلوم ہے کہ پبلشر دلی کا ہو یا لاہور کا، کراچی کا ہو یا بمبئی کا، علی گڑھ کا ہو یا راولپنڈی کا اسے تو صرف روپیہ چاہیے۔ میں نے ٹیلی فون پر طفیل صاحب کو ساری گفتگو سنا دی۔ کہنے لگے "یار ــــــــ عصمت آپا سے کہو ایک بار کسی طرح لاہور آجائیں

سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

عصمت آپا لاہور پہنچ گئیں۔ چند روز قیام کرنے کے بعد وہ اسلام آباد روانہ ہوئیں تو پورا قافلہ ساتھ تھا۔ کراچی سے عصمت آپا کے ہمراہ مدحت (عظیم بیگ چغتائی کی بڑی صاحبزادی) ڈاکٹر عطیہ (جنہوں نے تیرہ یا چودہ سال کی عمر میں سب سے پہلے سوتے سے اٹھ کر لحاف سنا تھا) کچھ بچے اور میں۔ سب ریل کار میں سوار تھے۔ واپسی ہوائی جہاز سے ہوئی اور سب خرچ طفیل صاحب نے برداشت کیا۔ عصمت آپا نے لکھا ہے "طفیل نے میرا ٹکٹ بھی بھیجا اور بچوں کے لیے تحفے بھی دیئے۔ چودھری صاحب نے میری اتنی کتابیں چھاپیں اور چھاپ رہے ہیں مجھ سے ملنے بھی نہ آئے۔"

میں نے اپنے پس انداز کیے ہوئے روپے سے رقم حاصل کی جو اجازت نامہ ملا اس میں میرے اندازے سے رقم کم تھی۔ شام کو کھانے کے بعد پوچھنے لگے "مولانا! کیا بات ہے؟" صورت حال بتلائی چپ ہو رہے۔ دوسرے دن صبح اپنے بیٹے پرویز سے کہنے لگے "پتر بیلرن روڈ چلنا ہے۔" میں بھی ساتھ تھا۔ بنک سے دس ہزار روپیہ نکلوایا" یار ـــــ یہ لیتے جانا۔" میں نے کل رقم بنک میں جمع کرادی اور ٹھیک ایک ہفتہ کے بعد زکوٰۃ کاٹ لی گئی۔ میں نے طفیل صاحب کی رقم واپس بھیج دی لیکن اس دور میں دوست کی یا کسی اور کی ضرورت کا خیال کرنے والے کتنے ہیں؟ ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے ان کی کشادہ قلبی اور فیاضی کا اندازہ ہوتا ہے۔

حرص و آز انھیں چھو کر نہیں گزرے۔ میں ایسے بے شمار واقعات سے واقف ہوں جو ان کے صاحبِ دل اور صاحبِ نظر ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ہندوستان سے ایک ماہر غالبیات . . . . تو اسی مار پر آتے ہیں کہ کس طرح نقد اور کتابوں کی شکل میں ان سے وصول کیا جائے۔ وہاں سے سرکاری طور پر بھیجے جائیں اور یہاں سرکاری طور پر اعلیٰ درجہ کے ہوٹل میں قیام ہو تب بھی وہ بستر اٹھا کر طفیل صاحب کے گھر پہنچ جاتے ہیں کہ ہوائی سفر کے لیے روپے اور کتب اسی در سے ملتی ہیں۔ ایسے فریب جو دیدہ و دانستہ کھائے جاتے ہیں ان میں سے ایک ہے۔ یہ بات نہیں کہ یہ جانتے نہ ہوں، سمجھتے نہ ہوں۔ سب کچھ جانتے ہیں، سب کچھ سمجھتے ہیں لیکن کیا مجال جو گفتگو یا تحریر میں تلخی یا شوریدگی آجائے۔ ہرگز بدمزہ نہ

ہوں گے بلکہ مسکراتے رہیں گے اور خندہ روی سے پیش آئیں گے، ان کی خوش طبعی میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ اپنی بذلہ سنجی کو برقرار رکھیں گے اور انسانی کمزوری کو درگزر کریں گے اور قابلِ عفو گردانیں گے۔ مالی نقصان برداشت کریں گے لیکن خوش گفتاری میں فرق نہ آنے دیں گے۔ دوسرے شخص کی حرص جوں جوں بڑھتی جائے گی ان کے لہجہ کی نرمی اور مزاج کی معصومیت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ یہی سبب ہے کہ میں طفیل کی خوبیوں پر جان دیتا ہوں۔ ان کے عیوب سے واقف نہیں۔ رہی انسانی کمزوریوں کی بات، وہ کس میں نہیں ہوتیں۔ لیکن ایسی کمزوریاں جن سے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچا نہ قلم سے نہ زبان سے نہ تحریر سے۔ ان کی حمایت یا مخالفت میں خواہ کچھ کہا جائے یہ کسی قیمت پر اصابتِ رائے کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے، کبھی ہوش مندی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے گا۔ یہی ان کی شخصیت کی بڑائی ہے۔

یہ درست ہے کہ ہر تحریر نقوش میں نہیں چھپ سکتی۔ میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جن کے دل میں یہ خواہش برسوں سے موجود ہے کہ ان کی تحریر نقوش میں جگہ پا جائے اور بعض اس غم میں گھلے جاتے ہیں کہ ان کی تصویر نقوش کے ٹائٹل پر کیوں نہیں چھپتی۔ اور پھر حاسدوں کا حلقہ بڑھتا چلا جاتا ہے لیکن طفیل صاحب نظر انھیں ادبی بددیانتی نہیں کرنے دیتی۔ ناقص اور نارسا تحریر نقوش میں جگہ نہیں پا سکتی۔ ادب کے نام پر لانا نیت، اخلاقی پستی، تنگ نظری، کھوکھلی اور نمائشی روایت، تعصب اور مصلحت آمیزی کا گزر نقوش میں نہیں ہو سکتا۔

جب نقوش کا کوئی شمارہ چھپتا ہے تو یہ حضرت بٹن بانٹنے بیٹھ جاتے ہیں۔ جب بیاضِ غالب بخطِ غالب کا نقوش نمبر آیا تو تقسیم اور بٹن کا دائرہ اور پھیل گیا۔ میں ایک دن نقوش کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے کہا "جی" طفیل صاحب ٹیلیفون پر ریسیور اٹھاتے ہی دو حرفی لفظ کہتے ہیں "طفیل جی۔ وڈا زور دار نمبر کڈھیا جے۔ اس واری دو بھیجیں" میں لفول غلو جل کر کباب ہو گیا لیکن ان حضرت نے دو نسخے فوراً بھیج دیے۔ ہندوستان سے ایک ماہر غالبیات.......... آئے تو کئی سو نسخے لے گئے اور وہاں جا کر تین سو روپے

فی نسخہ کے حساب سے فروخت کیے۔ طفیل صاحب نے تین سو نسخے ہندوستان کے ادبا، شعرا اور دانشوروں کے لیے بھیجے تھے جنھیں بعض ادیبوں ...... نے فروخت کر دیا۔ حالانکہ اس کی قیمت صرف تیس روپے تھی۔ خود میں نے بیاض غالب والے نقوش نمبر کو بہت سے حضرات کو بیس بائیس روپے میں دلوایا تھا۔ میں جھلا گیا اور شکایت کی کہ " آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟"

" یار تم غصہ نہ کرو۔ لوگ پڑھیں گے۔ غالب شناسی کا دائرہ وسیع ہوگا۔ نہ پڑھیں گے تو ڈرائنگ روم میں سجائیں گے۔ پھر بھی غالب اور نقوش کا نام بلند ہوگا۔" اسی کو بلند نفسی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ خلوص، حقیقی لگن اور شدید جذبہ کی یہی وہ روشن اور تابناک صداقت ہے جو ان کو عام ایڈیٹروں سے ممتاز و محترم بناتی ہے۔

محکمۂ تعلیم کے ایک ڈائرکٹر ایک دن میرے گھر آگئے اور حکم صادر فرمایا کہ نقوش کا وہ شمارہ لاؤ جس میں غالب کا دیوان شائع ہوا ہے۔ میں نے طفیل صاحب کو ٹیلی فون کیا پھر خط لکھا۔ جواب آیا کہ " غالب نمبر ۲ ختم ہو چکا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے کسی سے لوں گا اور واپس نہ کروں گا تمہاری خاطر یہ بھی گوارا کر لوں گا۔" میں نے ڈائرکٹر صاحب سے تو کچھ نہ کہا لیکن شکر و سپاس کا درجہ جو طفیل صاحب کے لیے میرے دل میں تھا، اپنی محدود بصیرت کے باوجود کہیں بلند ہوگیا۔

کسی شخص کے ذوق و ذہن کا اندازہ اس کے دسترخوان سے بھی ہوتا ہے۔ ہندوستان سے جیلانی بانو آئیں یا رام لعل، عصمت چغتائی آئیں یا ڈاکٹر محمد حسن یہ ممکن ہی نہیں کہ طفیل صاحب مدعو نہ کریں۔ کراچی اور لاہور کے ادبا و شعرا ہی نہیں ملک بھر کے ادیب و شاعر آتے رہتے ہیں۔ ایک روز نیٹ ہاؤس سے مسعود اشعر کے ہمراہ میں بھی اٹھا مسعود صاحب کہنے لگے " فاصلہ زیادہ ہے ہم آپ کو طفیل صاحب کے ہاں چھوڑ آتیں۔"

یوسف کامران صاحب نے کار اسٹارٹ کی اور " کشور حسین" کا ذکر کرتے ہوئے جب مسلم ٹاؤن پہنچے تو یوسف کامران گویا ہوتے " اچھا! تو یہ ہے طفیل محل" ڈرائنگ روم میں بیٹھے۔ نہ طفیل صاحب گھر پر تھے نہ بھابی جان۔ بڑی بہو زاہدہ خانم نے فوراً چائے کا اہتمام کیا اس سے قبل آم پیش کیے۔ صابر لودی اور فرخندہ لودی نے آموں کو درخور اعتنا نہ سمجھا کہ آم کھانے کے لیے بھی ذوق و ظرف کی ضرورت ہوتی ہے۔ مسعود اشعر اور یوسف کامران صاحب

نے آموں کے ساتھ انصاف کیا۔ دونوں صاحب ذوق ثابت ہوئے۔ چائے کی طرف توجہ دی۔ کامران صاحب نے جاتے ہوئے فرمایا "طفیل صاحب سے میرا سلام کہیے گا اور یہ بھی کہ بھائی آم سردخانے میں رکھنے کی چیز نہیں اسے جس قدر جلد ممکن ہو تنورِ شکم میں منتقل ہو جانا چاہیے اگر وہ یہ کام نہ کرسکے تو یہ سردخا دمیں اٹھا کرلے جاؤں گا" میں نے دل میں کہا کہ طفیل صاحب کے دسترخوان کے کونے کا ایک مختصر ترین حصہ ہے۔ بھابی، بہوئیں زاہدہ ولشریٰ لذیذ کھانے پکاتی ہیں۔ طفیل صاحب ہر آنے والے کو کھلاتے اور خوش ہوتے ہیں۔ خود بھی اچھا کھاتے ہیں اور اپنی ہومیوپیتھی کے علم کے بل بوتے پر ہر طرح کی بدپرہیزی کرتے ہیں۔

میرے ایک دوست نذیر احمد صاحب ہیں۔ کبھی انگریزی زبان کے بہت اچھے استاد اور اردو افسانے کے بہت اچھے ناقد تھے اب مرکزی سرکار کے بڑے افسر ہیں ادب منصب و مرتبے کے بھاری بوجھ کے نیچے کچل گئے۔ خدا جانے کیا مرض تھا کہ دنیا بھر کا علاج کرالیا، ٹھیک ہی نہ ہوتے تھے۔ طفیل بھائی کے ہم جماعت اور دوست محمود عالم قریشی صاحب بھی ہومیوپیتھی کے ماہر ہیں۔ ایک صاحب اور تھے ان کا نام میرے ذہن میں نہیں ہے، تینوں ماہرین کا بورڈ بیٹھا تشخیص ہوئی، طفیل صاحب نے دوا تجویز کی۔ تیسرے دن نذیر صاحب کا پیٹ تین انچ کم ہوگیا، شانے جو پتھر کی طرح سخت اور سُن تھے ٹھیک ہوگئے۔ طفیل صاحب نے بتایا کہ نذیر صاحب کا کیس بہت ہی ہوپلس ہوگیا تھا۔

گڑھی شاہو میں رہتے تھے تو ایک شخص کا علاج کیا جس کے تمام جسم سے پانی ٹپکتا تھا وہ امراضِ خبیثہ کا شکار تھا۔ دورانِ علاج وہ پھر اس گلی میں چلا گیا جہاں ایسے امراض پرورش پاتے تھے۔ یہ ناراض ہوگئے اور علاج کرنے سے انکار کردیا لیکن جب اس کی جان پر آ بنی اور اس کی غربت نے اس قابل نہ چھوڑا کہ وہ دوا اور غذا خرید سکے تو یہ اس کے جسم پر پھائے رکھتے اور دوا کھلاتے رہے حتیٰ کہ وہ صحت یاب ہوگیا۔

گڑھی شاہو والے مکان میں ایک شب میری داڑھ میں شدید درد اٹھا۔ میں کراہنے لگا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ طفیل صاحب کو تکلیف ہو۔ کراہنے کی آواز سن کر خود آگئے ہومیوپیتھی کی چند گولیاں پانی میں حل کرکے کلیاں کرائیں اور درد غائب ہوگیا۔

اس سلسلے کی ایک بات اور سن لیجیے۔ جمیلہ ہاشمی کے شوہر کا انتقال لندن میں ہوا تدفین بہاول پور کے قریب کسی خانقاہ میں ہونی تھی۔ خبر ملتے ہی دو کاریں لاہور سے روانہ ہوئیں۔ ایک میں خواتین دوسری کار میں طفیل صاحب اور مرحوم کے ہم زلف۔ خواتین جیسے کہ ان کا قاعدہ ہے آگے نکل گئیں۔ ملتان سے دس میل کے فاصلہ پر طفیل صاحب کی کار ڈرائیور اونگھ گیا۔ آنکھ کھلی تو موت یقینی نظر آئی۔ بھلا آدمی تھا اور سمجھدار، طفیل صاحب آگے کی سیٹ پر تھے۔ ڈرائیور نے خود کو بچانے کے لیے طفیل صاحب کو اس درخت کے سامنے کر دیا جس سے ٹکرا کر کار چکنا چور ہو گئی۔ ڈرائیور نے تو اردو ادب کو نقصان پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا رکھی تھی مگر جسے خدا رکھے۔

ایک ٹرک ڈرائیور نے انھیں نشتر اسپتال ملتان میں پہنچا دیا اور وہی مجھے اطلاع دینے آیا۔ میں جب پہنچا تو جنرل وارڈ میں اس طرح بیٹھے تھے کہ پٹی پیشانی سے گزر کر سر کے پچھلے حصہ کو چھپاتی ہوئی سر کے درمیانی حصہ سے گزر کر ٹھوڑی کو ڈھانپ رہی تھی۔ کپڑے خون میں لت پت تھے۔ سب سے پہلی بات جو انھوں نے کہی وہ یہ تھی "یار! میں انجکشن کسی قیمت پر نہیں لگواؤں گا اور ہاں تم جلدی سے نکس وامی کا تھرٹی لا دو اور ڈاکٹروں سے ہرگز اس کا ذکر نہ کرنا۔" جب تک اسپتال میں رہے نہ انجکشن لگوایا اور نہ ہومیو پیتھی کی دوا چھوڑی۔ جبھی تو میں کہتا ہوں کہ یہ صاحب عزم و ہمت ہیں اور اپنے مشاہدہ اور تجربہ کی اہمیت سے بخوبی واقف۔

میں نے دو بار طفیل صاحب کو غصہ ہوتے بھی دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ بھابی جان نے ان کے چھوٹے بھائی ملک اکرم کے لیے کچھ کہہ دیا۔ انھیں غصہ آ گیا اور یہ بے باک صداقت کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکے۔ دوسری مرتبہ غصہ اس وقت آیا جب یہ مجھے اسٹیشن پر سی آف کرنے میرے ہمراہ ٹیکسی میں سوار تھے۔ ڈرائیور نے طویل راستہ اختیار کرنا چاہا، وقت تنگ ہو رہا تھا ورنہ شاید اسے کچھ نہ کہتے لیکن جب ٹرین کے روانہ ہو جانے کا خدشہ بہت بڑھ گیا تو یہ ڈرائیور پر برس پڑے۔ ایسے موقع پر لاہور میں جو زبان عام لوگ بولتے ہیں اس سے بھی واقف ہیں۔ اس تندی و تیزی کے عالم میں بھی تلخی و زہرناکی نہ تھی، دوسرا شخص ہوتا تو

بے قابو اور بے کیف ہو جاتا۔ نفرت ہو یا غصہ طفیل کبھی پست سطح پر نہیں اتریں گے ضبط و تحمل قدرت نے مزاج میں اس درجہ ودیعت کیا ہے کہ وہ ہر جگہ اور ہر مقام پر نرمی و ملائمت کے قائل ہیں۔

دو مواقع پر بہت گھبراتے ہیں، موصوف کو پسینہ آ جاتا ہے حلق خشک اور اکثر آواز گُندھ جاتی ہے۔ ایک موقع تو وہ ہے جب کوئی خاتون ملنے آ جائیں اور دوسرا موقع وہ جب کہیں برسرِ محفل تقریر کرنی پڑے یا تحریر سنانی پڑے۔

میں نقوش کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ طفیل، موجد صاحب کی مزاج پرسی کو گئے تھے۔ ایک خاتون گلبرگ سے تشریف لائیں اور طفیل صاحب کو نہ پاکر یہ کہہ کر چلی گئیں "پھر حاضر ہوں گی"۔ تھوڑی دیر کے بعد طفیل صاحب آ گئے جب میں نے بتلایا کہ ایک خاتون ملنے آئی تھیں تو یک لخت چہرہ کا رنگ متغیر ہوا "ہیں! کون خاتون! میں ابھی آیا" پھر جو گئے تو چار بجے ڈرتے ڈرتے لوٹے "یار! معاف کرنا، میں ضروری کام سے چلا گیا تھا۔ بھوک لگی ہو گی، پُتر پرویز فٹافٹ چرغے لے آ" کھانے کے دوران میں نے کہا "وہ کالی کلوٹی خاتون دو مرتبہ آ چکی ہیں"۔

"یار! کھانا کھا لینے دو، ورنہ میں پھر ضروری کام سے چلا جاؤں گا"۔

ایسی خواتین جو ادب کی آڑ میں ملنا چاہیں یہ ان سے کوسوں دور بھاگتے ہیں لیکن جو ادب تخلیق کرتی ہیں ان سے یہ گھنٹوں باتیں کر لیں گے۔ شکیلہ اختر ہوں یا اختر جمال، عصمت چغتائی ہوں یا ہاجرہ مسرور و خدیجہ مستور۔ یہ سب ہوں مگر ایسی خواتین نہ ہوں جنہیں دیکھنا اور ملنا تو درکنار ذکر سنتے ہی ضروری کام یاد آ جاتا ہے۔

طفیل صاحب نک چڑھے بھی ہیں۔ اپنی پہ آ جائیں تو کسی کو نہیں گردانتے لیکن ایسا ادبی زندگی میں دو بار ہی ہوا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے بڑے ناول نگار اور بڑی افسانہ نگار ہونے میں جو شبہ کرے وہ کافر۔ شنید یہ ہے کہ وہ بہت سنوب ہیں۔ ہوں گی۔ کوئی ایسا پیچ آ پڑا کہ مس حیدر اور طفیل دونوں اپنی اپنی جگہ اڑ گئے اور پھر یوں ہوا کہ قرۃ العین حیدر کے آنسو نکل پڑے۔ طفیل چونکہ مزاجاً صرف محبت اور خلوص کی زبان جانتے ہیں اور بات

کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ پریس حیدر سے بھی زیادہ نک چڑھے ہو گئے لیکن دونوں کو جلد احساس ہوا کہ "بات ایسی نہیں کہ تم سے کہیں" لہٰذا وہ رشتہ پھر استوار ہو گیا جس کی بنیاد ادب پر ہے۔

نومبر ۱۹۷۰ء میں گلڈ کے نئے سیکرٹری جنرل کا انتخاب ہونا تھا۔ ہم سب کراچی پہنچے ہوئے تھے۔ ایک دن ایک صاحب آ گئے۔ ان کا نام لطف اللہ خاں تھا۔ ان حضرت کو عجیب و غریب شوق تھا۔ انھوں نے اپنے گھر میں آوازوں کی لائبریری بنا رکھی ہے۔ میں نے اس سے قبل اور اس کے بعد کبھی دیکھا نہ سنا کہ آوازوں کی بھی لائبریری ہوتی ہے۔ وہ طفیل صاحب کی آواز ریکارڈ کرنا چاہتے تھے اور یہ آمادہ نہ ہوتے تھے۔ میں نے بہلایا پھسلایا اور ہم سین گپتا روڈ، کاسمو پولیٹن کالونی کراچی پہنچے۔ لطف اللہ صاحب کے صاحبزادے اپنے والد محترم ہی کے مرض میں گرفتار تھے۔ اسٹوڈیو میں کل چار افراد تھے، آلات اس قدر حساس کہ ہلکی سے ہلکی آواز کو بھی گرفت میں لے لیتے تھے۔ طفیل صاحب نے اپنا کوئی خاکہ پڑھنا شروع تو بلا مبالغہ سات مرتبہ پانی پیا۔

کسی بھی ادارہ کو چلانے کے لیے بڑے مضبوط اعصاب کی ضرورت ہے۔ چار آدمی یک جا ہوئے اور یونین بنی۔ فرائض کم سے کم تر ہوتے جاتے ہیں اور حقوق کا مطالبہ بڑھتا جاتا ہے۔ نقوش پریس میں بعض لوگ سال ہا سال سے کام کر رہے ہیں اور آج تک یہ نوبت نہیں آئی کہ پھالک پر بے حیائی اور ڈھٹائی سے کسی کو نعرہ زنی کرتے ہوئے دیکھا گیا ہو۔ اس میں انتظامی صلاحیت کا دخل اتنا نہیں ہے جتنا حسنِ سلوک کا۔

پریس میں قرآن مجید کے سیپارے چھپ رہے تھے۔ ایک کارکن روز سیپارے چراتا اور بازار میں فروخت کرتا تھا۔ یہ بات طفیل صاحب کے علم میں تھی۔ انھوں نے اس کی تنخواہ اور بڑھا دی وہ پھر بھی چوری سے باز نہ آیا لیکن یہ اسے الگ نہ کر سکے۔ الگ کر سکتے ہی نہ تھے لندن جو ایک شہر ہے دنیا میں انتخاب۔ کہ سیاست داں ہو یا ادیب، مورخ ہو یا مدرس، کارل مارکس ہوں یا سکندر مرزا۔ لندن سب کو جگہ دیتا ہے۔ طفیل صاحب بھی سیدھے لندن پہنچ گئے۔ جو اپنے ملک سے نکالا جاتا ہے وہ بھی اور جو از خود جائے وہ بھی۔ لندن سب کو پناہ دیتا ہے۔

طفیل صاحب کے بیٹے جاوید نے پریس کا چارج سنبھالا تو سیپارے چوری کرنے والے ہی کو نہیں مشین کے پرزے تبدیل کرنے والے سے لے کر کاغذ چرانے والے تک سب کو نکال باہر کھڑا کیا۔ لندن کسی کا کچھ بگاڑے تو بگاڑے اِن کا کیا بگاڑ سکتا تھا یہ جیسے گئے تھے ویسے ہی گھر لوٹ آئے۔ نہ سفرنامہ لکھا نہ بتان سیم تن کا حال سنایا۔ کوئی ایران میں اور کوئی اُندلس میں اجنبی ہوتا ہے یہ ہر جگہ اجنبی ہیں سوائے گھر کے۔

لندن سے آتے ہی پریس کا حال معلوم ہوئے تو سخت پریشان ہوئے اور اُداس بھی۔ پریس کے چوکیدار جعفری کو بلایا اور باری باری ہر کارکن کے گھر بھیجا " اے وے آ پریشانی پے ہوئے گا"

سب سے بڑے بیٹے فاروق کی شادی کی۔ بڑی دھوم دھام سے دعوتِ ولیمہ کا اہتمام کیا۔ ایک بھری تھیلا میرے سپرد کیا جو نوٹوں سے بھرا تھا " خوب خرچ کرو"۔ مجھے چاول کی کوالٹی پسند نہ تھی " یار! دوسری بوری خرید لو"۔ فوراً نئی بوریاں آگئیں۔ دولہا میاں کو سلامی مل رہی تھی " تم ہی وصول کرو، تم ہی لکھو"۔ حسما جالندھری صاحب نے سہرا لکھا " یار! تم پڑھو"۔

طفیل بھائی! فلاں صاحب کو دعوت نامہ بھیجا ہے؟"

" یار! تم سے دوستی اسی لیے تو ہے کہ یوں سوچتے ہو"۔

مجھے معلوم تھا کہ کسی زمانہ میں اُن صاحب سے ہر روز کا ملنا تھا۔ نقوش کے سلسلہ میں کوئی بات ہوئی اور بڑھ گئی تھی۔ یہ نک چڑھے ہونے کا دوسرا موقع تھا۔ صلح صفائی تو ہوئی لیکن آمدو رفت کم سے کم تر ہوتی گئی اور ملنا جلنا ترک ہو گیا۔ جن صاحب کا ذکر ہے وہ یو۔ پی کے پٹھان ہیں اُن کے اسلاف نے جہاں داری کی ہے اور اِنھوں نے جہاں بینی۔ انھیں دعوت میں شرکت کرنی ہی چاہیے تھی وہ شریک ہوئے۔ دونوں نے اپنی بڑائی کا ثبوت دیا۔

دوسرے دن صبح کو پلاؤ کی دیگ کے گرد ہم دونوں بیٹھے بوٹیاں چُن چُن کر کھا رہے تھے یہ ناشتہ وقفہ وقفہ سے دوپہر تک جاری رہا۔ کہنے لگے " یار! آپ کو ایک خاکہ سناتے ہیں، چھپا ہوا تو پڑھ ہی لیا ہوگا"۔ پانی پیتے جاتے اور خاکہ سنا رہے تھے۔ خاکہ ایک افسانہ نگار خاتون کے

بارے میں تھا۔ میں نے کہا" یہ تو اس سے بہت مختلف ہے جو چھپا ہے"۔

"ہاں ــــ ! بہن کا معاملہ ہے جس حد تک چھپ سکتا تھا وہ چھپ گیا۔ میں سوچتا ہوں تو اب بھی ناراض ہی ہوں گی"۔ معلوم ہوا کہ آبگینوں کو ٹھیس نہیں لگنے دیتے۔ نگاہ نیچی رکھ کر گفتگو کرنے والا انسان کسی بھی موقع پر نہ بے تکلف ہوتا ہے نہ بے محابا۔

ہمیشہ کرائے کے مکان میں رہے لیکن بھابی جان کی ہر خواہش کا احترام تو جیسے ایمان کا حصہ ہے۔ کہنے کو یار لوگ ان کے مکان کو "طفیل محل" کہتے ہیں لیکن نہیں جانتے کہ مکان کا بالائی حصہ اب بھی نامکمل ہے طفیل صاحب مقروض ہیں۔ جب میں پہلی مرتبہ نو تعمیر شدہ مکان پر پہنچا تو بولے "آپ نے ہماری بیگم صاحب کی حماقت ملاحظہ کر لی ؟"

ایک مرتبہ کراچی میں خریداری کو نکلے محمود عالم قریشی صاحب ساتھ تھے (محمود بھائی چور پکڑنے کے ماہر ہیں) محمود بھائی ہم دونوں کو صدر بازار کراچی لے گئے اور ایک دلّی والے کی دوکان پر جا بٹھایا جو تاجر دلّی سے آئے تھے ان کی نسل جوان ہو رہی تھی۔ کراچی کی آب ہوا بارسی حسن کی کارفرمائی اور گوانیز نوخیز لڑکیوں کی عشوہ زائی کی دید اور قرب نے دلّی والوں لی نئی نسل کو کپڑے کی فروخت کے نئے انداز سکھائے تھے۔ دوکان پر کئی ملازم تھے جب کوئی چھے ڈیزائن کا کپڑا آتا تو ایک لڑکا انداز دلبری سے کپڑے کو اپنے گرد یوں لپیٹتا جیسے کسی ؛منی نے ساڑھی باندھ رکھی ہو۔ طفیل صاحب صرف ایک بار تو متحمل ہوئے کہ اس عالم میں س پر نگاہ ڈالیں "التفات اِن کی نگاہوں نے دوبارہ نہ کیا"۔ بھابی جان کے لیے اتنا کپڑا ریدا کہ میں حیران رہ گیا۔

شام کو جب یہ گھر پہنچتے ہیں تو فاروق کے بچے دروازے ہی پر گھیر لیتے ہیں بندیار تابندہ) مت اور فرخندہ اتنی تیز، شوخ اور طرار ہیں کہ ان تینوں بچیوں نے اپنے باپ فاروق کی وئی اور کم سخنی کا بدلہ سارے خاندان سے لے لیا ہے۔ کوئی اِس جیب پر لٹکی جاتی ہے کوئی ا پر۔ تیسری پوتی پتلون کھینچ رہی ہے اور پوتا قادر روٹھ کر زمین پر لوٹ گیا۔ یہ اسے نے اور گود میں اٹھانے کو فرش پر بیٹھ گئے اب کوئی کندھے پر سوار ہو رہا ہے کوئی پھلوں کا لانے بھاگا۔ دادی چلا رہی ہیں مگر دادا جان ہنس رہے ہیں۔

کپڑے تبدیل کر کے سلیپر مل گئے تو خیر ورنہ ننگے پاؤں گھر میں گھومتے پھریں گے۔ عام طور پہ شلوار کرتا پہنتے ہیں۔ کھانا کھا کر ہال میں ٹہلیں گے۔ ساری عمر ہو گئی گھر سے باہر ٹہلنے کبھی نہیں گئے ٹیلی ویژن پر کوئی اچھا ڈراما ہوا تو دیکھ لیں گے ورنہ کمرے میں جا کر لیٹ جائیں گے۔ ان کا خیال ہے کہ ہر کتاب کتاب نہیں ہوتی۔ چنانچہ گھر کے کتب خانے میں جو پہنچ گئی وہ کتاب ہے ورنہ دفتر کے ڈھیر میں سے جس کا جی چاہتا ہے اٹھا لیتا ہے۔ غالب لائبریری والے مرزا ظفر الحسن صاحب اسی لیے تو طفیل سے ناراض ہیں کہ وہ اس ڈھیر کو غالب لائبریری میں کیوں نہیں بھیج دیتے۔ طفیل صاحب کا کہنا یہ ہے کہ غالب سے منسوب جو ادارہ ہے اس میں کتابیں ہونی چاہئیں، ڈھیر تو ہر جگہ ملتے ہیں۔ دراصل یہ مزاج کا فرق ہے۔ یہ ذہن و فکر اور توضیح و تشریح کا فرق ہے یہ انداز اور اسلوب کا فرق ہے۔

سونے سے قبل کوئی کتاب مطالعہ کے لیے اٹھالیں گے۔ ان کا دلچسپ ترین مشغلہ لغت پڑھنا ہے۔ میں نے ایک دن پوچھ ہی لیا "آپ لغت کیسے اور کیوں پڑھتے ہیں؟"

"ہر لفظ ایک اکائی ہے اس کے معنی و مفہوم کو سمجھانے کے لیے مترادفات دیئے جاتے ہیں میں ہر لفظ میں ایک تصویر دیکھتا ہوں۔ صرف ایک اور مکمل تصویر لیکن جب دیے ہوئے معنی و مفاہیم کو پڑھتا ہوں تو اس تصویر کے مختلف زاویے بھی سامنے آتے ہیں۔ تصویر ایک مگر اس کے رخ کئی ہوتے ہیں۔"

ایک شب کہنے لگے "یار! آج جلدی سو جاؤ، صبح چہل قدمی کو چلیں گے۔" صبح ہوئی، اردو بازار سے نکلے اور سڑک پر آکر رکشہ میں بیٹھے اور مینارِ پاکستان پہنچ گئے۔ ایک ناٹے قد کا پہلوان دوڑ لگا رہا تھا اور ایک خاتون خیمہ نما برقع پہنے تیز رفتاری سے سبزہ پر سیر میں مصروف تھیں طفیل صاحب نے سلیپر اتارے اور پھر کُرتا، سوکھے ہوئے ہاتھ دو تین مرتبہ ہوا میں لہرائے۔ میں، بنیان کے نیچے سے جھانکتی ہوئی پسلیوں کو گن بھی نہیں پایا تھا کہ ان کی ورزش ختم ہو گئی۔ بھاٹی دروازے سے ہوتے ہوئے کچھ کھانے کی چیزیں خرید کر گھر آگئے۔ انھیں یہ معلوم ہے کہ لاہور میں حلوہ پوری کس دوکان پر اچھی ملتی ہے، چھولے کہاں عمدہ ہوتے ہیں، کچوریاں کس وقت اور کہا تلی جاتی ہیں، نہاری کا ماہر کہاں پایا جاتا ہے۔ دلّی والے جب تک بازار میں کچھ کھا نہیں لیتے تھے

ان کا پیٹ نہیں بھرتا تھا۔ طفیل لاہوری میں اس حد تک چٹورپن ضرور ہے کہ کبھی کبھار منہ کا مزہ ضرور بدلتے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے گھر نہایت اعلیٰ درجہ کا کھانا تیار ہوتا ہے۔

میں اور طفیل صاحب ایک دن اے۔ جی آفس میں ایسی جگہ کھڑے تھے جہاں سے اس دفتر کے نصف سے زیادہ ملازمین گزرتے تھے۔ جن صاحب سے ملنا تھا وہ بہت دیر میں آئے، گرمی کی حدت میں شدت پیدا ہو چلی تھی۔ پیدل ہی چل پڑے اک دوکان پر رک گئے " لاہور میں یہاں سے اچھی دہی کی لسی اور کھیر نہیں ہوتی"۔ میں نے لسی پی اور کھیر انھوں نے کھائی۔ طفیل صاحب اکثر حیران ہوتے ہیں کہ میں چائے کیوں نہیں پیتا اور میں حیران ہوں کہ یہ لسی کیوں نہیں پیتے۔ کہتے یہ ہیں کہ اب نہ موچی دروازے میں جلسہ ہوتا ہے اور نہ قوم کی خاطر چندہ، لسی پینے کا لطف بھی جاتا رہا۔

طفیل صاحب کے خلاف جب کچھ لکھا جاتا ہے یا ہوٹلوں میں دن بھر بیٹھنے والے بے کار باتوں میں وقت گزارنے اور بیرے کو پانی کے گلاس کا آرڈر دینے والے ادبا و شعرا ان کی برائی کرتے ہیں تو مجھے ذرا حیرانی نہیں ہوتی، یہ حضرات طفیل صاحب کی طرح ان تھک کام نہیں کر سکتے۔ ان لوگوں میں یہ صلاحیت بھی نہیں ہوتی کہ وہ کام کرنے والوں کی تلاش و جستجو کر سکیں نہ انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ میر، غالب اور اقبال یا دوسرے اکابرین ادب پر مواد کہاں سے حاصل ہو سکتا ہے۔ چائے کی چسکی لگا کر دن گزارنے والوں کو یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ ادب کے دفینے اور خزانے کہاں ہیں؟ انھیں کیسے برآمد کیا جا سکتا ہے اور کس طرح ان کی ترتیب و تدوین کی جا سکتی ہے؟ اپنی ناواقفیت کی بنا پر یہ حضرات بے کار دن اور بے کار راتیں گزارتے اور شرفا کو تنقیص و تعریض کا نشانہ بناتے ہیں۔ طفیل صاحب نے کبھی سوقیانہ اور فحش باتوں پر توجہ نہ کی۔ لوگوں کے پھکڑپن اور رکاکت کی طرف کبھی دھیان نہ دیا، ایسے لوگوں کی بے بصری کا ماتم کرنے کی بجائے اپنی ذہانت اور ذہن کو تخلیقی کاموں کے لیے وقف رکھا ہے۔

طفیل اپنے گرد و پیش سے بے خبر اور بے تعلق نہیں ہوتے ملک کا دولخت ہونا ہو یا اس کی زبوں حالی، عوام کی بے بسی ہو یا بے حسی، ان کی ناکامی ہو یا افتاد و اضطراب، یہ کسی بات بے خبر نہیں ہیں۔ موقع پرست افراد سے سخت چڑ ہے۔ ملکی حالات کی نامساعدت اور غیر شستگی

حکومتوں کی ستم کیشیوں سے بخوبی واقف ہیں لیکن ہر شخص کے سامنے اظہار سے کتراتے اور چپ رہتے ہیں لیکن بے تکلف دوستوں میں وہ بے لفظوں میں نہیں واشگاف الفاظ میں وہ باتیں کہہ جاتے ہیں جو ہر شخص نہیں کہہ پاتا۔ ان کی فکر بڑی واضح ہے وہ خارجی ماحول کا بھرپور انداز میں جائزہ لینے اور تجزیہ کرنے کے اہل ہیں۔ نقوش کے طلوع کے عنوان سے ان کی بعض تحریریں سماجی کیفیت کی عبرت انگیز عکاسی کرتی ہیں۔ یہ حضرت حالات کی بھٹی سے تپ کر نکلے ہیں۔ یہ پرومیتھیس PROMETHEUS کی طرح کرب مسلسل میں گرفتار رہتے ہیں اور اسی بہانقوش کے ہر شمارے کو گزشتہ شمارے سے بہتر بنانے میں خون کو پانی کرتے رہتے ہیں اور شعروادب کے مستقبل کے لیے رہائی تعمیر کے لیے جدوجہد ہمہ وقت ان کے پیش نظر ہے اس کی پاداش میں کتنا مالی نقصان اٹھایا ہے اس کا اندازہ عام شخص نہیں لگا سکتا۔

طفیل ہر شخص کے سامنے نہیں کھلتے۔ اجنبی ہو تو ہوں، ہاں اور جی سے آگے نہیں بڑھتے لیکن بے تکلف دوستوں کی موجودگی میں قہقہہ بھی لگاتے ہیں، ہنستے ہیں تو سارا جسم ہلنے لگتا ہے چہرہ سرخ ہو جاتا ہے۔ میں نے ان کو اس وقت بے حد ملول پایا ہے جب کوئی شخص مسلمانوں کی تہذیب کو گڑھے میں گرانے کی کوشش کرتا ہے یا ادب و شعری روایت کو رسوا کرنے پر تل جاتا ہے یا ادب کو بد مذاقی پر محمول کرتا ہے۔

کیسا خوش گفتار، خوش اطوار، کیسا باکردار، ایڈیٹر کی حیثیت سے کیسا بلند قامت، کیسا مخلص، کتنا عالی حوصلہ، کس قدر ان تھک، کتنا باذوق، کیسا معقول و معتبر، کتنا خاموش طبع لیکن کس قدر شفیق اور کیسا شریف النفس جسے ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا۔ ادب کے لیے محمد طفیل ہے، محمد نقوش ہے لیکن میرا تو یہ بھائی بھی، محسن بھی اور دوست بھی۔

واقعہ یہ ہے کہ عشق ایک ہی سے ہو سکتا ہے اور دوستی بھی ایک ہی سے ممکن ہے۔ غالب کو نہ پڑھا ہوتا تو انسانیت کے معنی و مفہوم سے ناواقف رہتا۔ رشید صاحب کی تحریروں کو نہ پڑھتا تو علی گڑھ کی اہمیت سے ناآشنا رہتا، طفیل صاحب سے نہ ملا ہوتا تو دوستی کی نعمت سے محروم رہتا۔

٭٭٭٭

عبدالقوی ضیا

ماتم یک شہر آرزو

(پروفیسر عزیز احمد مرحوم میری نظر میں)

پروفیسر عزیز احمد کی زندگی میں بھی اور ان کے مرنے کے بعد بھی نہ جانے کتنے مضامین ان کی افسانہ اور ناول نگاری، تنقید یا تاریخ نویسی کے بارے میں لکھے گئے اور جب تک لکھنے کا یہ سلسلہ جاری ہے نہ جانے کتنے اور لکھے جائیں گے۔ مگر مرحوم کے بارے میں میرا قلم اٹھانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ان کی شخصیت اور کردار کے بعض ان پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے جو یا تو دوسروں کی نظر سے اب تک پوشیدہ رہے یا دوسروں نے ان کی شخصیت کا مشاہدہ اور مطالعہ اس انداز سے نہیں کیا جس طرح میں نے کیا۔ ہر چند کہ میرا ملنا جلنا ان سے بہت زیادہ عرصہ تک نہیں رہا مگر تھوڑے ہی عرصہ میں جو کردار اور گفتار کی نرمیاں اور لطافتیں، میں نے ان کے یہاں پائیں مجھے کم لوگوں میں ملیں۔ بہت کم لوگ ہوں گے جن سے کوئی ایک بار ملے اور پھر ان کا گرویدہ ہو جائے۔ مگر عزیز احمد مرحوم کی باتوں میں اتنا پیار، اتنی چاہت اور اتنی اپنائیت تھی کہ جب میں ان سے ملا تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ جیسے میں ان کو ایک عرصہ سے جانتا ہوں۔ ان کی شخصیت کا یہ پہلو بڑا وزنی تھا اور اسی نے مجھ کو یہ مضمون لکھنے کے لیے آمادہ کیا۔ میں نے ان کو جیسا دیکھا، جیسا پایا اور جیسا سمجھا ویسا ہی ان کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے خدوخال کی جو جھلکیاں اس میں نظر آئیں ان سے بہت سے ان کے ملنے والے متفق نہ ہوں مگر میرے محسوسات اور نظریات جو ان کے بارے میں ہیں ان پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہی سبب ہے کہ میں بلا تامل یہ

کہہ سکتا ہوں کہ ان کے بارے میں میرا یہ مطالعہ مفروضی نہیں ہے، معروضی ہے۔ ان کی آشفتہ طبعی، ادبی ذوق اور فیاض دل سے میں نے جو کچھ سیکھا اس کا اظہار اور اعتراف میرے نزدیک لازمی تھا اس سے گریز خود میرے اپنے کردار کی کمزوری کے مترادف ہوگا۔

اردو ادب میں چاہے وہ افسانہ نگاری ہو یا ناول نویسی، ادب ہو یا تنقید عزیز احمد کا مقام متعین کرنا آسان نہیں مگر اس سے زیادہ مشکل مسئلہ ان کی حیثیت بحیثیت ایک اسلامی مورخ اور اسلامی تاریخ کے استاد کی طرح متعین کرنا ہے اور اس سے بھی زیادہ دشوار گزار مسئلہ ان کی شاعرانہ حیثیت کا تعین کرنا ہے جس کے بارے میں ابھی بہت کم لوگوں کو علم ہے اور جن لوگوں کو علم ہے بھی ان کی دسترس میں عزیز احمد مرحوم کی صرف چند غزلیں یا دو ایک نظمیں ہیں جو انھوں نے اپنی عمر کے آخری دور میں کہیں اور جنھیں نہ انھوں نے کسی محفل میں سنایا اور نہ ہی ان کو چھپوانے کی کوشش کی۔ مجھے یقین ہے کہ دوسرے حضرات ان موضوعات پر ضرور خامہ فرسائی فرمائیں گے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو شاید میں خود ہی آیندہ کبھی یہ جرأت کروں کہ ان کو بحیثیت مورخ اور شاعر کے، ادب نواز حضرات سے روشناس کراؤں۔ فی الوقت تو میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ جو کچھ میں نے ان کی ذات سے حاصل کیا ہے اس سے دوسروں کو بھی استفادہ کرنے کا موقع دوں۔

عزیز احمد مرحوم ایک انتہائی مہربان، شائستہ مزاج، نرم گو اور شیریں سخن قسم کے انسان تھے۔ ان کی منکسر المزاجی اور نیک نفسی نے میرے دل پر اتنا گہرا نقش بٹھایا کہ ان کے تتبع میں خود بھی انکسار پسند اور دوسروں کے پیچھے پیچھے رہنے کا عادی ہو گیا جس کی وجہ سے کچھ فائدہ بھی ہوا اور تھوڑا بہت نقصان بھی۔ جو لوگ انکساری کو کم علمی اور بے ہمتی پر محمول کرتے ہیں وہ سر چڑھنے لگے اور اپنے کو بہتر اور رہبر سمجھنے لگے لیکن ایسے لوگوں کے چھچھورے پن کا کوئی اثر میرے اوپر نہیں ہوا۔ میں پھر بھی عزیز احمد صاحب جیسی بلند پایہ شخصیت کا تتبع کرتا رہا۔ اپنے کو کمتر اور ہر شخص کو اپنے سے افضل اور برتر سمجھتا رہا۔ ایسا نہ کرتا تو عزیز احمد مرحوم کی صحبت سے خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھا پاتا۔ مجھے یقین ہے کہ جو لوگ خود انکسار پسند نہیں ہیں۔ وہ عزیز احمد صاحب کی فیاضانہ اور منکسرانہ طبیعت کو بھی نااہلی پر

محمول کرتے ہوں گے اور اس سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہوں گے۔ ایک مثال میں آپ لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہوں جس سے عزیز احمد صاحب کے کردار کا یہ پہلو زیادہ مضبوط اور نمایاں نظر آنے لگے گا۔

ٹورنٹو یونی ورسٹی کے شعبہ اسلامی تاریخ میں ایک لیکچرار کی جگہ خالی ہوئی جس کے لیے بہت سے امیدوار تھے۔ ڈاکٹر سیواری اس شعبہ کے صدر تھے اور انھوں نے جن امیدواروں کا انتخاب کیا ان میں سے ایک صاحب لندن یونی ورسٹی کے طالب علم تھے اور اورنٹیل کالج آف ایشین اور افریقن اسٹڈیز سے اسلام میں تصوف کے موضوع پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ عزیز احمد صاحب تعطیلات گرما انگلینڈ جانے والے تھے۔ ڈاکٹر سیواری نے ان کو ہدایت کی کہ ان صاحب سے مل کر بات چیت کرلیں، اس طرح ان امیدوار کو کینیڈا انٹرویو کے لیے بلانے کی زحمت نہ دینا پڑے گی۔ عزیز احمد صاحب کینیڈا تشریف لانے سے قبل وہ خود بھی اورنٹیل کالج میں اردو کے استاد رہ چکے تھے اور ان طالب علم سے ذاتی طور پر واقف تھے۔ یہ امیدوار جب سالانہ مذاکرے کا انعقاد ہوتا تو اس میں حصہ لیتے تھے اور حسن اتفاق عزیز احمد صاحب اس کے جج ہوتے تھے۔ وہ امیدوار سال بہ سال پہلا انعام جیتتے رہے، اور عزیز احمد صاحب کے کینیڈا چلے آنے کے بعد بھی اوّل انعام حاصل کرنے کا سہرا انھیں کے سر رہا۔ ذاتی واقفیت کی بنا پر عزیز احمد صاحب نے اِن امیدوار کا انٹرویو لینے کی زحمت بھی گوارا نہ کی اور انگلینڈ سے واپسی پر ان کی تقرری کے لیے نہ صرف پرزور سفارش کی بلکہ پوری کوشش کی۔ چنانچہ ان صاحب کا تقرر شعبہ اسلامی تاریخ میں بحیثیت لیکچرار ہو گیا۔ جب وہ صاحب اپنی جگہ کام کرنے کے لیے کینیڈا تشریف لائے تو عزیز احمد صاحب نے ان کو دوسروں سے ملانے کے لیے ایک پرتکلف دعوت کا اہتمام کیا اور مجھے بھی اس میں مدعو کیا۔ یہ میری خوش قسمتی سمجھیے یا بدقسمتی کہ میں ان صاحب کو عزیز احمد صاحب کی طرح پہلے سے جانتا تھا۔ مجھے وہ شام اچھی طرح یاد ہے جب عزیز احمد صاحب کے فلیٹ پارلمنٹ میں خاصی تعداد میں لوگ جمع تھے۔ باتوں کا سلسلہ زور وشور سے جاری تھا اور کہیں بیچ سے اٹھ کر عزیز احمد صاحب ادھر یا ادھر جاتے تو وہ صاحب بھی اس کے احترام اور ادب میں اپنی جگہ پر کھڑے

ہو جاتے اور جب تک عزیز احمد صاحب بیٹھ نہ جاتے وہ خود بھی نہ بیٹھتے۔ حتیٰ کہ ایک دو بار جب میں بھی کسی وجہ سے کھڑا ہو گیا تو وہ میرے احترام میں بھی اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ اس بات سے میں بہت متاثر ہوا اور ان کے رخصت ہونے کے بعد میں نے عزیز احمد صاحب کو ان کے انتخاب پر مبارکباد دی۔

اُن صاحب کو جب تک [illegible] نہیں مل گیا اور ان کا تقرر مستقل نہیں ہو گیا، ادب و احترام کا یہ سلسلہ جاری رہا، مگر جیسے ہی وہ مستقل ہو گئے، انھوں نے پُر پرزے نکالنے شروع کر دیے۔ عزیز احمد صاحب کی قدر دانی اور احسان شناسی کے بجائے ان کی جگہ جگہ مذمت اور ہتک کر کے اپنی احسان فراموشی کا ثبوت دینے لگے۔ ظاہری اخلاق کا جو خول ان پر چڑھا ہوا تھا وہ اترنے لگا۔

عزیز احمد صاحب کی صلاحیت اور قابلیت پر انھوں نے جو رکیک حملے کیے وہ ایک ناقدر شناس اور کم ظرف انسان ہی کر سکتا ہے۔ انھوں نے عزیز احمد صاحب کو نااہل اور نکما ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ طلبا اور اساتذہ میں یہ پروپیگنڈا شروع کیا کہ عزیز احمد صاحب کے پاس اسلامی تاریخ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ہونا تو درکنار، ایم۔ اے بلکہ بی۔ اے تک کی ڈگری بھی نہیں ہے۔ اس بنا پر یا تو ان کو اس عہدے سے معزول کیا جائے یا برطرف۔ ان کے اوپر شراب نوشی کا الزام لگایا۔ ان کو کم علم اور کم مایہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس کے برخلاف عزیز احمد صاحب نے ان کے اخلاق یا کردار کے بارے میں ایک لفظ بھی کبھی شکایتاً زبان سے نہیں نکالا بلکہ جب اِن صاحب کی ترقی کا سوال اٹھا تو ان کی حمایت میں ووٹ دیا۔ اور کمیٹی جو اس کی ذمہ دار تھی اس کے سامنے صرف یہ کہا کہ بلاشبہ ان صاحب کو ریڈر بنا دیا جائے مگر گریجویٹ طلبا ان کی تحویل میں نہ دیے جائیں ورنہ وہ طلبا ہی کا بیڑا غرق کر دیں گے۔ اللہ اللہ ایک ہی شعبہ میں ایک دانشور کی شریف النفسی کا یہ عالم تھا اور دوسرے کی کم ظرفی کا یہ طریقہ تھا۔ کم ظرف آدمی بہرحال کم ظرف ہی رہتا ہے۔ عزیز احمد صاحب کے انتقال کے بعد انھوں نے اپنی بدنفسی اور کم ظرفی کا ہدف ڈاکٹر سیواری کو بنایا اور ان کی کتاب جو اسلام اور تصوف کے موضوع پر شائع ہوئی تھی اس کے تعلق سے ان پر PLAGIARISM کا الزام

لگایا اور مختلف اخباروں میں اس کی تشہیر کرنے سے بھی گریز نہ کیا۔

عزیز احمد مرحوم سے میری ملاقات ۱۹۶۴ء میں میرے عم زاد بھائی صغیر احمد نے کرائی جو ان کے پڑوسی تھے اور دونوں سینٹ جارج اسٹریٹ پر دو مختلف اپارٹمنٹ بلڈنگ میں رہتے تھے یہ سڑک یونی ورسٹی آف ٹورنٹو کے کیمپس سے جو کافی پھیلا ہوا ہے ملحق تھی۔ میرے اوپر ان کا پہلا تاثر جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا نہ صرف خوشگوار بلکہ دیرپا تھا۔ وہ دیکھنے میں متین مگر ہنس مکھ نظر آئے تھے۔ خلوص اور محبت ان کی بات چیت میں ٹپکا کرتا تھا۔ شیریں سخن بھی تھے اور نرم گفتار بھی۔ میرے نام کے ساتھ ضیا کی شمولیت دیکھ کر پوچھا کیا میں شعر کہتا ہوں۔ جواب دیا گاہے بگاہے، باقاعدگی سے نہیں۔ موزونی طبع اور لکھنؤ کے ماحول میں پرورش پانے کی وجہ سے اس ذوق نے جلا پائی ہے ورنہ نہ میں شاعر ہوں اور نہ شاعر کہلانے کی خواہش ہے۔ کہنے لگے یہ ساری باتیں چھوڑیے کچھ شعر سنائیے۔ تعمیلِ حکم کی۔ شعر سن کر بہت خوش ہوئے دل کھول کر داد دی، پوری طرح سے ہمت افزائی کی۔ اس کے بعد جب کبھی بھی ٹورنٹو جاتا وہ اپنے یہاں ضرور مدعو کرتے۔ ان کی بیگم جو کھانا پکانے کی ماہر ہیں۔ بڑے پرتکلف انداز میں مختلف لوازمات کے ساتھ چائے پیش کرتیں یا کھانا کھلاتیں۔ وہ شعر سنتے اور تعریف کرتے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ کبھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ خود بھی شعر کہتے ہیں اور بہت ہی اچھے کہتے ہیں۔

ایک بار جو ان سے ملنے گیا تو کہنے لگے کہ ضیا ایک مشاعرہ ہونا چاہیے۔ میں نے جواب دیا کہ اگرچہ شہر میں کوئی شاعر واعر تو ہے نہیں (اس وقت واقعی شاعر اس شہر میں نہیں تھے) مشاعرہ کیا خاک ہوگا۔ کہنے لگے جو بھی ہیں اور جیسے بھی ہیں، غنیمت ہے۔ مشاعرہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ محفلِ مشاعرہ ان کے اصرار پر منعقد کی گئی۔ صغیر صاحب نے جس بلڈنگ میں وہ رہتے تھے اس کے لاؤنج میں سارا انتظام کیا۔ شرکا میں ۳۵۔ ۴۰ لوگ ہوں گے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے دوسرے شعرا کا کلام پڑھا۔ مشاعرے کی صدارت جناب طیب علی صاحب پروفیسر شعبہ جغرافیہ۔ ٹورنٹو یونیورسٹی نے کی۔ صد حیف کہ ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ بڑے مرنجاں مرنج قسم کے آدمی تھے۔ دل کے عارضہ میں مبتلا تھے۔ ایک دن حرکت قلب بند ہوئی اور بے چارے چل بسے۔ اس مشاعرے میں انھوں نے جو غزل پڑھی تھی اس کا ایک شعر مجھے اب تک یاد ہے،

اندھیری رات میں مجھ کو پولیس والی نے پکڑا ہے
چلو اچھا ہوا کام آگئی آوارگی اپنی!

عزیز احمد صاحب ایک گوشے میں صوفے پر بیٹھے سب کا کلام سنتے رہے۔ گاہے بگاہے مسکرا کر داد بھی دیتے رہتے۔ ان سے لوگوں نے بہت درخواست کی کہ کچھ سنائیں مگر بہ لطائف الحیل ٹال گئے۔ سچ پوچھیے تو اس وقت تک لوگوں کو یہ علم بھی نہ تھا کہ وہ شعر کہتے ہیں۔ اس کے بعد پھر میں نے ان کو کسی مشاعرے میں شریک ہوتے نہیں دیکھا۔

اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں نے جشنِ فیض منایا۔ ان سے درخواست کی گئی کہ وہ اس کی صدارت کریں۔ انکار کر دیا۔ پھر قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند۔ موت سے کچھ دن پہلے وہ اُس مشاعرے کی صدارت کرنے آئے تھے جس کے مہمان خصوصی فیض احمد فیض تھے۔ فیض صاحب تشریف تو لائے تھے رحیم انجان صاحب کے بلاوے پر۔ مگر جیسا کہ انھوں نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ اصل مقصد عزیز احمد صاحب سے ملنا تھا۔ اس مشاعرے میں وہ بمشکل تمام پکڑ کر لائے گئے تھے۔ ان کا وزن اس وقت صرف ۶۵ پونڈ رہ گیا تھا۔ آٹھ آدمیوں نے ملکر ان کو اسٹیج پر چڑھایا۔ بڑی دشواری کے ساتھ انھوں نے خطبۂ صدارت پڑھا۔ فیض صاحب کے شعر پڑھتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ "آپ لوگ فیض سے یہ نظم ضرور سنیے گا۔ اس غزل کی ضرور فرمائش کیجیے گا۔ میں تو خیر چلا جاؤں گا بلکہ بہت جلد اس دنیا سے ہی چلا جاؤں گا مگر آپ لوگ فیض صاحب سے یہ نظمیں ضرور سنیے گا۔" افسوس کہ اِس مشاعرے کے ایک ماہ بعد ہی وہ واقعی چلے گئے مستقل طور پر چلے گئے۔ مگر فیض صاحب نے وہ تمام نظمیں اور غزلیں جن کا عزیز احمد صاحب نے اپنے خطبہ میں ذکر کیا تھا، سنائیں۔ مجھے حال ہی میں پتہ چلا کہ اِس خطبہ کی نقل حاصل ہو گئی ہے اور وہ جلد ہی شائع ہونے والا ہے۔ یہ ان کا آخری تنقیدی مضمون تھا جس کو انھوں نے بڑی مشکل سے اور صرف فیض صاحب کی چاہت میں لکھا تھا۔ اس مشاعرے میں بھی عزیز صاحب نے اپنا کوئی کلام نہیں سنایا۔ کیا وضعداری تھی، کیا منکسر المزاجی تھی۔

یہ ۱۹۷۲ء کی بات ہے کہ پاکستان اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن نے ٹورنٹو میں ایک کانفرنس

منعقد کی جس میں پاکستان کی حالیہ مشکلات اور مستقبل کے حالات کے بارے میں تبادلۂ خیال کرنا مقصود تھا۔ اس کے افتتاحیہ سیشن کی صدارت سفیر پاکستان جناب جمشید مارکر کر رہے تھے اور اس اجلاس کا مقرر خصوصی میں تھا۔ طلبا نے بہت کوشش کی کہ عزیز احمد صاحب یا تو کسی سیشن کی صدارت کریں یا مقالہ پڑھیں۔ انھوں نے یہ دونوں باتیں ماننے سے انکار کر دیا۔ جلسوں میں، بڑی بڑی محفلوں میں جانے سے وہ گھبراتے تھے۔ جب کبھی ایسے مواقع پیش آتے تھے تو وہ کسی نہ کسی انداز سے اس سے گریز کر جاتے تھے۔ ۱۹۶۴ء میں جب مانٹریال میں ڈاکٹر سلیم قریشی نے پاکستان کے مسایل پر ایک کانفرنس منعقد کی، جس میں متعدد امریکی اور کینیڈین اساتذہ اور دانشور شریک ہو رہے تھے۔ عزیز احمد صاحب بھی مدعو تھے مگر وہ نہیں گئے البتہ ڈاکٹر سلیم قریشی کو میرا نام تجویز کر دیا۔ میں اس وقت تک قریشی صاحب سے واقف بھی نہ تھا۔ ایک دن اچانک مجھے ان کی جانب سے دعوت نامہ ملا۔ جس کا مجھے بہت تعجب ہوا۔ میں اس میں شریک ہوا۔ ان سے دریافت کیا کہ آپ کو میرا نام اور پتہ کیسے چلا؟ مگر انھوں نے نہیں بتلایا کہ عزیز احمد صاحب نے ان سے میری پرزور سفارش کی تھی اور ان سے کہا تھا کہ جیسے بھی ہو مجھے ضرور مدعو کیا جائے۔

خیر بات کر رہا تھا کہ پاکستانی طلبا کی کانفرنس کی۔ اس کانفرنس کا آنکھوں دیکھا حال لکھنے کے لیے عظیم میاں صاحب مانٹریال سے تشریف لائے تھے جنھوں نے مانٹریال سے حال ہی میں 'جنگ' نکالنا شروع کیا تھا۔ انھوں نے پروفیسر عزیز احمد کو خط لکھ کر ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور ان سے وقت ملاقات کے لیے بھی لے لیا۔ عزیز صاحب نے جو وقت ان کو دیا اس وقت مجھے بھی بلا لیا تاکہ میں بھی عظیم میاں سے مل لوں۔ اتفاق سے میری ملاقات ایڈیٹر جنگ سے کانفرنس ہی میں ہو گئی۔ اور جب ان کو پتہ چلا کہ میں بھی عزیز صاحب کے یہاں مدعو ہوں تو پھر ہم دونوں ساتھ ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ کر ان کے اپارٹمنٹ گئے۔ جہاں حسب معمول بیگم عزیز نے انتہائی پرتکلف چائے کا اہتمام کیا ہوا تھا جب چائے نوشی کا سلسلہ ختم ہو گیا تو عظیم میاں نے عزیز صاحب کا انٹرویو لینے کی خواہش ظاہر کی۔ عزیز صاحب اس بات سے ذرا گھبرا گئے۔ کہنے لگے بھئی میں حکومت پاکستان کا نمک خوار ہوں، وہاں سے پنشن پاتا ہوں۔ میرا داماد حکومت پاکستان کا رکن ہے۔ تم دوران انٹرویو

ممکن ہے کوئی ٹیڑھا میڑھا سوال پوچھ بیٹھوں اور میں نہ جانے کیا اس کا جواب دے بیٹھوں اور تم جانے اس کے کیا معنی پہنا دو جس سے مجھے نقصان پہنچ جائے اور اگر مجھے نقصان نہ بھی پہنچے تو مجھے اس کا خدشہ لگا رہے گا جو مجھے ذہنی خلجان میں مبتلا رکھے گا لہٰذا یہ انٹرویو وغیرہ کا چکر ختم کرو۔ ضیا صاحب یہاں موجود ہیں ان کے شعر سنو، ہنسی خوشی کی باتیں کرو اور اپنا اخبار مجھے باقاعدگی سے بھجوا دیا کرو۔ یہ کہہ کر بات ٹال دی۔

عزیز احمد مرحوم کی زندگی کے جس پہلو پر بھی نظر ڈالیے وہ بصیرت افروز ملے گا۔ ان کی باتوں میں دلآویزی بھی ہوتی تھی ہم آمیزی بھی، توازن بھی، سنجیدگی بھی۔ میں جب بھی اُن سے ملا افکار اور جذبات کے معاملے میں نہ کبھی ان کو غیر متوازن پایا اور نہ ہی سلام و کلام کے سلسلے میں غیر ہموار۔ وہ بہت ہی نرم لہجہ میں، تھمے تھمے انداز میں گفتگو کرتے۔ نہ خود بر داشتہ خاطر ہوتے تھے اور نہ ہی کسی دوسرے کو اپنی باتوں سے بیزار ہونے دیتے تھے۔ جس سے ملنا پسند کرتے اس سے دل کھول کر ملتے تھے، جس سے گریز کرتے اس سے بہت سلیقہ کے ساتھ کنارہ کشی اختیار کر لیتے۔ نہ کبھی دانستہ کسی کے جذبات کو ٹھیس لگاتے اور نہ ہی دوسرے کو یہ موقع دیتے کہ وہ حدودِ تہذیب سے آگے نکل جائے۔ ایک عرصہ تک وہ سینٹ جارج کی ایک بلڈنگ کے تین بیڈ روم اپارٹمنٹ میں رہائش پذیر رہے یہاں سے ان کو اپنے دفتر آنے جانے میں آسانی رہتی چونکہ وہ پاس ہی تھا، پیدل چلے جاتے تھے۔ کبھی شہر جانا ہوتا تھا تو الیکٹرک کار Electric Car لے لیتے تھے۔ ۱۹۷۵ء-۱۹۷۶ء میں جب اپارٹمنٹ کے کرائے بڑھنے لگے اور مکانوں کی قیمت اوپر چڑھنے لگی تو ان کے کئی دوستوں نے مشورہ دیا کہ اتنا زیادہ کرایہ ہر مہینے دینے سے کیا فائدہ، آپ اپنا مکان کیوں نہیں خرید لیتے۔ جب لوگوں نے بہت زور دیا تو تیار ہو گئے اور شہر کے مشرقی علاقے میں انھوں نے ایک اپارٹمنٹ خرید لیا۔ مگر اب یہاں سے آمد و رفت کی وہ سہولت نہ تھی جو سینٹ جارج سے تھی پھر وہ علاقہ شورہ پشتوں کی بھی آماجگاہ تھا جس کی وجہ سے رات برات نہتا نکلنا یا ادھر ادھر جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ کئی ایسے حادثے ہوئے جس میں ان کے دوستوں کو نقصان بھی پہنچا۔ انھوں نے چاہا کہ وہ اس اپارٹمنٹ کو بیچ کر پھر واپس اپنی پرانی جگہ پر چلے جائیں مگر اس مکان

کا بکنا بھی آسان نہ تھا۔ تین سال بمشکل تمام وہاں گزارے۔ مگر کبھی ان دوستوں سے غلط مشورہ دینے کی شکایت نہ کی اور نہ کسی ملال کا اظہار کیا۔ بیماری کی وجہ سے بار بار اسپتال جانا پڑتا تھا۔ لیکن اس علاقے سے آنا جانا آسان نہ تھا۔ مگر پھر بھی وہ صعوبت برداشت کرتے اور لبِ شکایت نہیں کھولا۔ جیسے تیسے اونے پونے اس مکان کو بیچ کر پھر وہ واپس سینٹ جارج پر آگئے اور آخری دم تک پھر وہیں رہے۔

بیماری کی وجہ سے کہیں آنا جانا، لوگوں سے ملنا جلنا بہت کم ہوگیا تھا۔ ضعف اتنا تھا کہ ٹیلی فون تک آنا اور ٹیلی فون پکڑنا بھی دشوار ہوتا تھا۔ لوگ بھی عیادت کو اس وجہ سے نہ جاتے تھے کہ ان کو دروازے تک آنے میں بڑی زحمت ہوگی۔ میں جب ایک بار ٹورنٹو گیا تو مجھ سے یہ گوارا نہ ہوا کہ اس شہر تک جاؤں اور عزیز احمد صاحب کی خیریت نہ دریافت کروں۔ چنانچہ ان کو ٹیلی فون کیا، ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ بہت ہی دقت کے ساتھ ٹیلی فون تک آئے۔ آنے کو منع کیا اور بس یہ کہا کہ "ضیا صاحب! ساری تمنائیں پوری ہو چکی ہیں بس اب صرف ایک تمنا باقی ہے کہ موت آجائے۔ دعا کیجیے کہ خاتمہ بالخیر ہو۔" افسوس صد افسوس! کہ اس کے بعد موت جلد ہی آگئی اور ان کی خواہش کے مطابق خاتمہ واقعی بالخیر ہوا۔

مرنے سے دو سال پہلے عزیز احمد صاحب نے اپنی کتاب Islam in Sicily "صقلیہ میں اسلام" کے بارے میں ختم کی اور جو ان کی زندگی ہی میں اشاعت پذیر ہوئی اور اس پر حکومت اطالیہ نے ان کو اس ملک کی شہریت عطا کی اور کئی اعزاز سے نوازا۔ یہ ان کی آخری کتاب تھی جو شائع ہوئی۔

عزیز صاحب کو اپنا کتب خانہ بہت عزیز تھا۔ اس میں بہت سے غیر مطبوعہ نسخے تھے جو وہ حیدرآباد دکن سے لے کر آئے تھے۔ بہت سے دکھنی شعرا کے دیوان تھے جو کہیں شائع نہ ہوئے۔ فارسی اور عربی زبان کے بہت سے نسخے موجود تھے۔ مجھ کو کئی بار اپنے آفس لے گئے اور اپنی کتابوں کے ذخیرے کو ذوق و شوق کے ساتھ دکھایا۔ افسوس کہ کوئی ایسا ٹرسٹ قائم نہ کر پائے جس کی تحویل میں یہ ساری کتابیں دے دی جاتیں ــــ اغلب ہے کہ شعبہ اسلامی تاریخ ٹورنٹو یونیورسٹی نے ان کتابوں کو اپنی سپردگی میں لے لیا ہوگا۔

عزیز احمد صاحب کی ایک بیٹی پاکستان میں بیاہی ہوئی ہیں۔ ان کے دو بیٹے البتہ انگلینڈ اور کینیڈا میں پلے بڑھے۔ اور انھوں نے کینیڈا ہی میں کینیڈین لڑکیوں سے شادی کرلی۔ ہر چند کہ عزیز صاحب دل سے ان رشتوں سے خوش نہ تھے مگر زبان پر کبھی حرفِ شکایت نہیں لاتے۔ بلکہ ہر محفل میں اپنی بہوؤں کی تعریف کیا کرتے تھے اور اگر وہ ذرا سا بھی کچھ اُن کے لیے کر دیتی تھیں تو اس سے خوش ہو جایا کرتے تھے۔ ادھر ایک عرصے سے جب کہیں آتے جاتے تھے تو ان کی بہو یا بیٹا اپنی گاڑی میں بٹھا کر ان کو لے جایا کرتے تھے جس کے لیے وہ بہت ہی متشکر ہوتے تھے۔ وہ خود اتنے عرصہ تک مغربی ممالک میں رہے مگر نہ گاڑی چلانا سیکھی اور نہ ہی گاڑی خریدنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ شراب نوشی سے پرہیز کرتے تھے مگر پینے والوں سے دل کھول کر ملتے تھے۔ نہ ان کو عذاب الٰہی سے ڈراتے اور نہ ہی اس کو مذہب کے خلاف سمجھتے تھے۔ خود مذہب کے بارے میں ان کے خیالات بہت آزادانہ قسم کے تھے۔ نہ ان میں مذہبی تعصب تھا نہ کینہ پردازی، نہ تنگ نظری بلکہ اس سلسلے میں وہ بہت ہی وسیع النظر اور Liberal Minded تھے جس کی بنا پر ان کے کئی ملنے والے جو کٹر قسم کے مسلمان اور تنگ دل اور تنگ نظر قسم کے انسان تھے بد دل ہو جایا کرتے تھے۔

عزیز احمد صاحب کی طبیعت میں نہ مکاری تھی نہ عیاری۔ وہ صاف گو بھی تھے اور صاف قلب بھی۔ جہاں ان کے مزاج میں سادگی تھی وہاں نفاست پسندی بھی تھی سچ پوچھیے تو وہ مشرقی اور مغربی اقدار کا ایک بہت حسین امتزاج تھے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ نہ مغربیت نے پوری طرح ان پر تسلط کیا تھا اور مشرقیت ان پر پوری طرح حاوی ہونے پائی تھی۔ ان کے ساتھ مل بیٹھنے اور باتیں کرنے میں جو مزہ آتا تھا وہ بہت ہی کم لوگوں سے ملنے کے بعد حاصل ہوتا تھا۔ ہر چند کہ وہ خود اپنے شعر سنانے سے پرہیز کرتے تھے مگر غزلیں دوسروں کو دیتے تھے کہ ان کی جانب سے مشاعرے میں پڑھ دیں۔ چنانچہ ان کی سب سے پہلی غزل میں نے جناب کبیر قریشی کی زبانی ہالی ڈے اِن HOLIDAY INN کے مشاعرے میں سنی جو ڈاکٹر افضل اقبال سفیر پاکستان کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ اس کے بعد اقبال کی صد سالہ برسی جب پاکستان کینیڈا ایسوسی ایشن والوں نے اوٹاوا میں منائی تو اس کے

آخری سیشن میں جو مشاعرہ کی صورت میں ترتیب دیا گیا تھا عزیز احمد صاحب کی غزل پڑھنے کا شرف مجھ ہی کو حاصل ہوا تھا۔

عزیز احمد مرحوم کبھی کسی کی مدد کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ جو بات ان کے مقدور میں ہوتی وہ ضرور کر گزرتے۔ ایک بار میں نے کینیڈا کونسل کے ایک وظیفہ کے لیے درخواست دی۔ عزیز صاحب کو اس کا Referee بنایا اور میری خواہش پر انھوں نے میری موافقت میں ایک پرزور خط لکھا جس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ اس کے بعد جب میں ان سے ملنے گیا تو انھوں نے مجھے اس خط کی نقل دکھائی جو انھوں نے میری سفارش میں کونسل والوں کے پاس بھیجا تھا۔ اس ملک میں عموماً پاکستانی ایک دوسرے کی اس قسم کی مدد کرنے سے یا تو گریز کر جاتے ہیں یا بہانہ بنا دیتے ہیں مگر عزیز صاحب میں یہ بات نہ تھی جو کام وہ نہیں کر سکتے تھے یا نہیں کرنا چاہتے تھے اس کے لیے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے انکار کر دیتے۔ جو شاید اکثر لوگوں کو ناگوار بھی لگتا۔ مگر جو لوگ صاف گوئی کو حیلہ جوئی کے مقابلے میں پسند کرتے ہیں وہ ان سے بددل نہیں ہوئے بلکہ اُن کی اِس خصلت کی تعریف کرتے۔

عزیز احمد صاحب ترقی پسند تھے اور ڈنکے کی چوٹ پر تھے۔ دنیا کا کون ایسا فن کار ہوگا جو آگے کی طرف نہ جانا چاہتا ہو اور ترقی پسندیت کا قایل نہ ہو۔ عزیز احمد کا شمار بھی اسی زمرے میں ہوتا تھا۔ ان کے افسانوں میں رومانیت اور ترقی پسندیت بڑے سلیقے سے سموئی ہوئی تھی۔ البتہ ان کی غزلوں میں حزن و یاس اور مایوسی کا عنصر غالب رہتا۔ ان کی بہت سی غیر مطبوعہ غزلیں ان کے رفیق کبیر قریشی صاحب کے پاس ہیں اور جن کو وہ ایک ایک دو دو کر کے اشاعت کے لیے رسالوں اور مجلّوں میں بھیجتے رہتے ہیں۔ میری طرح کبیر قریشی صاحب کو بھی ان کے مرنے کا بہت دکھ ہے۔ اگر وہ کچھ دن اور زندہ رہتے تو اسلامی تاریخ کے علاوہ دنیائے شاعری کو اور بہت کچھ دے جاتے۔ ایک عرصہ سے انھوں نے افسانے اور ناولیں لکھنا بند کر دیا تھا وہ صرف تحقیق اور تدقیقی کاموں میں مشغول رہتے تھے۔ ان سے اگر ان کے ناولوں اور افسانوں کا ذکر کیا جاتا تھا تو وہ شرما سے جاتے اور اس کو اپنے عہد جوانی کا کارنامہ سمجھ کر چپ ہو جاتے۔ اسے اپنے دور کا سرمایہ نہیں سمجھتے جس میں وہ ایک سنجیدہ مزاج محقق اور مورخ ہو کر رہ گئے تھے۔

⁂

عزیز قیسی



بین العدمین

مافات مضا وما سیات فآین ؟
قم فاغتنم والفرصۃ بین العدمین

(حضرت علیؑ)

(جو فوت ہوا ماضی ہوا، اور جو آنے والا ہے وہ کہاں ہے؟ اُٹھ۔ کہ عدم اور عدم کے بیچ کی یہ فرصت غنیمت ہے)

عزیز قیسی

یہ تضادِ جان و جسد اسے — تو وصال کہہ لے فراق میں
تو نشاط کہہ لے ہراق میں — تو رواق کہہ لے کہ بحر و بر
میں مذاق کہہ لوں کہ خیر و شر — ترے مرے کہنے میں کچھ نہیں
کہ ترا یقین مرا گماں — کہ ترا گمان مرا یقیں
ترے درک و ہوش و حواس کی — مرے وجد و وہم و قیاس کی
یہی ایک پل تو اساس ہے — یہی ایک پل تیرے پاس ہے
یہی ایک پل مرے پاس ہے
اِسی ایک پل کو مرور ہے — اسی ایک پل کو قیام ہے
اِسی ایک پل کو دوام ہے — اسی ایک پل کو سلام ہے
نہ حیات، اجل، نہ ازل نہ ابد
یہی پل ازل یہی پل اَبد

عزیز قیسی

غزلیں

۱

اُلجھاؤ کا مزہ بھی تری بات ہی میں تھا
تیرا جواب تیرے سوالات ہی میں تھا

سایہ کسی مکیں کا بھی جس پر نہ پڑ سکا
وہ گھر بھی شہرِ دل کے مضافات ہی میں تھا

یاروں کو انحراف کا جس پر رہا غرور
وہ راستہ بھی دشتِ روایات ہی میں تھا

الزام کیا ہے یہ بھی نہ جانا تمام عمر
مُلزم تمام عمر حوالات ہی میں تھا

اب تو فقط بدن کی مروّت ہے درمیاں
تھا ربطِ جان و دل تو شروعات ہی میں تھا

مجھ کو جو قتل کر کے مناتا رہا ہے جشن
وہ بد نہاد شخص مری ذات ہی میں تھا

۲

انھیں سوال ہی لگتا ہے میرا رونا بھی
عجب سزا ہے جہاں میں غریب ہونا بھی

یہ رات رات بھی ہے اوڑھنا بچھونا بھی
اِس ایک رات میں ہے جاگنا بھی سونا بھی

وہ حبس دم ہے زمیں آسماں کی وسعت میں
کہ ایسا تنگ نہ ہوگا لحد کا کونا بھی

عجیب شہر ہے گھر بھی ہیں راستوں کی طرح
کسے نصیب ہے راتوں کو چھپ کے رونا بھی

گُھلے میں سوئیں گے پر موتیا کے پھولوں سے
سجاؤ زلف بسا لو ذرا بچھونا بھی

نجاتِ روح بھی ارزاں نشورِ دل کی طرح
ہوا ہے سہل ضمیروں کے داغ دھونا بھی

عزیز قیسی یہ سوداگروں کی بستی ہے
گراں ہے دل سے یہاں کاٹھ کا کھلونا بھی

عزیز قیسی کی غزلیں

ہر لمحہ بے شرم سوالی لگتا ہے
جینا اب تو ماں کی گالی لگتا ہے

جب سے پیٹ پہ پاؤں رکھا ہے دنیا نے
ہم کو دل کا درد خیالی لگتا ہے

عکس عکس ہے آئینہ در آئینہ
پھر بھی یہاں ہر شخص مثالی لگتا ہے

دفن ہے دل کے ساتھ نہ جانے کیا کیا کچھ
سینہ لیکن خالی خالی لگتا ہے

آخر آخر حاصلِ جان و حاصلِ دل
بس پامالی ہی پامالی لگتا ہے

اب وہ عالم ہم پہ نہیں آنے والا
سوکھا دشت بھی جب ہریالی لگتا ہے

۲

بجھائے دل کوئی انگارہ مل گیا مجھ کو
عطا کے نام پہ یہ کس نے دی سزا مجھ کو

یہ گرد بادِ فنا کب سے ہوں میں گردش میں
میں تھک گیا ہوں ٹھکانے لگا کے جا مجھ کو

فسانہ ختم تھا وہ بل گئے تھے اُس کے بعد
یہ خیر گزری کہ میں ڈھونڈتا رہا "مجھ کو"

تعلقات کے اِس بے کراں سمندر میں
میں ایک پل کا جزیرہ ہوں بھول جا مجھ کو

عجب سزا تھی کہ قاتل رہا قصاصِ طلب
تمام عمر مِلا میرا خوں بہا مجھ کو

وہ مر چکا تھا مگر کل نشے کے عالم میں
عزیز قیسی اُسی طرح پھر مِلا مجھ کو

غزل

حسن عبّاس رضا

نہ آرزوؤں کا چاند چمکا، نہ قربتوں کے گلاب مہکے
نہ ہجرتوں کا عذاب سہتے ہوئے مسافر گھروں کو لوٹے

نہ آنگنوں میں درختِ جاں پر، وصال موسم کا بُور جاگا
نہ ڈالی ڈالی کسی پرندے نے خوشبوؤں کے ترانے چھیڑے

ورق ورق زائچوں میں تحریر ایک سے تھے جواب، لیکن
سوال پوچھنے کی خام خواہش میں ہم نے کیا کیا عذاب چکھے

بس ایک دیوار درمیاں ہے اور اُس سے آگے کُھلا جہنم
نہ جانے کس پل کی ایک لغزش عذاب صدیاں سمیٹ لائے

ہمیں خبر ہے کہ اپنے گھر کے چراغ کوئی گھڑی ہیں لیکن
ہمیں یقیں ہے کہ روشنی کی نوید سننے تلک جلیں گے

قبیلے والو، اٹھو، اور اپنا بچاؤ کر لو کہ میں نے کل شب
فصیلِ شہرِ اماں کے باہر، نقب زنوں کے گروہ دیکھے

قیمت

افتخار اعظمی

بیس برس تک امیدوں کی جوت جگا کر
بندوقوں سنگینوں کا بن
خون کا دریا پار کیا ہے
تیری دید کے امرت اس کے اک پل کی چاہت میں ہم نے
بیس برس یہ زہر پیا ہے
قطرہ قطرہ پی کر کاٹا

بیس صدی کے پاٹ کا دریا پیر کے جب میں
اس نگری تک آ پہنچا ہوں
جس نگری میں تم رہتی ہو

میری پیاسی، حیراں آنکھیں دیکھ رہی ہیں
تیری دید کے پیالے اور میرے ہونٹوں کے بیچ کھڑی ہیں
ہونی اور انہونی باتوں کی دیواریں
جن کو ڈھانا میرے بس کی بات نہیں ہے

مشتاق سنگھ مشتاق

مُہلت

ہتھیلیوں میں فولادی کیلوں کی چمک
پاؤں میں زنجیرِ آہن
زباں پر دہکتے انگاروں کی دمک
نفس نفس، تار تار
مہربانو! کچھ کرنے کی جرأت تو دو
حکمرانو! جرم کرنے کی مہلت تو دو
تاریخ شاہد ہے
سزا کے وقت ہم لاشوں میں ڈھل جاتے ہیں
اپنے مشاغل کے صلے میں
رونقِ مقتل میں بدل جاتے ہیں
زیرِ لب مسکراہٹیں لیے
ہم طرفِ زنداں نکل جاتے ہیں
راہوں میں پھنکارتے ہوئے
ہم کچھ نہ کچھ سانپوں کے سر کچل جاتے ہیں
اسپِ وقت کی رفتار پکڑنے والو
جرم کی مہلت تو دو!
ہاں سزا کے وقت تم بھی کوئی کمی نہ کرنا
ہاں کمی نہ کرنا!

درد کے سورج کی کرنوں سے چھلنی یہ دل
کیا گا رہا ہے، یہ سب کیا ہے؟
شمعِ عہدِ محبت گل ہے
پنسل سے لکھے خط کی تحریریں
میری آنکھوں میں روشن ہیں
ننھا قاصد اک خط دے کر
تُتلا تُتلا کر کہتا ہے
بھیا نے آداب کہا ہے
چائے کی پیالی ان ہاتھوں میں کانپ رہی ہے
تارِ نفس لرزاں لرزاں ہے
قرض کا جینا سود کا مرنا
آخر اپنی قسمت کیا ہے؟
عہدِ وفا کی قیمت کیا ہے؟

خون کا دریا! بندوقوں سنگینوں کا بن؟
ہونی اور انہونی باتیں!

شباب میرٹھ

زمین نیچے ہے

ہوش آتے ہی
مجھے محسوس ہوا
آسمان میں ہواؤں کے خلاف
لڑنے والی میں اک پتنگ ہوں
جس کی ڈور زمین سے آ رہی ہے
میرے آس پاس کی پتنگیں
جو میری ہی طرح
زمین سے آتی ڈوریوں میں بندھی تھیں
بولیں ——
کہ ڈوریاں آسمان والے کے ہاتھوں میں ہیں
میں نے سوچا
آسمان اوپر ہے اور زمین نیچے

میں نے جھانک کر دیکھا
لوگ مسجدوں، گرجا گھروں اور مندروں کی
بُرجیوں پر
کھڑے ہوئے
انہیں جدھر کو چاہتے موڑ دیتے تھے
انہیں ایک دوسرے سے لڑا رہے تھے
اور کٹی ہوئی پتنگیں
اڑتی ہوئی پتنگوں میں اُلجھا رہے تھے
یک بہ یک
ہوا تیز ہو گئی
ہمارا مزاج بگڑ گیا
ہم نے
اُن کی اُنگلیوں کو زخم دینے شروع کر دیئے
اور اُن کے ہاتھوں سے لوٹنے لگیں
ہوا کی سمت بہنے لگیں
وہ سب ٹوٹی ہوئی پتنگیں لوٹنے کے لیے بے تاب تھے
اور بُرجیوں کے اوپر بھاگ رہے تھے
اُنہیں پتہ نہ تھا کہ آگے آسمان ہے
اور تبھی......

غزل

طفیل احمد مدنی

پتھروں میں چھپ گیا تھا میں یہ منظر سامنے تھا
کس کو سب الزام دیتے آپ کا گھر سامنے تھا
کیا بتاؤں کیسا کرب انگیز منظر سامنے تھا
دستِ قاتل میں کسی مظلوم کا سر سامنے تھا
یہ ہوا لے کر گئی سہمے پرندے کو کہاں
جب رُکی آندھی تو اک گرتا ہوا پر سامنے تھا
رات بھر میں غرق تھا یادوں کے ماہ و سال میں
ڈائری رکھی تھی آگے اور کلنڈر سامنے تھا
کرب کی تاریکیوں میں کیا بھیانک رات تھی
نیند کوسوں دور تھی، کانٹوں کا بستر سامنے تھا
آنکھ اُٹھا کر اس نے دیکھا تھا لبِ خاموش کو
فائلوں میں بند اک دفتر کا دفتر سامنے تھا
گاؤں کی جانب طفیلؔ آخر کو پلٹی زندگی
پھر وہی مٹی کا گھر بوسیدہ چھپر سامنے تھا

غزل

منوہر لال ہادی

ایجاد کس نے کر دیے سانچے نئے نئے
ڈھلنے لگے ہیں کاغذی وعدے نئے نئے

محوِ بلند قامتی کچھ اور بڑھ گیا
جب سے زمیں پہ آئے ہیں بونے نئے نئے

بازارِ زندگی میں پھر اک حادثہ ہوا
ہوتے ہیں موڑ موڑ پہ چرچے نئے نئے

کیا کیا نہ کیں اس عہد نے جدّت طرازیاں
رقصاں ہیں شہر شہر اندھیرے نئے نئے

شہنائیاں لیے ہوئے گھر سے چلے تو ہو
ہادیؔ سناؤ گے کسے نغمے نئے نئے

اقبال مجید

جنگل کٹ رہے ہیں

الحاج مولوی حافظ قدرت اللہ ندوی نے پہلے کار سے اُتر کر میرن ڈرائیو پر بچوں کو شکم سیر ہو کر آئس کریم کھلوائی۔

اس سے پہلے بچے شکم سیر ہو کر تلی ہوئی مچھلی اور سنکا ہوا مرغ بھی کھا چکے تھے۔

جس گاڑی میں صبح سے قدرت اللہ شہر گھوم رہے تھے وہ بمبئی کے ایک بڑے ساہوکار کی گاڑی تھی جس کا ٹینک منہ تک بھروا کر اور ایک وردی دار ڈرائیور تعینات کر کے ساہوکار نے قدرت اللہ کے حوالے کر دیا تھا جس نائٹ کلب میں قدرت اللہ اور اس کی بیوی کو کیبرے دیکھنا تھا اس کے ٹکٹ صبح ہی قدرت اللہ کی جیب میں ڈالے جا چکے تھے۔ بیوی سے یہ تاکید قدرت اللہ پہلے ہی کر چکا تھا کہ کلب کے لیے جب وہ گاڑی سے اُترے تو اپنا برقعہ گاڑی میں ہی اتار کر رکھ دے۔

جس ہوٹل میں وہ پچھلے چار روز سے مع بیوی بچوں کے مقیم تھے اس کے نرم اور گُدگُدے کارپٹ پر قدرت اللہ کی بیوی کو ننگے پیر چلنے کا کئی بار جی چاہا، دراصل وہ اس موٹی گُدگُدی کارپٹ کو تلوں سے چھونا چاہتی تھی اس لیے ایک بار اس نے شوہر کی نظر بچا کر، جب وہ وزیٹر گیلری میں کھڑی تھی اپنی ہوائی چپل سے پیر نکال کر کارپٹ کو تلوے سے چھو کر محسوس کر لیا تھا۔

الحاج مولوی حافظ قدرت اللہ ندوی کی بیوی کے پیروں میں خالص نچلے درمیانہ طبقے والی عورتوں جیسی چاندی کی پازیبیں اور جسم پر آدھا میلا اور آدھا اُجلا برقعہ تھا۔ الحاج کے بچے ان کی گھورتی ہوئی حیران حیران سی آنکھیں، گھر کی سلی قمیصوں کے بے ہنگم کالر، پالش سے بے نیاز جوتے، بھوپال کے ایک قدیم مسلم محلے سے نکلا ہوا یہ قافلہ پچھلے تین روز سے فائیو اسٹار ہوٹل کی

راہداریوں میں گشت کرتا نظر آ رہا تھا۔ ہوٹل کے ان بے میل سیاحوں کو ہوٹل میں مقیم لوگ حیرت سے دیکھتے جب کہ ہوٹل والوں کے لیے ایسے مسافروں کی آمدورفت اب عام بات ہو چکی تھی۔ کیونکہ جب بھی کوئی الیکشن ہوتا، جب بھی سرکار بدلتی یا جب بھی کابینہ میں کوئی توسیع ہوتی تو اسی طرح کے بے جوڑ مسافروں کا قافلہ ہوٹل کی راہداریوں میں گھومتا پھرتا دکھائی دیتا، بڑی بڑی پگڑیاں باندھے جھک جھک کرتی وردیاں پہنے پیٹیاں کسے دربان ان بے میل قافلوں کو دیکھ کر خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتے۔ لیکن بیرے بیچارے عادتاً ان سے بھی مسکرا کر بات کرتے کیونکہ ان بیروں کو صرف مسکرانا ہی سکھایا گیا تھا۔

اُس رات فائیو اسٹار ہوٹل کے گُدگُدے بستر پر دن بھر کی سیر و تفریح کے بعد قدرت جب دراز ہوا تو بہت دیر تک سو نہ سکا۔ پہلے تو اسے اپنا وہ دادا یاد آیا جس کی چھوٹی سی تصویر لکڑی کے معمولی فریم میں لگا کر اس کے باپ نے گھر میں ٹانگ دی تھی۔

عظمت اللہ خاں

بڑی بڑی مونچھیں رعب دار سر سید والی ڈاڑھی، بھاری بھرکم تن و توش۔ وہ بہت چھوٹا تھا جب اُس نے عظمت اللہ خاں کو بسترِ مرگ پر اپنے گھر کے اُس کمرے میں پڑا دیکھا تھا جس کی باہری دیوار پر آج سنیما گھروں کے پوسٹر لگائے جاتے ہیں جن کے عوض میں سنیما کے فری پاس ملتے ہیں اور جنھیں چرا کر فلمیں دیکھتے دیکھتے اس کے چچا کے لونڈے اوباش ہو چکے ہیں اور پٹھانوں کی ناک کٹوا رہے ہیں۔

عظمت اللہ خاں کی تصویر دیکھ کر الحاج مولوی قدرت اللہ خاں کو ہمیشہ وہ باوقار جنگل یاد آ جاتا جس میں ایک بار بہت بچپن میں وہ ان کے ساتھ گیا تھا جنگل بھرا بھرا بارعب، پُرہیبت اور پُروقار جیسے ہر طرف سے دیکھ بھی رہا ہو سن بھی رہا ہو بول بھی رہا ہو۔

شاید ایسا کبھی کوئی جنگل رہا ہو گا جس کے مہیب راستوں سے گھوڑے کی پیٹھ پر راتیں کاٹتا ہوا وہ جنگ جو، خوددار اور غیور پٹھان ادھر آ نکلا ہو گا اور دوست محمد کہلایا ہو گا۔ شیر کی کلائی، چیتے کی کمر اور عقاب کی آنکھوں والا وہ سخت کوش سپاہی جب اس سرزمین پر اُترا تھا اور جب اس کے گورے چٹے خوب رو، خوش جمال اور خوش خصال، منصب داروں نے یہاں کے بڑوں

کے جھاڑ جھنکاڑوں کو اپنی تلواروں سے کاٹ پھینکا تھا۔ تو انھیں میں کہیں الحاج مولوی حافظ قدرت اللہ خاں ندوی کا پرداد ا بوڑھے عظمت اللہ خاں کا باپ اپنے تھکے ہارے پسینے میں نہائے کوچ در کوچ کر کے مسافتیں طے کرنے والے جفاکش اور وفا شعار گھوڑے کی پیٹھ پر سے زین اُتار رہا تھا اور اس کی کمر سے اُتری ہوئی فاتح اور سرخ رو تلوار درخت کی ایک نچلی شاخ پر لٹکی ہوئی تھی اور رہلالی ندی کے جنگلوں سے آنے والی بے پناہ ممتا بھری ہوائیں سرسرا رہی تھیں کہ جنگل مہربان تھا بہت مہربان۔

اور پھر ___

اور پھر ___ چلی سمت غیب سے اک ہوا۔

اسّی سے اوپر کا سن۔

مرتعش اعضا۔

ٹمٹماتی ہوئی اندر گھسی آنکھیں۔ موت کا منتظر!

عظمت اللہ خاں۔ یو پی کے اشفاق اللہ خاں کی طرح اس دن سرپھرا ہو گیا جب اس نے بیتول کے جنگلوں میں انگریز بہادر کی کاٹی ہوئی لکڑیوں میں ایک آدی باسی کو آگ لگاتے دیکھا تھا۔ یہ جنگل ہمارے ہیں۔

ہمارے جنگلوں سے انگریز منافع کماتا ہے۔ ہم انگریز کو اپنے جنگل نہیں بیچنے دیں گے۔ ترک موالات، سول نافرمانی، ۴۲ء کے ہنگامے۔ سرفروشی کی تمنا کے ساتھ عظمت اللہ خاں بھی جنگلوں میں کٹی لکڑیوں کو آگ دکھانے لگا۔ کسی نے یہ نہ جانا کہ عظمت اللہ کہاں جاتا ہے کیا کرتا ہے۔ عظمت اللہ خاں کو کبھی کوئی تامرپتر بھی نہیں ملا۔

انگریزوں کے جنگلات کو خاکستر کرنے والا عظمت اللہ الحاج مولوی قدرت اللہ ندوی کا جدامجد بھلا یہ کب جانتا تھا کہ ایک دن عظمت اللہ خاں کا اپنا لڑکا اس کا اپنا خون انہیں جنگلات کی لکڑیاں چیرا چرا کر بیچے گا اور چوری کی کمائی سے شہر کے مختلف حصوں میں پلاٹ پر پلاٹ خریدے گا۔

اُدھر فارسٹ افسروں کو نذریں گزرتی رہیں۔

ادھر عظمت اللہ خاں کا پوتا قدرت اللہ علم دین کے حصول میں استنجے کا ڈھیلا ہاتھ میں پکڑے شرعی پاجامے کا ازار بند کھولتا اور بند کرتا رہا۔

اُدھر چوری کی لکڑی کی گاڑیاں دن دہاڑے اُترتی رہیں۔

اور اِدھر قدرت اللہ کا باپ کبھی فرنیچر اور کبھی بیوی بدلتا رہا۔

باپ کہتا تھا " قدرت اللہ میرے بھروسے مت رہنا۔ میں ایسے باپ کی اولاد ہوں جس نے میری مسیں بھیگتے ہی مجھ سے کہا تھا بس اب اپنی دنیا آپ بناؤ، میں نے خوانچے لگائے حمالی کی۔ لیکن ہاتھ نہیں پھیلایا" قدرت اللہ سن کر سنک گیا۔ سوتیلی ماں کی سرد مہری اور بھائیوں کی کج خلقی باپ کا پراسرار دھندا۔ ایک دن قدرت اللہ باپ سے بھڑ گیا۔ قدرت اللہ کا باپ بھی اُس دن غصے میں لال ہو گیا۔

" میں چور ہوں ـــــ " اُس نے جل کر پوچھا تھا " یہ بتا مجھے کہ ایماندار کون ہے ؟ مجال ہے کسی کی کہ ایک تنکا جنگل سے نکل آئے۔ مگر لکڑی آتی ہے اور آتی رہے گی۔ کون بیچتا ہے یہ لکڑی ؟ میں یہ لکڑی نہیں خریدوں گا تو میرا پڑوسی خریدے گا۔ ایماندار کون ہے ؟ پتہ ہے تجھے دفتر کے آرڈروں میں کتنے حصے لگتے ہیں ؟ بڑے بڑے حاکموں کو دیکھا ہے میں نے قبریں چاٹتے۔ مجھے ایمانداری مت سکھا۔ شکرا دا کر شکر کر تیرے باپ کی آتنی ماندان ہے ورنہ اس کام میں بھی کھلے خزانے ہندو مسلمان کا چکر چل رہا ہے۔ وہ دس ٹرک اُٹھالیں تو کچھ نہیں، میاں لوگوں کے یہاں دو ٹرک اُترے کہ بھویں سکڑنے لگتی ہیں۔ تجھے ایماندار بننا ہے تو اپنا راستہ ناپ ـــــ "

اور اسی روز قدرت اللہ نے باپ سے قطع تعلق کر کے اپنا راستہ ناپ لیا تھا۔

وہ ساری رات سو نہ سکا۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے اس نے اپنے سرہانے رکھی مولانا آزاد کی رکھی ترجمان القرآن کے صفحات کو اُلٹا پلٹا۔ جس صفحے پر اُس کی نظریں ٹھہریں اس پر حدیث قدسی تحریر تھی۔ کئی بار وہ اس تحریر کو پڑھ چکا تھا، کئی بار وہ اس کے معصوم استدلال پر سحرزدہ سا ہو کر رہ گیا تھا۔

" اے میرے بندو ! اگر تم میں سے سب انسان جو پہلے گزر چکے اور وہ سب جو بعد کو پیدا ہوں گے اور تمام اِنس اور تمام جِنّ اُس شخص کی طرح نیک ہو جاتے جو تم میں سب سے زیادہ

حقی ہے تو یاد رکھو اُس سے میری خداوندی میں کچھ بھی اضافہ نہ ہوگا۔

اے میرے بندو! اگر وہ سب جو پہلے گزر چکے اور وہ سب جو بعد کو پیدا ہوں گے اور تمام اِنس اور تمام جِن اُس شخص کی طرح بدکار ہو جاتے جو تم میں سب سے زیادہ بدکار ہے تو اُس سے میری خداوندی میں کچھ بھی نقصان نہ ہوتا۔

اے میرے بندو! اگر وہ سب جو پہلے گزر چکے اور وہ سب جو بعد کو پیدا ہوں گے ایک مقام پر جمع ہو کر مجھ سے سوال کرتے اور میں ہر انسان کو اس کی منہ مانگی مراد بخش دیتا تو میری رحمت اور بخشش کے خزانے میں اس سے زیادہ کمی نہ ہوتی جتنی کسی سوئی کے ناکے جتنا پانی نکل جانے سے سمندروں میں ہو سکتی ہے۔

اے میرے بندو! یہ تمہارے اعمال ہی ہیں جنھیں میں تمہارے لیے انضباط اور نگرانی میں رکھتا ہوں اور پھر انھیں کے نتائج بغیر کسی کمی بیشی کے تمہیں واپس دے دیتا ہوں۔"

انضباط — !

قدرت اللہ نے کروٹ بدلی جیسے انگاروں پر لوٹ رہا ہو۔

انضباط یعنی ضابطہ ——— یہ تمہارے اعمال ہی ہیں جو تمہارے لیے ضابطہ ہیں۔ تمہاری نگرانی ہیں۔ قدرت اللہ کا گلا رندھ گیا اور وہ گھٹی ہوئی آواز میں بس اتنا ہی کہہ سکا:

"اے پالنے والے میں تیری شانِ ربوبیت کے قربان کیسے کیسے غاصب راتوں رات اہلِ دول بن گئے، انھوں نے یتیموں اور بے کسوں کا مال دبایا اور اپنے صدر دروازوں پر ھٰذا من فضل ربّی کا کتبہ نصب کیا۔ ان نو دولتوں کی بھیڑ میں مجھے میری پہچان بتا۔ مجھے میری شناخت عطا کر۔"

وہ ہاتھ جو اُس رات گڑگڑا کر دعا کے لیے اُٹھے تھے آج فائیو اسٹار ہوٹل کے نرم نرم بسترِ استراحت پر گہری نیند سو رہے تھے۔ بھوپال سے بمبئی قدرت اللہ اپنے بچوں کے ساتھ نتری جی کے ایماء پر آیا تھا۔ یہ خاطر مدارات انھیں کے اشارے پر تھی وہ جانتا تھا کہ دو ایک روز بعد اسے واپس گھر جانا پڑے گا۔

سویرے ہوٹل کے منیجر کو ایک فون ہوا ——— پوچھا گیا:

"آپ کے کمرہ نمبر ۱۶۰ میں کچھ میاں لوگ ٹھہرے ہیں؟"
"جی میاں لوگ ــــ؟" منیجر بڑبڑایا پھر سنبھلا۔
"اچھا ہاں ــــ میاں لوگ! ہاں ٹھہرے ہیں۔"
"اُن سے بول دیجیے دوپہر کا کھانا انھیں منتری جی کے ساتھ کھانا ہے۔"
"منتری جی کے ساتھ؟ آل رائٹ سر، کہاں کھانا ہے؟ کس منتری جی کے ساتھ؟"
"یہ سب ان کو معلوم ہے۔" اور ٹیلی فون کٹ گیا۔

دن چڑھ آیا تھا۔ الحاج مولوی قدرت اللہ ندوی نے جب بستر کی چائے سے گلّی کر کے منہ صاف کیا تو اس کے چہرے پر تازگی اور شگفتگی تھی۔

باپ نے قدرت اللہ کو درس و تدریس کی جس راہ پر لگایا تھا اس کے پیچھے ممکن ہے یہ جذبہ بھی رہا ہو کہ شاید اسی بہانے ان کی عاقبت سُدھر جائے، پر جب انھوں نے دیکھا کہ لڑکے کے چکر میں دنیا بھی ہاتھ سے جا رہی ہے اور لڑکا کچھ زیادہ ہی اللہ والا ہو گیا ہے تو انھوں نے ہوشیار بنیے کی طرح مرچوں کا بورا جھاڑنا شروع کر دیا۔

یہ وہ وقت تھا جب ملک کی سیاست میں میاں لوگوں کی حالت جنگل سے چُرائی ہوئی اُس لکڑی کے مانند تھی جسے ہر ٹھیکیدار اپنے پیٹھے پر اُتروا لینے کا متمنی رہتا تھا۔ قدرت اللہ بیچارہ آسمان سے گرا تو ببول میں اٹکا اسے سیاست کے ایک پیشہ ور کھلاڑی نے لُچک لیا اور تب ہی مولوی قدرت اللہ ندوی کے ساتوں طبق روشن ہو گئے۔

سب سے پہلا کام پارٹی نے یہ کیا کہ مولوی قدرت اللہ ندوی کو حج کرنے بھیج دیا کہ پارٹی کو مسلمانوں کی خوشنودی کی ضرورت تھی۔ پھر الحاج مولوی قدرت اللہ کو پارٹی کی تبلیغ کے کام پر لگا دیا گیا۔ تب سے قدرت اللہ کی بیوی اپنے بچوں کو ایک وقت بھنسے کے کباب اور ایک وقت تور کی دال اور چاول کھلاتی ہے، خالی وقت میں کھری چارپائی پر بیٹھ کر بڑی لڑکی کے سر کی جوئیں دیکھتی ہے، لڑکا پاس کے نل سے دن میں دو وقت پانی بھرتا ہے گھر کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ، چھوٹے سے آنگن میں ایک سائبان سے اٹھتا گیلی لکڑیوں کا دھواں، دن کی تھکن، رات کی کسلمندی، ننھی ننھی خوشیاں، ننھے ننھے غم۔

قدرت اللہ بیچارہ دن میں اپنے پارٹی لیڈر کے بچوں کی جوتیاں چپلیں ٹھکواتا ہے سبزی اور جنس خریدتا ہے، آنے جانے والے مہمانوں کا سامان رکھتا اور اٹھاتا ہے اور دفتر میں قلم سے کہتا ہے لکھ:

"یہ کیسی فیملی پلاننگ ہے۔ یہ تو مسلمانوں کی نسل کشی ہے۔"

قلم سے پھر کہتا ہے لکھ اور قلم لکھتا ہے:

"جہاں ہندو پٹیں وہاں فساد پاکستانی ایجنٹوں نے کرایا اور جہاں میاں لوگ پٹیں وہ فسادات کی ذمہ داری کانگریس کی ہے۔ لکھنے کی سب کو آزادی ہے اس لیے سب لکھ رہے ہیں۔"

کشمیر کشمیریوں کا ہے، بنگال بنگالیوں کا ہے، آسام آسامیوں کا ہے، خالصتان سکھوں کا ہے، پاکستان مسلمانوں کا ہے، رہ گیا ہندوستان تو ہندوستان ہندوؤں کا ہے۔ یہ بات بعد میں دیکھی جائے گی کہ مسلمانوں کے پاکستان میں شیعوں کا پاکستان کتنا ہے اور سنیوں کا پاکستان کتنا۔ ہندوؤں کے ہندوستان میں پنڈتوں کا ہندوستان کتنا ہے اور شودروں کا کتنا۔ خمینی، ریگن، برژنیف، سب کے پاس اپنے اپنے جنگل ہیں۔ ڈنس فارسٹ! تاریخ کو بہت سے فیصلے کرنے ہیں پہلے بھی کیے ہیں آگے بھی کرے گی۔

قدرت اللہ کے دفتر کے پڑوس سے استانی جی کی آواز آ رہی ہے جو سر سے دو پٹہ اوڑھے آٹھویں جماعت کی لڑکیوں کو اردو پڑھا رہی ہیں۔

اے آب رود گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو

لڑکیاں ایک ساتھ دہرا رہی ہیں۔ لحن میں گا رہی ہیں۔

اے آب رود گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو

آب رود گنگا

آب رود گنگا

قدرت اللہ مارے غصے کے کانپنے لگا۔ تب ہی اس کی نظر اردو کے مقامی اخبار پر پڑی جس پر لکھا تھا:

مدھیہ پردیش حکومت نے اردو اکاڈمی کا سالانہ بجٹ ۳۵ ہزار سے بڑھا کر پانچ لاکھ روپے کر دیا ہے۔ قدرت اللہ کے منہ کا ذائقہ اور کڑوا ہو گیا۔ اس نے اخبار کی سرخیوں پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔

علاقۂ ناموسِ ادب کا جلسہ۔ (چائے کے ساتھ ناشتہ بھی ملے گا)
یوسف سیٹھ کے صاحبزادے کے عقیقے پر غزل مشاعرہ۔
جشن ناطق بھوپالی۔
عوامی شاعر زہریلی شراب پی کر اسپتال میں۔
مناسب معاوضہ پر اصلاح کے لیے غزلیں اس پتے پر بھیجیں۔
بھیاں اب بھی گا رہی تھیں:

اے آب رود گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

تاریخ کو بہت سے فیصلے کرنا ہیں، پہلے بھی کر چکی ہے آگے بھی کرے گی۔
آخر کو قدرت اللہ اپنی میز پر سے اُٹھا اور پڑوس کی حویلی میں ولیمہ کھانے چلا گیا۔
صاحبِ خانہ نے دسترخوان پر بٹھانے سے پہلے چپکے سے اس کے کان میں کہا:
"ارے خان ایسا چکنا اور تیار سا مبصر ملا ہے کہ انگلیاں تربہ تر ہو جائیں گی۔"
قدرت اللہ ایسے فقرے بہت بار سن چکا تھا مسکرا کر بولا:
"بھوپالیوں پر نیلوں سامبھروں اور چیتلوں کا ہمیشہ سے بڑا احسان رہا ہے۔"
عام طور پر ولیموں سے ایک دو روز پہلے یہ غریب جانور جنگل سے ٹہلتے ہوئے باہر نکل آتے ہیں اور پھر انھیں جو بھی پہلا شکاری ملتا ہے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ بھائی ہمیں خدا کے لیے مار بھیے اور شکاری بیچارہ پہلے انھیں سمجھاتا ہے کہ حضور آج کل آپ کو مارنا سخت منع ہے آپ واپس جنگل میں تشریف لے جائیے مگر جب جانور انھیں شہر میں ہونے والے ولیموں کا واسطہ دیتے ہیں تو رسماً مگر جبراً شکاری انھیں مار لاتا ہے۔
الحاج مولوی قدرت اللہ ندوی منتری جی کے ساتھ کھانا کھا چکا تو اسے ہدایت کی گئی کہ منتری جی اسے اندر کے کمرے میں بلا رہے ہیں۔
قدرت اللہ اندر گیا۔ دیکھا ہزاروں روپئے میز پر گڈیوں کی شکل میں پڑے ہیں۔ پہلے تو منتری جی نے بمبئی کی تفریح کے بارے میں قدرت اللہ سے معمولی سے سوالات کیے۔ قدرت

کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس نے منتری جی کو بتایا کہ اس نے بچوں کو خوب گھما پھرا دیا ہے
۔ منتری جی نے اس کے بارے میں بمبئی میں جن جن لوگوں سے خاطر مدارات کرنے کے لیے
چاہتا اُن سب نے اُس کی خوب مدارات کی ہے۔ پھر منتری جی بولے :
"یہ ساٹھ ہزار روپیہ ہے اسے سنبھال کر رکھو۔"
قدرت اللہ نے نوٹوں کو اس بے توجہی سے دیکھا جیسے سگریٹ کی خالی ڈبیوں کو
بھ رہا ہو۔ پارٹی میں روپیوں کی ریل پیل لگی ہی رہتی ہے۔
"تمہیں یہ روپیہ چناؤ چھیتر میں امبو بابو کو پہنچانا ہیں۔"
"امبو بابو کو ـــــ" قدرت اللہ نے نام کو اس طرح دُہرایا جیسے یقین کر لینا چاہتا ہو
۔ جو کچھ اُس نے سنا وہ ٹھیک تھا یا نہیں۔
"ہاں امبو بابو کو ـــــ" منتری جی نے اپنے سامنے رکھی ہوئی ڈھیر ساری ڈاک میں
سے ایک لفافہ کھولتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا۔
"اُن سے کہنا ہم نے کہا ہے ہمارا کینڈیڈیٹ جیتنا نہیں چاہیے۔"
"جی، کسے جیتنا نہیں چاہیے ـــــ؟" قدرت اللہ چونک پڑا۔
"رام دھن گوسوامی کو ـــــ"
رام دھن گوسوامی منتری جی کی پارٹی کا آدمی تھا۔ بہت نیک، بہت ایماندار، یہ بات جب
ت اللہ نے منتری جی کو باور کرائی اور یہ بھی بتایا کہ بیس برس سے وہ بال بچوں کو چھوڑ کر
ٹی کی چوکھٹ پر ہی سوتا ہے اور بائی الیکشن میں اس کو جو ٹکٹ ملا تھا اس نے پارٹی کے
کنوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑا دی تھی۔ اُس رام دھن کے لیے منتری جی یہ کہہ رہے ہیں
اس کو جیتنا نہیں چاہیے تو منتری جی مسکرائے تھے اور بولے تھے :
"صرف کہہ ہی نہیں رہا ہوں بلکہ اس کام کے لیے ساٹھ ہزار روپیہ بھی بھیج رہا ہوں۔"
"رام دھن تو اپنی پارٹی کا آدمی ہے؟" تو جواب میں قدرت اللہ کو بتایا گیا :
"اپنی پارٹی کا تو ہے پر اپنے گروپ کا نہیں ہے میاں جی۔"
"مطلب ـــــ؟" قدرت اللہ کے منہ سے نکل گیا۔

"اگر تم چاہتے ہو کہ ہم مکھ منتری بنیں تو گوسوامی کا ہارنا ضروری ہے"
"میں سمجھا نہیں"
"ستنا خالی اپنی پارٹی سے نہیں ملتی، ستنا اپنے لوگوں سے ملتی ہے اور رام دھن اپنی پارٹی کا تو ہے، اپنا نہیں" پھر منتری جی نے تھوڑا توقف کیا اور بُرا سا منہ بنا کر بولے "مارشل لا ہی چلا نا آیا ہے ابھی تک آخر تم میاں لوگ پرجا تنتر چلانا کب سیکھو گے"
قدرت اللہ نے چپ چاپ بریف کیس میں نوٹ بھرے، سفر پر نکل کھڑا ہوا اور اٹبو بابو کی میز پر بر وقت بریف کیس خالی کر دیا۔ رام دھن گوسوامی ہار گیا۔
اس چناؤ میں محمد بیگ کو خاص طور پر تقریر کرنے کو بلایا گیا تھا۔ محمد بیگ ایک بہت بڑے ووٹروں کے مجمع کو خطاب کر رہے تھے۔
ذرا اس دُلہن کو دیکھو جس کا دولہا گھوڑے پر چڑھ کر اور سات پھیرے ڈال کر اسے بیاہ لے جانے والا ہے۔
"جس قالین پر وہ دُلہن بیٹھی ہے اس کے تانے بانے مسلمان کاریگروں نے ڈالے ہیں جو ساڑی اس کے بدن پر لپٹی ہے اسے بنارس کے مسلمان بُنکروں نے بُنا ہے، سہاگ کی جو چوڑیاں وہ پہنے ہے انھیں فرید آباد کے مسلمان شیشہ گروں نے تیار کیا ہے، جو برتن وہ جہیز میں لے کر جا رہی ہے اُن پر مراد آباد کے مسلمان کاریگروں کے ہاتھوں نے نقش و نگار بنائے ہیں، جو تالا اُس نے بکس میں ڈالا ہے اسے علی گڑھ کے مسلمان کاریگروں نے بنایا ہے، ہم کیسے بھول سکتے ہیں مسلمانوں کو، اُن کے ہاتھ کٹیں گے تو یہ دلہن کیسے سجے گی؟"
قدرت اللہ چناؤ چھیترسے بھوپال واپس آگیا۔ وہی بلندیاں وہی بستیاں، وہی دو قدم چل کر بند ہو جانے والی کھٹارا موپیڈ، کبھی پیدل کبھی سائیکل پر، وہی زہریلے چائے خانے، وہی بجھے بجھے سے صبح و شام ۔ جمعہ کی نماز ۔ پھر اس کے بعد دفتر۔
اپنے مسلک سے چمٹا ہوا قدرت اللہ، بھولے پن کے ساتھ وفاداری اور استواری کے دامن کو تھامے تھا۔ سیاست نہ ہندو ہوتی ہے اور نہ مسلمان، سیاست خود ایک مذہب ہے، خود ایک ضابطہ ہے۔ جو پہلے جو کچھ بنا رہے تھے وہی آج بھی بنا رہے ہیں، جو پہلے بچولیے بن کر ان سے مال خرید کر

مالدار بن رہے تھے وہی آج بھی بن رہے ہیں۔
کدھر سے جاؤ گے ___ ؟
ساری راہیں مسدود ہو چکی ہیں۔
جنگلوں میں لوٹ جاؤ ___ جنگلوں میں لوٹ جاؤ، اگر جنگل باقی ہوں۔
لیکن قدرت اللہ ندوی نے بڑا صبر کیا۔ نماز چھوٹ گئی لیکن ڈاڑھی نہیں منڈائی۔
ان اللہ مع الصابرین۔

قدرت اللہ کو جب بھوک لگتی اخبار لکھتے لکھتے دفتر سے اٹھتا مدینہ ہوٹل میں آدھا پلیٹ روغن جوش اور تین رومالی روٹیاں کھاکر شکرا لحمد اللہ کرتا اور پھر دفتر میں بیٹھ جاتا۔ گھر پر بیوی بچوں کو تور کی پانی ملی دال کھلاکر سُلا دیتی۔ قدرت اللہ کبھی کبھی اپنے گھر بھی چلا جاتا۔

پیسے والے مسلمان ٹھیکیداروں میں قدرت اللہ ندوی کے باپ کا بڑا نام شہر میں تھا۔ یہ سارے ٹھیکیدار روائتی مغلئی کھانوں کے بڑے شوقین تھے اور جب سے ہندوؤں میں مغلئی کھانے Status Symbol کی جگہ لینے لگے تھے ان ٹھیکیداروں کے گھروں کے کبابوں کا بڑا بول بالا تھا۔ قدرت اللہ کا باپ ہفتہ میں ایک بار سارے ٹھیکیداروں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتا۔
سارے ٹھیکیدار ایک ہی کھانا کھاتے تھے۔
سارے ٹھیکیدار ایک ہی اردو کا اخبار پڑھتے تھے۔

ہاں بیچارہ قدرت اللہ کا باپ مشاعروں کو چندے بڑے پیار سے دیتا تھا اور اکثر شاعروں کی ضیافتیں بھی کرتا۔ دوسرے ٹھیکیداروں کی طرح قدرت اللہ کے باپ کے چُونے میں بھی بالائی پڑی ہوتی اور کپڑے پان کی پیکوں کے دھبّوں سے داغدار رہتے۔

ایک رات جب قدرت اللہ اپنی بیوی کے ساتھ مباشرت کرکے لیٹا تھا تو اسے خبر ملی کہ اس کے باپ کو دل کا دورہ پڑ چکا ہے اور وہ اسپتال میں بھرتی ہے۔
بیوی نے بہت کہا کہ وہ باپ کو جاکر دیکھ آئے۔ قدرت اللہ کروٹیں بدلتا رہا۔
ابّا تم نے مجھے کیا دیا ___ ؟
ابّا تم نے خود کیا پایا ___ ؟

ابا تم کہتے رہے کہ مسلمانوں کا مستقبل کانگریسیوں کے ہاتھ میں ہے۔ تیس برس تک تم نے کتنا پسینہ جلسوں میں دریاں بچھائیں ــــ ابا تم کو بھی عام مسلمانوں کی طرح اپنے آپ کو مسلمان بھارتی کہتے اچھا لگتا تھا ــــ میں نے تم سے کہا تھا:

کیوں کوستے ہو حالات کو۔ کیوں روتے ہو دوسروں کے آگے؟ تم جمہوری ملک کے آزاد شہری ہو۔ تم مسلمان بھارتی نہیں ہو۔ مسلمان بھارتی اپنا حشر پچھلے بیسوں برسوں سے دیکھ رہا ہے تم مسلمان بھارتی نہیں بلکہ بھارتی مسلمان ہو۔

بھارتی مسلمان ــــ ؟ تم چونک پڑے تھے۔ یہ بھارتی مسلمان کیا تمہارے خیال میں مسلمان بھارتی سے کوئی الگ چیز ہے؟

ہاں ابا! مسلمان بھارتی اور بھارتی مسلمان میں بہت فرق ہے۔

جیسے ــــ ؟

جیسے تم اور میں۔

میں کیا ہوں؟

تم مسلمان بھارتی ہو۔ تم اپنے کو پہلے مسلمان سمجھتے ہو۔ پہلے تمہیں مسلمان نظر آتا ہے اس کے بعد بھارت، اور یہی تمہاری بھول ہے۔

تم اپنے کو کیا سمجھتے ہو؟

میں ــــ میں بھارتی مسلمان ہوں۔

مطلب ــــ ؟

مطلب میں پہلے بھارتی ہوں اس کے بعد مسلمان۔

ابا اُس دن جمعہ تھا۔ تم نماز پڑھ کر واپس آئے تھے، تم نے مجھے اپنے پاس بلایا تھا۔ تمہاری آنکھوں کے پپوٹے بھاری ہو رہے تھے تم دھیمے سے بولے تھے:

"قدرت اللہ میں نے دعا میں ہاتھ اٹھا کر اپنے خدا سے بار بار یہی مانگا تھا کہ اے میرے مالک اگر میرے دل میں میرے ملک سے ذرا بھی نفرت ہے تو مجھے اسی وقت اس دنیا سے اٹھالے ــــ بیٹا ہم کسی کے لیے بھارتی نہ بن سکے۔ یہ ندامت بھی ہے کہ ہم کسی کے لیے

مسلمان بھی نہ بن سکے۔ اتنا اطمینان ضرور ہے کہ دولت کے پیچھے بھاگتی اِس دنیا میں ہم بھی دس پانچ لاکھ چھوڑ کر ہی جائیں گے۔ خیر بیٹا! ہماری تو کٹ گئی اب تمہارے دن آئے ہیں تم مسلمان بنے، مولوی ہوئے، حافظ بنے، اب بھارتی بننا چاہتے ہو۔"

قدرت اللہ کا باپ وارڈ کے ایک پلنگ پر اپنے دل پر ہاتھ رکھے لیٹا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی اس کے ہوش و حواس لوٹے تھے۔ اس نے اپنے چاروں طرف اپنے عزیزوں کو دیکھا سب تھے قدرت اللہ نہیں تھا کسی نے اس سے دھیمے سے کہا:

"قدرت اللہ کو بلا لوت۔ اسے بھی دیکھ لو۔"

قدرت اللہ کے باپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

جیتے جی تو اس کی شکل نہیں دیکھوں گا۔ اندر سے دل بولا۔۔۔ کون ہے وہ میرا؟ میرے نطفے سے ہوتا تو جان دے دیتا مگر مولوی فاضل ہو کر یوں غلاموں کی طرح سیاسی آقاؤں کے گھروں کی سبزیاں نہ خریدتا پھرتا۔ اپنا نسلی وقار، اپنے خاندان کی آن، اپنی روایت کی شان کچھ بھی یاد نہیں رہا اسے کس طرح اکڑ کر بولا تھا اُس روز:

"تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ پارٹی میں نیچے سے اوپر جانے کے لیے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔"

"مگر تیری پارٹی مسلمانوں کی دشمن ہے۔"

"وہ دن گئے ابا۔ اب مسلمانوں سے دشمنی کر کے کوئی پارٹی پنپ نہیں سکتی۔"

"تیری پارٹی میں گُنڈے پالے جاتے ہیں۔"

"ہماری پرجا تنتر میں گُنڈوں کے بغیر کسی پارٹی کا کام ابھی کچھ دنوں اور نہیں چل سکتا۔"

"تو کیا چاہتا ہے۔۔۔؟"

اور وہ کمبخت کیسا ڈھیٹ بن کر بولا تھا۔ کیسی زہریلی آواز میں بولا تھا:

"کاٹنا چاہتا ہوں۔۔۔ جنگل کاٹنا چاہتا ہوں۔"

"کیا بکتا ہے۔۔۔؟ باپ پر پھبتے کستا ہے۔

اور پھر الحاج مولوی قدرت اللہ بکتا ہی چلا گیا تھا۔

میں وہی چاہتا ہوں ابا جو سب چاہتے ہیں۔ جب تک کمزور ہو دوسروں کی جوتیاں

سیدھی کرو، خوشامد کرو، تلوے چاٹو، رات کو دن اور دن کو رات کہو۔ بے ضمیری کی چادر میں ساری کمزوریاں چھپ جاتی ہیں اور سارے کمزور یہی کرتے ہیں۔ جب بھی تھوڑا آگے بڑھنے کو ملے دوسروں کو کچل کر آگے بڑھو، سارے آگے بڑھنے والے یہی کرتے ہیں۔ دنیا میں بڑے لوگ کم ہیں، زیادہ تعداد عام لوگوں کی ہے۔ دھکیل کر آگے بڑھنا، کچل کر آگے بڑھنا بہت عام ہے۔ دنیا میں زیادہ تر نادار لوگ ہیں، کم ہنر ہیں، کم استعداد ہیں۔ لیکن ان عام لوگوں کی زندگی میں بھی دو ایک موقعے آتے ہیں جب وہ کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔ وہ موقع کہاں ہے، کب ہے کس طرح ہے؟ جو صحیح وقت میں صحیح طور پر صحیح جگہ اس موقع کو پالیتا ہے، اس موقع کو استعمال کر لیتا ہے۔ وہ اپنی ناداری سے اپنی کمزوری سے اپنی کم مائگی سے چھٹکارا پالیتا ہے اور بعد میں اپنی ناداری کے دنوں کی کہانیاں دوسرے ناداروں کو چٹخارے لے لے کر سناتا ہے۔ سننے والے اس کی قسمت پر رشک کرتے ہیں اور پھر خود بھی دوسروں کو دھکیلنے اور کچلنے میں لگ جاتے ہیں۔ قدرت نہ تو اتنی فیاض ہے اور نہ اتنی مالدار کہ سب کو چنگیز خاں بنا دے۔ عظیم صلاحیتوں کا خزانہ بہت محدود ہے۔ میراتھان دوڑ میں حصہ لینا سب کے بس کی بات نہیں جو بازو والی گلی سے نکل جائے وہی کھلاڑی ہے
ابا تمہاری شان، تمہارا عیش آرام، تمہاری دریاں، تمہارے قالین، تمہارا دسترخوان اور تمہاری ضیافتیں جنگل لگانے پر نہیں جنگل اجاڑنے پر قائم ہیں۔

اس لیے کاٹو ــــ کاٹو۔

ہواؤں نے کہا ــــ دیکھو ہم سوکھ جائیں گے اور تب لو چلے گی۔

مگر جنگل کٹتا رہا۔

بادلوں نے کہا ــــ دیکھو اب ہمیں کون روکے گا، دیکھو ہم برسنا چھوڑ دیں گے۔

مگر جنگل کٹتا رہا۔

زمین نے کہا کہ ہم پیلے سے مرے تو ایک اکھوا بھی دیکھنے کو ترس جاؤ گے۔

مگر جنگل کٹتا رہا۔

کل کے موسم کل آئیں گے آج کی رُت تو اپنی ہے۔

ابا جنگل کٹتے کٹتے کٹتا ہے۔

ہم سب اپنے اپنے جنگل کاٹ رہے ہیں۔
ہوائیں دھیرے دھیرے سوکھ رہی ہیں، بادل اوپر سے نکل جاتے ہیں برستے نہیں۔
زمین العطش العطش پکار رہی ہے۔
لیکن اب بھی شاید کچھ جنگل موجود ہے اس لیے ــــ کاٹو ــــ کاٹو۔
میراتھان دوڑ میں حصہ لینا سب کے بس کی بات نہیں۔ جو بازو والی گلی سے نکل جائے وہی کھلاڑی۔

اس لیے کاٹو ــــ کاٹو جنھیں کل جنگل کی ضرورت ہوگی وہ پھر جنگل اُگالیں گے۔
بیوی نے کہا "جاؤ اباکی حالت ٹھیک نہیں ہے انھیں دیکھ آؤ۔"
قدرت اللہ نے جو سامنے رکھے کاغذ پر قلم سے کھیل رہا تھا نہ جانے کس بے خیالی میں اُس نے کاغذ پر ایک بڑی سی موٹی سی اور بھدی سی گالی لکھی اور پھر بہت دیر تک اُس گالی کے حروف پر قلم پھیر کر اسے خوش خط اور دیدہ زیب بناتا رہا۔ مختلف زاویوں سے اس میں روشنائی بھرتا رہا۔ آخر کو آڑی ترچھی لکیروں کے ساتھ اسے کاٹنے لگا۔ باریک لکیریں جب اس گالی کو چھپانہ پائیں اور وہ لکیروں کے پس منظر میں بھی اس طرح نظر آتی رہی کہ پڑھی جا سکے تو قدرت اللہ نے وہ کاغذ پھاڑ کر پھینک دیا۔ جب باپ کا جنازہ جا رہا تھا تو قدرت اللہ اپنے کمرے میں اُن پھٹی ہوئی چندیوں کے درمیان سو رہا تھا۔

رفیعہ منظور الامین



محبوب

پُل پار کرتے ہی تھوڑی دور پر سینکچو یری کا بڑا سیاہ بورڈ لگا تھا، جہاں دور ہی سے جنگل کے گھنیرے سائے نظر آتے تھے۔ سینکچو یری میں داخل ہو کر کچھ دور جانے پر فارسٹ گارڈز کے چند جھونپڑے بنے تھے ـــ بانس اور کھپریل کے، جن پر سرد ہواؤں کو روکنے کے لیے کالی مٹی کا لیپ کر دیا گیا تھا۔ ان جھونپڑوں میں صرف فارسٹ گارڈز ہی نہیں بلکہ اکثر وہ مزدور بھی چند روز کے لیے آکر بس جاتے جو عارضی طور پر بانس اور ساگوان کے جنگل کاٹنے پر مامور کیے جاتے ـــ تب ان جھونپڑوں میں کچھ رونق ہو جاتی۔ تہواروں اور پورنیما پر ڈھول بجتے اور یہ مزدور اور ان کی عورتیں، تاڑی کے سرور سے سرشار اپنے علاقائی گیت گا گا کر دھپڑے کی تال پر خوب ناچتے، لیکن جب یہ مزدور کام نپٹا کر اپنی مزدوری لے کر چلے جاتے، تب وہاں صرف تنّا اور اس کا خاندان باقی رہ جاتے ـــ تب تنّا کی عورت اپنے بچوں سمیت ان جھونپڑوں میں گھس پڑتی کہ شاید کوئی بھولا بسرا سامان ہاتھ لگ جائے۔ اسے ہمیشہ ہی نا امیدی ہو جاتی۔ لیکن اب خالی جھونپڑے جھانکنا اس کی عادت سی بن گئی تھی ـــ صرف ایک بار اسے وہاں مٹی کا ایک خالی مٹکا مل گیا تھا جسے وہ اُٹھا لائی۔ لیکن دو دن بعد چار میل کی مسافت طے کر کے اس مزدور کی عورت واپس آئی اور لڑ جھگڑ کر اپنا گھڑا واپس لے گئی۔

تنّا آدی باسی تھا۔ وہ جب وہاں فارسٹ گارڈ کی طرح آیا تھا تو صرف اس کی بیوی ساتھ آئی تھی۔ اس کے آٹھوں بچے اسی جھونپڑے میں پیدا ہوئے تھے۔ اب وہ اور اس کی بیوی دونوں وقت سے پہلے بوڑھے ہو چکے تھے۔ ان کا بڑا لڑکا میٹرک پاس کر کے شہر چلا گیا تھا۔ وہ اپنے باپ کی طرح فارسٹ گارڈ نہیں بننا چاہتا تھا، کیونکہ پھر اسے زندگی بھر رسٹ

گاڑ ڈی ہی بنے رہنا پڑتا جیسا اس کا باپ تھا ـــ کیونکہ وہ آدی باسی تھا۔ اس کے دوسرے ساتھی جو آدی باسی نہیں تھے، ان کی ترقیاں ہو گئی تھیں، وہ ایک ایک کر کے شہر جا بسے تھے۔

بچوں میں تیسرا نمبر گاچی کا تھا۔ شکل وصورت میں گاچی، تنا کے بچوں میں سب سے باغی تھی۔ پھر بھی اس کا قدردان کوئی نہیں تھا، کیونکہ وہ گونگی تھی۔ آٹھ بچے پیدا کر کے تنا کی عورت زندگی کی دوڑ میں ہانپ گئی تھی۔ اب وہ جھونپڑے کے کونے میں پڑی کھانستی رہتی اور گاچی کی بڑی بہن سوتی اس سارے کنبے کی دیکھ بھال کرتی۔ وہ گاچی سے پکڑ دھکڑ کر کچھ کام تو لے لیا کرتی لیکن اس کی نظر چوکتے ہی گاچی ہرنی کی چوکڑیاں بھرتی جنگل میں گم ہو جاتی۔ اس طرح اسے ڈانٹ پھٹکار سے نجات مل جاتی۔ سوتی کے لیے غنیمت تھا کیونکہ گاچی کی موجودگی اس کے لیے بھی دردِ سر تھی، جتنی دیر وہ سامنے ہوتی، کوئی نہ کوئی مصیبت کھڑی کرتی۔

کنبے کی لڑکیوں کو تو اسکول جانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ سوتی بیچاری دونوں چھوٹے بھائیوں کو صبح تیار کر کے ان کا توشہ ہاتھ میں دے کر اسکول بھجواتی تو اُن کے پیچھے پیچھے جا کر گاچی ان کی روٹیاں چھین کر بھاگ جاتی۔ وہی روٹیاں سینکچوری کے بندر ہضم کرتے جن سے گاچی کا یارانہ تھا۔ بندر ہی نہیں، ایسا لگتا تھا جیسے سینکچوری کے سبھی جانور گاچی کو اچھی طرح جانتے تھے اور گاچی انہیں ـــ ان کے تعلقات کافی مستحکم تھے کیونکہ وہ جانور کبھی اسے گونگے پن کا طعنہ نہیں دیتے تھے، نہ مار، نہ پھٹکار کرتے۔ اس کا گزر جنگل کے صرف اُس حصّے میں نہیں تھا جہاں خونخوار جانوروں کی اقلیم تھی۔ ویسے بھی اس کی چھٹی حس اِن جانوروں کی موجودگی سے اسے خبردار کر دیتی تھی اور وہ سرپٹ وہاں سے بھاگ آتی۔

زندگی کے پندرہ، سولہ سالوں میں بھی اس کا کھلنڈرہ پن ختم نہیں ہوا، بلکہ اس میں استغنا بھی شامل ہو گیا۔ گھر میں اس کی کسی کو چنداں پرواہ نہیں تھی۔ صرف ماں تھی جو اس کی طویل غیر حاضری کو محسوس کر کے فکرمند ہوتی۔ وہ تنا کو دق کرتی کہ گاچی کو ڈھونڈھ لائے اور وہ خاموشی سے چلم بیٹھا پیتا رہتا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ گاچی جنگل میں سرسراتا ہوا کا جھونکا ہے اس کا کچھ بگڑنے والا ہے اور واقعی گاچی واپس آجاتی۔ بھوک لگی ہوتی تو خود ہی ہنڈیا سے نکال کر کچھ کھا لیتی ورنہ ڈبک کر ماں کی گدڑی میں ہی سو جاتی جیسے وہ خود بھی ماں کی گدڑی کا

ایک بوند لہو

رات میں جنگل کے سارے راز انگڑائیاں لے کر جاگ پڑتے۔ جگنوؤں کے جھنڈ تیرگی میں چقماق کی چنگاریوں کی طرح چمک اٹھتے۔ بانس کے حلیم غول متانت سے چہل قدمی کے لیے نکلتے گویا کالے کوٹ اور سفید گھرالیوں میں خیرسگالی وفد ہوں۔ چیتوں کی سبزگوں شرارہ سی آنکھیں جو کسی بھی انسان کے خون کو منجمد کرنے کے لیے کافی ہیں۔ یا پھر پتے کے کھڑکنے سے ہی چوکنا ہوکر چوکڑیاں بھرتے ہرنوں کے غول ۔۔۔ خرگوشوں کے برفاب جسم اور سرسراتے سانپ لنگوروں کی بے مقصد چیخیں ۔۔۔ شہروں میں بسنے والوں سے یہ جانور بھلے تھے جو برسہا برس سے ایک ہی جنگل میں ساتھ ساتھ گزارا کرتے آرہے تھے۔ ہر کوئی اپنی بولی الگ بولتا تھا لیکن ان کے پاس نہ کبھی الیکشن ہوتے تھے نہ زبان کے اساس پر خون خرابے ۔۔۔ نہ کوئی کسی کی زمین ہتھیاتا تھا نہ عصمتوں کا نیلام ہوتا تھا ۔۔۔ لیکن ان سب غیرمانوس مظاہر کے باوجود سینکھو یری میں رہزن گھس ہی آتے۔ بلکہ جنگل کا یہی ماحول انھیں جرم کی طرف راغب کرتا۔ صرف اژدہوں کی کینچلیاں، ہرنوں کی کھالیں، ریچھوں، شیروں اور چیتوں کے چمڑے ہی نہیں بلکہ ساگوان اور بانس کے پرے کے پرے صاف کر دیئے جاتے جب تک کہ حکام کو اس کی خبر ہوتی رہزن چمپت ہو جاتے۔ کبھی کچھ پکڑے بھی جاتے جو یا تو چند ماہ کی جیل کاٹتے، یا رشوتیں دے کر چھوٹ جاتے۔ ان میں سیاسی تعلقات کی بنا پر چھوٹنے والوں کی فہرست الگ تھی۔ یہ ایسے لوگ تھے جو بے دھڑک سینکھو یری میں شکار کر کے اپنا شوق پورا کرتے۔ اور ان کی گولیوں کی آواز حکام کے کانوں سے ٹکرا کر لوٹ جاتی۔ کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

بہن بھائیوں سے چھپا چھپٹی تو کاچی صرف منہ کا مزہ بدلنے کے لیے کرتی تھی۔ اس کا محبوب مشغلہ کچھ اور ہی تھا جس کا علم صرف اسی کو تھا یا اس چھوٹی سی جھیل کو جو ساگوان کے جنگل سے پرے ۔۔۔ وہاں تھی جہاں بانس کے جنگل شروع ہوتے تھے۔ اس جھیل کے کنارے کاچی اپنے گھٹنوں پر ہاتھ باندھے گھنٹوں بیٹھی رہتی ۔۔۔ خاموش ۔۔۔ ساکت۔ خاموشیوں سے ساز باز اسے کسی نے نہیں سکھائی تھی، وہ انھیں اپنے نصیب میں لکھوا لائی تھی۔ دراصل وہ اپنی اندرونی ہنگامہ خیزیوں میں باہر کی خاموشیاں انڈیل لینا چاہتی تھی۔ باہر کے نام نہاد پُرشور تلاطم کا اس

قیامت سے کیا مقابلہ تھا جو ہر دم اُس کے اندر برپا رہتی تھی۔ یہی اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس کا ایک محبوب بھی تھا — بڑی بڑی آنکھوں، چست بدن والا ہرن۔ ہرنوں کا ایک دَل اس سے اتنا مانوس ہو گیا تھا کہ گاچی وہاں بیٹھی ہوتی، تب بھی وہ اپنی گردنیں بڑھاتے، جھیل کے شفاف پانی میں اپنی تھوتھنیاں ڈبوئے پانی پیتے۔ اُن میں سے ایک ہرن گاچی کا محبوب تھا۔ گاچی نے دل ہی دل میں اسے کوئی نام ضرور دیا ہوگا — گاچی بول نہیں سکتی تھی لیکن دل کی بھی زبان کہاں ہوتی ہے۔ گاچی سُن نہیں سکتی تھی — لیکن دل کے بھی کان کہاں ہوتے ہیں۔ پھر بھی دل، دل کی بات سُن لیتے ہیں۔ ان کا رشتہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ کالیداس نے ایسے ہی منظر کو دیکھ کر شکنتلا کو جنم دیا ہوگا۔

ایک دن گاچی کی خاموشی کی سیج پر موہن پہنچ گیا۔ موہن کا بھی سلسلۂ نسب رہزنوں سے ملتا تھا۔ وہ ایک ایسی ٹولی کا ممبر تھا جو چوری چھپے نہ صرف بانسوں کے پرے صاف کر دیا کرتے تھے بلکہ اس نے اندھیری راتوں میں اپنی بندوق سے خرگوشوں اور ہرنوں کے شکار بھی کیے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ وہیں پاس ایک جھیل ہے، اسے وہاں پیاس کی شدت کھینچ لائی تھی۔ وہ وہاں پہلے بھی آ چکا تھا لیکن اس نے کبھی گاچی کو وہاں نہیں دیکھا تھا۔ گاچی کو بھی موہن کی آمد نے حیران کر دیا۔ اس نے وہاں کئی بار سینکچویری دیکھنے کے لیے آنے والوں کی سفید سفاری گاڑی بھی دیکھی تھی جسے دیکھ کر وہ چھپ جایا کرتی تھی۔ وہ ان پُرشور یاجوج ماجوج کو اپنی خاموشی کی دیوار چاٹنے دینا نہیں چاہتی تھی۔

موہن کو دیکھ کر وہ بوکھلا کر کھڑی ہو گئی اور بہت جلد موہن کو پتہ چل گیا کہ گاچی گونگی ہے۔

سالی گونگی ہے یہ بھی اچھا ہوا — ورنہ ابھی بھاگ کر خبر کر دیتی — اس نے سوچا۔ لیکن خطرہ تو پھر بھی تھا۔ وہ گونگی ہونے پر بھی وہاں اس کی موجودگی کی خبر دے سکتی تھی۔ اس نے دل میں منصوبہ بنایا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر گاچی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اشاروں سے گاچی کو بتایا کہ وہ خود بھی گونگا ہے اور پیاس اسے وہاں کھینچ لائی ہے — وہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا — صرف پانی پی کر چلا جائے گا۔ لیکن گاچی کے گونگے حسن نے پانی پینے کے

مد بھی اسے وہاں باندھے رکھا۔ موہن کا گونگا ہونا بھی گاچی کے لیے بڑا دلچسپی کا باعث تھا۔ اسے ایسا ہم زبان زندگی میں پہلی بار ملا تھا۔

دنیادار موہن، گاچی کی لگاوٹ کی نظر فوراً بھانپ گیا۔ عورت حسین ہو اور پھر گونگی بھی ہو تو مرد کی نظر میں اس کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ دوسرے دن پھر اسے گاچی کی کشش وہاں کھینچ لائی لیکن وہ کچھ دور ہی ٹھٹک کر رہ گیا۔ کیونکہ گاچی جھیل کے پانی سے پتھر پر اپنی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دھو رہی تھی اور وہاں اس کی موجودگی کے باوجود ہرنوں کا ایک جتھا جھیل کے آس پاس جمع تھا موہن کی آہٹ پا کر سارے ہرن رفوچکر ہو گئے، سوائے محبوب کے، جس پر گاچی نے اپنا ہاتھ رکھا ہوا تھا۔

اس روز موہن کے دماغ نے کچھ اور سوچا۔ وہ ایک ادنیٰ درجے کا پوچر تھا۔ بندوق سے ہرن، خرگوش اور جنگلی سؤروں کا شکار کیا کرتا تھا۔ لیکن کارتوس اب مشکل سے ملتے تھے اور مہنگے بھی ہو رہے تھے۔ وہ گاچی کی مدد سے زندہ ہرن حاصل کر کے اونچے داموں فروخت کر سکتا تھا۔ کچھ سوچ کر وہ آگے بڑھا۔ گاچی اسے دیکھ کر خوش ہو گئی۔ محبوب کے گلے میں بانہیں ڈالے اسے دیکھ کر ہنستی رہی۔ لیکن موہن نے جب محبوب کی پیٹھ سہلاتے سہلاتے اسے بانہوں میں لینا چاہا تو وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی، اس کے ابرو تن گئے۔ ناگواری اس کے چہرے سے ظاہر تھی۔

"ارے میں تو مذاق کر رہا تھا" موہن نے اشاروں سے سمجھایا اور محبوب کو گاچی کے حوالے کر دیا۔ وہ صرف یہ دیکھ رہا تھا کہ کتنی سیدھی انگلیوں گھی نکل سکتا تھا۔

دوسرے دن شام کے دھندلکے تاریکیوں میں ڈھلنے لگے اور موہن نہیں آیا تو گاچی بھی تھک ہار کر اٹھی۔ ہرنوں کا دل جا چکا تھا، صرف محبوب کو اس نے روک لیا تھا۔ موہن کے لیے انتظار کی گھڑیاں تنہا کاٹنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ ایک آہٹ نے محبوب کو چونکا دیا اور ساتھ ہی گاچی نے پلٹ کر دیکھا۔ وہاں موہن کھڑا تھا، لیکن آج اس کے ہاتھ میں بندوق بھی تھی۔ اس کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ موہن ویسے بھی گونگی کے رومانس سے اکتا گیا تھا۔ دوسرے اسے پیسوں کی سخت ضرورت تھی، اور ہرن کا گاہک تیار تھا۔

"اے گونگی! وہ ہرن میرے حوالے کر" موہن نے ایکٹنگ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے

بے صبری سے کہا۔

گاچی کے چہرے پر ایک کربناک حیرانی چھا گئی۔ موہن اور اس کے مابین خاموشی کا جو تار بندھ گیا تھا ایک جھنکار کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ اس نے موہن کا مطلب سمجھ کر محبوب پر اپنی گرفت اور تنگ کر لی۔ وہ نہ صرف محبوب کو پناہ دے رہی تھی بلکہ محبوب کی موجودگی، اس کا لمس گاچی کے دھڑکتے دل کی ہمت بن گئے تھے۔ وہ کسی بھی قیمت پر محبوب کو دشمن کے حوالے کرنے کو تیار نہیں تھی۔

"اگر زندہ نہیں دے گی تو میں اسے مار ڈالوں گا۔" موہن نے بندوق تان لی۔ اور چشم زدن میں موقع پاکر گاچی محبوب کو کان سے گھسیٹتے فرار ہو گئی۔ ساتھ ہی موہن بھی دوڑا۔ لیکن اس کا جسم کچھ بھاری تھا جب کہ گاچی بجلیوں کی پالی تھی۔ دھوپ اور چھاؤں کی طرح جھاڑیوں اور پیڑوں کے بیچ کبھی گاچی اور ہرن نمودار ہوتے تو کبھی جنگل انھیں چھپا لیتا۔ موہن ہانپ گیا۔ وہ اپنی کمین گاہ میں رک گیا۔ پھولتی ہوئی سانسوں نے اس کی جھلاہٹ کو اور بھی ہوا دی۔ جیسے ہی ہرن ایکبارگی نمودار ہوا، موہن نے نشانہ لگا کر اس پر بندوق داغ دی۔ گولی چلی، سارا جنگل کانپ اٹھا۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سے سوکھے پتے کچھ دیر بجتے رہے اور پھر مکمل سکوت چھا گیا۔ شکار بہت دور نہیں تھا۔ موہن نے تھیلے سے رسّی نکالی اور جلد جلد قدم اٹھاتا وہاں پہنچا۔

جنگل میں بندوق کی آواز نے تنا آدی باسی کو خبردار کر دیا تھا۔ اس نے دوڑ کر سپرنٹنڈنٹ صاحب کو خبر دی کہ سینکچوری میں رہزن گھس آئے ہیں۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب فوراً اپنے عملے کے ساتھ موقعۂ واردات پر پہنچے۔

"ارے! یہ تو تنا کی گونگی چھوکری ہے۔" ایک اہلکار نے — جس کی دراز دستیوں سے گاچی بچ نکلی تھی، ٹارچ کی روشنی میں گاچی کے سرد جسم کو شناخت کرتے ہوئے کہا "یہ سالی رہزنوں سے ملی ہوئی تھی حضور، یہ جنگ میں ان کی مددگار تھی — مجھے تو پہلے ہی شبہ تھا۔"

نسیم محمد جان

سیلاب

میری آنکھ کھل گئی ہے۔ کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔ صرف چیخنے کی آواز سن رہا ہوں۔ یہ کسی بچے اور عورت کی ملی جلی چیخ ہے ___ لگتا ہے وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ سیلاب کا پانی آنگنوں میں گھس آیا۔ میں اندھیرے میں بستر پہ پڑا سوچ رہا ہوں۔ برابر نگرانی کی جا رہی تھی پھر یہ کیسے ہوگیا۔ کن لوگوں نے باندھ کاٹ دیا۔ رات کی تاریکی میں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ بستر سے اٹھ کر سوئچ آن کردیا۔ کھٹ کی آواز بھی ہوئی مگر بلب روشن نہ ہوسکا، لگتا ہے بجلی نہیں ہے۔ یہ پاور ہاؤس کو کیا ہوگیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ پاور ہاؤس میں بھی سیلاب کا پانی بھر گیا۔ میں ماچس کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اسے دوسرے کمرے میں ٹیبل پر رکھا تھا، لیمپ کے پاس۔ کبھی کبھی کچھ وقفے پر بہت دردناک چیخ سن رہا ہوں۔ دوسرے کمرے میں جانا ہے۔ اچانک کرسی سے ٹکرا گیا، کرسی اسٹول پر گری اور چھناک کی آواز کے ساتھ شیشے کا گلاس ٹوٹ گیا۔ سوتے وقت پانی رکھ لیا تھا۔ سیلاب میں پینے کا صاف پانی بڑا قیمتی ہوجاتا ہے، یہ اور بات ہے کہ حد نظر تک صرف پانی ہی پانی دیکھنے کو ملتا ہے مگر اس پانی پر دنیا بھر کی غلاظت تیرتی رہتی ہے۔ میں دوسرے کمرے میں پہنچ گیا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ ماچس زیادہ نہ ڈھونڈنا پڑی۔ لیمپ روشن کیا۔ شیشہ گندہ ہونے کی وجہ سے سیاہ ہوگیا ہے ___ تیل بھی کم ہے ___ لیمپ کی مدھم روشنی ___ تیل پر کنٹرول ہے ___ پھر چیخنے کی آواز آئی ___ مگر باڑھ کا پانی گاؤں میں گھسا کیسے۔ باندھ بظاہر بہت مضبوط لگ رہا تھا۔ لگتا ہے کچھ لوگوں نے تاریکی سے فائدہ اٹھا کر کاٹ دیا اسے، اگر ہمارے محافظ کیا کررہے تھے۔ سال بھر تو صرف نگرانی کا کام ان کے ذمے ہے۔ پھر باندھ کا ٹوٹنا۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ ہمارے گاؤں میں

پچھلی بار سیلاب آیا ہوا میں کھڑکی کے پاس کھڑا یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ سیلاب کتنا بڑا ہے مگر کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔ اندھیرا زیادہ گہرا ہو تو آنکھیں تقریباً بیکار ہو جاتی ہیں صرف وقفے وقفے پر دل ہلا دینے والی چیخ سن رہا ہوں —— اور ہر چیخ اس بات کی علامت ہے کہ کوئی نثار احمد ڈوب گیا۔ کسی نثار احمد کا خاندان غرق ہو گیا۔ پچھلی بار جب سیلاب آیا تو نثار احمد کا پورا خاندان ڈوب گیا، پورے سات افراد کا خاندان۔ جب بھی کوئی سیلاب کا نام لیتا ہے نثار احمد میرے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی، سیاہ رنگ، گال اندر کو دھنسے ہوئے، میلی سی بنیائن اور سبز لنگی —— سائیکل مرمت کرنے کی دُکان تھی اُس کی۔ رات میں سوتے وقت سیلاب کا پانی آنگن میں ایسا گھسا کہ نثار احمد اپنے بیوی بچوں اور بہن کے ساتھ لمحے بھر میں غرق ہو گیا۔ اب اُس دُکان کی جگہ ایک کپڑے کی دُکان ہے۔ سوائے بہن کے سب کی لاش مل گئی تھی۔

اس سے قبل بھی گاؤں میں کئی بار سیلاب آ چکا ہے۔ میں بچپن سے چند بڑے سیلاب کا حال بزرگوں سے سنتا آیا ہوں۔ ہمارے گاؤں کے پورب میں ایک گاؤں تھا چھوٹی سی بستی بسیلاب پوری بستی کو کھا گیا —— اور جس طرح جنگلی جانور گوشت کھانے کے بعد ان ہڈیوں کو چھوڑ دیتے ہیں جن کو چبانا اُن کے بس میں نہیں ہوتا، بالکل اسی طرح سیلاب چند ٹوٹے پھوٹے مکانات اور گری ہوئی عبادت گاہ چھوڑ کر چلا گیا —— پھر چیخنے کی آواز آئی —— میں اپنے وجود سے کانپ گیا ہوں —— پھر کوئی نثار احمد ڈوب رہا ہے —— ڈوب جائے گا کوئی اس کی مدد کو نہیں پہنچے گا —— باندھ کے محافظ بھی نہیں۔ جن مکھیا جی کے کہنے پر وہ چند کلو گیہوں ہر سال پابندی سے حفاظت کی خاطر ادا کرتا ہو گا —— پچھلے سیلاب میں تو بڑے بڑے تناور درختوں کو تنکے کی طرح بہتے ہوئے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کتنا زور ہوتا ہے اس برساتی سیلاب میں۔

ہر بار کی طرح اس بار بھی چند دنوں کے بعد سیلاب کا پانی اُتر جائے گا۔ گاؤں والے اس بار بھی باندھ ٹوٹنے کے کئی اسباب بتائیں گے۔ باندھ کاٹنے والے ضرور دوسرے گاؤں سے آئے ہوں گے۔ اس گاؤں سے ہمارا پرانا جھگڑا ہے۔ نہیں جی ہم لوگوں کو باندھ کی نگرانی کرنے والوں

بندھوا لینا چاہیے اور ان کے کالے پیل کے باندھ کیسے کاٹا جا سکتا ہے۔ راجی صاحب ہمارے سے
گاؤں میں سب اچھے لوگ ہی ہیں میں نہیں مانتا ——— اس بار بھی مکھیا جی کے بارے میں
کہا جائے گا۔ مکھیا جی اب سیلاب روکنے کا مستقل انتظام کر رہے ہیں۔ اب باندھ کبھی نہ
ٹوٹے گا۔ اب سیلاب کا پانی کھیتوں کو سیراب کرے گا ——— مکھیا جی کی مالی حالت
پہلے بھی اچھی تھی۔ چند لوگ کہتے ہیں کسی سیلاب ہی میں سکوں سے بھرا گھڑا نہ جانے
کہاں سے ان کے آنگن میں آ گیا تھا ——— پتہ نہیں کہاں تک سچ ہے ——— میں نے تو
مکھیا جی کو ہمیشہ اس سڑک پر دیکھا ہے جو شہر کو جاتی ہے یا پھر شہر سے گاؤں واپس لوٹتی
ہے ——— ہاں ان کا شاندار مکان میرے سامنے بنا ہے ——— پھر چیخ سن رہا ہوں۔ کیا ہوگا؟
——— ہوگا کیا کبھی دا ابھرنے کے لیے کچھ لوگ ڈوب جائیں گے ——— اور پھر کوئی بھولا
مزدوری کا کام چھوڑ کر تانگہ چلانے لگے گا۔ پچھلی بار بھی تو یہی ہوا تھا جو ہمیشہ بوجھ ڈھویا کرتا
تھا سیلاب کے بعد وہ اچانک شاندار گھوڑے اور سجے ہوئے تانگے کا مالک بن گیا ——— ارے
یہ کیا ہونے لگا۔ میرا سر چکرا رہا ہے۔ گھر کی ہر چیز ناچ رہی ہے ——— ہر چیز، سارے فرنیچر،
سلائی مشین، اسٹیل کی الماری ——— گھر کا ہر سامان اپنی شکل کھو رہا ہے ——— یا خدا ———
یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں ——— میرا گھر کہاں گیا ——— یہاں تو چار سجے سجائے گھوڑے کھڑے
ہیں۔ ہر تانگے پر ایک پہلوان قسم کا آدمی بیٹھا مونچھیں اینٹھ رہا ہے ——— میرا گھر ——— پھر
کوئی چیخ رہا ہے ——— ہر چیز کو تاریکی میں سیلاب کھائے جا رہا ہے اور ہم ——— ہم کچھ
نہیں کر پا رہے ہیں۔

——— اور اس بار بھی پیپل کے نیچے سیمنٹ کے چبوترے پر مکھیا جی کی صدارت میں
میٹنگ ہوگی۔ ہر بار کی طرح مکھیا جی کا فیصلہ کر دیں گے ——— 'جو کچھ ہوا اسے آپ بھول
جائیں' پھر کوئی پاگل پوچھ بیٹھے گا 'باندھ کی حفاظت کرتے ہوئے ہمارے محافظوں میں
سے کتنے لوگ ڈوبے' اس سے پہلے کہ مکھیا جی کوئی جواب دیں لوگ اسے بٹھا دیں گے ———
اور ایک دوسرے سے کہیں گے 'اس طرح کا سوال نہیں کرنا چاہیے تھا۔' مکھیا جی بات جاری
رکھتے ہوئے اعلان کریں گے 'محافظ بے قصور ہیں۔ اتنے لمبے باندھ پر نگرانی رکھنا کچھ آسان

کام نہیں ـــــ پچھلی باتوں کو یاد رکھنے سے کیا فایدہ ہوگا، ہمیں آیندہ کی فکر کرنی چاہیے۔ آیندہ سیلاب دائے اس کے لیے ہم سب چلو مل کر باندھ کی مرمت کریں۔ کچھ لوگ جو اس امید کے ساتھ اس بیٹھک میں شامل ہوئے تھے کہ آج یہ دیکھیں گے مکھیا جی ان محافظوں کو کس طرح پیپل کے پیڑ سے باندھ کر پٹائی کرتے ہیں، اسی بھیڑ میں شریک ہو جائیں گے جو باندھ کی مرمت کرنے جا رہی ہے۔ پتہ نہیں اس بھیڑ میں کوئی یہ بھی سوچے گا یا نہیں ـــــ کیا ہم صرف پرانے باندھ مرمت کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے؟

ضروری اعلان

آیندہ "عصری ادب" کے شمارے الگ الگ شائع ہوں گے: دو شماروں کو ملا کر شائع نہ کیا جائے گا۔ اسی بنا پر اس شمارے کی ضخامت اور قیمت دونوں کم ہیں، قارئین نوٹ کرلیں۔ یہ بھی کوشش کی جا رہی ہے کہ ہر شمارہ وقت پر شائع ہو۔

(ادارہ)

حسین الحق

جانا انجانا

ایمن بی بی پیدا ہوتے ہی رونے چیخنے لگیں۔

میں گھبرا گیا تو اتا نے سمجھایا کہ "پیدا ہوتے ہی بچوں کا رونا چیخنا فطری عمل ہے کیونکہ وہ اچانک گہرے دبیز گھنے اندھیرے سے نکل کر روشنی سے آشنا ہوتے ہیں، یا یوں کہو کر جہانِ داخل سے جہانِ خارج کا سفر کسی کے لیے بھی تکلیف دہ ہو سکتا ہے۔"

بعد میں یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی بچہ روتا نہیں ہے تو اُسے دایہ طمانچہ مار کر رُلاتی ہے کیونکہ جہانِ دگر سے جہانِ دگر کی شناسائی کا فطری ردّ عمل خموشی ہو ہی نہیں سکتا اور اگر خموشی طاری ہے تو اس ابنورمل ردعمل کو نورمل ردعمل کی سطح پر لانا ضروری ہے ورنہ غلط نتائج غیر متوقع نہیں۔

تقریباً چار ماہ تک ایمن بی بی این وآں سے بے خبر رہیں، نہ کسی کو جانا نہ کسی کو پہچانا کسی کے پاس لیٹی رہیں، کسی کی گود میں پڑی رہیں، کسی کے کاندھے پر چڑھی رہیں، کوئی گڑیا اُن کے آگے رکھ دی جائے، کوئی باجا ان کے پاس بجایا جائے، کوئی گانا، گیت یا لوری اُن کو سنائی جائے، خوب صورت یا بدصورت، دل موہنے والی یا دل دہلا دینے والی کوئی صورت یا تصویر اُن کے سامنے آن کھڑی ہو، اُن کی آنکھوں، چہرے یا حرکات سے اظہار کی کوئی رمق نمایاں نہیں ہوتی۔

بس وہ لیٹی رہتیں، ہاتھ پیر چلاتی رہتیں اور ہنستی رہتیں یا روتی رہتیں، ہاتھ پیر کا ہلنا عام دیکھنے والوں کے لیے کوئی خاص معنی پیدا نہ کر سکا البتہ سائنس کے ایک طالب علم نے طبیعاتی قوانین کا تابع بتایا، ہنسنے کی دو کیفیت تھی، ایک نیند میں ہنسنا دوسرا جاگتے

میں ہنسنا، نیند میں ہنسنا سائنس، نفسیات اور علم و دانش کے مختلف ماہر رشتہ داروں کے نزدیک کوئی خاص معنی پیدا نہ کرسکا۔ البتہ اماں نے بتایا کہ بچہ جب سوتا ہے تو نیند میں فرشتے گدگدی کرتے ہیں اور جاگتے میں ہنسنا ماہرین علم و دانش کے نزدیک مکمل اطمینان کا استعارہ ہے اور رونا بچے کی پہلی بنیادی جبلت بھوک کا اظہار۔

ایمن بی بی کا وہ زمانہ عجب زمانہ تھا۔ پیدائش کے پہلے لمحے سے ایک خاص مدت تک میں نے ان کو دیکھا، سمجھا اور جاننا چاہا تو مجھ پر اسرار کے نت نئے پہلو کھلے کہ کس طرح میری بیٹی وجود اور نمود کا استعارہ بنی، مگر ابتدا میں وہ خود اپنے وجود اور اس کے نمود کے ارتقائی مراحل سے بے خبر تھی گویا وجود "ہے" ہوکر بھی "نہیں" کے دریا میں گم اور "نہیں" کا یہ عالم کہ "نہیں" کبھی بھی "نہیں" "نہیں تھا یا اگر "نہیں" کبھی تھا تو جب وہ "تھا" تھا تب وہ "ہے" کی منزل پر ایستادہ۔

پس جب "نہیں" "ہے" "تھا" تو گویا "ہے" خود بے معنی!

مگر ایمن بی بی "نہیں" اور "ہے" کی اس کشمکش سے بے خبر، نہ جانے کس قانون کی تابع، اور کس مشبہ کی تشبیہہ، اور کس پیکر کی تمثیل بنی، اپنے آپ کو جانے بغیر اپنے آپ کو جنما چکی تھیں اور اب پہچنوا رہی تھیں اور شناخت کے مراحل میں ان کی شخصیت حرکت اور گریہ کے اردگرد (جو آواز کی تمثیل تھا) گردش کر رہی تھی۔

پس یہی حرکت اور آواز، اپنے آپ سے بے خبر، مگر اپنے آپ ظاہر، ایمن بی بی کے وجود اور نمود کی ضامن تھی اور میں جو اسرار کے گھنے جنگلوں میں گم ہوکر بھٹک رہا تھا، ایمن بی بی کے آپ ہی آپ رونما ہونے والے وجود کا بے معنی اور مہمل مشاہد تھا.... کہ میرے مشاہدے کا حاصل؟

مشاہدہ لاحاصل مگر مشاہدے کی خود دلچسپ کہ مجھ پر اسرار کے نت نئے پہلو کھلے، میں آج تک حیرت میں ہوں کہ یہ سب کیا ہے! مگر ایمن بی بی شاید بہت دیر میں حیرت سے آشنا ہوئیں کیونکہ جو تماشہ شروع ہوتے ہوتے آواز اور چہرے کی جانب اُن کی لپک شروع ہوئی مگر اس لپک میں حیرت کی ملاوٹ نہیں تھی، یہ لپک خواہ ضرورت کی رہی ہو یا قربت کی

بہر حال یہ ایک سادہ تھی۔

ایسے ہی ہے میرے دل میں ایک اور ۔ ۔ ۔ ۔ موہوم سے خیال کا دھندلا ہیولیٰ جنم لیتا اور جب یہ ہیولیٰ سر اٹھاتا تو میں اپنے آپ کو زمان و مکان سے ماورا محسوس کرتا اور اولین لمحوں کے اس زمان میں اپنے آپ کو موجود پاتا جب اتھاہ گہرے اندھیرے میں کسمساہٹ سی ہوئی۔

یہ کسمساہٹ ایمن کے یہاں حرکت اور آواز کی توسیع تھی، وہاں کیا تھا، مجھے معلوم نہیں مگر معلوم نہ ہونے کے باوجود محسوس یہ ہوتا ہے کہ شروع شروع میں جب کسمساہٹوں نے اپنے آپ کو ادھا ادھورا جانا ہوگا تب اسی طرح سے مختلف کسمساہٹیں ایک دوسرے کی جانب متوجہ ہوتی ہوں گی، خواہ یہ توجہ ضرورت کے سبب ہوئی ہو یا قربت کے سبب، شعوری ہو یا لاشعوری۔

دو ٹوک فیصلہ جب ایمن کی توجہ کے بارے میں ممکن نہیں ہے تو پھر اُس لمحے کا کیا ذکر؟ ایمن کے یہاں سب سے پہلے اس ناچتے گاتے گڈے کی طرف لپک پیدا ہوئی جو میں اُن کی خاطر اُن کی پیدائش کے دوسرے ہی دن لایا تھا، پھر آوازوں نے انھیں اپنی جانب متوجہ کیا اور حرکت و آواز سے قربت کے بعد سب سے زیادہ قربت والی ہستی یعنی ماں کی طرف لپک پیدا ہوئی، تو خیال ہوا کہ ایسا کیوں ہے؟

ابا نے کہا "کائنات اور اشیا کے درمیان یہ ہم رشتگی کا استعارہ ہے۔"

میں نے فلسفیانہ موشگافیوں سے گریز کیا مگر اک سوال نے پھر سر اٹھایا۔ "یہ توجہ نمو، جبلت کی کسمساہٹوں کا اشاریہ تو نہیں؟" میں پھر بکٹٹ بھاگا کہ دوبارہ خیال کی رو مشاہدے پر غالب آ رہی تھی۔

تو واقعات کی مشاہداتی ترتیب یوں ہے کہ چار ماہ سے چھ ماہ کے درمیان آواز اور چہرے کی جانب لپکتی رہیں اور میرے اندر شمعیں جلتی رہیں اور بجھتی رہیں اور میں عالم امکان کی سرحد پر کھڑا عالم امثال کا تماشائی بنا، اس تماشے یا گورکھ دھندے یا ڈرامے کا لطف لیتا رہا، گاہے یہ لطف انگیزی مسرت کا سبب بنتی، گاہے تاسف کا اسیر کرتی، گاہے تحیر کا شکار کرتی اور میں دیکھتا رہتا کہ اپنے آپ سے بے خبر ایمن کس طرح انجانے میں اپنے آپ پر کھیلی ہوئی

ا ہوئی، بسری ہوئی اور ڈری ہوئی کیفیتوں کا انعکاس دوسروں میں دیکھ کر اپنے آپ میں ایسی
نا پیدی محسوس کرتی ہے جو اسے کشاں کشاں کہاں کہاں لیے ہے کسمساہٹ کی دہلیز تک
پہنچے لیے جا رہی ہے۔

ساتواں مہینہ شروع ہوتے ہوئے ایمن پچھلے گھر سے وداع ہوئی اور ڈوبی کسمساہٹ
، دوار آکر رکی اور توجہ میں تحیر کے عناصر شامل ہوئے وہ ناچتا گاتا گڈا جو چار ماہ پہلے تک
ن کے لیے بے معنی، عبث اور مہمل تھے تھا اب صرف لیک ہی کا سبب نہیں رہا بلکہ وہ اس پر
بلکہ ٹھمک رہا اس کو اٹھا اٹھا کر پٹختی اور جب وہ دوبارہ ناچنے گانے لگتا تو ہنسنے لگتی۔

گڈے کے ٹھہراؤ پر اس کا ردعمل جس تحیر اور جھنجھلاہٹ کا استعارہ تھا میں اسی استعارے
ے ہراساں بھی تھا کہ جانے ابھی میری بیٹی کو کتنی دہلیزیں پار کرنی ہیں!

۔۔۔ وہ ایمن جو بھوک کی شدت میں بھی گود میں لے کر کھڑے ہو جانے سے چپ ہو جاتی تھی اب
سکین کے کسی بدل پر قانع رہنے کے لیے تیار نظر نہیں آتی اور جب تک اسے دودھ مل نہیں
تا، وہ مسلسل رو رو کر اپنی بے اطمینانی کا اظہار کرتی رہتی۔

وہ ایمن جو پہلے کسی کی گود میں بھی اطمینان سے پڑی پڑی سو جاتی وہ اب سونے کے
ے صرف ماں کی گود کی طالب ہوتی اور جس نئی چیز کا مزا چکھ لیتی اُس کی طرف بے ساختہ اور
شدت کے ساتھ لپکتی۔

ان تمام نوع بہ نوع وقوعات میں گھری ایمن ایک سال کی ہونے کو تھی کہ شب برات
ان کھڑی ہوئی اور شب برات میں جب بچوں نے پٹاخہ چھوڑا تو وہ چیخ چیخ کر رونے لگی، میں نے
پتا تا سف ضبط کیا کہ بالآخر خوف نے بھی اس کے وجود میں قرار پکڑ لیا تھا۔

یہ خوف چودہ پندرہ ماہ تک بے ترتیب تھا اور اس کا کوئی ٹھکانہ ہوتا تھا اور گاہے
نہیں ہوتا تھا مگر چند روز ماہ سے اس نے بھی استقلال کا ثبوت دیا۔

اب وہ اندھیرے سے ڈرتی اور بھیانک آواز سے ڈرتی اور گھر والے اس کی شرارتوں پر
ے چپ کرانے کو شیر کی آواز نکال کر ڈرا دیتے اور وہ سہم کر چپ ہو جاتی، گلابہ بازار میں بکنے
لے کا غذ پر بنا بھیانک چہرہ دونوں طرف لمبے دھاگے سے چہرے پر باندھ کر کوئی بھی سامنے

جاتا اور وہ پانی میں بھیگی گوریا کی طرح ٹھٹھر جاتی۔

اور اب وہ ڈیڑھ برس کی ہو چکی ہے اور آئینے کی طرف لپکتی ہے، اس پر حملہ کرتی ہے
اور اُس میں جانے کیا کیا تلاش کرتی رہتی ہے!

شاید وہ انجانے میں اب اپنے آپ کو جاننے کی منزل پر ہے.....

اور جب وہ اپنے آپ کو پورے کا پورا جاننا چاہے گی تب!.... تب؟

ہاں لوگو! عرفان کا حصول اگر تقدیر بنا..... تب؟..... تب!

میں سوچتے سوچتے تھک کر ریلنگ پر سر ٹیک دیتا ہوں اور میری آنکھیں دھندلا جاتی ہیں۔

میں دھندلی دھندلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں.....

نیچے آنگن میں میری بیٹی آئینے سے کھیل رہی ہے!

وہ معصوم میری آنکھوں کی دھندلاہٹ کو کیا سمجھے کہ ابھی تو وہ انجانے میں صرف جاننے
کی دہلیز پر آن کھڑی ہوئی ہے۔

سمجھ کا دوار تو کٹرے کوس واقع ہے.....

وہاں پہنچتے پہنچتے.....!

وہاں پہنچتے پہنچتے.....!!

دیوندر ستیہ

تھکن

(اُداس نسل کے نام)

پہلا باب

جس دالان میں میں کھڑی ہوں اس کا کوئی دروازہ نہیں۔ پچھلی طرف ایک کھڑکی ہے آگے روشندان۔ آس پاس دو کالی دیواریں ہیں۔ کھڑکی باتیں کرتی ہے۔ اس نے مجھ سے کچھ پوچھا ہے۔ روشندان نے سنا تو ہنس دیا اور میں گلی میں آگری ہوں۔ پتہ نہیں کس نے روشندان نے یا کھڑکی نے مجھے اُٹھا کر باہر پھینک دیا ہے۔ گلی میں اندھیرا ہے۔ اِس گلی کے بہت سے نام ہیں۔ ہر موڑ پر اس گلی کا نام بدل جاتا ہے۔ جہاں نام ختم ہو جاتے ہیں وہاں دریا شروع ہو جاتا ہے۔ دریا پر ایک پُل ہے۔ پل پر دو پل اکیلے رہ گئے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ میں اور وہ۔

دوسرا باب

دریا پر سانسوں کا پُل ہے۔ اُس پار کوئی کھڑا ہے جس کے ہاتھ میں وفا کی چابک ہے لیکن جہاں میں کھڑی ہوں وہاں آتا ہٹ ہے ہر چیز سے، تھکن ہے ہر آدمی سے یہ تھکن نہ جانے کب سے میرے ساتھ چپکی ہوئی ہے۔ آئینے میں دیکھا تو لگا کہ عورت اُس وقت بوڑھی ہوتی ہے جب اُداس ہو۔ آدمی اُداس ہو تو کرومیم سٹیل کا ہو جاتا ہے۔

تیسرا باب

دالان والے روشندان میں سے جھانکو تو ایک ۳۵ سال عورت کے پیچھے ایک ۱۸ برس کا لڑکا جا رہا تھا۔ گلی اندھیری تھی۔ ۔ ۔ ۔ اُن دونوں کے پیچھے ایک لال پھول کھل اٹھا تھا۔ اسی

پہ لولا کا نٹر نٹر کر اس پھول کی طرف دیکھتا تھا۔ میں نے کہا "تم اُدھر مت دیکھو تمہارا اس سے کیا رشتہ، ہم تو ....." لڑکا غصے میں ایک ہجوم میں تحلیل ہو گیا۔

چوتھا باب

وہ کیا تحلیل ہوا میں بیس برس اُداس ہو گئی۔ بیس برسوں میں بیس چہرے اُداس ہو گئے اداس سڑک پر کسی اور ..... وہی کسی عورت کی تلاش میں بھٹک رہا ہے۔ ہر سکن ایک موڑ ہے۔ ہر موڑ پر سڑک کا نام بدل جاتا ہے۔ میرا نام ۲۵ برس لمبی سڑک ہے۔ وہ مجھ سے کئی میل چھوٹا ہے لیکن اب وہ چھوٹا ہے دمیں بڑی ہوں۔ میرے ہم عمر مرد رو رہے ہیں اور اس کی ہم عمر لڑکیاں بَین کر رہی ہیں۔ آج اخبار لیٹ ہو گئے ہیں۔

پانچواں باب

میں پل پر کھڑی ہوں۔ ہوا چل رہی ہے اتنی تیز کہ میرے پاؤں تلے کئی سڑکیں سرک گئی ہیں۔ دریا کا پانی جھاگ چھوڑ رہا ہے۔ اُس کو کسی ٹھوکر، کسی روک کی پروا نہیں۔

جو میں کہہ رہی ہوں اسے ہوا کی لہر نے سنا، دریا کی لہر نے دُہرایا "نہیں نہیں، میں آتم ہتیا نہیں کروں گی۔ اخبار پھر بھی بھونکتے رہیں گے، میری تصویریں چھاپیں گے میری آخری کہانی، میرے ساتھ آخری ملاقات۔ یہ سب میرے پیچھے پڑے ہیں۔ میں تو تنگ آ گئی لیکن میں ان سب سے مقابلہ کروں گی۔ آ جائے جس نے آنا ہے۔ گزر جائے جو ہم پہ گزرتی ہے۔ موت کا کیا ڈر؟ موت تو ہر روز آتی ہے۔ اگر کسی ظالم نے کبھی رحم کیا بھی تو کیا کیا؟ آنے والا آ ہی گیا اس لے درد کی بات سن لی۔ ہم نے زیادتیوں کا پٹارا کھول ہی دیا تو کیا؟ میں اُس کو پھر پل چھاؤں کی وادی میں تو لے ہی جاؤں گی۔ شکر ہے کوئی آیا تو؟

چھٹا باب۔ تیرے ساتھ ساتھ شمشان سے ایک پکھا بانہیں پھیلائے واپس آ رہا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ کوئی پیڑ ہو جس کو میں جڑ تک ہلا جاؤں ..... آگے اندھیرا ہے اور پیچھے سنسان۔

تم بھی چلے ہو؟ میں اس مرے ہوئے ننھے منے کا کیا کروں گی یہ جو شمشانوں سے نکل کر میری گود میں آ بیٹھا۔ آؤ بیٹا گھر چلیں گلیوں میں خاموشی ہے۔ اس گاؤں کے کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ کر ستائیں ہم تم ہولے ہولے آؤ گھر چلیں ..... تم بھی تھک گئے ہو گے میں تو سڑک کی تھکی ہوئی ہوں۔

سعید انجم

خوش قسمت

"ناصر عباس کہاں ہے؟" ندیم سے پوچھا گیا۔

"ناصر عباس؟ — وہ کون ہے؟"

"جسے تم تسکین کیفے میں ملے تھے!"

"میں تسکین کیفے میں کسی ناصر عباس سے نہیں ملا" ندیم نے بتایا۔

"دیکھو تم سیدھی طرح بتا دو!"

"کیا بتا دوں؟"

"اپنے دوستوں کے نام جو زیر زمین سرگرمیوں میں مصروف ہیں"

"میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو زیر زمین سرگرمیوں میں ملوث ہو"

"تمہارا ہیڈ کوارٹر کہاں ہے؟"

"میرا کوئی ہیڈ کوارٹر نہیں ہے!"

تین گھنٹے کی تحقیر آمیز تفتیش کے بعد ندیم کو ایک دوسرے پولیس افسر کے سامنے پیش کیا گیا جو نسبتاً زیادہ ذمہ دار آدمی تھا۔ اس کے چہرے پر سویلین مسکراہٹ تھی۔ اس نے ندیم کو سگریٹ پیش کی۔ اس کی روزمرہ مصروفیات کی تفصیل پھر سے سنی۔ پھر بولا:

"کیا کیفے تسکین میں تم نے انقلاب کے بارے میں بات کی تھی؟"

"ہماری میز پر انقلاب کی بین الاقوامی صورت حال پر تبادلہ خیال ہو رہا تھا"

ندیم نے بتایا۔

"کیا تم کمیونسٹ ہو؟" پولیس افسر نے پوچھا۔

"نہیں!"

"ہوں! ـــ تم کافی ذمہ دار آدمی نظر آتے ہو۔ شکریہ کہ تم یہاں پر آئے۔" اس نے کہا پھر ندیم سے ہاتھ ملا کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

پہلا پولیس والا آنکھوں میں خونی چمک لیے کمرے میں۔ اُس نے ندیم کو اُس کی کلائی سے پکڑا اور کمرے سے باہر لایا پھر تھانے کا گیٹ دکھاتے ہوئے ہالی وُڈ کے پیشہ ور قاتلوں کی طرح بڑبڑایا "جاؤ! ـــ تم خوش قسمت ہو!"

ندیم سہما ہوا گھر پہنچا۔ وہاں بے شمار لوگ اکٹھے تھے۔ تقریباً تمام ہمسائے۔ وہ ندیم کے بارے میں فکر مند تھے اور اندازے لگا رہے تھے کہ آخر وہ کون سی ایسی غلط حرکت ہو سکتی ہے جس کے سبب ندیم کو پولیس اسٹیشن لے جایا گیا تھا۔ ندیم کی ماں نے اُس کے پورے بدن کو چھو کر دیکھا پھر اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ماں کی اپنی ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ اُس کے ابا بھی پریشان تھے۔

"تم ٹھیک ٹھاک ہو نا؟" انھوں نے بظاہر لاپروائی سے پوچھا۔

"ہوں!"

"کیا انھوں نے تمہیں مارا؟"

"نہیں!"

"تم خوش قسمت نکلے!" ایک ہمسائے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں ٹھیک کہتا تھا!" اُس کا چھوٹا بھائی چلّایا "یہ تو بیرون ملک جانے کے لیے روٹین کی کارروائی تھی۔ کیوں ـــ ٹھیک ہے نا بھائی جان؟" اُس نے ندیم سے پوچھا۔

"ہاں ہاں!! ـــ تم ٹھیک کہتے ہو!" ندیم نے پیچھا چھڑایا۔

یکدم سب مطمئن ہو گئے۔ اُس کی ماں نے ایک خط لا کر دیا۔

"آج کی ڈاک سے آیا ہے۔" اُس نے بتایا۔

"ناروے سے!" چھوٹا بھائی بولا۔

ندیم کے دوست علی نے اُس کے سفر سے متعلق کاغذات بھجوائے تھے۔ ہمسائے خوش

نظر آنے لگے۔ کچھ کی آنکھوں میں ولایت پلٹ پاکستانی گھوم گئے۔ کسی کی نظروں میں کوئی گورا ٹورسٹ۔ کئی ایک نے ٹیلی ویژن پر دکھائی جانے والی امریکن فلموں کے کسی کردار کے ساتھ ندیم کے مستقبل کا موازنہ کرنا شروع کر دیا۔

"آپ خوش قسمت ہیں بھائی جان!" اُس کے چھوٹے بھائی نے سرگوشی میں کہا۔

ندیم کی روانگی کا وقت آن پہنچا تو اُس کے ماں باپ اور بہن بھائی نے اس کے ساتھ تنہائی میں ملاقاتیں کیں۔ اُس کی ماں نے کہا:

"تمہارے باپ کو ہمیشہ سے پیسے کی طلب رہی ہے جو کبھی پوری نہیں ہوئی۔ میرا زیور بیچ کر اُس نے کاروبار کیا تھا اور اب بیٹی کے جہیز کا پیسہ خرچ کر کے تمہیں باہر بھجوا رہا ہے۔ اپنی جوانی میں خود مجھ سے دور رہا اور اب میرے بڑھاپے میں جوان بیٹے کو پردیس بھجوا رہا ہے۔ اچھا! — جیسے اللہ کی مرضی — میں کیا کروں۔ میں بس بدقسمت ہوں — بیٹے خط باقاعدگی سے لکھنا، ہر ماہ اپنی تازہ فوٹو بھجواتے رہنا، اپنی صحت کا خیال رکھنا اور ہمیں مت بھولنا، تمہارے جانے کے بعد ہم تمہارے لیے زندہ رہیں گے تمہیں دوبارہ دیکھنے کے لیے، تمہیں محسوس کرنے کے لیے۔" پھر ندیم کی ماں نے اسے زور سے بھینچا اور آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی "اچھا! خدا تمہارا حافظ و ناصر ہو۔"

چھوٹے بھائی نے کہا "بھائی جان آپ خود کالج میں پڑھتے رہے ہیں اور ایک کالج اسٹوڈنٹ کی ضروریات سے خوب واقف ہیں۔ مجھے تھوڑا سا جیب خرچ اور اچھا لباس چاہیے جو اللہ کے فضل سے مل رہا ہے، صرف ایک چیز کی کسر ہے اور وہ ہے کنوینس۔ اگر انسان کے پاس اپنی سواری ہو تو وہ شہزادہ ہے شہزادہ — مجھے بس ایک ہی بات کہنی ہے آپ جاتے ہی مجھے ایک موٹر سائیکل بھجوا دیں، صرف ایک موٹر سائیکل۔"

ندیم کی بہن نے کہا "مجھے تمہاری ضرورت تھی، تمہاری دوستی کی، تمہارے خیالات کی۔ تم ذرا اصل میرا دکھ سمجھتے ہو۔ نئے دور کے انسان کی ضروریات سمجھتے ہو۔ ہمارے والدین اُس وقت کی پیدائش ہیں جب اخبار بھی نہیں ہوتے تھے، اب تو گھر گھر میں ٹیلی ویژن ہے۔ میں تمہاری موجودگی میں مضبوط تھی، تمہاری غیر حاضری میں کمزور ہو جاؤں گی لیکن

ں ایک بات بتا دوں تم سے مجھے اپنی کمزوری قبول ہے اگر میرے لیے تعیشات کے لیے تمہارے پردیس جانے سے ہم سب کے مشترکہ دکھ دور ہونے کا امکان ہے۔ اس لیے تم ضرور جاؤ — وعدہ کرو کہ تم بھول نہیں جاؤ گے کہ تم ہم سب کے دکھوں کا مداوا ہو۔ تمہاری تعلیم میں پورے گھر کی قربانیاں شامل ہیں، اب تمہاری آمدنی میں بھی پورے گھر کو شریک ہونا چاہیے۔ جاؤ میرے بھیا الوداع! میں رونا نہیں چاہتی لیکن یہ بتا دوں کہ میں افسردہ ضرور ہوں — تم مجھے ہنسنے کو مت کہنا۔ خدا حافظ!" اور وہ کمرے سے چلی گئی۔

ندیم کے ابا نے کہا "بیٹے اب تم ذمہ دار ہو۔ میرا فرض تھا تمہیں تعلیم دلانا، وہ تم نے مکمل کر لی۔ اب تم میرا دایاں ہاتھ ہو، میرا مستقبل ہو، میرے تشنہ خوابوں کی تکمیل ہو۔ اس کے لیے تمہاری ہمت اور میری قربانی کی ضرورت ہے۔ میں نے سینے پر پتھر رکھ لیا ہے اور تمہیں اپنی آنکھوں سے دور بھجوا رہا ہوں۔ میری بس ایک ہی نصیحت ہے، سؤر، شراب اور لڑکی سے پرہیز کرنا۔ سؤر آنکھوں سے حیا چھینتا ہے، شراب انسان کی عقل سلب کرتی ہے اور لڑکی انسان کو والدین سے جدا کرتی ہے۔ اب میں انتظار کروں گا اور دیکھوں گا کہ میری قربانیوں کے مقابلے میں تم نے کتنی ہمت کی ہے — میں دیکھوں گا کہ میں کتنا خوش قسمت ہوں؟"

ندیم کے دوستوں نے اس کی دعوت کی۔ ایک دوست نے کہنا شروع کیا۔

"تمہارے ساتھ تو بے شمار امیدیں وابستہ تھیں ندیم۔ ہم تو موقع پرست تھے کہ ہم نے — جھٹ سرکاری نوکری کر لی۔ ہماری مجبوریاں — لیکن تم کیوں انقلاب سے غداری کر رہے ہو؟"

دوسرے دوست نے کہا "تم ہو خوش قسمت! یورپ میں شراب پیو گے اور کلیوں کا رس چوسو گے، ہمیں یاد رکھنا اور کبھی کبھار کوئی کلینڈر اور تصویری رسالے ضرور بھیجتے رہنا۔"

تیسرے نے کہا "ہم یورپ تو جا نہیں سکتے لیکن اگر تم چاہو گے اور مطلوبہ کلینڈر رسالے بھیجتے رہو گے تو ہم یہاں بیٹھ کر بھی وہاں کے مزے لوٹ سکیں گے۔"

آخر میں ندیم کو فوزیہ ملی۔ فوزیہ جس سے ندیم کو محبت تھی۔ اس نے کہا:

"ندیم تم جو ہمیشہ سے محبت میں لمس کے قائل رہے اب وہاں تمہارے ہو جہاں

محبت ہوئی ہی طمع کی بنیاد پر ہے۔ حادثے میں غریب ماں باپ کی بیٹی ہوں اور میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔ اب خوش حال گھرانوں کی لڑکیوں کے باپ تمہیں قیمتی جہیز کے عوض خریدیں گے اب میرا تمہارے اوپر کوئی حق نہیں —— مگر وہ لمحات جو ہم نے مل کر گزارے ہیں۔ آؤ ان کی شہادت کے لیے ایک رودادِ معانقہ کرلیں، ہمارا یہ پہلا اور آخری لمس میری بدقسمتی کے نام ہوگا۔"

روانگی کے لیے اعلان ہوا اور ندیم ہوائی جہاز میں آن بیٹھا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ خالی رہی۔ فرینکفرٹ کے ہوائی اڈے سے ایک یورپین وہاں آن بیٹھا۔

"جرمن بولتے ہو؟"

"انگلش۔"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"اوسلو!"

"ٹورسٹ؟"

"نہیں۔"

"طالب علم؟"

"نہیں!"

"ورکر؟"

"ہاں!"

"پاکستان غریب ملک۔"

"ہاں۔"

"ناروے امیر ملک؟"

"ہاں!"

"خوش قسمت ہو!" اُس نے آنکھ دبائی۔

ندیم سر ہلاتے ہوئے مسکرا دیا۔

اوسلو ایرپورٹ پر ندیم دوسرے مسافروں کے ساتھ باہر نکلا تو علی اس کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ اس نے خوشی سے ہاتھ ملایا اور قریب آکر بولا:

"تم بڑی جلدی باہر آگئے۔"

"دوسرے مسافروں کے ساتھ ہی آیا ہوں۔"

"پولیس والے نے تمہیں روکا نہیں؟"

"نہیں!"

"سوال جواب نہیں کیے؟"

"کیے۔ ایک دو روٹین کے سوال!"

"اور بس ــــ؟"

"بس! ــــ پھر مہر لگا دی۔"

"واہ! ــــ بڑے خوش قسمت ہو!"

ندیم نے علی کی رہنمائی میں صحت عامہ کے سرٹیفیکٹ کے لیے بڑے اسپتال کا چکر لگایا۔ پولیس آفس میں یہ سرٹیفیکٹ دکھا کر ناروے میں رہائش اور کام کرنے کے اجازت نامے کی مہر لگوائی۔ فیکٹری پہنچا جہاں اسے کام کرنا تھا اور لکڑی کی وہ بیرک دیکھی جس میں اسے رہنا تھا ــــ ہاں برف پر چلنے والے گرم بوٹ بھی خریدے۔

فیکٹری میں ترکی کے مزدوروں نے "گردش" کہہ کر اور مراکو کے مزدوروں نے "برادر" کہہ کر اور ہاتھ ملا کر ندیم کا استقبال کیا۔ اُس نے کارڈ پنچ کرنا سیکھا اور محنت میں جُت گیا۔ کام کے دوران اس کے گرد لوگ "ہائے" ــ "برا" اور "فارڈی" کے الفاظ میں گفتگو کرتے رہے۔ نارویجن پروڈکشن منیجر شیشے کے کیبن میں بیٹھا ٹیلی فون کے ساتھ مصروف رہا۔

ہفتے کی شام علی اسے کلب لے گیا۔

"چیرز!" ندیم نے گلاس اُٹھایا۔

"سکول!" علی نے کہا "ناروے میں سکول کہتے ہیں۔"

"پاکستان میں کیا کہتے ہیں؟" قریب بیٹھی نارویجن لڑکی نے انگریزی میں پوچھا۔
"بسم اللہ!" علی نے بتایا۔
"اسلام میں شراب حرام ہے۔" ندیم نے جواب دیا۔
"پھر تم کیوں پیتے ہو؟"
"ہم بُرے مسلمان ہیں۔" علی نے شارٹ کٹ اختیار کیا۔
"انگریزوں کی غلامی کے سبب۔" ندیم نے کہا۔
"میں سمجھی نہیں۔"
"ولایتی ثقافت کو اپنانا ہمارے ہاں تہذیب یافتہ ہونے کی نشانی ہے۔" ندیم نے وضاحت کی۔
"اچھا؟" نارویجن لڑکی نے حیرانی سے کہا اور کرسی بدل کر قریب آگئی۔
"تم اسے بئیر پلاتے رہنا، میں اپنے لیے بھی کوئی دیکھوں"۔ یہ کہتے ہوئے علی میز سے اُٹھ گیا۔
کلب بند ہونے کو تھا تو علی ایک لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالے ندیم کی میز پر آیا۔
"آؤ میرے گھر چلتے ہیں، چھوٹی سی پارٹی کریں گے۔" اس نے انگریزی میں کہا۔
ندیم نے حیرانی سے اُس کی طرف دیکھا۔
"یہ ہوئی نا مزے کی بات۔" ندیم کی ساتھی چہکی۔
"چلو بھئی اِس کی کمر میں ہاتھ ڈالو۔" علی نے تقریباً ڈانٹتے ہوئے ندیم سے کہا۔
چند روز بعد علی کے پتے پر ندیم کے نام ایک چٹھی آئی ایک ڈاکٹر کی طرف سے۔ اسے چیک اپ کے لیے بلایا گیا تھا۔ معلوم ہوا وہ لڑکی کسی جنسی بیماری میں مبتلا تھی۔ تفتیش کے بعد اُس نے کچھ مردوں کے نام اور پتے مہیا کر دیے تھے جن کے ساتھ وہ سوئی تھی۔ ندیم کا چیک اپ ہوا تو وہ صحت مند ثابت ہوا۔ ڈاکٹر نے کہا "تم خوش قسمت ہو ــــ لیکن احتیاطاً ایک ٹیکہ لگائے دیتا ہوں۔"
پھر یوم مئی آیا۔ فیکٹریاں، کارخانے بند تھے۔ شہر میں سرخ جھنڈوں والے جلوس تھے

ندیم بھی سڑک کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ لوگ نعرے لگاتے گزرتے رہے۔ اسے اپنی فیکٹری میں کام کرنے والا ایک نارویجن بھی نظر آیا۔ ندیم نے ہاتھ ہلایا۔ اس نے بھی مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ جلوس گزرتا چلا گیا۔

فیکٹری میں ندیم نے اس نارویجن سے پوچھا "تمہیں لال جھنڈوں کے جلوس میں جاتے ہوئے ڈر نہیں لگتا؟"

"ڈر کیوں لگے گا؟"

"پولیس پیچھے لگ جاتی ہے!"

وہ زور سے ہنسا "ایسا پاکستان میں ہوتا ہو گا —— یہاں نہیں!"

"اچھا!" ندیم نے غیر مطمئن لہجے میں کہا۔

"کیوں —— پولیس کبھی تمہارے پیچھے لگی تھی؟"

"ہاں! —— میرا ایک دوست کمیونسٹ تھا۔ میں اس سے ملا تو پولیس نے مجھے پکڑ لیا۔"

نارویجن زور سے ہنسا "یہاں ایسا نہیں ہوتا۔ یہاں دوست ملنے کی آزادی ہے۔ چاہے تمہارے دوست کمیونسٹ ہی کیوں نہ ہوں"۔ پھر اس نے ندیم سے ہاتھ ملاتے ہوئے بتایا کہ وہ ہر جمعرات کی شام کو اور ہفتے کی صبح کو ایک اسٹور کے کیفے میں بیٹھتا ہے۔ ندیم کو وہاں آنے کی دعوت ہے۔ ندیم نے دوستوں کی تلاش میں وہاں جانا شروع کر دیا۔

ایک روز ندیم نارویجن دوست کے بتائے ہوئے اسٹور کے کیفے میں بیٹھا کافی پی رہا تھا کہ تین نارویجن اس کے پاس آن کھڑے ہوئے۔ ایک نے اپنا شناختی کارڈ دکھاتے ہوئے کہا "پولیس" اور باہر کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ باہر سائرنوں والی کار کھڑی تھی۔ تھوڑی دیر میں ندیم پولیس اسٹیشن میں بیٹھا تھا۔

"پول جانسن کہاں ہے؟" اس سے پوچھا گیا۔

"پول جانسن —— وہ کون ہے؟"

"جسے تم وہاں کیفے میں ملے تھے۔"

"میں کیفے میں کسی پول جانسن سے نہیں ملا۔"

"دیکھو تم سیدھی طرح بتا دو!"

"میرے پاس بتانے کے لیے کچھ ہے ہی نہیں!"

"ہے۔ تم اپنے گروہ کے آدمیوں کے نام اور پتے بتاؤ؟"

"میرا کوئی گروہ نہیں ہے!"

"یہ کالا شیطان ایسے نہیں مانے گا!" دوسرا پولیس والا اسے خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے آگے بڑھا۔ ندیم کو ہالی وُڈ کی فلموں کے پیشہ ور قاتل یاد آ گئے۔ پاکستانی پولیس والا تو اس کے مقابلے میں کاغذ کا شیر تھا۔ یہ امریکنوں کا ہم شکل سفید فام کردار تھا فرق صرف اسکرین اور حقیقت کا تھا۔

تین گھنٹے کی تحقیر آمیز تفتیش کے بعد ندیم کو دوسرے پولیس افسر کے سامنے پیش کیا گیا جو نسبتہً زیادہ ذمہ دار آدمی تھا اس کے چہرے پر سوبلین مسکراہٹ تھی۔ اُس نے ندیم کو سگریٹ پیش کی۔ اس کی روزمرہ کی مصروفیات کی تفصیل پھر سے سنی، پھر بولا "تم چرس پیتے ہو؟"

"نہیں!" ندیم نے جواب دیا۔

"ہوں! ـــ تم کافی سمجھدار آدمی نظر آتے ہو!"

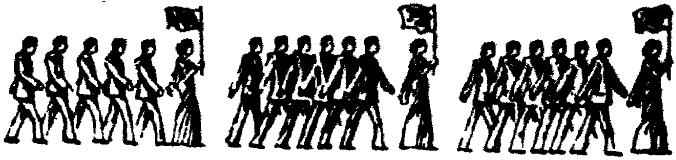
پھر پولیس والا ٹیلی فون کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ اس نے مختلف نمبر گھمائے اور ایک ہی قسم کی باتیں کیں۔ پھر ندیم کو بتایا کہ پول جانسن نارویجن پولیس کے ایک کارندے کا نام ہے جو چرس اسمگل کرنے والے ایک گروہ کی گرفتاری کے لیے تفتیش کر رہا تھا۔ پول جانسن اسٹور کے کیفے میں ایک غیر ملکی سے کچھ معلومات حاصل کرنے کے لیے گیا تھا۔ پھر غائب ہو گیا۔ پولیس کے خیال میں جس غیر ملکی نے پول جانسن کو معلومات مہیا کرنا تھیں وہ ندیم تھا۔

ندیم کے انکار کے باوجود پولیس نے اپنی کارروائی کے لیے ریمانڈ حاصل کر لیا۔ اب اسے ایک ہفتہ جیل میں رہنا تھا۔

چند روز بعد پول جانسن خود ہی پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔ اس نے بتایا کہ ندیم بے قصور تھا۔ ہالی وُڈ کی فلموں کے پیشہ ور قاتلوں کا ہم شکل ندیم کے پاس پہنچا۔ اس نے ندیم کی کلائی پکڑی، عمارت سے باہر لایا اور دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا:

"جاؤ ـــ تم خوش قسمت ہو!"

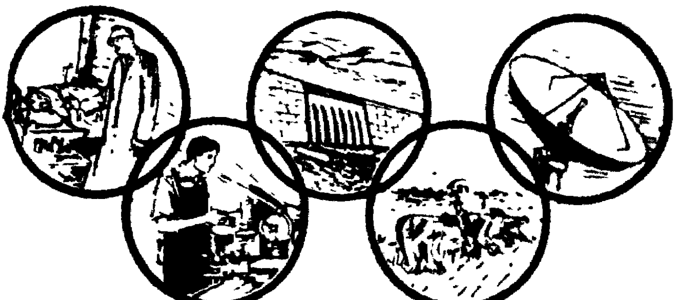
٭٭٭



سدا بڑھتے قدم

نویں ایشیائی کھیلوں کی میزبانی کے فرائض انجام دیتے ہوئے ہم نے جو کامیابیاں حاصل کی ہیں، ان کے لئے بھارت کو دنیا بھر سے تہنیت کے پیغام ملے ہیں۔

اسٹیڈیم ریکارڈ ٹائم میں تعمیر کیے گئے۔ ملک بھر اور دیگر ممالک کے لاکھوں ہی گھروں میں رنگین ٹیلی ویژن پر کھیل لوگوں کو دکھائے گئے۔ اس کے لئے کمپیوٹروں، الکٹرانک ایکسچینجوں، مائکرو ویو اور مصنوعی سیارے کے ساتھ رابطوں کے عظیم سلسلے کا کامیابی کے ساتھ استعمال کیا گیا۔



تال میل کے ساتھ کی گئی سخت محنت کی یہ منہ بولتی مثال ہے

اگر ہم قومی تعمیر کے دیگر شعبوں میں بھی اسی لگن سے کام کریں تو اسی طرح کی کامیابیاں حاصل کی جا سکتی ہیں۔



آیئے ہم سب مِل جُل کر
اپنے وطن کو مضبوط بنائیں

dp 82/566

فلم نامہ

اے سیونتھ مین A SEVENTH MAN (ساتواں آدمی) :-

پچھلے دنوں ہندوستانی سینما کی دنیا میں ایک اہم واقعہ ہوا۔

ہندوستان سے باہر اس واقعے کی گونج جرمنی اور پیرس کے انتہائی تربیت یافتہ فلمی حلقوں میں سنی گئی۔ ہندوستان میں انگریزی، بنگالی اور ہندی کے متعدد اخبارات اور رسائل اس واقعے کی خبروں سے بھرے ہوئے ہیں۔

۳۵ ایم ایم، ایسٹ مین کلر میں چالیس منٹوں پر محیط اس واقعے کا عنوان ہے — اے سیونتھ مین (ساتواں آدمی) !

یہ ساتویں آدمی کی کہانی ہے اور پراسرار قدیم داستانوں کے ساتویں در کی طرح ایک انوکھی دیومالا کے چہرے سے نقاب اٹھاتی ہے۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کہانی کا ساتواں آدمی نہ تو دیوتاؤں کی قبیل سے تعلق رکھتا ہے، نہ امراء اور شہزادگان کی اس دنیا سے جس پر اب تاریخ کی گرد جم چکی ہے۔

یہ ساتواں آدمی بے نام بھی ہے اور بے چہرہ بھی — یوسف، فضلو، امام دین — اس کا نام کچھ بھی ہو سکتا ہے اور اس کا چہرہ؟ کلکتے کی سڑکوں پر آٹھوں پہر دیکھا جا سکتا ہے لیکن اسے یاد رکھنا آسان نہیں کیونکہ یہ کسی سپر اسٹار، اسٹار یا ایکٹر کا چہرہ نہیں ہے۔

اس طرح یہ کہانی، جس کے کرداروں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے، ایک ایسی "فلمی کہانی" ہے جس میں ایک بھی اداکار نہیں ہے۔ اس فلم کا سینیریو لاکھوں کی آبادی والے ایک گنجان شہر کی تاریخ نے ترتیب دیا ہے اور اس کے واقعات آج کی سماجی صورت حال

کے بطن سے نمودار ہوتے ہیں۔

اسی لیے عین رشید خاں اس کہانی کا خالق ہے مگر یہ کہانی اس کی تخلیق نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ لمحہ جب عین رشید کو اس کہانی کا خالق کہا جائے، اس کے لیے اپنے حواس کی اذیت کا سب سے شدید اور بے مہر لمحہ ہوگا۔

عین رشید کو میں پچھلے دس بارہ برسوں سے جانتا ہوں۔ بہت دن ہوئے، اس نے اپنے شہر کلکتہ پر ایک نظم کہی تھی اور مجھے یاد ہے کہ اس نظم کو پڑھنے کے بعد دل بہت گھبرایا تھا، کلکتا اور عین رشید دونوں کے لیے۔

ویسے عین رشید ایک نوجوان پولیس آفیسر ہے۔ زندہ دل، پُرجوش اور ایک دلکش شخصیت رکھنے والا۔

اُس کے شعور کی تربیت مغرب اور مشرق کی ادبی روایات کے ساتھ ساتھ ہمارے ثقافتی وجود کی اُس تاریخ کے ہاتھوں بھی ہوئی جس کے ایک رخ کو ہم آواں گارد سینما یا سیریس سینما کا نام دے سکتے ہیں اور عین رشید کی بصیرت، جو اب تک تخلیقی لفظ کے واسطے سے انسانی تجربوں کا احاطہ کرتی آئی تھی، اب اپنے اظہار کے لیے اس نے ایک نئے وسیلے کا انتخاب کیا ہے ـــــ انسانی حال اور مستقبل کے تحفظ اور تعمیر کا شاید سب سے موثر اور طاقتور وسیلہ۔ ماہرین سماجیات غلط نہیں کہتے کہ آج کا اصل ایڈیم انسانی نطق کا محتاج نہیں بلکہ بظاہر بے جان اور بے روح سلولائیڈ ہے۔

"اے سیونتھ مین" (ساتواں آدمی) ایک دستاویزی فلم ہے، اور جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا، اس فلم کے تمام مناظر و مظاہر ساتویں آدمی کی زندگی کے گرد گھومتے ہیں۔ مگر یہ ساتواں آدمی اس بے حساب تماشے کا محور نہیں ہے۔ کلکتہ شہر کے ہر چھ آدمیوں کے مقدر کا شریک یہ ساتواں آدمی، اس شہر کے ایک عام مسلمان کا علامیہ ہے۔ اس شہر کی تاریخ، اس کی روایات، اس کے ثقافتی ہنگامے، اس کا آشوب اور اس کے الم، اس کی محرومیوں اور اس کی امیدوں ـــــ ان سب میں یہ ساتواں آدمی آج برابر کا شریک ہے۔ گئے دنوں میں اس شہر کی بہت سی روایتیں، ساتویں آدمی کی انفرادی ملکیت تھیں۔ یہ آثار آج بھی پرانی حویلیوں، کھنڈروں

مقبروں اور مسجدوں، گلیوں اور بازاروں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ مرشدآباد کے نوابین، اودھ کے معزول تاجدار جانِ عالم واجد علی شاہ، سلطان ٹیپو کے بیٹے، اردو صحافت اور زبان کے ابتدائی راکز، ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے پہلے مسلمان رؤسا اور اُمرا کے جاہ وحشم سے آباد محل اور محلے یہ توکب کے اُجڑ چکے، مگر ساتواں آدمی بناؤ اور بگاڑ کے اس تماشے سے بے نیاز ان اُجڑی ہوئی عظمتوں اور فراغتوں سے بے پروا، کلکتہ شہر کی گھنی، گھناؤنی، گنجان بستیوں میں آج بھی آباد ہے — اسے کسی نے یہ نہیں بتایا کہ اس کی تاریخ کیا ہے اور اپنی تاریخ سے باخبر ہونے کی جستجو اس نے یوں نہیں کی کہ اسے اس کی فرصت نہ ملی۔ تہذیب اور تعیش، فرصتوں اور فراغتوں کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں، باقی جو کچھ ہے وہ صرف زندگی ہے، بدہئیت، کھردری اور دہشت آثار۔

عین رشید کا کارنامہ یہ ہے کہ اس کے کیمرے کا لینس انسانی دل کی طرح دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور کیمرے کی آنکھ وہ سب کچھ دیکھ لیتی ہے جس کی دید کے لیے صرف دو آنکھیں کافی نہیں ہوتیں۔ یہ کرشمہ فن کار کی تیسری آنکھ انجام دیتی ہے۔

ماضی اور حال اس فلم میں اپنے تناظر کے اور اپنی سمتوں کے اختلافات کے باوجود ایک دوسرے میں پیوست دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ایک تسلسل کا قصہ ہے اور اپنی آخری کڑی ہے — مستقبل کا منتظر۔

میرا خیال ہے کہ تاریخ میں رہتے ہوئے، تاریخ کے حدود کو مسمار کرنے کی اس سے روشن مثال ہندوستانی سینما نے اب تک پیش نہیں کی ہے۔ عین رشید نے جس تخلیقی اعتمادی اور فن کارانہ جسارت کے ساتھ ہندوستان کی سماجی صورت حال کے ایک نازک، گرچہ ناگزیر موضوع کو ہاتھ لگایا ہے، اسے ہم دستاویزی فلموں کی روایت کے نئے آغاز سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ اس موضوع کو برتنے میں اس بات کا اندیشہ تھا کہ خود رشید کے ہاتھ جلتے، یا یہ کہ حقائق کی آگ کچھ دب گئی ہوتی۔ مگر ہوا یہ کہ اس کی بصیرت اس بصیرت کی گرفت میں آنے والی سچائی، دونوں کی حرارت محفوظ نظر آتی ہے۔

لائپزگ، مینہم اور بارسیلونا کے فلمی میلوں میں اس فلم کو شرکت کی جو دعوت دی

تی با اینتھرو پولوجیکل سروے آف انڈیا نے ایک تاریخی دستاویز کے طور پر محفوظ رکھنے کے لیے اس فلم کی جو کاپیاں خریدیں، وہ بجائے خود اس بات کا ثبوت ہے کہ عین رشید کے ہاتھوں ساتویں آدمی کی یہ الم آمیز سرگزشت رائیگاں نہیں گئی۔ ساتویں آدمی کے المیے کا اظہار نہ تو کوئی تقریر بنی نہ کوئی جذباتی چیخ پکار ـــــ یہ کام عین رشید نے ساتویں آدمی کی خاموشی کے واسطے سے لیا ہے۔ اس لیے اس فلم میں ایک زیریں لہر کی طرح جاری وساری احتجاج اور اس احتجاج کی تہہ میں چھپا ہوا اخلاقی ملال فلم بینوں ہی نہیں، فلم بنانے والوں کے لیے بھی ایک مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ساتویں آدمی کی یہ کہانی دیس پردیس کے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے۔ خاص طور سے ہمارے ملک میں جو کام عمائدین قوم اور مقرروں اور مفکروں کی ایک پوری جماعت کے بس سے باہر ہے، چالیس منٹ کی یہ فلم اپنی خموشی کے ساتھ بھی انجام دے سکتی ہے۔ یوں بھی کسی نہ کسی سطح پر، اس دیس کے اکثر باسی ساتویں آدمی کی سرگزشت میں اپنے مقدرات کی شناخت بھی کرسکیں گے ـــــ اور شاید اس امکان کی بھی جس کا خمیر انھی مقدرات کی سرزمین سے اُٹھے گا۔

اگر سلولائیڈ کی زبان میں نظم کہی جاسکتی ہے اور آنکھوں کے واسطے سے کوئی نظم سنی جاسکتی ہے تو میں بلا تکلف "اے سیونتھ مین" کا نام لوں گا۔ یہ ایک فلم بھی ہے اور طویل بحر میں لکھی ہوئی ایک نظم بھی۔

لیکن ہم چاہیں تو اس تسلسل کو، دو دائروں میں مقید کرسکتے ہیں۔ پہلا دائرہ اس فلم کا تاریخی تناظر ہے جس کی ترتیب میں ایٹکنس، ڈوائلی، ڈینیئل اور زوفانی کی پینٹنگز سے مدد لی گئی ہے۔ بظاہر یہ تصویریں ساکت ہیں مگر فلم کے پردے پر یہ واقعات کے عام تحرک اور صورت حال کی عام سرگرمی میں شامل دکھائی دیتی ہیں۔ دوسرا دائرہ فلم کے عصری پس منظر سے مربوط ہے۔ اس ضمن میں فلم کو دیکھتے وقت یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ اس دائرے کی تکمیل غیر معمولی تحقیق و تجسس اور فیلڈ ورک کے ذریعے ممکن ہوسکی ہے۔ عین رشید نے ڈاکٹر ایم کے۔ اے صدیقی کی مشہور کتاب "مسلمان کلکتہ" Muslims in Calcutta

سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ یہ کتاب اینتھروپولوجیکل سروے آف انڈیا نے شائع کی تھی
چنانچہ اس کا استناد مسلّم ہے، تاہم عین رشید نے ڈاکٹر صدیقی کے پیش کردہ اعداد و شمار کو
آج کی سطح تک لانے کے لیے جا بجا کچھ اضافے بھی کیے ہیں۔

عین رشید کی وابستگی تاریخ کے جس سچ اور اس سچ کی تہہ سے ابھرنے والے جن ایقانات اور اقدار سے ہے، ان کی ترجمانی اس فلم کے مجموعی پیغام سے ہوتی ہے۔ یہ پیغام اس حقیقت کا دوسرا نام ہے کہ ساتویں آدمی کے مقدر میں تبدیلی کا مسئلہ اس کے گردوپیش کی اجتماعی سماجی صورت حال کی تبدیلی کے مسئلے سے جڑا ہوا ہے۔ اس منطقے پر اس کی ذاتی تاریخ اور عقاید کا سوال بے معنی ہو جاتا ہے کہ اب بقیہ چھ آدمیوں کی طرح، یہ ساتواں آدمی بھی اپنی اقتصادی حیثیت اور اپنے پیشے کی نوعیت کے واسطے سے پہچانا جاتا ہے۔

ایک غیر ملکی نامہ نگار سے بات چیت کرتے ہوئے عین رشید نے یہ اطلاع دی تھی کہ "اے سیونتھ مین" (ساتواں آدمی) کی تکمیل میں دو برس لگے۔ فلم کے لیے کوئی سیٹ نہیں لگایا گیا نہ کوئی مصنوعی وسیلہ کام میں لایا گیا۔ ہمارے "اداکار" پوری آزادی کے ساتھ کیمرے کے سامنے چلتے پھرتے تھے، نہ کوئی ہدایت، نہ کوئی پابندی۔ اس طرح سلولائیڈ پر جو کچھ بھی ہے، وہی ہے جو آنکھ کیمرے سے الگ ہٹ کر بھی دیکھتی رہتی ہے۔

مگر زندگی کی عام سچائی کو ایک جمالیاتی سچائی کی شکل دینا، ظاہر ہے کہ یہ کام سہل نہیں ہے۔

(شمیم حنفی)

"غریبی دُور کرنے کا ایک ہی منتر ہے
— اور وہ ہے واضح مقصد اور
ڈسپلن کے احساس
کے ساتھ سخت محنت۔"
— اندرا گاندھی

ستیہ میو جیتے —
شرّم ایو جیتے



"عصری ادب" ۵۱۔ دہلی

کتابوں کی باتیں

"اردو ناولوں میں سوشلزم" ——————— ڈاکٹر زرینہ عقیل احمد

کتابستان۔ الہ آباد ۱۹۸۲ء صفحات ۲۰۱ قیمت: -/۴۵

اشتراکیت اور ناول کی تعریف کرنے کے بعد مصنفہ نے پریم چند، کرشن چندر، عصمت، بیدی، قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں سوشلزم کے تصورات کا تجزیہ کیا ہے۔ سوشلزم کی کارفرمائی انھوں نے بہت سیدھے سادے طور پر دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ سوشلزم کے ان تصورات کے ضمن میں نذیر احمد اور مرزا محمد ہادی رسوا کے ناولوں کا تفصیلی تذکرہ بے محل سا لگتا ہے جب کہ کرشن چندر کے معاصرین اور ان کے بعد کے ناولوں میں سوشلسٹ تصورات کی کارفرمائی کا زیادہ بھرپور تجزیہ مفید ہو سکتا تھا۔ موضوع کی ندرت کے اعتبار سے یہ کتاب اہم ہے۔ اس موضوع پر بھی اور زیادہ گہرائی اور توجہ کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے (م۔ ح)

"بہار میں اردو تنقید" ——————— ڈاکٹر اعجاز علی ارشد

پٹنہ ۱۹۸۱ء صفحات ۱۱۲ قیمت -/۱۵

صاحب تذکرہ شورش سے لے کر وہاب اشرفی تک بہار کے اہم ادبی نقادوں کا یہ مختصر سا جائزہ محض معلوماتی نہیں تجزیاتی بھی ہے۔ مصنف نے بہار کے مختلف ادبی نقادوں کے تنقیدی نظریات اور طریق کار سے اہم اصول و ضوابط کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ علاقائی حد بندی کے باوجود یہ کوشش قابل قدر ہے۔ مصنف نے نقادوں کے قد و قامت سے مرعوب ہوئے بغیر ان

کے کارناموں اور کمزوریوں کو پرکھا ہے اور کافی اہم نتائج نکالے ہیں۔ کلیم الدین احمد، شکیل الرحمن اور وہاب اشرفی پر مضامین خاص طور پر خیال انگیز ہیں۔

* سعادت حسن منٹو: اپنی تخلیقات کی روشنی میں (ایک نفسیاتی تجزیہ) از پروفیسر محمد محسن
صفحات ۱۲۸ قیمت: -/۲۲
دارالاشاعت ترقی۔ دہلی ۱۹۸۲ء

پروفیسر محمد محسن کا یہ کارنامہ ادبی تنقید اور نفسیاتی تجزیے، دونوں حیثیتوں سے عہدآفریں ہے مدتوں بعد اردو تنقید ایک معتبر اور مستند نفسیاتی تجزیے سے آشنا ہوئی ہے۔ مصنف نے نہایت دیدہ ریزی سے منٹو کی شخصیت اور زندگی کی کڑیوں کو منٹو کے فن سے جوڑنے کی کوشش کی ہے اور اس کے ذریعے نفسیاتی حقائق تک رسائی حاصل کی ہے۔ مصنف منٹو کے ایک کردار اور رام سروپ میں اس کی تصویر دیکھتے ہیں اور منٹو کے تصور جنس میں ایک نفسیاتی آویزش کا پتہ چلاتے ہیں جو یقیناً منٹو شناسی کا ایک نیا رخ ہے:

> "کوئی داخلی زبردست طاقت منٹو کو غیر عورتوں سے جنسی تعلق پیدا کرنے سے روکے رہتی تھی۔ بچے کے لیے ماں سے مادی وابستگی، اس کی جسمانی قربت کی خواہش ایک فطری تقاضا ہے لیکن منٹو کے نامساعد حالات جن میں اس کا بچپن گزرا تھا اس تقاضے کی ماہئیت میں مزاحم ہو گئے تھے۔ یہ تقاضہ اپنی اصلی صورت میں اس کے لاشعور میں جگہ بنائے رہا ماں کی محبت اور غیر عورت سے جنسی وابستگی کے فرق کا ہیولیٰ تیار نہ ہو سکا جس کی بنیاد پر یہ فرق زیادہ سے زیادہ واضح ہوتا گیا۔" (صفحہ ۱۰۵)

مصنف نے منٹو کی محبت کو شہوت سے الگ نہ کر پانے اور اپنی بیوی صفیہ کے لیے احترام، اس کی دلجوئی اور دلداری کی فکر کو عورت کی طرف منٹو کے عام رویے کے مقابلے میں رکھ کر نہایت بصیرت افروز تجزیہ کیا ہے۔ آخر میں منٹو پر مکمل کتابیات بھی شامل ہے۔ کتاب منٹو کی "ناری نہ نوری" کے بعد یقیناً اہم ترین کتاب ہے بلکہ حال میں چھپنے والی تنقیدی کتابوں میں امتیازی درجہ رکھتی ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ جدیدیے اور مہمل پسند اپنے وجودی اور نیم نجت رجعت پسندانہ خیالات کے

لیے جس طرح منٹو کو استعمال کر رہے ہیں ان کا اس تنقید سے سدباب ہوتا ہے۔ (م۔ ح)

"تعلیمی افکار و مسائل" ——————— عبداللہ بخش قادری

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ دہلی ۱۹۸۲ء صفحات ۱۶۰ قیمت: ۱۲/۵۰

ہندوستان میں تعلیمی مسائل خاصے الجھے ہوئے ہیں ان مسائل کا عبداللہ ولی بخش قادری نے بڑی خوبی سے احاطہ کیا ہے۔ مختلف عمائدین (خاص طور پر مولانا آزاد) کے نظریاتِ تعلیم ہی پر ان کے مضامین نہایت سلجھے ہوئے ہیں۔ نصاب کو ہندوستان میں زہر پھیلانے کے لیے استعمال کیا جا تا رہا ہے نصاب اور طرزِ تعلیم کے ان نئے قومی مقاصد کو مصنف نے اپنے مضامین میں خاص طور پر اہمیت دی ہے جو سنجیدہ غور و فکر کے مستحق ہیں۔ (م۔ ح)

" شاعرِ آخرالزماں جوؔش ملیح آبادی" ——————— ڈاکٹر فضل امام

موڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی ۱۹۸۲ء صفحات ۱۸۲ قیمت: ۳۰/-

جوؔش ملیح آبادی پر غالباً پہلی تنقیدی کتاب ان کے انتقال کے بعد شائع ہوئی ہے۔ ۱۸۲ صفحات میں مصنف نے ان کی شخصیت، نظم نگاری، غزل گوئی، رباعی نگاری، مرثیہ نگاری اور نثر نگاری میں ان کے کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔ جوؔش ملیح آبادی پر تنقید کا رویہ غیر متوازن رہا ہے ان کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ اقبال کے دور میں پیدا ہوئے اور غالباً اسی بنا پر اکثر نقاد اقبال سے ان کا موازنہ کرتے رہے اور جوؔش کی انفرادیت کو اقبال کے حوالے سے ناپنے اور پہچاننے کی کوشش کرتے رہے۔ جوؔش کی اپنی آواز ہے اور اس کی ہر لہر اور ہر تموّج کی اہمیت ہے اور مصنف اس مستحسن کوشش کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ (م۔ ح)

"نشانِ منزل" ——————— جگن ناتھ آزاد

موڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی ۱۹۸۲ء صفحات ۲۴۸ قیمت: ۴۰/-

جگن ناتھ آزاد کے ۲۳ تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ اقبال کے عاشق جگن ناتھ آزاد کی تحریروں

پر مشتمل ہے۔ موضوعات مختلف اور متنوع ہیں اقبال پرستی ان مضامین کا وصف بھی ہے اور کمزوری بھی، اور بسلسلۂ حسرت موہانی اور اقبال' والے پہلے مضمون سے اقبال عالمی کانفرنس تک ــــ ہر مقالے پر حاوی ہے۔ آزاد نے اقبال کی شاعرانہ عظمت کو جا بجا خراج عقیدت پیش کیا ہے لیکن ان عظمتوں کی حد بندیوں کو عام طور پر نظر انداز کر دیا ہے۔ آخری دور میں شاعر اقبال تجدیدیت پسند اقبال کے سامنے پسپا ہوتے نظر آتے ہیں اور اس بات کو ماننے میں بھی کوئی ہرج نہیں کہ اقبال اردو شاعروں میں کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہو، ہومر اور ورجل، گوئٹے اور شیکسپیئر کے قد و قامت تک نہیں پہنچتے۔

آزاد نے جوش ملیح آبادی سے اقبال پرستی کے جوش میں خاصی زیادتی کی ہے مثلاً صفحہ ۱۶ پر جوش کا ذکر ہی بے محل سا ہے پھر جوش کی دو نظموں پر مقالے میں (صفحہ) یہ مشورہ کہ آپ کی فلسفیانہ شاعری میں کمال فن ایجاز ہے نہ کہ اطناب۔ یا جوش کی نظم بھٹکی ہوئی نیکی' کو "ناکام شاعرانہ کوشش" قرار دینا جوش کے ساتھ بے انصافی ہے۔ رہا اقبال کے "فلسفیانہ" شاعری میں ایجاز و اطناب تو کلیم الدین احمد صاحب کے نزدیک اقبال کی بہترین نظم 'مسجد قرطبہ' بھی اطناب، طوالت بیان، تکرار اور شاعری کے بجائے محض مندرج فلسفیانہ مقولوں کو (یا قرآن اور حدیث کے ٹکڑوں کو) منظوم لباس پہنانے کے "عیوب" سے خالی نہیں۔

'جواہر لال نہرو کا ادبی مرتبہ' اور ترقی پسند شاعری کے ضمن میں "تعمیری ادب" اور ہند کے پنج سالہ منصوبوں کی فتوحات کو نظم نہ کر پانے کا الزام ترقی پسندوں پر عائد کرنے کی کوشش (صفحہ) پڑھ کر یاد آتا ہے کہ آزاد حکومت ہند کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر رہ چکے ہیں اس لیے حکومت وقت کی وکالت سے بے خبر نہیں رہتے۔ (م۔ ح)

موصولات

۱۔ 'انتخاب صبا'، مرتبہ، کاظم علی خاں :۔ میر وزیر علی صبا کے کلام کا انتخاب، مرتب کے مقدمے کے ساتھ اتر پردیش اردو اکادمی نے شائع کیا ہے۔ ۱۹۸۲ء، ۱۲۷ صفحات، قیمت ۲/۴۰

۲۔ 'نیل دھارا' (ناول)، رام لعل :۔ فرانسیسی ناول نگار فرانسواز ساگاں کے ناولٹ کا آزاد ترجمہ۔

سیمانت پرکاشن، نئی دہلی۔ ۱۹۸۱ء، ۱۹۰ صفحات، قیمت ۲/-

۳۔ "کلاسیکیت ورومانیت اور دوسرے مضامین"۔ ڈاکٹر رام ہانی اشرف، مکتبہ الفاظ علی گڑھ۔ ۱۹۸۲ء
۱۱۲ صفحات، قیمت ۱۲/-۔ آٹھ تنقیدی مضامین کا مجموعہ جس میں بیدی کے نسوانی کرداروں پر مضمون قابل توجہ ہے گو مصنف نے ان کرداروں کی ارضیت پر زور دیا ہے حقیقت یہ ہے کہ بیدی کے نسوانی کردار زیادہ تر Intellectualised ہیں۔

۴۔ شفق زار (مجموعہ کلام)، اوم کرشن راحت۔ ادبی سنگم، فرید آباد۔ ۱۹۸۱ء، ۱۴۴ صفحات، قیمت ۱۵/-
رشی پٹیالوی کے دیباچہ سے مزیّن راحت کی غزلیات اور چند قطعات، رباعیات اور منظومات کا مجموعہ ہے۔ دیباچے میں لکھتے ہیں "میں سخت قسم کا غیر مذہبی آدمی ہوں لیکن انسانیت کا قایل ہوں۔ کوئی تہوار سوائے ہولی کے نہیں منا تا کیونکہ یہ موسمی تہوار ہے۔ سیاست کو مکاری سمجھتا ہوں ویسے فطرتاً کمیونسٹ بننے کو جی چاہتا ہے کیونکہ (ان) کے نعروں میں انسان کا دکھ درد ضرور ہے لیکن کیا کیا جائے کہ سیاست اس جذبے ہی کو مسخ کر دیتی ہے جو تحریک کی شریانوں میں بہہ رہا ہوتا ہے"۔ پورا کلام اسی دردمندی کا آئینہ دار ہے۔ بعض اشعار یہ ہیں:

یہ عہد اردو سمجھ کے ہمیں بھلا بیٹھا
کشش تھی ہم میں بھی تاثیر گفتگو کی طرح

زنجیر پا کا ہر کوئی حلقہ پگھل گیا
جب شوق بن کے بھڑکی صدائے جرس کی آگ

۵۔ عکسِ تمنا (مجموعہ کلام)، کمال جعفری۔ دہلی، ۱۹۸۱ء، ۹۶ صفحات، قیمت ۱۵/-
ڈاکٹر وحید اختر، ڈاکٹر عنوان چشتی، ڈاکٹر مظفر حنفی کے مقدموں کے ساتھ کمال جعفری کی غزلوں اور آزاد اور پابند نظموں کا مجموعہ۔

۶۔ "زخموں کا چراغاں" ازوم احمد۔ اکتوبر ۱۹۸۲ء، ۱۲۸ صفحات، قیمت درج نہیں۔

رسالے

۱۔ "غالب نامہ" جلد۳، شمارہ ۲، جولائی ۸۲ ۱۹ء، ۲۱۶ صفحات ۔/۳۵
خاص طور پر غالب کی دتی پر پروفیسر خلیق احمد نظامی، اور عہد غالب کے علمی و فکری ماحول پر شبیر احمد خاں غوری کے مضامین قابل ذکر ہیں اور ڈاکٹر نذیر احمد کا نقد قاطع برہان نہایت اہم سلسلہ ہے۔

۲۔ "اکادمی" لکھنؤ، مئی ۱۹۸۲ء۔ اترپردیش اردو اکادمی کا ادبی دوماہی، ۱۳۵ صفحات، قیمت ۔/۴

۳۔ "ارتکاز" علی گڑھ، جولائی ۱۹۸۲ء، علی گڑھ غیر مطبوعہ تحریروں کا کتابی سلسلہ۔ مرتبہ ابوالکلام قاسمی۔ ۲۸۵ صفحات، قیمت ۔/۱۵
قرۃ العین حیدر کا رپورتاژ اور ہمارے معاشرے میں دانش وروں کا رول پر مباحثہ قابل توجہ ہے۔

جناب ڈاکٹر عظیم سعی

عصری ادب ۵۳

سہ ماہی

جولائی تا اکتوبر ۱۹۸۳ء

نگراں۔ محمد حسن

مدیران: ڈاکٹر روشن آرا حسن
سید بہاء الدین احمد

قیمت فی شمارہ: دس ۱۰ روپے سالانہ: تیس ۳۰ روپے

ادارہ تصنیف۔ ڈی ۷، ماڈل ٹاؤن۔ دہلی ۱۱۰۰۰۹

(ایڈیٹر، پبلشر، پرنٹر سید بہاء الدین احمد نے نودیپ آفسٹ پرنٹرس دہلی ۶ میں چھپوا کر ادارۂ تصنیف۔ ڈی ۷، ماڈل ٹاؤن۔ دہلی ۹ سے شائع کیا۔ ٹائٹل فائن آرٹ پریس۔ دہلی ۶ میں چھپا۔)

ذرّے ہی سہی کوہ سے ٹکرا تو گئے ہم
دل لے کے سرِ عرصۂ غم آ تو گئے ہم
اب نام رہے یا نہ رہے عشق میں اپنا
روداد وفا دار پہ دُہرا تو گئے ہم
کہتے تھے جواب کوئی نہیں جاں سے گزرتا
لو جاں سے گزر کر انھیں جھٹلا تو گئے ہم
جاں اپنی گنوا کر کبھی گھر اپنا جلا کر
دل اُن کا ہر اک طور سے بہلا تو گئے ہم
کچھ اور ہی عالم تھا پسِ چہرۂ یاراں
رہتا جو یوں ہی راز اُسے پا تو گئے ہم
اب سوچ رہے ہیں کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے
پھر اُن سے نہ ملنے کی قسم کھا تو گئے ہم
اٹھیں کہ نہ اٹھیں یہ رضا ان کی ہے جالب
لوگوں کو سرِ دار نظر آ تو گئے ہم

حبیب جالب

فہرست

حرف آغاز

• عصری ادب ۵۳۰ کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہوئی۔ اسباب اور وجوہ کا تذکرہ بے محل ہوگا۔ "عصری ادب" کے ہر شمارے کو وقت پر شائع کرنے میں ہمیں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی ہے کوشش البتہ جاری ہے۔

اس بار ادبی سماجیات پر خصوصی گوشہ شریک اشاعت ہے۔ اردو میں پہلی بار یہ موضوع متعارف ہو رہا ہے۔ امید ہے اہلِ نظر کی توجہ اس طرف مبذول ہوگی اور اردو تنقید کو نئی جہت حاصل ہوگی۔

افسانوں میں آغا سہیل کے افسانے میں علامت کی تہہ داریوں کو بڑی بلاغت سے برتا گیا ہے اور خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ 'کتابوں کی باتیں' اس بار پاکستانی مطبوعات کے لیے وقف ہیں اور سید سبط حسن اور عبداللہ ملک کی تازہ تصانیف پر تبصرے بھی ان میں شامل ہیں

• پاکستان میں احتجاجی ادب" کے لیے ہمارے قارئین کو ابھی کچھ اور انتظار کرنا ہوگا۔ دیگر معذرتوں کے ساتھ یہ معذرت بھی واجب ہے۔

معذرت

پچھلے شمارے (۵۲) کی فہرست عنوانات میں "ادبی سماجیات" پر مضامین کا ذکر حذف ہونے سے رہ گیا۔ یہ مضامین زیر نظر شمارے میں شامل ہیں۔

آر۔ کے منوجہ کے عنوان کے ساتھ جو شعر شائع ہوا وہ منظر سلیم کا نہیں ہے، وسیم بریلوی کا ہے۔ یہ غلطی افسانہ نگار کی نہیں، ادارہ کی ہے جس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ شعر یہ تھا:

جلتے ہوئے مکانوں کے منظر بتائیں گے
کیا بات تھی کہ روٹھ گئے روشنی سے ہم

۵

سیاسی صورت حال

گریناڈا پر امریکی حملے نے بند آنکھوں سے بھی سارے حجابات دور کر دیے ہیں۔ افغانستان میں "بیرونی مداخلت" پر شور مچانے والی حکومت نے کھلم کھلا دھاندلی کی اور چند لاکھ کی آبادی والے آزاد جزیرے پر فوجیں اُتار دیں، قبضہ کر لیا اور اس طرح کہ سارے حریت پسند ممالک حیرت سے دانتوں میں اُنگلی دبائے اور سانس روکے رہے۔ جرم اس بے گناہ جزیرے کا یہ تھا کہ وہ امریکی براعظم میں واقع تھا اور وہاں کی حکومت امریکن جنگ بازوں کے تابع و فرمان نہ تھی۔ لطف یہ ہے کہ امریکی مداخلت کی دعوت نہ اس جزیرے کی کسی حکمراں جماعت نے دی تھی نہ وہاں کی کسی سیاسی جماعت نے۔ اس بار پھر امریکا نے نیا "ویت نام" بنایا ہے۔ دوسری طرف یورپ کے مختلف ملکوں میں سوویت روس کے نزدیک نیوکلیائی تنصیبات قایم کی گئی ہے گویا امریکا ایک بار پھر عالمی جنگ کی نئی تیاریاں کر رہا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ دنیا کے امن پسند عوام ان کوششوں کو کس طرح ناکام بناتے ہیں!

ریگن صاحب دن رات ہتھیاروں کی خرید و فروخت سے دولت اکٹھی کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ایک دوسری فکر بھی لاحق ہے جو آبرو ویت نام اور ایران کے نظر بند امریکنوں کی درگت میں گنوائی ہے کچھ اسے بھی پھر سے حاصل کرنے کی چنتا لگی ہوئی ہے اسی کے لیے ہمت اور حوصلے سے بڑھ بڑھ کر بولتے ہیں، گیدڑ بھبکیاں بھی دیتے ہیں جیسے وہ دنیا بھر کے اشتراکی ممالک کو ہی نہیں، ناوابستہ ملکوں کو بھی چٹنی بنا ڈالیں گے۔ ڈلس صاحب کا زمانہ یاد آگیا جب روس کا نام لینے والے کی زبان کھینچ لی جاتی تھی

اور اشتراکی کا لفظ ڈکشنریوں سے نکال دیا گیا تھا۔ چنانچہ پولینڈ میں محاذ کھولنے کا ارمان ہوا، وہاں روسی فوجیں ہی نہیں پہنچیں افغانستان میں انقلاب دشمنوں کو بہت اکسایا، ہتھیار دیے، روپیہ سے مدد کی، پاکستان کو بہت غیرت دلائی یہاں تک سنا ہے کہ فوجی اڈے تک قائم کیے گئے اور اسلحہ خانے کے دروازے کھول دیے گئے، ایف ۱۶ اور اس کے بعد ہارپون دے گئے غرضیکہ احمق بھی کھلم کھلا میدان میں آنے سے کچھ ہچکچائے۔ پھر بیروت کا مقتل سجا اور لاشوں کے ڈھیر لگا دیے۔ خیال تھا کہ روس آستین سونت کر مقابلے پر آئے گا مگر وہ سانس کھینچ گیا۔ اب امریکہ کے قلب میں نکاراگوا میں اشتراکی دوست حکومت کے قیام نے ریگن صاحب کو پھر للکار دیا اور ادھر جنوبی کوریا کا ایک مسافر بردار جہاز سوویت فضائی خلاف ورزی میں مار گرایا گیا۔ روسی ہوائی سروس کی اڑانیں امریکا میں بند کردی گئیں اور روسی وزیر خارجہ تک مجلس اقوام متحدہ کے جلسے میں شرکت سے روک دیے گئے۔ ادھر ریگن صاحب ناوابستہ ممالک پر بھی بہت گرجے برسے ہیں، انھیں وہ روسی پٹھو کہتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ ان ممالک کو امریکی قیادت کی سخت ضرورت ہے جس کے لیے بیگم کرک پٹرک کو مناسب ہدایات کردی گئی ہیں۔ غرض کہ اداکار ریگن صاحب نے تیسری جنگ عظیم کی بساط بچھا دی ہے اور اپنے تئیں شیر نیستاں سمجھ کر گرج رہے ہیں گو بقول ماؤزے تنگ ایسے شیر، کاغذ کے ہوتے ہیں کہ تاریخ کی ایک آندھی انھیں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں پھینک دیتی ہے۔

اپنے پاس پڑوس میں بھی شیروں اور تاریخ کی آندھیوں کی داستان بھی شد و مد سے دہرائی گئی۔ سری لنکا میں تامل اور سنہالی زبانوں کے جھگڑے نے ناگوار صورت اختیار کرلی۔ ہزاروں بے گھر ہوئے، سینکڑوں قتل ہوئے، آتش زنی اور لوٹ مار الگ؛ پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کی تحریک چلی۔ جو خبریں ہندوستان پہنچیں ان سے پتہ چلا کہ مظاہروں کا سلسلہ سندھ ہی میں نہیں، بلوچستان اور صوبہ سرحد میں بھی جاری رہا۔ ریلوے لائنیں اکھاڑی گئیں، پولیس اور فوج میں ٹکراؤ بھی ہوا، سینکڑوں مارے گئے، ہزاروں قید ہوئے اور سلسلہ برابر جاری ہے، تشدد بھی برابر جاری ہے۔ جو لوگ ملک کے حالات سے تنگ آکر باہر کے ملکوں

میں پناہ گزیں ہو گئے تھے ان کی بھی بڑی تعداد واپس آ آکر وطن کی جیلوں کو آباد کرنے لگی ان میں خان ولی خاں اور ان کی بیگم بھی ہیں اور نوّے سال سے زیادہ عمر کے خان عبدالغفار خاں بھی، مولانا نورانی بھی اس مہم میں شریک ہیں اور جنوبی فرانس میں کینسر میں مبتلا نصرت بھٹو بھی۔ غرض یہ کہ احتجاج کا آتش فشاں پھوٹ پڑا ہے اور بات صرف اتنی ہے کہ پاکستان کے عوام اپنا طرز حکومت خود منتخب کرنے کا حق چاہتے ہیں۔

خود اپنے ملک کی طرف نظر کیجیے تو اول تو ان سیٹ اور غیر وابستہ ممالک کی کانفرنس کے اجلاس کی چمک دمک آڑے آتی ہے پھر ورلڈ کپ میں ہماری کرکٹ ٹیم کی فتح آنکھیں خیرہ کرتی ہے خیر سے، جمہوری حکومت بھی قائم ہے مگر اس اوپری تام جھام کے نیچے صورت حال خاصی تشویش ناک ہے۔ ملک بھر میں نظم و نسق ابتر ہے، گرانی بڑھ رہی ہے، پریشانی اس سے زیادہ بڑھ رہی ہے ہر جگہ لوٹ مار، کرپشن، رشوت ستانی، خوشامد کے علاوہ ایک عجیب غیر یقینی صورت حال، ایک مستقل انتشار پیدا ہو رہا ہے۔ ریاست جموں و کشمیر میں نیشنل کانفرنس کے مقابلے میں اندرا کانگریس نے لوہا لیا اور جموں میں گو بھارتیہ جنتا پارٹی کو چت کر دیا مگر وادیٔ کشمیر میں نیشنل کانفرنس سے شکست کھائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پوری ریاست فرقہ وارانہ تناؤ کی لپیٹ میں آگئی، سید میر قاسم جیسے پرانے آزمودہ کار سیاستداں کانگریس سے رشتہ توڑنے پر مجبور ہو گئے، ادھر پنجاب میں اکالی تحریک زور پکڑ رہی ہے اور کہنے والے کہتے ہیں کہ بھنڈراں والا کو اندرا کانگریس ہی نے اکالیوں کا زور توڑنے اور اندرا جی کو سکھوں کے خلاف ہندوؤں کا تنہا محافظ ثابت کرنے کے لیے بڑھاوا دیا ہے۔ بہار میں جگن ناتھ مشرا برخاست ہوئے تو اسمبلی میں اکثریت ان کے حمایتیوں کی ہے گویا ریاست غیر یقینی سیاست کا شکار ہوئی۔ حیدر آباد کی ضلع کل ریاست میں فساد پھوٹ پڑے ہیں ادھر آسام میں ابھی تک خیریت نہیں ہے۔ ہر ریاست میں گڑبڑ ہو رہی ہے اور اندرا کانگریس کی اندرونی دھڑے بازی بھی نمایاں ہونے لگی ہے۔ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری راجیشور راؤ کو بیان دینا پڑا کہ اندرا جی جان بوجھ کر ہندو فرقہ پرستی کو بڑھاوا دے رہی ہیں اور اقلیتوں کی طرف سے انھوں نے آنکھیں بند کر لی ہیں۔

ادھر اپوزیشن نے بھی کچھ کل پُرزے درست کیے ہیں۔ بھارتیہ جنتا پارٹی اور لوک دل نے مل کر قومی اتحاد بنایا۔ شکاری بھی پُرانے اور جال بھی پُرانا، پروگرام بھی فرقہ پرستانہ اور دقیانوسی بھی۔ البتہ جاٹ اور برہمن جاتیوں اور ہندو دھرم کے نام پر کوئی کرشمہ دکھا جائیں تو دوسری بات ہے، ملک کے جمہوری تقاضوں کو پورا کرنا تو ان کے بس میں معلوم نہیں ہوتا۔

غیر فرقہ پرست پارٹیوں میں سے پانچ نے مل کر نیا محاذ بنایا ہے جس میں چندر شیکھر کی جنتا پارٹی سے لے کر بہوگنا کی جمہوری پارٹی اور شرد پوار والی کانگریس سبھی شامل ہیں۔ اس محاذ کی باہر سے حمایت کرنے کا اعلان تو ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی اور مارکسی کمیونسٹ پارٹی دونوں نے کیا ہے۔ البتہ دیکھنا یہ ہے کہ اس محاذ کا پروگرام کیا ہے اور طریق کار کیسا ہے۔ اگر یہ بھی متضاد اور مخالف رویوں کی کھچڑی پکانے لگے تو ان سے بھی امیدیں وابستہ کرنا مشکل ہوگا۔

سری نگر میں اپوزیشن پارٹیوں کا جلسہ ہو رہا ہے شاید کوئی صورت نکلے۔ اندرا جی باہر کے دوروں سے ملک کو متاثر کرنے میں لگی ہوئی ہیں، آخر دنیا بھر میں نام کمانے کا بھی تو اپنے ہم وطنوں پر کچھ نہ کچھ اثر ہوتا ہے لیکن ملک کے اندر اگر آر۔ ایس۔ ایس اور ان کے حامی فرقہ پرست اندرا جی اور راجیو گاندھی کی حمایت کر رہے ہیں اور ایک ہی پلیٹ فارم سے خطاب کرتے ہیں تو پھر یہ نیک فال نہیں اور ملک کے سنجیدہ حلقوں کے لیے فکر اور تشویش کی بات ہے۔

البتہ یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے کہ بائیں باز و کب تک دوسرے محاذوں ہی کی حمایت کرتا رہے گا یا کبھی خود محاذ بھی بنائے گا یعنی ایسا محاذ جس کی رہبری ان کے اپنے ہاتھ میں ہو۔ آخر وہ دن کب آئے گا اور اس دن کو جلد تر لانے کے لیے کیا کیا جا رہا ہے۔

لا کے اس بزم میں رکھو، کوئی خورشید اب کے

آڑے ترچھے آئینے

عقل کی مشعل روشن رکھیے

فرقہ پرستی اور دقیانوسیت کی اندھی آندھی چل رہی ہے بقول مجروح سوجتن کے ساتھ حالات ایسے ہیں کہ ایک طرف وشو پریشد برملا 'ہندی۔ہندو۔ہندوستان' کا نعرہ بلند کررہا ہے دوسری طرف علاقہ پرستی اور مذہبیت خواہ کسی علاقے کی، کسی علاقائی زبان کی اور کسی مذہب کی کیوں نہ ہو آواز لگا رہی ہے کہ فلاح ہے تو تنگ نظری میں ہے اپنے اپنے حلقوں میں بند ہو جاؤ، اپنے اپنے خول میں محفوظ ہو جاؤ، اپنے فرقے کے وفادار ہو کر باقی سب فرقوں کو للکارو، فلاح ہے تو دقیانوسیت اور ظلمت پرستی میں، خطرہ ہے تو سیکولرازم اور روشن خیالی میں — گویا ایک بار پھر ۱۹۴۷ء کے ارد گرد جا کھڑا ہوا۔

ایسے میں وہ لوگ کیا کریں جن کے لیے سیکولرازم، روشن خیالی اور جمہوریت محض مصلحت یا ضرورت نہیں ہیں بلکہ جزوِ ایمان ہے۔ مسلمانوں اور مذہبی، لسانی اور تہذیبی اقلیتوں میں اکثر ایسے ہوں گے جن کے لیے سیکولرازم، روشن خیالی اور جمہوریت کا نام لینا ان کی مجبوری یا ضرورت ہے کیونکہ اگر ان اقدار سے روگردانی کریں تو ان کے لیے جدید ہندوستان میں کوئی مقام یا کم سے کم کوئی باعزت مقام باقی نہیں رہتا۔ مگر ان میں ایسے بھی ہیں — اقلیتوں میں بھی اور بعض اکثریتی فرقے میں بھی جن کے لیے سیکولرازم، روشن خیالی اور جمہوریت کے بغیر ہندوستان کے مستقبل کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ایسے لوگوں کی تعداد بہت تھوڑی بھی ہو تو بھی ان کے لیے فرار کے راستے بند ہیں اور آخری سانس تک ان اقدار کے لیے لڑتے رہنے اور نامساعد حالات میں بھی برابر لڑتے رہنا ان کا مقدر ہے۔ اقلیتوں کے لیے اس مختصر سے طبقے، چھوٹی سی جماعت سے خود کو وابستہ کرنا ہی لازم ہے۔

ظلمت پرستی، رجعت پرستی، توہم پرستی اور فرقہ پرستی کی خبروں سے روز اخبارات

بھرے رہتے ہیں وہ اخبار بھی جن میں دھریندر برہماچاریہ کے فضائل کے لیے یہ خبر بھی چھپتی ہے کہ یا دش بخیر وہ جموں میں ناجائز اسلحہ کا کارخانہ بھی چلاتے رہے ہیں اور آر۔ایس ایس اور دوسری جماعتیں ان سے خفیہ طور پر یہ ہتھیار حاصل کرتے رہے ہیں۔ وشوہندو پریشد کے ایکت ماتا یجیہ کے ہندوستان گیر جلوس کی شاندار شاہ سرخیاں بھی چھپتی ہیں۔ مگر پچھلے دنوں 'اسٹیٹسمین' نے جسٹس اور چیناریڈی کے برٹینڈ رسل یادگاری خطبہ کا خلاصہ چھاپا تو لگا کہ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں جنھیں ظلمت پرستی اور توہمات کے بڑھتے ہوئے طوفانوں کا اندازہ ہے اسی طرح پلاننگ کمیشن کے اردو رسالے "یوجنا" نے سائنسی مزاج پر ایک خصوصی شمارہ شائع کیا تو جیسے تپتی دوپہر میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا۔ اس شمارے میں چونکا دینے والے مضامین بھی تھے اور تعلیم و تربیت دینے والے مضامین بھی۔ سائنس اور ٹکنالوجی ترقی کر رہے ہیں اور سائنسی مزاج اور معقولیت پر نت نئے حملے ہو رہے ہیں، فلسفے میں بھی، ادب میں بھی اور سماجی علوم میں بھی۔ توہم پرستی اور ظلمت تابی کا یہ طوفان بلاخیز بھی اسی کا شاخسانہ ہے۔

غرض ہر ذمہ داری ہندوستانی کے سامنے ہے اس کے سوا چارہ نہیں کہ ملک کو شاونزم اور دقیانوسیت کے عقل دشمن سیلاب سے بچائے اور سیکولرازم، روشن خیالی اور جمہوریت کے تحفظ کی لڑائی میں محض ضرورت اور مصلحت کے طور پر نہیں ایک مشن اور ایک جہاد کے طور پر شریک ہو۔ اس لڑائی کی حیثیت محض نظریاتی نہیں عملی بھی ہے۔ آخر ہمارے دور کے مفکر اور دانش ور کب تک اپنے آپ کو ایک بکے ہوئے دور کے تماشائی ہونے کا ماتم کرتے رہیں گے۔ "اندھیرا اندھیرا" چلانے سے بہتر ہے کہ مٹی کا ایک دیا روشن کیا جائے۔ برٹینڈ رسل گروپ کی مختلف شاخیں ہندوستان بھر میں قایم کی جا سکتی ہیں جو کم سے کم دقیانوسیت، توہم اور ظلمت پرستی سے لوہا لے سکیں۔ شاید تاریخ کے مسخ شدہ حصوں کو پھر سے درست کیا جا سکتا ہے شاید ملک میں چھوٹے پیمانے پر ہی سہی ایک صحت مند فضا کی تشکیل کی کوشش کی جا سکتی ہے۔

ظاہر ہے یہ کام بنیادی طور پر ایک قومی کام ہے۔ ایک قوم کو توہم پرستی، ظلمت پرستی ہی سے نہیں، پارہ پارہ ہونے سے بھی بچانے کا کام ہے۔ دانش وروں نے موجودہ حالات سے

کٹھن سخت حالات میں ایسے کام کیے ہیں فرانس کی انسائیکلو پیڈی تحریک نے عقل ودانش کی جس طرح حفاظت کی. اس سے نئی فکر کی کونپلیں پھوٹیں. کیا ہندوستان کے دانشوروں کا ایک چھوٹا سا حلقہ بھی وقت کی اس للکار کو قبول نہیں کرے گا کہ کم سے کم ہر شہر اور ہر قصبے میں Rationalist Club قایم ہوں اور ظلمت پرستی، توہم پرستی اور دقیانوسیت کے مقابلے میں سائنسی مزاج پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

اسی کا ایک عملی پہلو یہ بھی ہے کہ ایک مختصر سا حلقہ ہی سہی ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کو ناممکن نہ سہی دشوار ضرور بنا سکتا ہے اب سے پہلے یہ دستور رہا تھا کہ ہر فرقہ وارانہ فساد کے بعد ادیبوں اور فن کاروں کا ایک جلوس اس فضا کے خلاف آواز بلند کرنے نکلتا تھا اب وہ دستور بھی ختم سا ہو گیا. ظاہر ہے یہ کافی نہ تھا اور فساد ہونا بھی ضروری نہیں. ظلمت پرستی اور دقیانوسیت کے خلاف آواز بلند کرنا ضروری ہو گیا ہے تاکہ فساد کی جڑوں پر وار کیا جا سکے اور خود ہمارے فن کار اور ان سے متاثر ہونے والے نوجوان کم سے کم عقل دشمن نظریوں کے خطرے سے آگاہ ہوں۔

یہ ان کی محض سماجی ذمہ داری نہیں، فن سے ان کی وفاداری کا تقاضا بھی ہے. کوئی اعلیٰ ادب اور فن ظلمت پرستی سے جنم نہیں لے سکتا. عقل کو رد کر کے فن آگے کیسے بڑھے گا بیمار ذہن اور مریض فکر صحت مند علم وادب کی تخلیق نہیں کر سکتی. لہٰذا اگر ادب، سچے اور کھرے ادب کو پھلنا پھولنا ہے تو ادیب، فن کار اور دانش وروں کو یہ لڑائی لڑنی ہی ہوگی. خواہ وہ اس عظیم جہاد میں خود کو کتنا ہی تنہا اور ناتواں کیوں نہ محسوس کریں — یہ ان کے فن کی پکار ہے اور اسے بلا جھجک قبول کرنا چاہیے خواہ سر دست یہ زیاں کا سودا ہی کیوں نہ ہو۔

سورج نے اپنی شعاعوں کو واپس آنے کا حکم دیا. سبھی کرنیں زمین سے رخت سفر باندھ کر سورج کے روشن آغوش میں کھو جانے کو روانہ ہونے لگیں مگر ایک شوخ کرن، شوخ مثال نگہ حور ایسی بھی تھی جس نے واپس جانے سے انکار کر دیا. اس کا ارمان اور عہد یہ تھا.

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو

جب تک نہ ہو اس خاک کا ہر ذرہ جہاں تاب


بیس نکات کا یہ مقصود
کنبہ ہو سب کا محدود

محمد حسن

ادبی سماجیات

ادبی سماجیات ادب کو سماج کے رشتوں سے اور سماج کو ادب کے وسیلے سے پہچاننے کی کوشش ہے۔ ادبی سماجیات، ادب کا سماج کا وسیلۂ اظہار ہی کے طور پر مطالعہ نہیں کرتی بلکہ اس کے آئینے میں عصری مسائل، اقدارِ حیات، بدلتے ہوئے ذوقِ سلیم اور ان کے محرکات کو پرکھنا اور پہچاننا بھی چاہتی ہے۔ اندازِ بیان اور تکنیک کے بدلتے ہوئے تصورات بھی اسی دائرے میں آتے ہیں۔

لیکن اس سے آگے بڑھ کر وہ تخلیق کے ساتھ ساتھ تخلیق کار کو بھی زیرِ مطالعہ لاتی ہے وہ شاعروں اور ادیبوں کے پیشے ان کے طبقے، ان کے دیہی اور شہری رشتے اور ان کی زندگی کے رنگ ڈھنگ ہی کو نہیں بلکہ عوام کے ذہنوں میں ان کی تصویر کو بھی زیرِ بحث لاتی ہے اور ان سے دور رس نتیجے نکالتی ہے جو ادب اور سماج دونوں کے مطالعے کے سلسلے میں مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

ادبی سماجیات کا تیسرا اہم پہلو ادبی سرپرستی کا مسئلہ ہے۔ ہر دور میں ادب کی سرپرستی مختلف طریقوں پر مختلف طبقوں کے سپرد رہی ہے اور ظاہر ہے کہ اس سرپرستی کے نتیجے تخلیقی ادب کے طرز و روش، تکنیک اور اندازِ بیان پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں ایک زمانے میں دیہی سماج میں چوپال لوک گیتوں اور عوامی فن پاروں کی سرپرستی کا مرکز تھا، پھر دیوان خانے اور درباروں کی سرپرستی کا دور آیا۔ پھر صنعتی دور میں عوامی ذرائع ترسیل کا دور دورہ ہوا۔ اخبارات و رسائل، ریڈیو، فلم اور ٹی وی کے ذریعے سرپرستی کی جانے لگی اور طباعت و اشاعتِ کتب کے کاروبار میں اجارہ داروں کا سکّہ

چلنے لگا اور ان سبھی ذرائع اور وسائل نے ادب کے رنگ و آہنگ، نفسِ مضمون، ہیئت اور تکنیک سبھی کو متاثر کیا۔

ادبی سماجیات کا چوتھا اہم پہلو ادب کی سماجی اثر پذیری کے عمل کو پہچاننا ہے۔ ادبی سماجیات صرف اسی سے غرض نہیں رکھتی کہ کس قسم کی کتابیں اور رسالے زیادہ یا کم بکتے ہیں اور کس حد تک مقبول ہیں اور کیوں؟ اس کا موضوع یہ بھی ہے کہ کسی دور کا ادب اِس دور کو کس حد تک اور کس طرح متاثر کرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ادبی سماجیات کے طریق کار سے تنقید کے مختلف دبستانوں کو اختلاف ہے اور یہ بات اکثر دُہرائی جاتی ہے کہ ادبی سماجیات دراصل ادبی تنقید کا نہیں سماجیات ہی کا ایک جزو ہے اور ادبی تفہیم اور فن کے رموز و نکات سمجھنے میں اس سے کوئی مدد نہیں ملتی بلکہ اکثر اس قسم کی دیدہ ریزی سے غیر متعلق مسائل سامنے آجاتے ہیں جو ادبی تفہیم کو دھندلا دیتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ادبی تنقید کا کوئی رویہ بھی مکمل اور جامع نہیں کہا جا سکتا اور کسی فن پارے کی قدر و قیمت کی مختلف جہات کو سمیٹنے کے سلسلے میں ادبی سماجیات کا بھی ایک اہم منصب ہے اور اسے نظر انداز کرنا ادب کی تفہیم اور اس کی سماجی معنویت کے ایک دلچسپ اور بصیرت آموز پہلو سے محرومی کے مترادف ہے۔ رچرڈ ہوگرٹ نے لکھا کہ "مکمل ادبی گواہ کے بغیر سماج کا طالب علم سماج کی تکمیل سے بے بصر رہ جائے گا۔"

" Without the full literary witness, the student of Society will be blind to the fullness of the society[۱] "

یہی حال ادب کے طالب علم کا بھی ہے۔ ادبی سماجیات کے علم کے بغیر ادب کی تکمیل کا احساس و ادراک ممکن نہیں یا کم سے کم اس کے ایک اہم پہلو سے محرومی لازم ہوگی۔ ماہرین سماجیات نے ۱۹ ویں صدی میں کومٹے اور سپنسر کی رہنمائی میں سماج کے

---

[۱] Literature and Society in ' A Guide to the Social Sciences ' ed. by N. Mackenzie, London: Wiedenfield and Nicholson-1966.

مطالعے میں ادب سے کام لینے کی روایت کی بنیاد ڈالی تھی۔ بیسویں صدی میں ڈرک ہیم اور ویبر نے سماج کے مطالعے میں جہاں نئی جہتوں کا اضافہ کیا وہاں ادب کے مطالعے کو بھی نئی اہمیت دی۔ عام طور پر ادب کے سماجیاتی مطالعے کے سلسلے میں دو رویے اپنائے گئے۔

پہلا رویہ ادب کو سماج کے کسی مخصوص دور کا آئینہ قرار دے کر اُس سے اُس دور کے بارے میں تہذیبی اور اقداری شہادتیں حاصل کرنے کا تھا جس کی ابتدا لوئی ڈی بونالڈ (۱۷۵۴ تا ۱۸۴۰ء) سے ہوتی ہے یہ صحیح ہے کہ کسی دور کا ادب اُس دور کی تہذیبی دستاویز بھی ہوتا ہے اور عوام کے اور خاص طور پر پڑھے لکھے طبقوں کے جذبات واحساسات کی عکاسی بھی کرتا ہے لیکن اس سے سماجی نتیجے نکالنا خاصا پیچیدہ عمل ہے اور اکثر گمراہ کن بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے دو باتیں خاص طور پر ضروری ہیں۔ اول تو کسی دور کے ادب کے ادبی پیرایۂ بیان، ادبی روایت، فیشن اور فارمولے سے الگ کر کے اس کے اس حصّے تک رسائی جو واقعتہً حقیقی ہو اور صحیح معنوں میں اپنے دور کی عکاسی کرتا ہو اور اس حصّے اور اس کی اصل معنویت تک اس کے ادبی پیرایۂ اظہار اور مخصوص طرزِ ادا کے باوجود پہنچا جائے۔ دوسرے اس دور کے جذبات واحساسات، تہذیبی اقدار اور تصورات کا علم ہمیں کسی اور ذریعے سے بھی حاصل ہو چکا ہو۔ گویا ادب کے ذریعے حاصل ہونے والے شواہد تہذیب عصر کے بارے میں توثیق تو کر سکتے ہیں مگر صرف تنہا شہادت فراہم کرنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتے۔

اس کے علاوہ ایک بڑا خطرہ یہ بھی ہے کہ ادبی فن پارہ فنی حیثیت سے جتنا گھٹیا اور پست ہوگا اتنا ہی سماجی عکاسی کے اعتبار سے غالباً زیادہ بیانیہ ہونے کی وجہ سے زیادہ کارآمد ہوگا۔ غالب کے دیوان کے مقابلے میں ۱۸۵۷ء کی دہلی کا حال اس دور کے اخبارات سے کہیں بہتر طور پر معلوم ہو سکتا ہے اس لحاظ سے فن پارے کی جمالیاتی کیفیت ادبی سماجیات کے اعتبار سے اس کے استناد کی راہ میں حائل ہو سکتی ہے اس کے علاوہ ادب میں چونکہ تشریح کی گنجائش بہت زیادہ

ہے اس لیے اس سے نکالے ہوئے نتائج گمراہ کن حد تک اضافی اور داخلی ہو سکتے ہیں۔

ان خطرات کے پیش نظر ادبی سماجیات کے ایک دوسرے دبستان نے ادب کو کسی دور کے سماج کی ہو بہو تصویر سمجھنے کے بجائے اس پر زور دیا کہ ادب کسی دور کے جذبات واحساسات کے سانچے کی نشان دہی کرتا ہے اور اسے بیانِ واقعات سمجھنے کے بجائے کسی دور کی امیدوں، ارمانوں، اندیشوں، خوابوں اور خواہشوں سے عبارت ایک ایسا تانا بانا سمجھنا چاہیے جو بعض رویوں اور اقدار میں مجتمع ہو گیا ہے اس لحاظ سے وہ ایک ایسا پیچیدہ مرکب ہے جسے ابھی ادبی سماجیات کو اپنے طور پر اپنی زبان میں منتقل کرنا ہے اور اپنے طور پر تجزیے کے بعد سمجھنا ہے، بقول لوون تھال (LOWENTHAL) "ناولوں کے کرداروں کی اندرونی زندگی کی سماجی معنویت سماجی تبدیلی کے مسایل سے جڑی ہوتی ہے۔" اور اس رشتے کو ادبی سماجیات ہی کے ذریعے پہچانا جا سکتا ہے۔ جیسے جیسے ادبی سماجیات کا علم ماہرین کے دائروں میں تقسیم ہوتا گیا اور SPECIALISATION عام ہوا تو ادب کے مختلف اسالیب اور ان کے مضامین، مباحث اور اقدار کی چھان پھٹک اسی نقطۂ نظر سے کی جانے لگی۔

ادبی سماجیات کا دوسرا دبستان وہ تھا جس نے ادب کا جمالیاتی فن پارے کے بجائے مالِ تجارت کی حیثیت سے مطالعہ کیا۔ ان کے نزدیک اہم مسئلہ یہ تھا کہ کسی دور میں ادب کی سرپرستی کن طبقوں کے ہاتھ میں رہی ہے اور کیوں؟ ادب کی اشاعت کا صرفہ کتنا ہے اور اس پر کس طبقے کا قبضہ ہے یا اس کی نوعیت کیا ہے؟ ذرائع ترسیل عامہ کا اس میں کتنا حصہ ہے؟ اس سلسلے میں مشہور فرانسیسی ادبی سماجیات کے ماہر رابرٹ اسکارپٹ (ROBERT ESCARPIT) نے نمایاں کارنامے انجام دیے۔

اس ضمن میں ادب اور اس کی تخلیق، اور اس تخلیق کے ذریعے اس کے قاری تک اس کے نتیجے پہنچنے کے مسایل بھی سامنے آئے اور بیگانگی کا سوال بھی اٹھا۔ ادب

صنعتی دور میں اپنے فن پارے سے بڑی حد تک کٹ کر رہ گیا ہے اور غیر متعلق اور بیگانہ ہو گیا ہے اس کی تخلیق صنعتی دور کے ذرائع ترسیل عامہ میں یکسر اس کی ذات کا اظہار نہیں رہ جاتی بلکہ اس کی ذات سے آزاد ہو جاتی ہیں۔ اس کی سب سے واضح مثال فلم کے لیے گانا لکھنے والے شاعر کی تخلیق ہے۔ یہ گانا شاعر اکثر اپنی ذات کے اظہار یا اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کے لیے نہیں لکھتا بلکہ دی ہوئی صورت حال پر پروڈیوسر یا ڈائرکٹر کی فرمائش کے مطابق لکھتا ہے جس کی دھن اکثر میوزک ڈائرکٹر پہلے ہی سے فراہم کر دیتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ شاعر جب اپنا گیت مکمل کر کے لائے تو میوزک ڈائرکٹر یا صلاح کاروں کے مشورے سے گیت کے بولوں میں تبدیلی کر دی جائے یا ایک دو مصرعوں یا لفظوں کا اضافہ کر دیا جائے۔ جب گیت پردۂ سیمیں پر پیش ہوگا تو شاعر کا گیت کوئی اداکار یا اداکارہ کسی دوسری گلوکار مغنیہ کی آواز میں میوزک ڈائرکٹر کی دھن پر گا رہا ہوگا یا گا رہی ہوگی اور اس کا گیت اب صرف اس کا اپنا نہیں ہوگا اس میں بہت سے دوسرے فن کار بھی شامل اور شریک ہوں گے اور شاعر کی شخصیت اس منزل تک پہنچتے پہنچتے گیت سے تقریباً بیگانہ ALIENATE ہو چکی ہوگی گویا گیت اب اس کے لیے ذریعۂ اظہار نہیں مال تجارت بن چکا ہوگا۔

ظاہر ہے یہ سوال محض ادب کی سرپرستی کا نہیں ہے بلکہ پورے تخلیقی عمل کو متاثر کرنے کا ہے اور اس کی جڑیں ادبی تنقید کے بنیادی مباحث تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس نظریے کی بنا پر مان ہیم MANHEIM نے ادیبوں کو ایک "گھومنے پھرنے والی ایسی دانش ورانہ مخلوق" قرار دیا تھا جو اپنی جڑوں سے کٹ چکی ہے اور جس کی ادبی تخلیق اب مال تجارت بن چکی ہے۔ اس کے برخلاف لیوسی ان گولڈمان (LUCIEN GOLDMANN) نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ یہ صورت حال صرف ادنی درجے کے ادیبوں کو پیش آتی ہے جب کہ اعلیٰ ادب کبھی بازار کے لیے نہیں لکھتا اور اس طرح وہ ناشر، مصنف، قاری کے جبر سے نکل جاتا ہے اور اپنی تخلیقات کو مال تجارت نہیں بننے دیتا۔

اسی کے ساتھ ساتھ ادبی سماجیات اس کا بھی مطالعہ کرتی ہے کہ ایک مخصوص معاشرے پر کسی ادبی فن پارے کا کس طرح ردعمل ہوتا ہے۔ دستاوسکی کے ناولوں کو کس طرح نازیوں نے جرمنی میں اپنے عقل دشمن اور دانش دشمن تصورات کی حمایت میں استعمال کیا اس کا تجزیہ لوون تھال (LOWENTHAL) نے بڑی خوبی سے کیا ہے۔

اس کے پہلو بہ پہلو خود مصنفین کا مطالعہ ادبی سماجیات کے لیے دلچسپی کا موضوع رہا ہے۔ بڑے فن کار کے فن پارے بقول لوون تھال "حقیقت سے زیادہ حقیقت ہوتے ہیں" اور بقول رچرڈ ہوگرٹ "عظیم ادب انسانی تجربات کی گہرائیوں تک رسائی حاصل کرتا ہے کیونکہ اس میں محض انفرادی صورتوں سے آگے بڑھ کر سطحی تفصیلات کے نتیجے کار فرما۔ رپا تحریکوں کو دیکھ لینے کی بصیرت ہوتی ہے" اور عظیم ادب اسی لیے اس گہری بصیرت کی بنا پر اپنے دور کے بعد بھی زندہ رہتا ہے کیونکہ وہ ان بنیادی اقدار اور علائم کو گرفت میں لے لیتا ہے جو کسی دور کے مختلف گروہوں اور طبقوں کے درمیان مشترک رشتے فراہم کرتے ہیں۔ عہدِ جدید کے انسان کو سمجھنے کے لیے عوامی کلچر کے انہی شواہد سے کام لیا جا سکتا ہے۔

۱

یوں تو ادب کا سماجی مطالعہ کی روایت افلاطون سے شروع ہوتی ہے جس نے حقیقت اور فنونِ لطیفہ کے رشتے پر غور کر کے فن کو نقل کی نقل قرار دیا تھا اور دوسری طرف سماج پر فن کے مضر اثرات کے پیشِ نظر فن کاروں کو اپنے مثالی معاشرے سے نکال باہر کرایا تھا لیکن سائنس کے عروج کے بعد ادب کا رشتہ سماج سے اور گہرا ہو گیا اور یہ کوشش کی جانے لگی کہ جس طرح سائنسی طریق کار مادی حقیقت کے مختلف اجزا کو معروضی طور پر جانچنے اور پرکھنے میں کامیابی حاصل کر چکا ہے اسی طرح ادب کی پرکھ میں بھی دو ٹوک اور قطعی فیصلوں تک پہنچے اثباتیت POSITIVISM اسی کوشش کا نتیجہ تھا اور ادب کو سائنسی اور معروضی معیاروں پر پرکھنے کی کوشش مختلف نوعیتوں

سے جاری رہی۔ ویکو نے ۱۷۲۵ء میں "نئی سائنس" میں اس کی کوشش کی۔ ہرڈر نے (۱۷۴۴ء تا ۱۸۰۳ء) اپنی تصانیف میں تخیل اور کھیل کے نظریے کے ذریعے ادب کے تفریحی عنصر کو سماجی تربیت اور شخصیت کی تعمیر و تشکیل کے عمل سے ہم آہنگ کرنا چاہا مادام دی اسٹیل (۱۷۶۶ء تا ۱۸۱۷ء) نے ادب کو قومی مزاج کا عکس قرار دیا اور اس پر آب و ہوا اور رہن سہن کے جغرافیائی اور تہذیبی اثرات تلاش کرنے کی کوشش کی اس نے اِس خیال کا بھی اظہار کیا کہ ناول صرف اُن معاشروں میں فروغ پاتا ہے جہاں عورت کا مرتبہ بلند ہے۔ متوسط طبقے کا عروج، آزادی اور نیکی کی اِن اقدار کا ضامن ہے جو فن کی لازمی شرائط ہیں، اس نے لکھا:۔

"مبارک ہے وہ ملک جہاں ادیب اداس ہوں، تاجر مطمئن ہوں
دولت مند افسردہ ہوں اور عوام آسودہ حال۔"

اس قسم کی کوششوں سے قطع نظر طین (۱۸۲۸ء تا ۱۸۹۳ء) نے پہلی بار تہذیب اور ماریخ کے پس منظر میں ادبی تنقید کی ابتدا کی اور ادبی تنقید کے تاریخی دبستان کی بنیاد رالی اور اس اعتبار سے طین کو ادبی سماجیات کا بانی قرار دیا جاسکتا ہے طین کی کوشش یہ تھی کہ ادب کا کسی ایسے معروضی سائنٹیفک عناصر کی مدد سے مطالعہ کیا جائے جن میں ختلاف رائے کی گنجائش نہ ہو اور جس کو جانچا اور پرکھا جاسکے اس کے لیے اس نے نسل، ہ اور ماحول کا فارمولا وضع کیا۔ اس کے نزدیک ہر دور کا ادب اپنے نسلی مزاج کا ائینہ دار ہوتا ہے اور اپنے دور کی عام فضا اور معاصر واقعات، افکار و اقدار سے عبارت تا ہے اور اپنے تخلیق کار کی واردات ذہنی اور قلبی کا عکس پیش کرتا ہے گویا اگر کوئی دبی نقاد کسی ادب کے نسلی مزاج کے عناصر کا پتہ لگالے، اس کے دور کی عام فضا کے ناصر کو پہچان لے اور فن کار کی شخصیت اور اس کے ذاتی کوائف و واردات کی نشاندہی رے تو وہ ادب پارے کے تجزیے پر قادر ہو سکتا ہے لیکن اس قسم کے تنقیدی رویے ں ماحول اور خارجی عوامل کو تخلیقی عمل میں بنیادی اہمیت دے دی گئی ہے اور تخلیقی ل کی اُپج اور اس کے نجی پہلو اور اس کی فن کارانہ داخلی شخصیت کو تقریباً نظر انداز کر دیا گیا ہے

اس کے علاوہ یہاں ادب کو گویا ایک سماجی دستاویز کی حیثیت دے دی گئی ہے جو درست نہیں۔ ادیب محض رپورٹر نہیں ہے وہ محض کیمرے کی آنکھ یا کیسٹ کا ریکارڈ نہیں ہے کہ جو دیکھے یا سنے اسے محفوظ کرتا جائے بلکہ اس کی اپنی داخلی اور تخلیقی حیثیت ہے اور اس میں تخیل کا ایک بڑا حصہ ہے اس لحاظ سے ادب میں پیش کردہ تفصیلات کو تاریخی حقائق کا درجہ دینا اتنا ہی غلط اور گمراہ کن ہوگا جتنا ادب کے فنی پہلو اور اس کی جمالیاتی بصیرتوں کو نظرانداز کرنا۔

ٹین کی سائنٹیفک تنقید کی اس کوشش کے پہلو بہ پہلو کارل مارکس (۱۸۱۸ء تا ۱۸۸۳ء) اور فریڈریک اینگلز (۱۸۲۰ء تا ۱۸۹۵ء) کے سماجی نقطۂ نظر سے پیدا ہونے والی ادبی تنقید تھی۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بان یونی ورسٹی میں مارکس کی دل چسپی قانون سے زیادہ ادب سے تھی۔ اور شاعری کے علاوہ "ایک مزاحیہ قصہ" A uro oks Tale کے نام سے اس نے ایک ناتمام ناول بھی تصنیف کیا تھا۔ کلاسیکی طرز کا المیہ ڈراما لکھنے کی بھی کوشش کی تھی اور ۱۸۴۰ء میں ہیگل کے زیر اثر ادب کا یہ ذوق بالآخر فلسفہ کی نذر ہوگیا۔

ٹین نے ادب کو فرد کی تخلیق قرار دیا اور اسی لیے فرد کی شخصیت کے نفسیاتی مطالعے کو ادبی تنقید کی بنیاد بنا ڈالا۔ مارکس اور اینگلز نے اس کے برخلاف ادب کو کسی دور کی غالب حقیقت کا عکاس قرار دیا وہ ادب میں محض کسی دور کی تصویر یا بیان تلاش نہیں کرتے بلکہ ان اقدار کی جستجو کرتے ہیں جس سے وہ دور پہچانا جاتا ہے۔

مارکس اور اینگلز نے ادب کو سماجی ارتقا کے عمل کا حصہ قرار دیا۔ اُن کے نزدیک سماجی ارتقا مادی جدلیات سے عبارت ہے اور ہر دور کا سماج اپنی اقتصادی ضرورتوں اور معاشی نظام کے اعتبار سے مختلف طبقوں میں بٹا ہوا ہوتا ہے اور ہر طبقہ اپنی اقتصادی ضرورتوں کی وجہ سے اپنا تہذیبی اور اقداری نظام کا پابند ہوتا ہے مختلف طبقوں کے یہ اقداری نظام ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اور اسی آویزش

سے سماجی ارتقا ممکن ہوتا ہے۔ ہر طبقے کی اپنی تہذیب، اپنی اقدار اور اپنا ادب ہے اور اسی طرح ہر دور کے ادب کا کوئی نہ کوئی نظریاتی میلان ضرور ہوتا ہے یا تو وہ ان استحصالی طبقوں کا حامی ہوتا ہے جو تبدیلی اور ارتقا کے مخالف ہیں یا پھر ان مظلوم طبقوں کا حمایتی اور ان کی ترقی پذیر اور تبدیلی اور انقلاب کی خواہاں اقدار کا علمبردار ہوتا ہے جو کمزور ہونے کے باوجود اقتدار سے ٹکراتے ہیں۔ یہی جھکاؤ ادب کو صرف اپنے دور کے انقلابی رویے سے ہم آہنگ کرتا ہے بلکہ اسے انسانیت کے ہر دور کے ترقی پذیر عناصر کا ہم نوا اور ہم آواز بنا دیتا ہے۔

مارکسیت نے ادب کو معاشی نظام کے بنانے اور تبدیل کرنے والے طبقاتی ٹکراؤ سے وابستہ کر دیا البتہ مارکس اور اینگلز دونوں نے اس نقطۂ نظر کو میکانکی ہونے سے بچانے کی کوشش کی اور بار بار اس پر زور دیا کہ ادب کو عظمت بخشنے والا عنصر روحِ عصر سے اس کی وابستگی اور اس کے حقائق پر اس کی نظر ہے محض نظریاتی میلان نہیں۔ چنانچہ مارکس نے بالزاک کو جاگیردارانہ نظام سے اس کی نظریاتی وفاداری کے باوجود اور لینن نے لیو ٹالسٹائے کو اس کی فکر کے رجعت پسند عناصر کے باوجود عظیم فن کار تسلیم کیا۔ کیونکہ دونوں روحِ عصر سے رشتہ جوڑنے میں کامیاب ہوئے گو ان کا نقطۂ نظر اس راہ میں حایل تھا۔ اسی بات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بعد کے دور کے مشہور مارکسی نقاد لوکاچ نے ان الفاظ میں بیان کیا:۔

"بالزاک کی طرح جب کوئی عظیم حقیقت نگار جب کبھی یہ دیکھتا ہے کہ اس کے وضع کردہ حالات و کردار کا داخلی فنی ارتقا اس کی اپنی عزیز اقدار و تعصبات یا اس کے اپنے مقدس عقاید سے ٹکراتا ہے تو وہ ایک لمحے تامل کیے بغیر اپنے تعصبات و عقاید کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے اور وہ سب کچھ بیان کرنے لگتا ہے جو وہ خود دیکھ رہا ہے اور وہ بیان نہیں کرتا جو وہ دیکھنا چاہتا ہے (اور خلافِ حقیقت ہے۔)"

بعد کے مارکسی نقادوں میں کاڈویل نے ادب کو عمل کے لیے ذہنی تیاری کا وسیلہ قرار دے کر زاید توانائی کی کارفرمائی بتایا۔ لوکاچ نے جامعیت، عالمی نظریے اور نمایندہ کردار کے تصورات کا اضافہ کیا۔ جامعیت سے مراد یہ تھی کہ ہر فرد کے نجی احساسات و جذبات دراصل اس دور کے طبقاتی نظام کے کسی نہ کسی حصے کی نمایندگی کرتے ہیں اور لازمی طور پر اجتماعی آہنگ کی کسی ایک وحدت کی آواز ہیں۔ وحدت کا یہ تصور کسی نہ کسی عالمی نظریۂ حیات پر مبنی ہونا لازم ہے۔ اس عالمی نظریۂ حیات میں کسی بھی تخلیقی فن پارے کی خارجی اور عالمگیر معنویت کو متعین کرنا ہے اور ٹائپ یا نمایندہ صورت حال یا نمایندہ کردار کسی مخصوص دور کے تبدیل ہونے والے نقشے کی وہ اکائیاں ہیں جو سماجی تبدیلی کا وسیلہ بنی ہوئی ہیں اور جو تاریخ کے اس موڑ پر فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہیں۔

گولڈمان نے لوکاچ کے نظریوں کو ایک نئی جہت بخشی۔ اپنے طریق کار کو گولڈمان نے LE ERALISED E E I STRUCTURISM عمومی و خلقی تشکیلیت کا نام دیا اس کا لب لباب صرف یہ تھا کہ ہر ادبی فن پارے کو مکمل بالذات وحدت قرار دیا جائے اور اسے پہلے اس کے مختلف عناصر اور اجزا کی شناخت اور ان کے باہمی رشتوں کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی جائے اور پھر ان عناصر اور اجزا کی ٹھوس تاریخی اور سماجی جڑیں اور عوامل اور محرکات تلاش کیے جائیں اور ان سماجی طبقوں سے جوڑ کر انھیں دیکھا جائے جو مصنف کے عالمی وژن یا تصورِ حیات میں ظاہر ہوئے ہیں۔ اس اعتبار سے گولڈمان کی تشکیلیت روسی ہئیت پرستوں (مثلاً شلاوسکی اور رومن جیکب سن وغیرہ) سے بالکل مختلف تھی بلکہ ہئیت پرستوں کی متن پرستی اور مارکسی تنقید کے سماجی تجزیے کے درمیان ایک موثر مفاہمہ تھی۔

۲

مگر ادب کی سماجی توجیہ اور سماجی ارتقا کے ذریعے اس کی تفہیم ادبی سماجیات کا

محض ایک پہلو ہے۔ ادب کا تعلق لازمی طور پر کسی نہ کسی حد تک فن کار کی شخصیت سے بھی ہوتا ہے اور ادبی سماجیات کے نقطۂ نظر سے ہر فن کار ایک ایسا سانس لیتا ہوا انسان ہے جو اپنے سماج کا حصہ ہے اس کے کسی نہ کسی طبقے سے تعلق رکھتا ہے وہ اپنے خاندان کا ایک فرد بھی ہے، وہ کسی کا بیٹا بھی ہے، کسی کا بھائی بھی اور کسی کا محلے دار بھی۔ اس اعتبار سے اس کی سماجی پہچان ہے اور اس کا اثر محض نفسیاتی سطح ہی پر نہیں سماجی سطح پر اس کے احساسات ہی پر نہیں اس کی پوری حسیت اور پوری آگاہیوں پر پڑتا ہے۔

سماجی تبدیلی کا عمل یہاں بھی متواتر جاری رہتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب شاعر چوپال میں اجتماعی استناد اور قبول عام والے قصّے نظم کرتا ہے اور کوچہ کوچہ گاتا تھا پھر وہ دیہات سے شہر آیا اور چوپال سے دیوان و دربار تک پہنچا۔ اس کی مالی حیثیت بدلی، اس کے طبقاتی نوعیت بدلی اور یہ تجزیہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ کسی دور کے ادیبوں میں کتنے شہروں میں آباد ہیں اور کتنے دیہاتوں میں بسے ہوئے ہیں۔ اُن کے پیشے کیا ہیں اور ان کی طبقاتی وابستگیوں کی نوعیت کیا ہے۔ ایرک فرام ERIC FROMM نے اپنے ایک مقالے میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اچھے ادیب کے لیے عصر حاضر میں ادب کو پیشہ بنانے کے بجائے غیر ادبی پیشوں میں رہ کر ادب کو محض جز وقتی دلچسپی بنائے رکھنا ضروری ہو گیا ہے تاکہ ادب پر شاعر کے روزگار کے اثرات نہ پڑیں۔

ادیبوں کے ان شخصی مطالعوں کا تعلق ان کی نفسیاتی پیچیدگیوں سے نہیں ہے کیونکہ ادبی سماجیات نفسیاتی تنقید کے دبستان سے مختلف ہے البتہ ادبی سماجیات کو اصرار ہے کہ انفرادی نفسیات بھی دراصل وسیع تر اجتماعی سماجیات ہی کا ایک حصہ ہے اور اس لحاظ سے ادبی سماجیات ادیبوں کی انفرادی صورت حال کا مطالعہ کرکے ادیبوں کی اجتماعی حیثیت اور ان کے ادب پر اثرات کے متعلق نتیجے نکالتی ہے۔

مختلف ادوار میں ادیبوں کی شخصیت، ان کے پیشے، مشاغل اور طبقاتی کردار کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو اس سے نہ صرف دلچسپ نتیجے نکل سکتے ہیں بلکہ اُن کے

موضوعات اور طرزِ بیان ان کی علامتوں اور تمثالوں کے بارے میں بھی نئی معلومات فراہم ہو سکتی ہے اور ہر دور میں شاعر اور ادیب کی بدلتی ہوئی تصویر اور اس کی شہرت اور مقبولیت کے مد و جزر کے مطالعے سے بھی بعض اہم حقائق سامنے آ سکتے ہیں۔ ان مطالعوں سے ادب کی تفہیم اور اس کی پرکھ کا ایک نیا پہلو تو سامنے آئے گا ہی، اس کے ساتھ ساتھ کسی دور کے سماج کی ذہنی اور جذباتی صحت یا عدم صحت کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہو سکتی ہے۔

اس نقطۂ نظر سے ہر فردِ معاشرے کا وسیلۂ اظہار ہے اور ہر شاعر اور ادیب نجی حیثیت و سیع تر اجتماعی حسیت کا حصہ بھی ہے اور اس کا نمایندہ بھی، اور انفرادی حسیت ہی نہیں انفرادی زندگی اور انفرادی رویوں کا مطالعہ بھی پورے سماج کے مطالعے پر محیط ہو جاتا ہے اور یہی رویے کبھی ادب کی دنیا کی دھوپ چھاؤں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ کبھی دوسرے علوم و فنون کے رنگ و آہنگ اور سماج کی ساخت اس کی تبدیلیوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔

۳

ادبی سماجیات کا تیسرا اہم پہلو ادب کی سرپرستی کرنے والے اداروں کا مطالعہ ہے ظاہر ہے کہ یہ بھی ادب کے موضوعات اور طرزِ بیان دونوں پر اپنے طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ مثل مشہور ہے جو پیسہ دے گا وہی راگ سنے گا۔ پہلے زمانے میں ادب کی سرپرستی کا معاملہ سیدھا سادہ تھا اور اس کے سرپرست اداروں کی پہچان زیادہ آسان تھی۔ شاعر کی سرپرستی قبیلہ یا اس کا معاشرہ کرتا تھا۔ پھر یہ کام امیر امرا کے حوالے ہوا۔ دیوان خانے شاعر اور داستان گو سے آباد ہونے لگے۔ پھر شاعر کی سرکار دربار تک رسائی ہوئی۔ شاعر قصیدہ خواں اور ادیب پرچہ نویس اور میر منشی بن گیا اور ان سبھی مناصب اور پیشوں میں مقابلہ ہونے لگا۔ شاعر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہونے لگے۔ ادبی معرکوں کے میدان گرم ہوئے۔

ادبی اسلوب پر بھی اس کا اثر پڑا۔ صنعت گری کا رواج ہوا۔ نثر میں مرقع کاری اور مقفیٰ اور مسجع اسلوب کے ذریعے ادیب اپنا کمال ظاہر کرنے لگے۔ شاعری میں کہیں ایہام کا چلن ہوا، کہیں لفظی بازی گری کا، کہیں خیال بندی اور مضمون آفرینی کے ایسے حربے استعمال کیے جانے لگے جو حریفوں کے مقابلے میں شاعر کی افضلیت ظاہر کرسکیں۔ شوکت الفاظ کا خیال رکھا جانے لگا۔ قصیدہ ذریعہ کمال اور وسیلۂ معاش بن گیا اور شاعر عام کاروبار میں لگنے یا عام پیشوں کے اختیار کرنے کے بجائے خود کو اشرافیہ کا حصہ سمجھنے لگا اور اپنے مرتبے کو بلند جاننے لگا۔

صنعتی انقلاب کے بعد جب ادب کی سرپرستی سرمایہ داروں کے ہاتھ میں آئی تو اس کی نوعیت میں اہم تبدیلیاں ہوئیں۔ اکادمیاں بننے لگیں، یونی ورسٹیوں کا عروج ہوا اور ادب کی سرپرستی کی دوسری بالواسطہ شکلیں اختیار کی جانے لگیں۔ قصیدہ نگار معدوم ہوگئے مگر ارباب اقتدار کی مدح سراؤں اور ثنا گستروں میں کمی نہیں ہوئی۔ عوامی ذرائع ترسیل نے قصیدہ نگاروں کی جانشینی کا حق ادا کر دیا۔ عوامی ذرائع ترسیل کا چلن ہوا تو پریس اور اخبارات وجود میں آئے۔ فلم، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا رواج ہوا اور ان میں سے ہر وسیلے نے ادب کے موضوعات، طرزِ بیان اور تکنیک پر نہایت دور رس اثرات ڈالے۔ ادب کے دائرۂ اثر کو وسیع بھی کیا اور گہرا بھی اور ان میں سے ہر اثر کی نوعیت ایسی پیچیدہ اور متنوع ہے کہ ادبی تحقیق کے لیے نئے امکانات کا دروازہ کھلتا ہے۔ ادبی سماجیات ان سبھی اثرات کے مطالعے کے ذریعے آگے بڑھتی ہے۔

مختلف عوامی ذرائع ترسیل کے ادبی اثرات کے سلسلے میں ریڈیو اور فلم کی مثالیں کافی ہوں گی۔ ریڈیو نے محض آواز کی اکائیوں کے ذریعے فن پاروں کی تخلیق کی۔ آواز کے ان تاثر پاروں کی نئی تکنیک نئے وسیلے سے پیش کیا گیا۔ فلیش بیک مقبول ہوا اور پس منظر کی موسیقی نے محض فضا آفرینی ہی نہیں کی بلکہ علامتی ڈھنگ سے گویا پوری صورت حال کو بیان کر دیا۔ یہ سب تکنیک شعری اور افسانوی ادب

میں بھی اپنے طور پر رچ بس گئیں۔ فلم نے بکھرے ہوئے محاکاتی ٹکڑوں کی اکائیوں کو استعمال کیا۔ مونتاژ کی تکنیک برتی اور فضا آفرینی اور پس منظر PERSPECTIVE کو موثر ہو کر اپنایا۔ ان سبھی حربوں کو ادب کی دیگر اصناف میں برتا جانے لگا بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ادب میں بعض اصناف کی ابتدا اور فروغ سرپرستی کرنے والے طبقوں اور اداروں اور سرپرستی کے طریقوں کے مرہونِ منت ہے۔

قصیدہ ایوان و دربار کی سرپرستی کے بغیر شاید اس طرح فروغ پذیر نہ ہوتا ناول جسے صنعتی دور کا رزمیہ کہا جاتا ہے۔ متوسط طبقے کے عروج، پریس کے چلن اور چھاپے خانے اور اخبارات و رسائل کے رواج کے بغیر ناول کا فروغ ممکن نہ تھا۔ جن، پریوں، بادشاہوں اور شہزادوں کے رومانی قصے اور رومانوی مہمات سے دل بہلانے والے سماج کی جگہ متوسط طبقے کے قارئین نے لے لی تھی اور اب وہ اپنے طبقے کے لوگوں کے قصے، ان کی کامرانیوں اور ناکامیوں کی داستانیں سننا چاہتے تھے اسی لیے ناول نے میرِ داستان کا تاج شہزادوں کے سر سے اتار کر متوسط طبقے کے نوجوان اور اس کے معاشرے کے سر پر رکھ دیا۔ غرض ادب کی سرپرستی کرنے والے اداروں کے اثرات براہ راست موضوع اور ہئیت، طرزِ فکر اور طرزِ ادا پر مرتب ہوتے ہیں۔

اسی مرحلے پر عوامی ذرائع ترسیل کی اجارہ داری کا مسئلہ بھی سامنے آتا ہے۔ جاگیرداری دور کے برعکس صنعتی دور میں شاعر اور ادیب کی تخلیقات براہ راست عوام یا ان کے مخاطبین تک نہیں پہنچتیں بلکہ ان دونوں کے درمیان عوامی ذرائع ترسیل کا پورا کاروبار ہے جس پر حکومت یا با اثرات طبقوں کی اجارہ داری کسی نہ کسی شکل میں قائم ہے۔ مثلاً کوئی شاعر شعر کہے تو اسے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کا انتظام وہ خود اپنے طور پر نہیں کر سکتا۔ اخبارات، رسائل، ناشر، کتب فروش، ریڈیو، فلم، ٹیلی ویژن یا اسی قسم کا کوئی ذریعہ اسے ضرور استعمال کرنا ہوگا اور یہ سب ذرائع براہ راست اس کے قابو سے باہر ہیں اور ان ذرائع ترسیل پر جو طبقے یا ارباب اقتدار قابض ہیں اور اپنی اسی اجارہ داری کے ذریعے وہ ادیبوں کو اور ان کے تخلیق کردہ ادب

اوران کے نظریات اور رویوں کو متاثر کرسکتے ہیں۔

اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اپنی تخلیقات کو جنسِ بازار بنانے کے خلاف احتجاج کے طور پر بعض ادیب ذرائع ترسیل سے اپنا رشتہ توڑنا چاہتے ہیں اور ترسیل ہی کے عمل کو فضول اور غیر ضروری قرار دے کر اپنی ذات کا نجی اظہار ایسی علامتوں اور ایسی عبارتوں میں کرتے ہیں جو ان کے نجی پن کو برقرار رکھ سکیں اور ان کے ذاتی تاثرات اور نجی واردات کو جنسِ بازار نہ بننے دیں۔ بیگانگی کا یہ عمل اور مخاطبین سے فن کار کے رشتے کا کٹ جانے کا یہ سلسلہ بھی ادب اور ادیب پر اثر انداز ہوتا ہے اور سماج کو بھی متاثر کرتا ہے۔ ادبی سماجیات اس عمل اور ردعمل کا مطالعہ ہے۔

۴

ادبی سماجیات کا سب سے زیادہ وسیع اور غالباً زیادہ معروضی شعبہ ادبی ذوق کا تجزیہ اُس کے عوامل و محرکات کا مطالعہ اور سماج پر اس کے اثرات کی نوعیت اور اس کے دائرۂ اثر کا تعین ہے۔ کوئی تخلیقی فن پارہ اپنی آواز بازگشت سے خالی نہیں ہوتا۔ مختلف صورتوں سے وہ عوام تک پہنچتا ہے قبولِ عام حاصل کرتا ہے اور اس کی مقبولیت کبھی کبھی اس حد تک بھی بڑھ جاتی ہے کہ وہ اپنے دور کی آواز ہی نہیں بنتا بلکہ اس آواز کو تبدیل کرنے میں معاون ہو جاتا ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کا ذاتی اثر یوں بھی ہوتا ہے کہ پڑھے لکھے ان کی نقل کرنے لگتے ہیں نشست و برخاست، رہن سہن، طرزِ گفتگو لباس اور پوشاک ہی میں نہیں، چلنے پھرنے کے طریقے اور تفریحات و مشاغل میں بھی ان کی تقلید ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ بعض ناولوں کے کردار ضرب المثل بن جاتے ہیں اور بعض ناول اپنے دور کے طرزِ احساس کو بدلنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ تخلیقی کرداروں پر حقیقت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ لوگ رچرڈسن کی پامیلا اور مرزا ہادی رسوا کی امراؤ جان ادا کے مکان تلاش کرنے نکل پڑتے ہیں۔ بعض ناولوں کے ذریعے شعور اور طرزِ احساس میں ایسی تبدیلی ہو جاتی ہے کہ ناولوں کے مرکزی تصورات عہد آفریں ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً

والٹیر کا ناول' کاندید' یا بنکم چٹرجی کا ناول 'آنند مٹھ'۔

ان ادب پاروں (اور ادیبوں) کے اثر و نفوذ کا تعین کس طرح کیا جائے اور ان اثرات کا مطالعہ کیونکر ہو؟ ادبی سماجیات نے اس کے لیے معروضی پیمانے وضع کرنے کی کوشش کی۔ سب سے پہلے مطبوعہ کتابوں کی اشاعت کے گوشوارے کی طرف توجہ کی گئی۔ کس ادبی صنف کی کتابیں زیادہ بکتی ہیں اور اس صنف میں بھی کس قسم کی کتابیں مقبول ہیں اور اس راہ سے ادبی سماجیات کتابوں کی بکری کے چارٹ اور مارکیٹ سروے (بازار کے جائزے) تک پہنچی۔ ظاہر ہے اعداد و شمار گمراہ کن بھی ہو سکتے ہیں اور مقبولیت اور بکری کے متعدد اسباب بھی ہو سکتے ہیں جس میں ناشر کا سلیقہ، کتب فروش کی اشتہار بازی، تبصرہ نگاری کی اہمیت اور دیگر عناصر شامل ہو سکتے ہیں پھر بھی مذاقِ عام کا پتہ لگانے کے لیے دوسرے طریقے کے ساتھ ساتھ یہ طریق کار بھی برتا جاتا رہا ہے اور اس سے حاصل کردہ نتائج کو دوسرے طریقوں سے اخذ کردہ نتائج کی توثیق کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ فلم، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر پیش ہونے والے پروگراموں کا تجزیہ بھی کیا جاتا ہے۔ جو مذاق عام کی نشان دہی کرتا ہے اور اس دور کے سماج کے عام موڈ کو ظاہر کرتا ہے۔ فلم، ریڈیو اور ٹیلی ویژن اور دوسرے ذرائع اظہار کے ذریعے عوام کے پہنچنے والے ادب کو سامنے رکھ کر کسی معاشرے کی حسیت کی عام روش کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کس قسم کے موضوعات کسی مخصوص معاشرے کو زیادہ پسند ہیں (اور اس مقصد کے لیے CONTENT ANALYSIS یا نفسِ مضمون کے تجزیے کا طریقِ کار برتا جاتا ہے) کس قسم کے اندازِ بیان، علامتیں، تلمیحیں اسے زیادہ عزیز ہیں اور ان سب کی مدد سے کسی دور کے مذاق ہی کا نہیں، اس معاشرے کے جذبات و احساسات، اقدار و افکار کا ایکسرے کیا جا سکتا ہے۔

گویا ادبی سماجیات پورے سماج کو ایک اکائی یا ایک فرد سمجھ کر اس کا مطالعہ کرتی ہے اور کسی دور کے اندیشوں اور ارمانوں، خواہشات اور خطرات کا اسی نقطۂ نظر سے جائزہ لیتی ہے کہ اس دور کے بدلتے ہوئے پیٹرن، فکری اور حسی سانچے محض اتفاقی نہیں رہتے بلکہ سماجی ارتقا کے عمل کا ایک جزو بن جاتے ہیں اور ادب اور سماجی ارتقا دونوں کی تفہیم میں معاون ہوتے ہیں۔

محمد حسن

اردو ادب: ادبی سماجیات کے آئینے میں

ایک زمانہ تھا شاعری پیشہ تھی اور معزز اور مقتدر پیشہ۔ شاعر درباروں میں جگہ پاتے، امیروں اور منصب داروں کے ایوان میں عزت سے بٹھائے جاتے۔ قصیدے لکھتے اور انعام پاتے، وظیفے مقرر کیے جاتے اور ملک الشعرا قرار پاتے۔ جو اس پیشے کو قبول نہ کرتے وہ قلندری کی زندگی گزارتے اور عزت پاتے۔ مجموعی طور پر ۱۹ویں صدی تک اردو کے شاعر کی تصویر صوفی، عاشق اور قلندر کی تھی جسے مال و دولت اتنی عزیز نہ تھی جتنی اپنی آزادروی اور دل زدگی عزیز تھی۔ شاید اس کی آمدنی کا کوئی مستقبل اور مستحکم وسیلہ نہ تھا دوچار کے علاوہ کوئی فارغ البالی کا خواب نہ دیکھ سکتا تھا گویا شاعری خطرناک انداز میں زندہ رہنے کا سودا تھا مثالیں بہت سی ہیں، دکن کے اِنے گنے شاعروں سے قطع نظر دربار سے انشا اور مصحفی سے قبل کوئی بھی باقاعدگی سے وابستہ نہیں رہا اور اِن سے قبل حاتم ہوں یا آبرو، نظیر ہوں یا میر، سودا ہوں یا درد، میراثر ہوں یا میرحسن کوئی بھی درباری شاعر نہیں رہا اور ان سب کی مجموعی تصویر وہی صوفی، عاشق اور قلندر ہی کی ہے (باستثنائے چند)۔ یہ بھی اہم بات ہے کہ یہ سب کے سب اپنے کو اہل حرفہ میں گنتے ہیں اور اشرافیہ میں شمار کرتے ہیں۔ شہرآشوب میں مختلف پیشہ وروں اور اہل حرفہ ہی کے ساتھ اپنا ذکر کرتے ہیں۔

انشا اور مصحفی دربار سے وابستہ ہوتے اور شاعری درباداری بنی تو شاعر کی تصویر

بھی مصاحب اور دنیا دار صاحب منصب امیر کی ہونے لگی وہ یا تو محفل کی رونق بن گیا وہ عوار وزیوں صوفی، عاشق اور قلندر نہیں رہا، اس کی امیج اب ایک زباں داں اور ماہر کلام کی ہوگئی۔ ناسخ سے لے کر (باستثنائے آتش وانیس) اسیر تک یہی صورت ہے شاعر اب گویا تہذیب کا امین اور زبان کا پارکھ بن گیا گویا اب بھی وہ مدرسے سے باہر تھا مگر اس کا رشتہ تخلیق اور احساس سے زیادہ زبان کی تراش خراش اور مجلسی شائستگی سے زیادہ گہرا ہو گیا۔

۱۸۵۸ء کے بعد انگریزی کا عمل دخل ہوا تو لکھنے والے کی امیج پھر بدلی، پرانے طرز کی امیج نے ہندوستانی نوابوں اور راجاؤں کے دربار کا رخ کیا۔ داغ، امیر، جلال تسلیم اس کی نشانی تھے۔ نئے دور میں شاعری گہنا گئی اور نثر کا بول بالا ہوا۔ لکھنے والے افسر، معلم یا مختلف محکمہ ہائے تعلیمات کے منشی اور محرر ہو گئے۔ میرامن اور فورٹ ولیم کے لکھنے والے تو خیر باقاعدہ منشی تھے ہی انجمن پنجاب میں محمد حسین آزاد کا اور دہلی میں حالی کا بھی یہی منصب تھا۔ سرسید، نذیر احمد اور سید حسن بلگرامی وغیرہ سرکاری نوکریوں کی طرف چلے گئے گویا شاعر کی قلندری والی امیج ختم ہوئی اور شاعر (اور مصنف) کے لیے دنیوی کاروبار میں کامیابی اور کامرانی بھی ضروری سمجھی جانے لگی۔ ۱۹ ویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے صحافی، وکیل اور اسکولوں کالجوں میں پڑھانے والے معلمین بھی اس میدان میں آگئے مثلاً ناول نگاروں میں سرشار اور شرر صحافی تھے، مرزا رسوا اور سیر اور بعد کو معلم، پریم چند بھی شروع میں معلم ہی رہے، چک بست اور اقبال وکیل تھے۔ اس دور تک۔۔۔ عورتیں یا تو ادب کے میدان میں آئی ہی نہیں تھیں یا کم از کم ان کو ادبی استناد حاصل نہیں ہوا تھا اور ان کا حلقہ خواتین تک محدود تھا۔ محمدی بیگم، نذر سجاد حیدر اور "روشنک آرا بیگم" کی مصنفہ اور آمنہ نازلی بعد کو مقبول ہوئیں۔ اردو ناول میں ہندو ناول نگاروں کی کمی نہیں تھی اور وہ سرشار اور پریم چند جیسے اہم اور مقتدر تھے مگر پریم چند سے پہلے کسی اردو ناول نگار نے ہندو کردار پیش نہیں کیے تھے۔ یہی حال افسانے کا بھی تھا سجاد حیدر اور نیاز فتح پوری تک کے افسانوں میں کوئی ہندو کردار نہیں ہے اور قصے

صرف شہر کے اعلیٰ متوسط طبقے تک محدود ہیں۔

پھر آزادی کی تحریک چھڑی تو قید و بند کا قصہ شروع ہوا، ادیب اور شاعر کی امیج پھر بدلنے لگی اب مرفہ الحالی یا سرکاری دربار میں عزت یا سرکاری نوکریوں کے اعتبار سے جانچے جانے کے بجائے شاعر کو حق گوئی و بے باکی، قلندری، دنیوی کامرانی سے بے نیازی اور آزاد روی کا پیکر سمجھا جانے لگا۔ چنانچہ حسرت موہانی، مولانا محمد علی، ابوالکلام آزاد، ظفر علی خاں جیسے مصنف مثالی کردار بن گئے انھیں میں نوکری چھوڑ کر پریم چند بھی شامل ہو گئے، وکیلوں کے آزادانہ پیشے سے سر عبدالقادر، سر سلیمان، سر تیج بہادر سپرو وغیرہ شریک ہوئے یہ الگ بات ہے کہ یہ بعد میں جج اور جسٹس بھی مقرر ہوئے۔ اسی زمانے میں مشاعروں کا چلن بڑھا اور شعرا کی سرپرستی ریاستوں اور رجواڑوں کے بجائے عوام کے ہاتھ آگئی اب ایسے شاعروں کا تصور بھی ممکن ہو گیا جو مشاعروں کی کمائی سے زندہ رہ سکیں (جیسے جگر مراد آبادی)، ادبی رسالے نکلنے لگے اور ان رسایل اور اخبارات کی مدد سے بھی ادیب کو روٹی روزی ملنے لگی (مثلاً نیاز فتح پوری اور دیوان سنگھ مفتوں)، صیغۂ تعلیم سے بھی کچھ لوگ وابستہ ہوئے اور تھیئٹر، فلم اور ریڈیو کی مقبولیت بڑھنے کے بعد اردو کے شاعروں اور ادیبوں کی اچھی خاصی تعداد ان اداروں سے بھی وابستہ ہوئی (مثلاً آغا حشر کاشمیری، آرزو لکھنوی اور سعادت حسن منٹو وغیرہ)

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک نے ادب کا رشتہ قومی آزادی کی جدو جہد سے ملا دیا، اشتراکی نقطۂ نظر مقبول ہوا تو سیاسی طور پر سرگرم کل وقتی کارکنوں کی صف میں بھی مخدوم محی الدین، سردار جعفری، مجروح جیسے نام نظر آنے لگے۔ سجاد ظہیر، ڈاکٹر اشرف جیسے مقتدر مصنفین کی زیر سرکردگی "نیا زمانہ" کی ادارت میں ادیبوں کا اچھا خاصہ حلقہ شامل ہو گیا۔ مجاز ریڈیو سے ہارڈنگ لائبریری پہنچے، جوش، کلیم، کی ادارت سے سرکاری رسالے "آج کل" کی ادارت تک پہنچے، فراق الہ آباد یونی ورسٹی کے شعبۂ انگریزی سے متعلق ہو گئے۔

آزادی کے کافی عرصے بعد تک تصویر کچھ یہی رہی۔ ۱۹۵۰ء تک ادیب کی تصویر

باغی کی نہ سہی تو ایک آزاد منش، قلندر صفت انسان کی ضرور تھی گو نقاد زیادہ تر یونیورسٹیوں سے متعلق تھے اور اکثر فن کار اور شاعر سرکاری نوکریوں سے باہر تھے، کرسی اور وردی سے بے پروا یا تو کسی آزادانہ مشغلے جیسے وکالت، صحافت سے متعلق تھے یا پھر ریڈیو فلم وغیرہ سے روزی کما رہے تھے جگر اور جوش کے زمانے سے شاعر کی تصویر میں شراب نوشی کا تصور بھی شامل ہوگیا اختر شیرانی اور مجاز نے اسے کمال تک پہنچا دیا۔ اب شاعر کی تصویر کامیاب اور مرفہ الحال سرکاری افسر کی نہ تھی بلکہ ایسے خوددار اور دنیاوی کامرانی سے بے نیاز نوجوان کی تھی جس کی زندگی میں کوئی زبردست المیہ پوشیدہ ہے اور جو سماج کے ضابطوں کو ٹھکرا کر ایک باغی کی زندگی بسر کرتا ہے بقول کسی خاتون کے "اس سے عشق کیا جا سکتا ہے شادی نہیں کی جا سکتی"۔ چنانچہ شاعروں کی کمزوریوں کو نہ صرف برداشت کیا جاتا تھا بلکہ انھیں شاعرانہ شخصیت کا لازمی حصہ سمجھا جاتا تھا یہی نہیں ارباب اقتدار تک ان کی تلخ باتوں کو بھی برداشت کر لیتے تھے۔ جوش ملیح آبادی کی ناز برداری وزیر اعظم نہرو تک کرتے تھے۔ عام طور پر شاعر اور ادیب حکومت کے خوف یا سماج کے اندیشے کے بغیر اپنے طور پر سوچنے اور شعر کہنے کی ہمت کر سکتا تھا جگر مراد آبادی نے فسادات کے زمانے میں اور اس کے بعد نئے ہندوستان میں سماجی نابرابری اور اقلیت کشی پر جو کچھ لکھا وہ اس کی مثال ہے۔

سماجی باغی اور بت شکن کی یہ تصویر میراجی، منٹو، مجاز سے لے کر جامی اور زریش کمار شاد تک قائم رہی مگر ترقی پسند تحریک کے بکھرنے کے بعد اور نہرو حکومت کو اشتراکی حمایت حاصل ہونے کے بعد شاعر اور ادیب حکومت کی ملازمتوں کا رخ کرنے میں قباحت محسوس نہیں کرتا تھا اب شاعر اور ادیب کی تصویر پھر بدلی، اب اجلے کالر، خوش سلیقگی، ہونٹ میں پائپ اور استری کلف کے کوٹ پتلون کے ساتھ اردو شاعر یا ادیب کا تصور کیا جانے لگا۔ اب جگر صاحب کے بکھرے بال، مجاز کی واسکٹ، اختر شیرانی کی مخمور آنکھیں، حسرت موہانی کی فلاکت ماضی کی تصویریں بن چکی ہیں۔

اس طرح ہم دور جدید تک پہنچے۔ ظاہر ہے آج کے شاعر، ادیب سینکڑوں ہیں اور

سب کے بارے میں معلومات میسّر نہیں ہیں ابھی تک اس کی کوشش بھی نہیں کی گئی ہے کہ ان کے خاندان، پیشے اور کاروبار اور زندگی کی دیگر تفصیلات کے بارے میں معلومات فراہم کی جائیں۔ اس لیے موجودہ حالات میں صرف چند ادیبوں ہی کے بارے میں کچھ کہنا ممکن ہے۔ زیر نظر جائزے کے سلسلے میں مندرجہ ذیل ادیبوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے (تقدیم و تاخیر کا خیال نہیں رکھا گیا ہے):۔

شاعروں میں:۔ اخترالایمان، فراق، جذبی، مجروح، کیفی، ساغر، تاباں، ملّا، سردار جعفری، وجد، شاذ تمکنت، وحید اختر، وامق، ندا فاضلی، بشیر بدر، شہریار، شہاب جعفری، جگن ناتھ آزاد، زبیر رضوی، مخمور سعیدی، پرکاش فکری، حسن نعیم، اعزاز افضل، دوراں، عمیق، کلیم عاجز، کمار پاشی، کرشن موہن، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، مظہرامام، فضا، عرمت الاکرام، علیم صبا نویدی، رفعت سروش، ممتاز مرزا، عزیز قیسی۔

مشاعرے کے شاعروں میں:۔ ندا فاضلی، ملک زادہ، ایاز جھانسوی، وسیم بریلوی، شمس مینائی، بیکل اتساہی، نازش، والی آسی، قمر مراد آبادی، کیف بھوپالی، داراب وفا، بشیر بدر۔

افسانہ نگاروں میں:۔ بیدی، عصمت، حیات اللہ، قاضی عبدالستار، واجدہ تبسم، جیلانی بانو، غیاث احمد گدی، قرۃ العین حیدر، اقبال مجید، اقبال متین، عابد سہیل، سلام بن رزاق، رام لال، رتن سنگھ، کنور سین، جوگندر پال، بلراج مین را، آمنہ ابوالحسن، احمد یوسف، عائشہ، حسین الحق، قمر احسن، سریندر پرکاش۔

مزاح نگاروں میں:۔ یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین، خواجہ عبدالغفور، فکر تونسوی، مجیب سہالوی، نریندر لوتھر، بھارت چند کھنہ، وجاہت علی سندیلوی، شفیقہ فرحت احمد جمال۔

نقادوں میں:۔ فراق، کلیم الدین احمد، آل احمد سرور، اسلوب احمد انصاری، وحید اختر، باقر مہدی، شمس الرحمان فاروقی، وہاب اشرفی، سید محمد عقیل، قمر رئیس، شمیم حنفی، وارث علوی، ابن فرید، محمود ہاشمی، دیوندر اسر، مغنی تبسم، اصغر علی

انجینئر، حامدی کاشمیری، شکیل الرحمان، عصمت جاوید، ظ۔ انصاری، سردار جعفری۔
محققین میں :۔ قاضی عبدالودود، مالک رام، انصاراللہ نظر، رشید حسن خاں، گیان چند جین، نثار احمد فاروقی، حنیف نقوی، عابد پشاوری، عبدالستار دلوی، غلام عمر خاں۔

ظاہر ہے یہ فہرست مختصر ہے اور بہت سے اہم نام چھوٹ گئے ہیں مگر اس مختصر فہرست میں شامل ناموں کے ساتھ بھی انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ وقت اور جگہ کی کمی کے علاوہ ایک بڑا سبب ان کے بارے میں معلومات کی کمی بھی ہے۔ بہرحال جو کچھ معلومات میسر ہیں ان کی روشنی میں ان مصنفین کے بارے میں تین حیثیتوں سے غور کیا جائے گا۔ پہلے ان کے پس منظر کا ذکر ہوگا، پھر ان کے پیشوں یا ذرائع روزگار کا اور آخر میں ادبی سرپرستی اور وسایلِ اظہار کا۔ تشنگی کا احساس قدم قدم پر ستائے گا مگر ایک حقیر ابتدا بھی بعض اوقات جامع مباحث کے انتظار سے بہتر ہوتی ہے۔

۱۔ خاندانی پس منظر

مصنفین کی فہرست پر سرسری نظر ڈالنے سے بھی دو باتوں کا تو اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ ان میں اکثر مصنفین بڑے شہروں کے رہنے والے نہیں ہیں گو اب وہ بڑے شہروں میں رہتے ہیں مگر ان کے خاندان کا پشتینی رشتہ اکثر قصبات سے ہے اور بعض چھوٹے شہروں سے آئے ہیں۔ یہاں بڑے شہروں سے مراد دہلی، بمبئی، مدراس، کلکتہ، پٹنہ، لکھنؤ، حیدرآباد وغیرہ ہیں۔ گاؤں سے تعلق رکھنے والے ادیب بہت کم ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان میں اکثر مصنفین جاگیردارانہ گھرانوں کے چشم و چراغ ہیں گو خود انھوں نے اس نظام سے وابستگی ترک کر کے دوسرے روزگار یا ملازمت میں لگ گئے مگر جاگیردارانہ نظام کے اثرات ان کے ہاں نمایاں ہیں تیسری بات یہ ہے کہ شاعروں میں اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنھوں نے مکتبی تعلیم حاصل کی تھی اور انگریزی کے بجائے عربی فارسی (یا طب) وغیرہ میں

دستگاہ بہم پہنچائی تھی بعد کو خود اپنی کوشش سے یا حالات کی تبدیلی کی وجہ سے انھوں نے انگریزی اور بعض دوسری مغربی زبانوں اور ادبیات کے مطالعے میں دستگاہ حاصل کرلی مثال کے طور پر سردار جعفری، کیفی اعظمی، مجروح سلطانپوری، بیکل، نازش، ظ۔ انصاری، رشید حسن خاں کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

ان تینوں باتوں کو ذرا پھیلایے تو بہت دلچسپ نتائج برآمد ہوتے ہیں قصبوں سے وابستگی نے ہمیں عموماً دیہات سے دور رکھا ہے۔ پریم چند کے بعد ہم دیہات کی طرف گئے بھی ہیں تو تشبیہوں کی تلاش میں یا پھر جاگیردارانہ ہمدردیوں کے ساتھ۔ دیہات کی تصویرکشی قرۃ العین حیدر اور قاضی عبدالستار ہی نے کی ہے اور دونوں کی ہمدردیاں مٹتے ہوئے جاگیردارانہ طبقے کے ساتھ ہیں (شاید اس لیے بھی کہ ان کا تعلق بھی اسی طبقے سے تھا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اردو کے غیر مسلم افسانہ نگاروں کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جاسکتی۔ بیدی، رام لال، رتن سنگھ، جوگندر پال، بلراج مین را، سریندر پرکاش وغیرہ کے یہاں جاگیردارانہ سماج اور اس کی اقدار بہت کم ملے گا اور اس سے جذباتی وابستگی نہ ہونے کے برابر ہے اس کے مقابلے میں وہ صنعتی نظام اور شہری زندگی کے تشنج کا زیادہ ذکر کرتے ہیں) اس سے یہ بھی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اردو شاعری اور بالخصوص افسانوی ادب کی لے اتنی ماتمی کیوں رہی ہے اور ہمارے ناول اور افسانے کا اکثر و بیشتر موضوع زمینداری کا خاتمہ، تقسیم ہندوستان کا المیہ اور بیتی ہوئی قبل تقسیم کی تہذیب کا مرثیہ کیوں رہا ہے جب کہ ہندی میں ان تینوں موضوعات پر تین سے زیادہ ناول نہیں لکھے گئے۔ ہمارے یہاں آنچلک (علاقائی تہذیبوں کی عکاسی کرنے والے) ناول اور افسانے کیوں نہیں لکھے گئے اور ہمارے یہاں نئے صنعتی ہندوستان کے حالات اور اس کی نئی آویزشوں سے اتنی بے تعلقی کیوں ہے؟

یہ سب باتیں شکایت کے طور پر نہیں کہی جاسکتیں محض گزارش احوال واقعی ہے۔ وجہ اس کی ایک یہ بھی ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات اور اردو کے ساتھ ۳۵ سالہ ظلم

نے اردو کے عام ادیب کو ماضی سے زیادہ وابستہ کر دیا اور حال سے کسی قدر بیزار اور ناامید بنا دیا۔

۲۔ پیشے

پیشے اور آمدنی کے اعتبار سے یہ سبھی مصنفین (چند کو چھوڑ کر) متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں ان میں سے کوئی بھی مزدور یا کسان نہیں ہے نہ کوئی کروڑپتی سیٹھ ہے نہ کوئی ایسا اقتدار والا ہے کہ اس کے زیرنگیں کوئی علاقہ ہو۔ یہ شاید اس وجہ سے بھی ہے کہ ابھی تک تعلیم ہمارے نچلے طبقوں تک پہنچی ہی نہیں ہے اور ادب پر ہنوز متوسط طبقے ہی کا قبضہ ہے۔ اردو کے اپنے مخصوص مسایل کی وجہ سے اردو کے مصنف کے سامنے صرف قلم کے سہارے زندہ رہنے کا امکان نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ مشغلے یا تفریح کے طور پر تصنیف و تالیف کو بھی لگائے رکھتے ہیں اور دوسرے پیشوں کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی یہ بھی آمدنی کا ضمنی ذریعہ بن جاتا ہے خاص طور پر خواتین کے لیے اس کا امکان زیادہ ہے (جیلانی بانو اور واجدہ تبسم) اس ضمن میں سب سے زیادہ کامیابی مشاعروں والے شاعر کو ملتی ہے گو بہت کم ایسے شاعر ہیں جو صرف اسی کو ذریعۂ معاش بناتے ہوں مگر مشاعروں سے خاص آمدنی ممکن ہے۔

ادیبوں کی بہت بڑی تعداد تعلیمی اداروں سے وابستہ ہے مثلاً اوپر دی ہوئی فہرست کے ۳۰ شاعروں میں سے ۱۳ کا تعلق یونی ورسٹیوں یا کالجوں سے ہے دوسری فہرست میں ۱۰ میں سے ۳ کا تعلق تدریس سے ہے۔ افسانہ نگاروں میں ۲۳ میں سے صرف دو کا تعلق یونی ورسٹی سے ہے، مزاح نگاروں میں بھی ۱۰ میں صرف دو مدرس ہیں جب کہ ۲۲ نقادوں میں سے ۱۶ کا تعلق یونی ورسٹیوں سے ہے یا رہا ہے، ۱۰ محققین میں سے ۷ مدرس ہیں۔ پیشوں کے اعتبار سے صورت حال یہ ہے :۔

(جدول اگلے صفحہ پر)

پیشے کی تفصیل

		کل تعداد	تدریس	صحافت	وکالت، انجینئری	ریڈیو، ٹی وی	فلم	سرکاری ملازمت	کاروبار	دیگر
۱	شاعر	۳۷+۱۰	۱۳	–	۲	۳	۵	۱	۳	۵
۲	افسانہ نگار	۲۳	۳	۳	–	۳	۲	۲	۴	۲
۳	مزاح نگار	۱۰	۲	۲	–	–	–	۴	–	۲
۴	نقاد	۲۲	۱۶	×	×	۱	×	۲	–	۳
۵	محقق	۱۰	۷	–	–	–	–	–	–	۱
	کل تعداد	۱۱۲	۴۱	۵	۲	۷	۷	۹	۷	۱۳

تصنیف و تالیف کا آزادانہ پیشہ :- ۲+۴+×+×+ = ۶

ریٹائرڈ زندگی گزارنے والے یا غیر منسلک :- ۳+×+×+۲ = ۵

اس فہرست سے اندازہ ہوگا کہ زیادہ مصنفین کا تعلق تدریس یا فلم، ٹی وی یا ریڈیو سے ہے دیگر مشاغل میں انجینئر سے لے کر انکم ٹیکس آفیسر تک سبھی قسم کے پیشے میں (اصغر علی انجینئر اور کرشن موہن) بعض احباب ایسے بھی ہیں جنھیں ملازمت یا کاروبار پسند نہیں انھوں نے اپنے معاشی وسایل دوسرے ذریعوں سے نکال لیے ہیں۔ اس گوشوارے سے یہ بھی واضح ہوا ہوگا کہ تدریس، صحافت، ریڈیو، ٹی وی، فلم اور سرکاری ملازمتوں کا مرکز چونکہ شہر ہیں اس لیے ہمارے ادیبوں کا تعلق بھی دیہات یا قصبے کے مقابلے میں شہر سے ہو گیا اور وہ اپنے قصباتی مراکز سے دور ہو گئے۔ یہاں متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کی بنا پر وہ للچائی ہوئی نظروں سے کبھی اپنے سے اوپر والے طبقے کی چمک دمک کی زندگی کو دیکھتے ہیں کبھی غصہ ہوتے ہیں تو نچلے طبقے کی کشمکش سے اسے ڈراتے ہیں اور نچلے طبقے کی نظروں سے مستقبل کے حسین چہرے کی ایک جھلک دیکھ لیتے ہیں

اگر اس سے مایوسی ہوتی ہے تو کبھی مذہب اور روحانیت میں پناہ لیتے ہیں کبھی حسیت زدگی اور اعصابیت میں کبھی فلسفہ طرازی میں — پناہ گاہیں الگ الگ ہیں۔

۳۔ ادبی سرپرستی

سرپرستی کی اصطلاح ادبی سماجیات میں PATRONAGE کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ یہ سرپرستی محض سرکار دربار ہی کی نہیں ہوتی جمہوری دور میں ان سبھی اداروں کی ہوتی ہے جو ادیب کے لیے ذریعۂ معاش فراہم کرتے ہیں۔ اردو کو آزاد ہندوستان میں مناسب مقام نہیں ملا، اردو تعلیم کے انتظامات ختم کر دیئے گئے اردو ادارے تعطل کا شکار ہو گئے، سرکاری دفاتر سے اردو کو دیس نکالا ملا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو پڑھنے والوں کی تعداد کم ہوتی گئی اور اردو نفع بخش کاروبار نہیں رہی، کاروباریوں نے اس طرف توجہ نہیں کی اور ہندی کے برخلاف اردو میں طباعت اور اشاعت کے کاروبار پر بڑے بیوپاری کا قبضہ نہیں ہوا۔ اردو میں نہ ہی نوبھارت ٹائمز، دن مان، ساریکا اور دھرم یگ جیسے بڑے کاروباری پرچے نکلے، نہ مدھیہ پردیش اکاڈمی اور سنٹرل ہندی ڈائرکٹریٹ کی طرح یہاں کوئی ایسے ادارے تھے جو اردو کی معیاری ادبی کتابوں کو تھوک میں خرید لیں۔ ہمارے یہاں اگر کوئی کاروباری ادارہ تھا تو رسالہ شمع، تھا یا تھوڑی بہت مدد ترقی اردو بورڈ یا حال ہی میں مختلف ریاستوں کی اردو اکاڈمیوں سے مل سکتی تھی۔

اس معاملے کا المناک پہلو یہ ہے کہ اردو میں کتابوں کی اشاعت اور بکری کا کام کاروباری سطح پر کیا ہی نہیں گیا، زیادہ تر اس پورے کاروبار کی نوعیت شوقیہ قسم کی ہے مکتبہ جامعہ جیسے پرانے اور مستند ادارے تک کا یہی حال ہے، نہ کبھی مارکیٹ کا کوئی جائزہ لیا گیا نہ باقاعدہ اشاعت گھر موجود ہیں جن کے باقاعدہ منصوبے ہوں، نہ بک اسٹالوں اور کتب فروشوں کی کوئی باقاعدہ تنظیم ہے نہ ان کی کوئی مکمل فہرست موجود ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اردو میں تصنیف و تالیف عام طور پر گھاٹے کا سودا ہے اور اس کی بڑی وجہ اس کی غیر کاروباری تنظیم یا عدم تنظیم ہے۔

اردو کے شاعروں اور ادیبوں کے معاشی وسایل عام طور پر مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ مشاعرے
۲۔ کتابوں کی اشاعت
۳۔ رسالوں میں مضامین کی اشاعت
۴۔ ریڈیو اور ٹی۔ وی کے لیے ڈرامے یا دیگر پروگرام
۵۔ ساہتیہ اکادمی اور دیگر اکادمیوں کے انعامات
۶۔ فلم
۷۔ تراجم۔ نیشنل بک ٹرسٹ، پی آئی بی وغیرہ کے لیے تراجم
۸۔ صحافت

کتابوں اور رسالوں کے سلسلے میں صورت یہ ہے کہ اس کاروبار کی مناسب تنظیم نہ ہونے کی وجہ سے اردو کتابوں کی بکری محدود ہے گو ہندوستان کی ۵۰ یونی ورسٹیوں میں بی۔ اے اور ایم۔ اے کی سطح پر اردو کی تعلیم کا انتظام ہے اور اس کام میں ۰ ہم سے زیادہ اساتذہ اور کم سے کم چار ہزار طلبا مصروف ہیں جن میں پی ایچ ڈی اور ایم فل کے طلبا کی تعداد کئی سو ہے مگر ان کے لیے کتابیں فراہم کرنے کا انتظام اطمینان بخش نہیں ہے اس کے باوجود اردو کتابوں کی بکری کا تجزیہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ سب سے زیادہ بکری مذہبی ادب کی ہوتی ہے اور تقریباً اسی قدر کھپت فلمی، جاسوسی اور رومانی ادب کی ہے۔ رسالوں کے سلسلے میں بھی، یہی صورت رسالوں کی ہے شمع، بیسویں صدی، روبی، اور مختلف ادبی اور نیم ادبی ڈائجسٹ مثلاً ہما، ہدیٰ، شبستان خاصے مقبول ہیں یہی حال جاسوسی دنیا، رومانی دنیا کا ہے۔

کتابوں کی بکری کے سلسلے میں صورت حال یہ ہے کہ تصنیف وتالیف سے مصنف کے پلّے کچھ نہیں پڑتا، اگر کچھ پڑتا ہے تو ناشر کو یا پھر اس بک سیلر کو جو اکثر صورتوں میں نادہند ہوتا ہے اور ناشر سے بہت بڑا کمیشن حاصل کر لینے کے باوجود اصل رقم بھی ناشر یا مصنف کو نہیں دیتا۔ مصنف محض صاحبِ کتاب بننے کے شوق میں خود کتاب

چھپواتا ہے اور دوستوں کے حرف تحسین سے تسکین حاصل کر لیتا ہے جب کہ کتب فروش اس سے تھوڑی بہت منفعت بھی حاصل کر لیتا ہے صاحب تصنیف کو کچھ رقم ملتی ہے تو وہ ساہتیہ اکادمی یا اردو اکادمیوں کے انعامات ہی کی رقم ہوتی ہے۔

رسالے کی صورت حال یہ ہے کہ مندرجہ ذیل رسالوں میں گیارہ رسالے سرکاری یا نیم سرکاری ہیں۔ (آج کل، نیا دور، تعمیر، زبان و ادب، نورس، نخلستان، پاسبان، مغربی بنگال، دلی، تعمیر ہریانہ، خبرنامہ) سات کاروباری رسالے ہیں (شمع، بیسویں صدی، شبستان، ہما، ہدیٰ، جاسوسی دنیا، رومانی دنیا) ۹ ماہوار رسالوں میں شب خون، شاعر، سب رس، عصری آگہی، سہیل، آستانہ، منادی، معارف، برہان، ہیں جو اکثر گھنٹے دار نکلتے ہیں۔ سہ ماہی یا ششماہی رسالوں میں نوائے ادب، گفتگو، عصری ادب، تناظر، معیار، شعور، سطور وغیرہ ہیں۔ ان میں سے سرکاری رسالوں کے علاوہ کوئی بھی مضامین کا معاوضہ نہیں دیتا اور یہ معاوضہ بھی بہت معمولی ہوتا ہے۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بھی گنجائش بہت محدود ہے گو اردو کے بعض اچھے لکھنے والے ریڈیو اور ٹی وی سے متعلق ہیں (قیصر قلندر، عمیق، زبیر رضوی، کمال احمد صدیقی، انیس رفیع، اقبال مجید وغیرہ ریڈیو سے اور مظہر امام، منظور الامین، فاروق نازکی، ٹی وی سے متعلق ہیں) مگر پھر بھی اردو پروگراموں کے کم ہونے اور مناسب تربیت اور ٹریننگ نہ ہونے کی بنا پر عام لکھنے والوں کو اس کا فیض نہیں پہنچتا۔ فلم تعلقات کے بھروسے روزگار دے سکتا ہے مجروح، اور ساحر کے بعد کی نسل میں عزیز قیسی، ندا فاضلی اور دو ایک نام ہی اور ہیں جو اس میدان میں قسمت آزمائی کر رہے ہیں۔ تراجم کا بھی یہی حال ہے، صحافت نے اچھے ادیب پیدا کیے مگر ان دنوں صحافت سے متعلق ہونے والے ادیب بہت کم ہیں۔

اردو اکادمیاں

اردو اکادمیاں اب خیر سے دس ہو گئی ہیں جموں و کشمیر اکادمی تو اردو کا کام

۔ نہ کرنے کے برابر کرتی ہے باقی دہلی، راجستھان، کرناٹک، مدھیہ پردیش کی اردو اکادمیوں کو جو رقمیں مل رہی ہیں وہ بہت کم ہیں اور ان پر سرکاری گرفت زیادہ ہے۔ اتر پردیش، بہار، آندھرا پردیش، مغربی بنگال اور مہاراشٹر کی اکادمیاں البتہ فعال ہیں لیکن عام طور پر اکادمیوں کا نظم و نسق ایسے ارباب اختیار کے ہاتھوں میں ہے جنھیں یا تو اردو کے معاملات سے سرے سے واقفیت ہی نہیں ہے اور وہ اردو کو محض سیاسی ہتھیار کے طور پر ہی استعمال کرنا جانتے ہیں یا پھر ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جن کو اردو کے لیے کام کرنے کی فرصت نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ مشاعرے ہوں یا اکادمیاں سب جگہ ادبی سرپرستی کے وسیلے عام طور پر بنیادی طور پر ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جنھیں اردو کے کام سے دلچسپی یا واقفیت یا اس کی فرصت نہیں ہے۔

اکادمیاں سارے کام کر نہیں سکتیں، یوں بھی حکومت کی سرپرستی کی وجہ سے ان کے اختیارات محدود ہیں۔ اردو دنیا پچھلے ۳۵ برسوں کی ناانصافیوں کو یک قلم ختم کرنا چاہتی ہے اس لیے اکادمیوں سے کڑھتی ہے، بیزاری اور خفگی کا اظہار کرتی ہے جو بلاوجہ نہیں، مگر نامناسب ہے۔ اکادمیاں صرف انعام دے سکتی ہیں، معذور ادیبوں کی مدد کر سکتی ہیں، اشاعت کتب کے لیے روپیہ اور اردو کے طالب علموں کو وظیفے دے سکتی ہیں وہ اردو کو دوسری سرکاری زبان نہیں بنا سکتیں، نہ اردو کی تعلیم کا انتظام کر سکتی ہیں اور نہ دفتر اور کچہریوں میں اس کا عمل دخل کرا سکتی ہیں اور جب کبھی کوئی پیش رفت ہوتی ہے تو وزیروں کی تقریریں اور سرکاری دفتر والوں کی لیت ولعل اسے ختم کر دیتی ہے۔ یہی حال ترقی اردو بورڈ کا بھی ہے اور ان نیم سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کا بھی ہے جنھیں اردو دنیا نے بڑے ارمانوں سے بنایا تھا اور اب انھیں صبر کرلیا ہے انجمن ترقی اردو (ہند) تک سے بھی توقعات پوری نہیں ہوتی ہیں کہ وہ تعطل کا شکار ہے۔

اس صورت حال کو سامنے رکھیں تو اندازہ ہوگا کہ اردو کے لکھنے والوں کے لیے

تصنیف وتالیف سنجیدہ ذریعۂ معاش نہیں ہے محض مشغلہ بن کر رہ گئی ہے انھیں علم ہے کہ اس سے اگر روپیہ حاصل کرنا ہے تو سطحی قسم کی سرسری کاوشیں ــ مثلاً مشاعرے میں 'چلنے' والی پست سطح کی غزل لکھنا ــ مناسب ہے۔ سنجیدہ غور وفکر، محنت ــ اور ریاضت غیر ضروری ہے۔ اگر تصنیف وتالیف کا مقصد محض اکادمی کا انعام لینا یا ہم چشموں میں عزت وشہرت حاصل کرنا ہے تو اس کے لیے بھی دیدہ ریزی اور مغز کاوی ضروری نہیں، جوڑ توڑ، سعی سفارش زیادہ ضروری ہے اور اگر خود اپنا قد بڑا نہ کر سکیں تو دوسروں کی ٹانگ کھینچنا زیادہ مفید ہوگا۔ اس پس منظر میں اردو مصنفین کی صفوں میں چھائی سازشوں، غیبت اور خوشامد، شکر رنجیوں اور بیزاری اور کلبیت کا کچھ جواز تو ملتا ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ اکادمیوں میں انعام کے لیے پیش ہونے والی کتابوں میں سب سے زیادہ تعداد بے رنگ شعری مجموعوں کی ہوتی ہے، اس کے بعد افسانوں کے مجموعے ہوتے ہیں۔ اکا دکا ناول باقی تراجم وہ بھی معمولی، سنجیدہ علمی ادبی کتابیں شاذ ہی نظر آتی ہیں اور شعری اور افسانوی مجموعوں میں کبھی وزن و وقار ریاضت اور محنت کے آثار تقریباً ناپید ہوتے ہیں۔

مجموعی طور پر اردو کے ادیب عدم وابستگی کا شکار نظر آتے ہیں۔ وہ نہ تو ارباب اقتدار کا حصہ بن کر ملک کے اندر تہذیبی اور عمرانی تبدیلیوں کا فعال اور محرک حصہ بنے ہیں کہ ان کے لب تبدیلی کے رجز اور نئی قدروں کے نغمے گا سکیں نہ وہ ان انقلابی طاقتوں سے خود کو ہم آہنگ پاتے ہیں جن کی نظریں مستقبل پر ہیں۔ اس عدم وابستگی میں لسانی اور تہذیبی اقلیت کے مسایل کو بھی دخل ہے اور ان سب عناصر سے مل کر ایک نئی صورت حال پیدا ہو گئی ہے جو ملک کی عام فضا کا حصہ ہوتے ہوئے بھی اپنی مخصوص پیچیدگیوں اور الجھنوں سے خالی نہیں۔

مصنفین: سیمیں ثمر و ڈاکٹر فضل رب

اردو کے ابتدائی ناول:

ادبی سماجیات کے نقطہ نظر سے

ادب معاشرے کا ردعمل ہے۔ فن کار خواہ وہ سماجی قدروں کا حامی ہو یا مخالف اپنے تخلیقی شہ پاروں میں اپنی ذات کے تعلق رکھنے والے معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر معاشرے کا ادب نہ صرف ایک دوسرے سے الگ ہوتا ہے بلکہ ایک ہی معاشرے کا ادب ہر دور میں مختلف نظر آتا ہے۔ موضوع اور ہئیت دونوں کے اعتبار سے، کیونکہ وقت اور سماج کے مزاج کے مطابق ہی ادب تشکیل پاتا ہے ادب جہاں اپنے زمانے کے سماجی، سیاسی اور معاشی ماحول کی عکاسی کرتا ہے اور ایک نئے سماج کی بنیاد بھی رکھتا جاتا ہے۔

ہندوستان میں تعلیم نسواں کی تحریک میں اردو کے ابتدائی ناولوں کا بہت ہی اہم مرتبہ رہا ہے۔ اردو کے ابتدائی ناولوں کا موضوع کم و بیش تعلیمی اصلاح سے تعلق رکھتا ہے۔ غدر کے فوراً بعد سے دوسری جنگ عظیم تک عورتوں کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ تعلیم رہا ہے۔

انیسویں صدی کے ابتدا ہی سے ہندوستانی معاشرہ نئی تبدیلیوں سے دوچار ہونے لگا۔ مذہبی، سماجی اور تعلیمی تحریکوں کی جڑیں ہندوستانی معاشرے میں پیوست ہونے لگیں، خصوصاً انگریزی تعلیم کی وجہ سے ہندوستانیوں کے سیاسی شعور نے ایک نئی انگڑائی لی۔ ۱۸۳۵ء ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل

کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب حکومت برطانیہ نے انگریزی تعلیم کی اشاعت کے لیے اقدامات اٹھائے اور اس طرح ہندوستانیوں کو مغربی تہذیب وتمدن اور فکر و نظر سے رابطہ قایم کرنے کا موقع ملا، چنانچہ مغربی افکار کے اثرات اس وقت کے ہندوستان کی بیش تر سماجی، تہذیبی اور تعلیمی تحریکوں میں دکھائی دیتے ہیں لیکن انگریزی نظام تعلیم کی ایک بہت بڑی خرابی یہ تھی کہ وہ صرف ہندوستانیوں کے اعلےٰ طبقوں تک ہی محدود تھی جس کا مقصد ہندوستان میں محض تعلیم یافتہ عملے کو فروغ دینا تھا۔ اس طرح انگریزی نظام تعلیم نے ہندوستان میں طبقاتی فرق کو اور بھی نمایاں کرنا شروع کیا جو ایک نوآبادیاتی سماج کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ ۱۸۹۸ء میں جب لارڈ کرزن بحیثیت وائسرائے ہندوستان آیا تو اس نے محسوس کیا کہ حکومت برطانیہ نے تعلیم کو مناسب اہمیت نہیں دی۔ لہٰذا لارڈ کرزن نے تعلیم کی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے حکومت برطانیہ کے داخلی پالیسی کی فہرست میں اسے دوسرے نمبر پر رکھا کیونکہ جب تک حصول تعلیم کے مواقع کو عام نہیں کیا جاتا اس وقت تک ملک کی معاشی ترقی ممکن نہیں۔ چنانچہ ۱۹۰۴ء میں لارڈ کرزن نے پورے ہندوستان میں پرائمری تعلیم کو عام کرنے کا اعلان کیا۔[1]

عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ ابتدا میں جدید تعلیم خصوصاً انگریزی تعلیم سے مسلمانوں نے اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھنے کی کوشش کی، اس کے کئی وجوہات تھے مثلاً مسلمان جدید تعلیم کو مذہب کے خلاف تصور کرتے تھے۔ جدید نظام تعلیم میں پرانی تہذیبی قدروں اور مذہبی احساسات کو فروغ پانے کی کوئی گنجائش نہیں تھی اسکولوں میں مسلمان اساتذہ کی غیر موجودگی اور ان اسکولوں میں مادری یا عربی زبان میں مذہبی تعلیم دینے کی کوئی صورت نہیں تھی، حکومت برطانیہ کے تسلط

1 ARPAIA BASU: The Growth of Education and Political Development in India (1898—1920) Delhi, Oxford University Press, 1974. P 60.

کے بعد خصوصاً ۱۸۵۷ء کی شورش کے نتیجہ میں مسلمانوں کا معاشرہ ایک نئے بھونچال سے دوچار ہو رہا تھا۔ چونکہ مسلمان ایک فاتح قوم کی حیثیت سے آئے تھے لہٰذا اپنے علوم و فنون اور زبان و ادب کو چھوڑ کر عیسائیوں کی زبان و علم کو سیکھنا اپنی تہذیب و شرافت کے خلاف سمجھتے تھے، گرچہ انگریزی تعلیم کی ابتدا سب سے پہلے بنگال میں ہوئی، کلکتہ میں اسکول اور کالج قایم کیے گئے لیکن ان اداروں میں زیادہ تر طلبا ہندو تھے کیونکہ مسلمانوں کی کثیر آبادی گاؤں میں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ۸۵ فی صد بنگالی مسلمان انگریزی تعلیم سے بالکل محروم رہے اور اس طرح مغربی افکار سے ان کا کوئی رابطہ نہیں ہو سکا۔ ڈاکٹر ہنٹر نے بھی اس بات کی طرف حکومت برطانیہ کی توجہ مرکوز کی کہ مسلمانوں کا نچلا طبقہ کبھی بھی انگریزی تعلیم سے مستفید نہیں ہوا۔ لیکن ۱۸۰۰ء کے لگ بھگ حکومت برطانیہ نے مسلمانوں کی تعلیم کی طرف تھوڑی بہت توجہ دینی شروع کی، لیکن وہ بھی کسی مصلحت پر مبنی تھی، غدر کے بعد مسلمانوں کی بچی کھچی طاقت ختم ہو چکی تھی اور انگریزوں کو تعلیم یافتہ ہندوؤں کی طرف سے خطرہ محسوس ہونے لگا تھا۔ لہٰذا انگریزوں نے مسلمانوں کو ہی اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک ڈھال کے طور پر استعمال کرنا چاہا۔ چنانچہ ۱۸۷۱ء میں ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی مشہور کتاب "ہندوستانی مسلمان" میں اس بات کی وکالت کی کہ اگر مسلمانوں کا دل جیتنا ہے اور ان کی وفاداری حاصل کرنی ہے تو ان کے لیے علیحدہ تعلیم کا انتظام کرنا ہوگا، مثلاً مسلمانوں کے لیے علیحدہ اسکولوں کا قیام، موجودہ اسکولوں میں مسلمان اساتذہ اور انسپکٹروں کی بحالیاں۔ اس طرح ہنٹر کمیشن نے مسلمانوں کو تعلیمی مواقع فراہم کرانے کے سلسلے میں تقریباً ۱۷ تجاویز پیش کیں، لیکن دوسری طرف ہندوؤں میں راجہ رام موہن رائے کی قیادت میں تعلیمی بیداری کے آثار رونما ہونے لگے تھے اور انگریزی تعلیم کی طرف لوگوں کا رجحان تیزی سے بڑھنے لگا۔ ۱۸۲۱ء میں جب حکومت برطانیہ

لہ ایضاً صفحہ ۱۵۲

نے سنسکرت کالج قائم کیا تو دو سال کے اندر ہی اس کی مخالفت شروع ہوئی۔ راجہ رام موہن رائے نے اس کی مخالفت میں گورنر جنرل کو ایک عرض داشت بھیجی جس میں انھوں نے شکایت کی کہ سنسکرت کالج قایم کر کے حکومت برطانیہ ہندوستان کو تاریکی میں رکھنا چاہتی ہے، دوسری طرف مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ جب ۱۸۳۵ء میں انگریزی حکومت نے یہ اعلان کیا کہ تمام ہندوستان میں حکومت انگریزی تعلیم پھیلانا چاہتی ہے تو کلکتے کے مسلمانوں نے حکومت کے اس فیصلے کی مخالفت میں ایک عرض داشت تیار کی جس میں آٹھ ہزار مسلمان رئیسوں اور عالموں کے دستخط تھے جس میں یہ شکایت کی گئی تھی کہ حکومت برطانیہ کا انگریزی تعلیم پر اس قدر توجہ دینا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انگریزوں کا ارادہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا ہے۔ مسلمانوں کی ذہنی کشمکش کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک اخبار نے لکھا تھا کہ:

"..... مسلمانوں کا طرز عمل دانش مندانہ نہ تھا۔ انھوں نے اپنے آپ کو تمام ملازمتوں سے علیحدہ رکھ کر اس تعلیم سے خود کو محروم کر لیا جسے انگریزی حکومت یا دوسری ایجنسیاں ان کے لیے فراہم کر رہی تھیں اور ان کو سرکاری اسامیوں کے سزاوار بنا سکتی تھی، اس دوران میں ہندو بالخصوص کمزور حقیر بنگالی نے اس حقیقت کو پالیا کہ علم زور بھی ہے اور زر بھی۔"[۱]

لیکن سرسید کی قیادت میں کچھ ذی شعور لوگوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ مسلمانوں کی ترقی اور ان کی اقتصادی اور سیاسی حالات کو مستحکم اور بہتر بنانے کا واحد وسیلہ تعلیم ہی ہے، چنانچہ سرسید کی تعلیمی تحریک میں جن حضرات نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان میں مولوی چراغ علی، مولوی سید احمد، محسن الملک، وقار الملک، مولوی

۱؎ بحوالہ نورالحسن نقوی "سرسید اور ہندوستانی مسلمان" علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۰۹ء

ذکاء اللہ، حالی، شبلی، نذیر احمد اور زین العابدین وغیرہ کے نام سرِ فہرست آتے ہیں ان بزرگوں کا خیال تھا کہ تعلیم کے بغیر مسلمانوں کی حالت بہتر نہیں ہو سکتی، جب تک مسلمان علوم و فنون کے میدان میں ترقی کرتے رہے وہ تہذیبی، ثقافتی اور اقتصادی میدان میں آگے بڑھتے رہے۔ لیکن جیسے جیسے علوم و فنون میں کمی آئی مسلمانوں کا معاشرہ انحطاط پذیر ہوتا گیا، مسلمانوں کے علوم و فنون اور ذوقِ تحقیق ہی پورے یورپ میں صنعتی انقلاب اور نشاۃ ثانیہ کے سبب بنے لیکن جیسے جیسے مسلمان اس میدان میں کمزور ہوتے گئے ان کی حکومتیں بھی سکڑتی گئیں، چنانچہ سرسید اور ان کے رفقا نے تعلیمی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ سرسید کی تعلیمی تحریک کے متعلق پنڈت جواہر لعل نہرو لکھتے ہیں :-

> "سرسید کا یہ فیصلہ کہ تمام کوششیں مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے پر صرف کر دینا چاہیے یقیناً درست اور صحیح تھا۔ میرا خیال ہے کہ بغیر اس تعلیم کے مسلمان طرز جدید کی قومیت کی تعمیر میں کوئی قابل قدر حصہ نہ لے سکتے تھے بلکہ اندیشہ تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کے غلام بن جائیں گے۔ جو تعلیم میں ان سے آگے تھے اور معاشی اعتبار سے بھی زیادہ مضبوط[1]"

بہر حال سرسید اور ان کے رفقا کی کوششیں کافی حد تک بار آور ہوئیں۔ علیگڑھ تحریک کا خاطر خواہ فائدہ ہوا اور ہندوستانی مسلمانوں کا تعلیمی رجحان انگریزی تعلیم کی طرف مائل ہونے لگا۔ لوگ بیرسٹر، ڈاکٹر اور سرکاری افسر بننے لگے لیکن سرسید کی ان ساری کوششوں کے بیچ تعلیم نسواں کی گنجائش یا تو بہت کم تھی یا سرے سے تھی ہی نہیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے الفاظ میں "سرسید احمد خاں کے زمانے تک تعلیم عورتوں کے لیے نہ صرف غیر ضروری تھی بلکہ نامناسب سمجھی جاتی تھی اور بہت کم گھرانوں میں پڑھی لکھی

[1] سرسید اور ہندوستانی مسلمان، ص ۶۳

عورتیں موجود تھیں، یہی وجہ ہے کہ . . . . عورتوں کی اکثریت جاہل تھی اور معاشی نظام میں ان کی حیثیت بڑی حد تک عضو معطل کی سی تھی۔" ایسی ہی عورتوں کا تذکرہ نواب محسن الملک نے بھی محمڈن اینگلو اورنٹیل ایجوکیشنل کانفرنس کے دسویں سالانہ اجلاس ۱۸۹۵ء میں کیا تھا:۔

"افسوس ہے کہ ہماری قوم فی زمانہ علم دین سے بے بہرہ ہے اور انگریزی تعلیم کو حرام سمجھتی ہے اور طرح طرح کے عذر اور حیلے پیش کرتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قوم کا جنازہ سامنے رکھا ہوا ہے اور خاندان کے لوگ ہنسی کر رہے ہیں۔ شرفاء، امراء، علما، سب کی حالت عبرت انگیز ہے، ہزاروں گھر برباد ہو چکے ہیں، ہزاروں خاندان تباہ ہو چکے ہیں . . . . جب کبھی میں حیدر آباد سے اپنے وطن اٹاوہ کو آتا تھا تو دیکھتا کہ باہر مرد اور اندر رشتہ دار عورتیں ملنے کو آتی تھیں جن کو دیکھ کر افسوس آتا تھا اور روتا تھا کہ خدایا ان کی مصیبت دور کر یا ہمارا حال بھی انھیں کا سا کر دے، ہمارے قریبی رشتہ داروں میں بعض سیدانیاں ایسی تھیں کہ جن کے بدن پر ثابت کپڑا تک نہ تھا باوجود اس کے تعلیم سے نفرت، علم سے بیگانگی، فقر و فاقہ میں مست اور اپنی تباہ حالت پر قانع، نتیجہ اس کا یہ ہے کہ علم کا نام باقی نہ رہا اور اب تو ایسی افسوس ناک حالت ہے کہ اگر ان کو تعلیم کی فہمائش کی جاوے تو ہزاروں عذر اور حیلے پیش کیے جاتے ہیں، جہاں جہاں مسلمانوں کی آبادی یا عملداری ہے سب جگہ باہمی عداوت اور تفرقہ اور خانہ جنگی ہے، مشکل سے آپ دیکھیں گے کہ کسی ایک بات پر دو مسلمان متفق ہیں لیکن اس نہ پڑھنے پر سب متفق ہیں۔"

عورتوں کی جہالت نہ صرف ناخواندگی تک ہی محدود تھی بلکہ فرسودہ خیالات، غلط

رسم و رواج اور طرح طرح کی سماجی برائیاں انھیں جکڑے ہوئی تھیں۔ ایک طرف مردوں کا ایک گروپ پڑھ لکھ کر تیار ہو چکا تھا لیکن دوسری طرف عورتیں وہی لکیر کی فقیر بنی بیٹھی تھیں، عورتوں اور مردوں کے بیچ تعلیمی نابرابری کی خلیج پیدا ہونے لگی تو سماجی زندگی ڈانواڈول ہونے لگی، اس کا اندازہ ہمیں محترمہ والدہ سلیمان بار ایٹ لا کے ناول "اصلاح النساء" کے دیباچے سے ہوتا ہے جس میں انھوں نے میاں بیوی کے رشتوں میں ناہمواری کے اسباب کی طرف اشارہ کیا ہے :۔

"جیسا اشرافوں میں ہوتا ہے اور قوموں میں نہیں ہوتا اس کے کئی سبب ہیں۔ اول تو یہ ہے کہ اور قوموں میں جیسی عورتیں ویسے مرد، دونوں ایک طرح کے ہوتے ہیں۔ میاں بھی جاہل بی بی بھی جاہل..... شریف امیروں کا یہ حال ہے کہ میاں پڑھے لکھے، بیوی جاہل، بے تعلیم، بے ہنر۔ بی بی نے شیخ بدو کا بکرا چڑھانا چاہا تو میاں نے منع کر دیا، بی بی نے پیر کھلانا چاہا تو میاں نے پیر کھلانے والی عورتوں کی ممانعت کر دی..... میرے نزدیک انھیں وجہ سے ناچاقی میاں بیوی میں ہو جاتی ہے۔"

جیسا کہ پہلے ہی اس بات کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ برطانوی نظام تعلیم کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہندوستان میں ایک ایسا طبقہ پیدا کرنا چاہتے تھے جسے تعلیم یافتہ اشرافیہ کے نام سے منسوب کیا جاتا تھا اور جس کا تعلق سماج کے اونچے طبقے سے ہوتا تھا کیونکہ انگریز ان اعلیٰ طبقوں کے لوگوں کے ذریعہ ہندوستانی عوام پر کچھ دن اور حکومت کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان لوگوں کو انگریزی تعلیم دے کر اعلیٰ نوکریوں پر بحال کرتے، اس طرح ہندوستانیوں کا ایک گروپ انگریزی تعلیم سے مزین ہو کر تیار ہو گیا لیکن ان اعلیٰ طبقے کی عورتوں کا حال کچھ اور ہی تھا، ان کی تعلیم محض گھریلو تھی کیونکہ اس وقت ہندوستانی معاشرہ خصوصاً مسلمانوں کا معاشرہ اتنا آزاد نہیں تھا کہ مغرب کی ہوائیں داخل ہو جاتیں لہٰذا ان کی تعلیم بھی بند معاشرے میں ہوتی رہی جس کا مقصد

عورتوں کو مرد کے تابع رکھنا، بچوں کی پرورش کرنا، امورِ خانہ داری سنبھالنا، خط و کتابت کرنا اور دینی معلومات فراہم کرنا تھا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورتوں اور مردوں کے درمیان ایک خلیج حائل ہوتی گئی۔ مرد روشن خیال، جدید تعلیم سے لیس اور مغربی تہذیب کے دلدادہ، دوسری طرف ان کی عورتیں مشرقی روایتوں کی پابند، رجعت پسند اور جدید تعلیم سے بے بہرہ ــ اس فرق نے گھر کے اندر ایک سرد جنگ کی سی صورت پیدا کر دی چنانچہ اردو ناول نگاروں نے اس سرد جنگ کو محسوس کیا اور یہ اندازہ لگایا کہ اگر عورت اور مرد کے درمیان یہ خلیج بڑھتی گئی تو خاندان کی جڑیں ٹوٹنے لگیں گی اور پھر مسلمانوں کا معاشرہ ایک عجیب افراط تفریط کے عالم سے دوچار ہوگا جو نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ پورے ہندوستان کے لیے ایک عظیم سانحہ ہوگا۔ چنانچہ ان ناول نگاروں نے ان اعلیٰ طبقوں یا متوسط اعلیٰ طبقوں کی عورتوں کی تعلیمی اور سماجی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا تاکہ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کی شخصیت کی ترقی بھی یکساں طور پر ہو سکے اس تحریک کا بھرپور نقشہ ہمیں اردو کے ابتدائی ناولوں میں شدت کے ساتھ دکھائی دیتا ہے جس کا اندازہ "اصلاح النساء" کے دیباچے کے مذکورہ بالا اقتباس سے بھی ہوتا ہے۔

سرسید کے بعض رفقا نے تعلیم نسواں کی اہمیت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ ان میں سرفہرست نذیر احمد تھے۔ اردو ناول کی شروعات اور اس کے ذریعہ تعلیم نسواں کی تحریک کو آگے بڑھانے میں نذیر احمد کا کارنامہ ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے حالات کو ناموافق بنانے کے کئی اسباب تھے مثلاً ایک بڑی رکاوٹ کم سنی کی شادی تھی۔ یہ رسم اس وقت ملک کے تقریباً ہر حلقے اور ہر فرقے میں کم و بیش موجود تھی، اس کی وجہ سے لڑکیوں کی جسمانی، روحانی، اخلاقی اور تعلیمی نشو و نما کا بہترین زمانہ برباد ہو جاتا تھا۔ دوسری رکاوٹ پردے کی تھی دس برس کی عمر میں لڑکیوں کا باہر نکلنا یا اسکول جانا اخلاقی اور مذہبی جرم سمجھا جاتا تھا یہاں تک کہ اگر کسی عورت کا کوئی مضمون کسی اخبار میں شائع ہوتا تو لوگ

اس کو بھی اس طرح معطون کرتے کہ گویا وہ پردے سے باہر نکل آئی ہو۔" (مشیر نسواں، ص۱۲) غرض لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ بہت پیچیدہ تھا۔ ایک طرف تو ہندوستانی مسلمانوں کا افلاس اور ان کی تنگ خیالی خاطر خواہ فیصلے کے راستے میں مزاحم تھے تو دوسری طرف قدیم رواج جو مذہب کا رنگ اختیار تھے تعلیمی ترقی کی رفتار کو روک رہے تھے، ان تمام حالات کے باوجود اگر لڑکیوں کو تعلیم دی بھی جاتی تو وہ اس قدر خشک اور ثقیل ہوتی جسے پڑھ کر ذہن بوجھل ہو جاتا تھا کیونکہ ان کا موضوع صرف مذہب اور پند و نصائح سے تعلق رکھتا تھا، ایسے وقت میں نذیر احمد نے ناول کو عورتوں کی اصلاح و تعلیم کا ایک موثر ذریعہ بنایا۔ نذیر احمد کا پہلا ناول "مراۃ العروس" ہے جسے انھوں نے مستورات کی تعلیمی اور معاشرتی اصلاح کی غرض سے لکھا۔ نذیر احمد کے بعد کئی مصنفین نے اردو ناول کو عورتوں کی تعلیم کا ایک موثر ذریعہ بنایا، ان ناولوں کے ذریعہ جہاں ایک طرف تعلیم کے فوائد سے انھیں روشناس کیا گیا تو دوسری طرف علمی اور معلوماتی مضامین کو قصے میں پرو کر ناول بینوں کے سامنے لایا گیا۔ "بنات النعش" میں نذیر احمد نے اخلاقی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دلائی سائنسی تعلیم کے متعلق معلومات فراہم کیں مثلاً علم جر ثقیل، ریاضی، وزن، زمین کی کشش، ہوا کا دباؤ، مقناطیس اور کشش۔ ۔ ۔ ۔ ۔، زمین کی جسامت، جغرافیہ، کرۂ زمین، سمندر کے فوائد، علم تاریخ اور رسومات، اجرام فلکی اور علم ہئیت کے سلسلے میں معلومات بہم پہنچائی، اس طرح صغریٰ ہمایوں کے ناول "مشیر نسواں" میں انتظام، خانہ داری کی قابلیت، علم جغرافیہ، چمن کا شوق باعث صحت، قریب کے رشتہ داروں میں مناکحت سے آیندہ نسل کمزور ہوتی ہے، اصول حفظان صحت وغیرہ معلوماتی مضامین کا ذکر ملتا ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ناول ہی کو کیوں اس مقصد کے لیے استعمال کیا گیا؟ نذیر احمد نے خود لکھا ہے کہ "ان (عورتوں) کے خیالات کی اصلاح اور ان (عورتوں) کے عادات کی تہذیب ہو اور کسی دلچسپ پیرایہ میں ہو جس سے ان کا دل نہ اکتائے

طبیعت دگھبرائے۔" یہ دلچسپ پیرایہ ناول ہی تھا کیونکہ نذیر احمد اپنے عہد کے مکتبوں اوران کے نصابوں سے اچھی طرح واقف تھے، وہ محسوس کرتے تھے کہ ان کتابوں سے جدید علوم نہیں حاصل کیے جاسکتے تھے خصوصاً لڑکیوں کی حالت تو اور بھی قابل رحم تھی کیونکہ ان کے لیے اسکولوں کے دروازے بند تھے، لہٰذا انھوں نے محسوس کیا کہ ناول کے ذریعے ہی دہلی کے متوسط گھرانے کی لڑکیوں کو ایسی تعلیم دی جاسکتی ہے جس سے ان کی زندگی سنور سکتی ہے۔ صغریٰ ہمایوں نے بھی "مشیر نسواں" کے دیباچے میں ناول لکھنے کے سبب کے ساتھ ساتھ تعلیم نسواں کی اہمیت اور اس کی نشرواشاعت میں خود عورتوں کے مرتبے وغیرہ موضوعات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے:

> "مجھ کو یہ دیکھ کر افسوس ہوتا تھا کہ مردوں کا فرقہ اگرچہ تمام قوم کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے لیکن اس کی توجہ زیادہ تر لڑکوں کی تعلیم اور اصلاح کی طرف مائل ہے..... میری یہ رائے ہے کہ عورتیں اپنا تمام کام مردوں پر نہ چھوڑیں بلکہ خود اپنی ہی تعلیم کی فکر میں مشغول ہوں اور ایسے ذرائع بہم پہنچائیں جو حصول تعلیم میں مدد دینے والے ہوں۔ آج کل تعلیم نسواں جن ابتدائی حالت میں چھوڑ دی جاتی ہے ایک خطرناک اثر رکھتی ہے کیونکہ خیالات کی اصلاح کے بغیر صرف آشنا ہوجانا اخلاق کے لیے مفید نہیں ہے افسوس ہے کہ ہم لوگوں کی بدقسمتی سے اردو زبان میں اخلاقی تعلیم اور عام معلومات کا ذخیرہ اس قدر کم ہے کہ وہ عام طور پر لڑکیوں کے ہاتھ نہیں پہنچتا ہے جو اپنا کچھ وقت مطالعہ میں صرف کرنا چاہتی ہیں..... میں نے ان کو ناول کے پیرایہ میں لکھنا شروع کیا ہے۔"

پھر اسی قسم کی بات کا اظہار محترمہ والدہ سلیمان ہارایٹ لانے بھی اپنے ناول "اصلاح النساء" کے دیباچے میں کیا ہے:۔

"ان باتوں کو نصیحت کے طور پر لکھنا میری حیثیت پر زیبا نہیں
بلکہ ان باتوں کو قصہ کے پیرایہ میں لکھنا ہر طرح مناسب ہوگا۔"

غرض ان باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ناپختہ ذہن کو ایسے دقیق مسائل کی طرف متوجہ کرنے کے لیے عام فہم اور دلچسپ پیرایہ استعمال کیا گیا جسے کہانی یا ناول کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ انسان ازل سے قصہ گوئی و قصہ خوانی کا شوقین رہا ہے، کہنے سننے کا شوق ہی قدیم انسانوں کے آپس میں مل بیٹھنے کا سبب ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ عورتوں کو تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کے لیے ہلکے پھلکے قصوں کا سہارا لیا گیا کیونکہ اس وقت عورتوں کی ذہنی صلاحیت کسی سنجیدہ اور خشک مضامین کے اہل نہ تھی، اگر اسی مقصد کے حصول کے لیے لمبے چوڑے مضامین یا تقاریر کا سہارا لیا جاتا تو شاید اتنی کامیابی حاصل نہیں ہوتی کیونکہ اسے عورتیں اپنے اوپر لادی جانے والی چیز سمجھ کر اس سے گھبراتیں، کتراتیں اور کنارہ کشی اختیار کرنے لگتیں لیکن جب انھیں باتوں کو قصے کی شکل میں انسانی کرداروں کے ذریعہ ان کے سامنے پیش کی گئیں تو اس سے عورتیں کافی متاثر ہوئیں، بہتوں نے تو اصغری اور محمودہ کے کردار میں خود کو ڈھالنے کی کوشش کی، چنانچہ "جب نذیر احمد کا ناول "مراۃ العروس" پہلی بار شائع ہوا تو اس قدر مقبول ہوا کہ ایک عرصے تک لوگ اصغری اور اکبری کے مکان تلاش کرتے پھرتے۔"[1]

اس طرح انیسویں صدی کے آخیر اور بیسویں صدی آغاز کے درمیان ناول نگاروں نے تعلیم نسواں کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ نذیر احمد کے بعد حالی، راشد الخیری، بشیر الدین، سرفراز حسین، منشی ہادی حسین، صغریٰ ہمایوں، محمدی بیگم، والدہ سلیمان بیرسٹرایٹ لا، مرزا عباس حسین ہوش، سید احمد دہلوی، سید علی سجاد، سید افضل الدین، صغیر بلگرامی، شاد عظیم آبادی وغیرہ مصنفین نے ناول کے ذریعہ عورتوں کی تعلیم و معاشرتی

[1] ڈاکٹر اشفاق محمد خاں: نذیر احمد کے ناول، دہلی، مکتبہ جامعہ۔ ۱۹۷۹ء، ص ۱۳۳

اصلاح کی کوششیں کیں ۔ایک طرف تو انھیں اکتسابی تعلیم کے شوق کو بڑھانے، نئے نئے علوم سیکھنے کی ترغیب دی تو دوسری طرف رچی بسی ہوئی سماجی خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً بچپن کی منگنی، بے جوڑ شادی، شادی بیاہ کی فضول رسمیں، ضعیف الاعتقادی یعنی جن کھیلنا، پیر کا آنا، مزار کی خاک چھاننا وغیرہ، پھوہڑپن، فضول خرچی، قرض کی بری عادت وغیرہ کے خلاف جہاد کیا اور یہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کی کہ تعلیم ہی وہ حربہ ہے جس سے ان ساری برائیوں کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے۔ تعلیم انسانی ذہن کو بالیدگی اور عقل کی روشنی عطا کرتا ہے۔ ان مصنفین نے اپنی تحریر کے ذریعہ یہ بھی سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ تعلیم کسی مخصوص طبقہ اور مخصوص جنس کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ سب کے لیے یکساں ہے۔ عورتیں اس کی زیادہ ضرورتمند ہیں کیونکہ آنے والی نسل کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری انھیں پر ہے مسلمان گھرانوں میں ان ناولوں کو بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا تھا۔ اس بات کا ثبوت ہمیں اس وقت کے لکھے گئے ناولوں سے بھی ملتا ہے۔ مثلاً مولوی شیخ احمد علی صاحب کاکل اپنے ایک ناول "کلثوم" میں یوں رقمطراز ہیں :۔

> "کلثوم علی الصبح نماز پڑھ کر مریضوں اور محتاجوں کی صحت اور فلاح کے لیے دعا کرتی ..... مغربین سے فرصت کرکے اپنے چوکے پر جا بیٹھتی اور لڑکیوں کو اور اپنی پھوپھی کو تعلیم نسواں کے متعلق کتابیں پڑھ پڑھ کر سناتی، کبھی سید علی محمد صاحب شاد عظیم آبادی کی صورۃ الخیال ..... ہئیت المقال کی جلدیں، کبھی سید عباس حسین صاحب ہوش لکھنوی کا افسانہ نادر جہاں، المعروف بہ عریضہ طاہرہ، کبھی حافظ نذیر احمد صاحب دہلوی کی 'مراۃ العروس' کی جلدیں، کبھی مولوی محمد حسین صاحب آزاد کی 'آب حیات' (تذکرہ شعراء)، کبھی خواجہ الطاف حسین حالی صاحب پانی پتی کی مسدس، مناجات بیوہ اور شکوۂ ہند، کبھی راجہ شیو پرشاد بنارسی کی

گلاب چنبیلی وغیرہ، کبھی مولوی عبدالحلیم صاحب شرر کی دلگداز کی جلدیں میں سے وہ منتخب مضامین جو حد سے زیادہ موثر ہیں اور عاشقانہ نہیں ہیں اور ملک العزیز ورجینا، منصور موہنا، حسن انجلنا کے تاریخی رزم اور (ہم نہایت مسرت اور فخر کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ) کبھی کبھی احمد علی کاآمل منیجر "جام جم" کی مترجم کتاب اندرا اور مولانا اکمل کی نوٹ بک میں سے پاربتی اور رادھارانی نہایت شوق اور جوش سے پڑھی جاتی تھی[۱]۔"

ان کے علاوہ بھی اکثر ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں پچھلے ناولوں خصوصًا نذیر احمد کے ناولوں کا تذکرہ کسی نہ کسی طور پر ضرور ملتا ہے۔ یہ مسلّمہ حقیقت ہے (اور مندرجہ بالا اقتباس سے بھی ظاہر ہوتا ہے) کہ اس زمانے میں پڑھے لکھے گھروں میں ان ناولوں کو اہمیت حاصل تھی، لوگ اسے وسیع پیمانے پر پڑھتے اور سنتے، لہٰذا اس کے اثرات بھی کم و بیش اسی پیمانے پر ہوئے۔

---

[۱] شیخ احمد علی صاحب کاآمل۔ "کلثوم" لکھنؤ شام اودھ۔ ۱۹۰۲ء

اصغر علی انجینئر

غالب کی شاعرانہ عظمت

غالب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ غالبیات کے میدان میں کوئی نئی راہ پیدا کرنا بڑا مشکل کام ہے لیکن شاعرانہ عظمت کا یہ تقاضہ ہے کہ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ عظیم شاعری کے نئے نئے نقطے ہم پر کھلتے رہیں۔ ظاہر ہے کہ قاری کا شعور اس کے اپنے دور کی پیداوار ہوتا ہے اور ماضی کو وہ اپنے موجودہ شعور کی مدد سے سمجھنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں اپنے سے ماقبل دور کے ادب کو پرکھنے کے پیمانے بدل جاتے ہیں۔ ہم اپنے نئے شعور کو ماضی میں پروجیکٹ کرتے ہیں۔ غالب کی شاعری بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

عظیم ادب جہاں اپنے دور کی سچائیوں کو منعکس کرتا ہے وہاں وہ اپنے دور سے ماورا بھی جاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ادب میں اپنے دور سے ماورا جانے کی صلاحیت نہ ہو تو وہ عظیم ادب کہلانے کا مستحق ہی نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ یونانی ادب آج تک ہمیں متاثر کرتا ہے۔ ہم یہاں اختصار کے ساتھ اس بات پر روشنی ڈالیں گے کہ ماورائیت کے عناصر کیا ہیں تاکہ ہم کسی تخلیق کو ماورائیت کے ان عناصر کی روشنی میں جانچ سکیں۔

ماورائیت کا سب سے اہم عنصر انسانی آئیڈیل ہے۔ عظیم ادب کی تخلیق کے لیے کچھ آدرش جو فوری اور موجودہ حالات سے آگے لے جانے والے ہوں بے حد ضروری ہیں تخلیق کار ان آدرشوں کو اپنا نصب العین بناتا ہے۔ لیکن ایک عظیم تخلیق کار کے لیے انھیں اپنا نصب العین بنا لینا کافی نہیں ہے۔ اس سے میکانکی قسم کا ادب پیدا ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ عظیم ادب اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے جب شاعر یا ادیب ان آدرشوں سے اتنا وابستہ ہو کہ وہ اس کی شخصیت کا جزو بن جائیں اور یہ جذباتی وابستگی اس میں ایک تڑپ پیدا کر دے۔ دوسرے لفظوں میں

یہ وابستگی محض شعوری سطح تک محدود نہ رہتے ہوئے اس کے لاشعور کی گہرائیوں تک اُتر جائے اسی صورت میں یونگ کے لفظوں میں وہ اس کے اجتماعی لاشعور — Collective Consc iousness۔ کا حصہ بن کر اس کا زندگی کی طرف رویہ طے کرے گی۔

ہم نے عام طور پر وابستگی (کمٹ منٹ) کے معنی کو بہت محدود قرار دے دیا ہے۔ اگر وابستگی کسی فوری پروگرام، چاہے وہ پروگرام اپنی فوریت کے اعتبار سے کتنا ہی ضروری اور مفید کیوں نہ ہو سے ہو تو اس میں ماورائیت کی خاصیت پیدا نہیں ہوسکتی بلکہ عین ممکن ہے کہ یہ موقع پرستی کی حدوں کو چھونے لگے۔ ایسی وابستگی اکثر ادب کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے اور اس کی منفی قدر کا تعین کرتی ہے۔

ماورائیت کا دوسرا اہم عنصر تناؤ کی وہ شدت ہے جو فن کار موجود اور آئیڈیل REAL AND IDEAL کے درمیان پیدا کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ یہ تناؤ جتنا شدید ہوگا فن پارے میں ماورائیت کا احساس بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا اور قاری پر اس کا اثر بھی۔ ظاہر ہے تناؤ کی یہ شدت وابستگی کے میکانکی تصور سے پیدا ہوسکتی ہے نہ فوری قسم کے مقاصد سے۔ فن پارے میں اس تناؤ کی شدت جتنی زیادہ ہوگی قاری میں اپنے ماحول سے بے اطمینانی بھی اتنی ہی شدت سے پیدا ہوگی اور فن پارہ نیا سماجی شعور بخشنے میں اتنا ہی کامیاب ہوگا۔

ماورائیت کا تیسرا اہم عنصر موجود حقیقت اور بالقوۃ امکانی حقیقت کا فرق ہے یعنی difference between actual and potential ہمیں یہاں Ideal and potential کا فرق مدنظر رکھنا چاہیے۔ ہر آدرش Ideal امکانی حقیقت POTENTIAL تو ہوتا ہے لیکن ہر امکانی حقیقت کا کسی خاص آدرش کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے۔ دوسرے فن پاروں کے مقابلے میں شاعری میں امکانی حقیقت کی صلاحیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی ایک وجہ شاعری میں علامتوں کا استعمال بھی ہے۔ اگر علامتیں ہمہ جہتی اور موجودہ حقیقت کے اعتبار سے مبہم ہوں تو ان کی امکانی صلاحیت اتنی ہی زیادہ ہو جاتی ہے۔ امکانات موجودات سے آگے کی شئے ہیں اور اسی لیے یہ ماورائیت کا بہت اہم عنصر ہیں۔ ہر عظیم شاعری میں امکانی قوت کا عنصر ہوتا ہے۔ اگر شاعری میں ابہام اور امکان کے عناصر

صحیح توازن کے ساتھ شامل ہو جائیں تو اس میں بے پناہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

جہاں ہم ماورائیت کے ان عناصر کو واضح کر رہے ہیں وہاں ایک اور بات کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے۔ فن پارے کی عظمت کے لیے مجرّد آدرش یا مجرّد ماورائیت Abstract Ideal یا Abstract transcendence زیادہ مددگار ثابت نہیں ہوتی۔ اس طرح تو فن پارے کا زندگی کے حقائق سے رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ یہ رشتہ تو بہرحال قائم رہنا ہی چاہیے۔ مصوری میں بھی تجریدیت کی گنجائش زیادہ ہونے کے باوجود ایک حد تک پہنچنے کے بعد بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ چنانچہ ہم جدید مصوری میں داغ دھبّوں والی مصوری اور ایکشن پینٹنگ کے حشر سے اچھی طرح واقف ہیں۔

آئیے، اب ہم غالبؔ کی شاعری میں ماورائیت کے عناصر سے بحث کریں۔ شاعرانہ عظمت کی ماورائیت کے علاوہ بھی دوسرے عناصر ہیں جن پر ہم بعد میں روشنی ڈالیں گے جیسا کہ ہم جانتے ہیں غالبؔ خود اس بات کا شعور رکھتے ہیں کہ وہ گلشن ناآفریدہ کے عندلیب ہیں اور ان کا یہ گلشن ناآفریدہ ظاہر ہے کہ موجودہ حقیقت سے ماوراہے اور مستقبل کے امکانات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ گویا کہ غالبؔ شعوری طور پر بھی ماورائیت کے عنصر کو اپنی شاعری کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ماورائیت کے لیے یا دوسرے لفظوں میں موجود سے زیادہ اطمینان بخش مستقبل کی طرف جانے کے لیے آدرش ضروری ہوتے ہیں اور یہ آدرش زندگی کا رویہ اسی وقت بن پاتے ہیں جب ان سے وابستگی جذبات کا حصہ بن کر تڑپ پیدا کرنے لگے۔ غالبؔ اسے اپنی مخصوص زبان میں دل کو آتش کدہ ہونا کہتے ہیں۔ ؎

ہے ننگِ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

غالبؔ اس نفس کو بھی عارِ دل سمجھتے ہیں جو آذر فشاں نہ ہو۔ یہاں لفظ آذر بھی بڑا بامعنی ہے۔ آذر کو وہ ایک علامت کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ آذر سنگ تراش تھے اور سنگ تراش اپنے فن سے پتھر کے ٹکڑے کو تراش کر نئی نئی امکانی صورتیں پیدا کرتا

ہے۔ وہ پتھر کے ٹکڑے یعنی موجود حقیقت سے مطمئن نہیں ہوتا اور اس سے ماورا جانا چاہتا ہے۔ غالب تو ہر نفس کو آذر فشاں بنانا چاہتے ہیں۔ اس سے ہم اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ غالب کس قدر اپنی شاعری میں ماورائیت کے قائل ہیں اور اس سے اتنی گہری جذباتی وابستگی رکھتے ہیں کہ اپنے دل کو آتش کدہ بنا دیتے ہیں جو اقبال کے یہاں خونِ جگر ہے وہ غالب کے یہاں آتش کدہ ہے۔

غالب جس گلستان کی خواہش رکھتے ہیں وہ خواہش اتنی شدید ہوتی ہے کہ دل حرارت کدہ بن جاتا ہے۔ واقعی غالب کی تمنّا کا جوش اور مستقبل کے گلستان (جو آج کے حالات سے ماورا ہے) کے تماشے کی آرزو قابلِ دید ہے۔ ؎

بیاؤ جوشِ تمنائے دیدنم بنگر چو اشک از سرِ مژگاں چکیدنم بنگر
اگر ہوائے تماشائے گلستاں داری بیاؤ عالمِ در خوں تپیدنم بنگر

ماورائیت سے تو شاعری میں عظمت کا پہلو پیدا ہوتا ہی ہے لیکن اگر اس کے حصول کے لیے اپنے آپ کو ہر خطرے میں ڈالنے کا حوصلہ بھی بدرجۂ اتم موجود ہو تو وہ شاعری واقعی عظمت کی اعلیٰ ترین بلندیوں کو چھونے لگتی ہے۔ ؎

بہ ذوقِ رہروی آنرا کہ خار خارے نیست مرو بہ کعبہ اگر راہ ایمنی دارد

عظیم شاعری، بلند حوصلہ شاعری ہوتی ہے محض رونے بسورنے کی نہیں۔ حالانکہ یہ بھی زندگی کی حقیقت ہے۔ یہاں بحث شاعری کے مختلف پہلوؤں سے نہیں ہے نہ اس بات سے کہ شاعری کیا ہے، یہاں بحث عظیم شاعری کے اہم عناصر سے ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حوصلہ اور عزم بخشنے والی شاعری محض سوگوارانہ شاعری سے زیادہ عظیم ہوتی ہے حالانکہ مؤخر الذکر شاعری ہمارے جذبات کو چھوتی ہے۔ اگر موجود سے ماورا جانے کو ہم شاعرانہ عظمت کا بنیادی عنصر قرار دیتے ہیں تو ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ بلند حوصلگی بھی شاعرانہ عظمت کے لیے ضروری ہے کیونکہ موجود میں انسان کے لیے تحفظ کا احساس ہوتا ہے اور ماورائیت نامعلوم ہے اور عدم تحفظ کا احساس پیدا کرنے والی۔ اس لیے اس کا رخ کرنے کے لیے بڑے حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔

غالب ایک جاگیردارانہ معاشرے کی پیداوار تھے۔ نئے دور کی انھوں نے کلکتے میں ایک ہلکی سی جھلک ہی دیکھی تھی لیکن اس کے متعلق یہ کہنا دشوار ہے کہ وہ ان کے شعور میں کس حد تک رچ بس گئی ہوگی۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ وہ جاگیردارانہ معاشرے میں پروان چڑھے اور اسی معاشرے میں ان کی آنکھیں بند ہوئیں۔ جاگیردارانہ معاشرے میں ٹھیراؤ ہوتا ہے اور کسی بھی تبدیلی یا ماورائیت کی خواہش کو بری نظروں سے دیکھا جاتا ہے Statusquo باموجود کو خدا کی نعمت تصور کر کے اسے قائم رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔

مارکس کی یہ بات بھی بالکل سچ ہے کہ ہمارے وجود سے ہمارا شعور طے پاتا ہے نہ کہ ہمارے شعور سے ہمارا وجود۔ غالب کا شعور بھی ان کے اپنے جاگیردارانہ معاشرے میں وجود سے متاثر ہوا۔ لیکن ہمیں یہ ذہن نشین کرنا چاہیے کہ مارکس نے اپنی دوسری تحریروں میں اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ انسان کے شعور اور عمل میں ایک جدلیاتی رشتہ ہوتا ہے۔ انسان میں تخیل کی قوت ہوتی ہے اور اس قوت سے وہ اپنے موجودہ حالات کی پیداوار شعور سے ماورا جانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اسی ماورائی تخیل اور عمل میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے تو وہ اپنے حالات کو بدل بھی سکتا ہے۔ شعور کے رول پر مارکسی ادب میں خاصی بحث ہوتی رہی ہے۔ شعور کا کیا رول ہے؟ کیا یہ محض خارجی حقیقت کا ثبوتیتی Positivistic معنی میں عکس ہے؟ یا شعور کا اپنا ایک جدلیاتی رول ہے جس کے مطابق خارجی حقیقت اس سے متاثر ہو سکتی ہے۔ مارکس کے نزدیک شعور خارجی حقیقت کا منفعل عکس نہیں ہے۔ تخیل اور حقیقت کا ٹھوس اتحاد عمل میں ممکن ہوتا ہے۔

لیکن عام آدمی میں بڑی حد تک تخیل کی قوت کمزور ہوتی ہے اور یہ قوت جتنی کمزور ہوگی اس کا شعور اسی مناسبت سے خارجی حقیقت کا منفعل عکس ہو کر رہ جائے گا۔ کچھ لوگوں میں اس کے برعکس تخیل کی قوت بڑی طاقت ور ہوتی ہے اور ان کا شعور بھی اسی مناسبت سے اپنے حالات سے ماورا جانے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے۔ ایک ریفارمر یا پیغمبر کے یہاں تخیل اور خارجی حقیقت میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور وہ عملی طور پر اپنے سماج کو بدل

دیتا ہے۔ لیکن ایک شاعر کے یہاں یہ اتحاد عمل کی صورت اختیار نہیں کرتا بلکہ محض ایک وژن کی صورت اختیار کرتا ہے جس میں ابہام کا بھی عنصر ہوتا ہے اور ابہام کا یہی عنصر اس میں مزید امکانات کی صورت پیدا کر دیتا ہے۔ امکانات کا عنصر جتنا زیادہ ہوگا شاعرانہ عظمت اتنی ہی زیادہ ہوگی۔

غالبؔ جاگیردارانہ معاشرے کی پیداوار ہونے کے باوجود ان کا شعور خارجی حقیقت کا منفعل عکس نہیں تھا۔ ان کی قوت تخیل ان کے شعور کو اپنے ماحول سے ماورا لے جانے والی تھی۔ لیکن غالبؔ کوئی ریفارمر یا پیغمبر بھی نہیں تھے جو ماورائی امکانات میں سے ایک امکان کا عملی انتخاب کرکے اپنے سماج کو ایک خاص منصوبے کے تحت بدل ڈالتے۔ کسی ایک امکان کو عملی صورت دینا دوسرے امکانات کی نفی کر دینا ہے۔ ریفارمر ٹھیک یہی کرتا ہے (حالانکہ اسی عملی تبدیلی کی انسانی سماج میں بڑی زبردست اہمیت ہے جسے ہرگز ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا) لیکن ایک شاعر کسی ایک امکان کا انتخاب نہیں کرتا اور اس کی ماورائیت میں تمام تر امکانات موجود رہتے ہیں اور کبھی کبھی یہ امکانات اپنی دوسری انتہا کو پہنچ کر محض تجریدی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور حرکتِ محض (PURE MOVEMENT) ایسی ہی ایک تجریدی صورت ہے۔ گویا امکان حرکتِ محض میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

ہمیں غالبؔ کے یہاں کئی شعروں میں اسی حرکتِ محض کی جھلک نظر آتی ہے۔ مثلاً

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

یہاں دشت نوردی وہی امکانات کے صحرا کی دشت نوردی ہے جو حرکتِ محض کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ امکانات کی وہ انتہائی صورت ہے جو کبھی ٹھوس عملی شکل اختیار نہیں کر سکتی۔ اقبالؔ اور غالبؔ میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ دونوں اپنے ماحول سے ماورا جانا چاہتے ہیں لیکن اقبال اپنے ماورائی مستقبل کا ایک خاص بلو پرنٹ لیے ہوئے ہیں اور اس طرح وہ ایک حد تک مستقبل کے کئی امکانات میں سے ایک امکان کا انتخاب کر لیتے ہیں لیکن اس کے برخلاف غالبؔ اس قسم کے انتخاب سے اپنا دامن بچاتے رہتے ہیں۔ ان کا اپنا رویہ

تو یہ ہے کہ ع وہ ہر ایک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا
ان کا تحرک کا نظریہ ایک اور شعر میں یوں بیان ہوتا ہے۔ ؎

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے، ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ غالب کے یہاں ماورائیت اپنی انتہائی صورت یعنی حرکت محض کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے کلام کو ٹھہرے ہوئے اور جامد جاگیردارانہ معاشرے میں وہ قدر و منزلت حاصل نہ ہو سکی جو انھیں حاصل ہونا چاہیے تھی۔ اسی لیے انھیں یہ کہنا پڑا کہ ؎

ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
ہوں میں کلامِ نغز ولے ناشنیدہ ہوں

امکانات کا تصور چھوٹا دماغ نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے تو موجودہ حقیقت ہی ان امکانات کی انتہا ہوتی ہے لیکن دیدۂ بینا کی بات ہی اور ہے۔ ؎

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا

دیدۂ بینا فکر کی گہرائیوں اور سماج اور تہذیب کے پیچیدہ عمل کے صحیح عرفان سے پیدا ہوتا ہے۔ بغیر ان ذہنی صفات کے موجود سے ماورا کی طرف جانا ممکن نہیں ہوتا اور انسانی ذہن صحیح معنی میں فکر کی عظمتوں کو ہر قسم کی ادّعایت اور اذعانیت سے آزاد ہو کر ہی چھو سکتا ہے۔ جاگیردارانہ معاشرے میں ذہنی جمود کا ایک مظہر مذہبی ادعایت ہوتا ہے۔ اس کی تنقید یا توڑ بڑی جرأت چاہتا ہے، غالب بڑی جرأت مندی سے مذہبی ادّعایت اور کٹرپن پر بھرپور وار کرتے ہیں۔ ؎

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنّا
واماندگیِ ذہن تراشے ہے پناہیں

دیر و حرم کو واماندگیِ ذہن کی پناہیں قرار دینا اور انھیں آئینۂ تکرارِ تمنّا کہہ کر ذہنی

جمود کی علامت قرار دینا جہاں بڑی جرأت کا کام ہے وہاں بڑی بیدار مغزی کا بھی ثبوت ہے ظاہر ہے جاگیردارانہ معاشرے میں دیر و حرم صحت مند اقدار کی نمائندگی کرنے کے بجائے ذہنی جمود کی علامتیں بن جاتے ہیں جہاں تھکے ہوئے ذہن نیا فیضان حاصل کرنے نہیں بلکہ تلاش و جستجو کے امکانات سے گھبرا کر اور موجودہ تلخ حقائق کے سامنے ہتھیار ڈال کر پناہ لینے آتے ہیں۔ اگر انسان کو موجودہ حالات سے ماورا جانا ہے تو اسے ان پناہ گاہوں سے آزاد ہو کر فکری آزادی کے خطرے مول لینا ہوں گے، یہی انسان کی ترقی کی ضمانت ہے۔

ارباب غفلت اذعانیت کے نشے میں اونگھتے رہتے ہیں۔ ان کے سکون پر گھڑی بھر کے لیے رشک تو کیا جا سکتا ہے لیکن یہ سکون سماج کو جامد رکھنے والا سکون ہے ماورائیت کے لیے تو بڑے پیچ و تاب کی ضرورت ہے اور یہی پیچ و تاب حرکت، تبدیلی اور ترقی کی طرف لے جانے والا ہے۔ ؎

رشک ہے آسائش ارباب غفلت پر اسدؔ
پیچ و تابِ دل نصیبِ خاطر آگاہ ہے

فکری بلندی چونکہ ماورائیت کے لامحدود امکانات کی طرف لے جانے والی ہوتی ہے یہ تنگ نظری انسان کو نجات بخشتی ہے۔ غالب کے یہاں ایمان بالغیب کی تعبیر ہی ان لامحدود امکانات پر ایمان ہے جو موجودہ حالات میں ہماری آنکھوں سے اوجھل ہیں۔ تنگ نظری موجود کو آخری حقیقت سمجھ کر اس میں الجھے رہنے کا نتیجہ ہے۔ ہم ان لامحدود امکانات کو قطعاً نظر انداز کر دیتے ہیں جو اس کے ماورا پائے جاتے ہیں۔ اگر ہم ایمان بالغیب کے اس معنی میں قائل ہو جائیں تو تفرقہ پرستی سے آزاد ہو سکیں گے کیونکہ ہم نے مسمّیٰ کو چھوڑ کر اسماء کو ہی حقیقت سمجھ لیا ہے۔ ہم ناموں کے چکر میں پڑ کر اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں جو ان ناموں کے ماورا اپنے تمام امکانات کے ساتھ موجود ہے۔ ؎

ایمان بغیب تفرقہ ہا رفت از ضمیر
زاسماء گذشتہ ایم و مسمّیٰ نوشتہ ایم

پھر فکری آزادی موجود پر بھروسہ وار کرتی رہتی ہے کیونکہ موجود تمام آئندہ امکانات

ی مکمل نفی ہے۔ جب تک موجود کو مسمار نہ کیا جائے، نئے نئے امکانات وجود میں نہیں آسکتے اور یہ عمل بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہنا چاہیے، چاہے موجود میں کتنا ہی تحفظ کا احساس پیدا کرنے والا اور آسائشوں کی ضمانت دینے والا ہی کیوں نہ ہو۔ تحفظ کی ضمانت اور آسائشوں کا احساس دوسرے امکانات کی راہ میں زبردست رکاوٹ بن جاتے ہیں اسی لیے غالب عشق ویراں ساز کو رونق ہستی قرار دیتے ہیں۔ ؎

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں سازے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

گویا غالب کے نزدیک ماورا جانا رونق ہستی کو برقرار رکھنا ہے اور اس رونق ہستی کا سارا دار و مدار موجود کو مسمار کرنے کا عشق جنون کی حد تک پیدا کرنے پر ہے۔ میرے خیال سے عالمی ادب میں اس سے بڑھ کر Anti-Statusquoist رویے کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ اگر غالب کے رویے کو کچھ حد تک بھی زندگی میں اپنا لیا جائے تو کسی بھی اسٹبلشمنٹ سے مفاہمت اور خصوصاً ایسے اسٹبلشمنٹ سے مفاہمت جو ظالمانہ ہو، انسان دشمن ہو، ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہو اور وضع موجود کا ضامن ہو، ناممکن ہو جائے۔ لیکن غالب کے یہاں بھی یہ ذہنی رویہ ہی رہتا ہے لیکن اس رویے کی بھی اپنی اہمیت ہے کیونکہ یہ زندگی کو برتنے کا ایک صحت مند نظریہ دیتا ہے۔

غالب کے یہاں ایک اور اہم بات ہمیں نظر آتی ہے۔ وہ زندگی کے منفی امکانات کی بھی انتہا تک پہنچنے کی بات کرتے ہیں اور ان منفی امکانات سے بھی ایک جذباتی وابستگی پیدا کر لیتے ہیں۔ ؎

میرے غم خانے کی جب قسمت رقم ہونے لگی — لکھ دیا منجملۂ اسباب ویرانی مجھے
گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا — بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا
ہے موجزن اک قلزم خوں کاش یہی ہو — آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

منفی رویے کے انتہائی امکانات کو قبول کرتے ہوئے بھی غالب زندگی اور زمان و مکان کی حقیقت سے جدیدیوں کی طرح انکار نہیں کرتے نہ ہی اپنی شاعری کو اپنی ذات کی خول میں

بند کرتے ہیں۔ زندگی کی طرف ان کا رویہ مثبت ہی رہتا ہے۔ ان کے یہاں غم کی وقعت "بیش از یک نفس" نہیں ہے اور وہ شمع ماتم خانہ بھی برق سے روشن کرنے کے قائل ہیں۔ دوسری طرف وہ "سراپا رہنِ عشق" اور "ناگزیر الفت ہستی" ہو کر "برق کی عبادت" کرتے ہیں اور حاصل کا افسوس۔ اس طرح غالب دنیا کے منفی اور مثبت پہلوؤں کے انتہائی امکانات سے آنکھیں ملاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ دنیا ان کے لیے "محشرِ خیال" بن جاتی ہے اور اس "محشرِ خیال" دنیا کے متعلق وہ کہہ اٹھتے ہیں۔ ؎

یارب ہمیں تو خواب میں بھی مت دکھائیو — وہ محشرِ خیال کہ دنیا کہیں جسے

اس محشرِ خیال کے تصور کے لیے ـــ جو انتہائی امکانات کی پیداوار ہے ـــ بھی بڑا ذہن چاہیے۔ معمولی ذہن اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس محشرِ خیال دنیا میں غالب اپنی آرزوؤں ـــ وہ پایۂ تکمیل کو پہنچے یا نہ پہنچے ـــ کو بھی بڑی اہم سمجھتے ہیں کیونکہ آرزوئیں ہی انسان کو اپنے موجودہ حالات سے ماورائے جاتی ہیں۔ اسی لیے وہ انجمنِ آرزو سے باہر سانس لینے کے قائل نہیں ہیں اور جب خدا ان سے گناہوں کا حساب طلب کرتا ہے تو انھیں بے اختیار اپنی حسرتوں کے داغ کا شمار یاد آجاتا ہے۔

وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آرزوئیں اپنے ساتھ مایوسیاں بھی لاتی ہیں۔ آرزوئیں زندگی کو مالامال کرنے کی طرف راغب کرتی ہیں تو مایوسیاں انسان کو نفی زندگی کی طرف مائل کرتی ہیں لیکن غالب ان آرزوؤں اور مایوسیوں میں گھر کر بھی زندگی کرنے کی راہ پیدا کر لیتے ہیں۔ ؎

جاں را دبغم غالب خوشنودیٔ روحش را
در بزمِ عزا مے کش در نوحہ غزل خواں شو

وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ صحرا کو گلستاں بنانے کے لیے خونِ دل میں آغشتہ ہونا پڑتا ہے

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم

خواجہ عبدالغفور

ہنسی ہنسی میں

امریکا جانے کا موقع ملا تو امریکی معاشرہ اور وہاں کے سماج میں مزاح اور ظرافت ڈھونڈھنے سے پہلے سوچا کہ وہاں کے مزاح نگاروں سے مل کر ان کی سوجھ بوجھ سے فائدہ اٹھاؤں۔ رسل، بیکر، سین فورڈ ٹری ورٹن، مارکس، رزوِن، گیری لاؤٹنس، فرینک لا کا وِلز، آرٹ بوخا والڈ، لیرائے نائی مین، آرتھر بلاخ، وغیرہ مشہور و معروف شخصیتیں ہیں۔ موخرالذکر نے پارکنسن لا کی طرح مرفی لا بنایا ہے، ان کے نظریے کچھ اس طرح کے ہیں:۔

— اگر سارے کام بگڑ جائیں اور ذمہ دار شخص مسکراتا رہے تو سمجھ جایے کہ اس نے کسی اور کو موردِ الزام قرار دینے کے لیے چُن لیا ہے۔

— اگر کوئی کام بگڑ جائے تو اس کو سدھارنے کی کوشش اس کو بدتر کر دی ہے۔

— جو آدمی خود کچھ نہیں کرتا اس کے لیے دنیا میں کوئی بھی کام مشکل یا ناممکن نہیں ہوتا۔

— کسی مسئلہ کا حل ڈھونڈھتے وقت اگر اس کا حل پہلے سے معلوم ہو تو سہولت ہوتی ہے۔

— مسائل کا سلجھنا ان کی نوعیت ہی بدل ڈالتا ہے اور نیا مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے۔

— مخالف کو ہم خیال نہ کر سکو تو اس کو الجھن میں ضرور ڈال دو۔

— بے وقوف سے بحث اور حجت نہ کرو، لوگ اس میں اور تم میں فرق نہیں کریں گے۔

— دوست آتے جاتے رہیں گے لیکن دشمن ڈٹے رہیں گے۔

— دشمنوں کی کمی ہو تو دوستوں سے مہربانی کرتے رہیے۔

— جو کچھ بگڑنا ہے وہ ضرور بگڑے گا اور وہ بھی بگڑے وقت میں۔

۲

گیری پول اور وینس ڈونا ٹو ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے نہایت ہی مقبول کامیڈین ہیں انھوں نے بیڑا اٹھایا کہ امریکیوں کو گدگدا کر ہنسا ہنسا کر صحت مند قوم بنائیں گے۔ ان کی تلقین ہے کہ دن میں ایک بار ضرور ہنسیے اور ڈاکٹر کو دور رکھیے آپ کو دوا کی ضرورت ہے نہ وٹامن کی۔ ان کی ہدایت ہے کہ :۔

—— مضحکہ خیز واقعات وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں ، غافل نہ رہیے ان سے لطف اندوزی کا سلیقہ پیدا کیجیے ۔

—— ایسی صحبت میں رہیے اور اس طرح کا ماحول بنایے کہ ہنسنے ہنسانے کی فضا بنی رہے۔

—— دن بھر کی مصروفیات میں کچھ وقت ہنسنے ہنسانے کے لیے مقرر کر لیجیے جس میں کارٹون، مزاحیہ کتابوں کا مطالعہ کیجیے، ریکارڈ سنیے، ٹی۔وی پروگرام دیکھیے، بچوں کو چھیڑ چھیڑ کر ان سے توتلی باتیں سنیے، ان کی معصومانہ حرکتوں پر ہنسیے۔

—— لوگ جسمانی صحت بنانے کے لیے ورزش کرتے ہیں، کسرت اور یوگ کرتے ہیں تو دماغی صحت کے لیے یہ سب کچھ کیوں نہیں ؟

—— چھوٹی سی چھوٹی غیر اہم بات پر بھی کھل کھلا کر ہنسیے۔ نقلی ہنسی اصلی بن جائے گی۔

ان ہدایات کے ساتھ اعصابی کسرت بھی بتائی گئی ہے۔ اپنی آنکھیں جس قدر کھولی جاسکتی ہیں کھول لیجیے۔

ابرو جتنا اوپر چڑھا سکتے ہیں چڑھا لیجیے ۔

منہ اتنا کھولیے کہ ناک اور ٹھوڑی کے ساتھ جڑی ہوئی رگیں پوری طرح کھل جائیں اپنی زبان ہونٹوں کے باہر نکال لیجیے، اس پوز میں پانچ دس سکنڈ رہیے۔ سارا اعصابی تناؤ دور ہو جائے گا، رگیں اور شریانیں کھل جائیں گی۔ اس طرح نہ صرف ہونٹوں پر ہنسی کھیلنے لگے گی بلکہ سارا چہرہ مسرت و انبساط سے چمک اٹھے گا، دل و دماغ ہشاش بشاش ہو جائیں گے۔

لطائف اور مضحکات کے بیان کے لیے بھی قواعد مرتب کیے گئے ہیں۔

کبھی تمہید نہ باندھیے، تضیع اوقات نہ ہونے دیجیے، معذرت یا انکساری سے شروعات نہ کیجیے، کبھی یہ نہ کہیے کہ شاید آپ نے یہ پہلے سنا ہوگا، سادہ بیانی، خوش کلامی زیادہ مؤثر ہوتے ہیں، ظریفانہ انداز ہونا چاہیے، مسخرے پن سے گریز کیجیے، موقع محل سے مطابقت پیدا کیجیے، تسلسل قائم رکھیے، بیاں کو آگے پیچھے نہ کیجیے۔

انوکھا پن ضروری ہے، گھسا پٹا انداز برداشت نہیں کیا جاتا، مذاقِ سلیم سے لگاؤ ضروری ہے، گہرائی اور سپاٹ پن نہیں چاہیے، ردعمل پر دھیان ضروری ہے اسی مناسبت سے اپنے بیان کو خوشگوار موڑ دیجیے۔

جس طرح موسیقی میں لے تال سُر بنیادی ہیں اور کبھی بدلتے نہیں اسی طرح لطیفہ بھی اپنی جگہ قائم رہتا ہے، ادائیگی بدلتی ہے اس لیے کبھی لطائف وظرافت پرانے نہیں ہوتے۔ سڑک پر پڑے کیلے کے چھلکے پر سے پھسلنا اور گرنا دیکھنے والوں کے لیے ہمیشہ ہنسی کا باعث رہا ہے۔ کسی فلم میں اسی قسم کی منظر نگاری دکھانا تھا۔ سوال یہ تھا کہ سڑک پر چلنے والی موٹی خاتون کو کس طرح پھسلا کر گرایا جائے کہ زیادہ سے زیادہ مضحک نظارہ بنے ایک تجویز تھی کہ سڑک پر پڑا کیلے کا چھلکا پہلے بتایا جائے پھر موٹی خاتون سین پر آئے اور پھسل کر گرے۔ دوسری تجویز تھی کہ پہلے ہی سین میں موٹی خاتون کو بتایا جائے پھر کیلے کے چھلکے پر نظر پڑے اس کے بعد وہ خاتون پھسلے اور ہنسی کا نشانہ بنے۔ ردوقدح کے بعد طے ہوا کہ یہ دونوں بھی سین فرسودہ اور پُرانے ہیں دیکھنے والے بہرحال سمجھ جائیں گے کہ کیا ہونے والا ہے۔ ان میں حیرت اور استعجاب ہوگا نہ غیر متوقع موڑ۔ اس کے بجائے یہ زیادہ موثر ہوگا کہ پہلے اس خاتون کو دکھایا جائے پھر کیلے کا چھلکا، اس کے بعد دونوں ایک ہی سین میں ہوں اور وہ خاتون کیلے کے چھلکے کو دیکھ کر نہایت ہی محتاط طریقے سے بچتے بچاتے نکلنے کی ممکنہ کوشش میں کامیاب ہو اور آگے نکل جائے۔ لیکن ان احتیاطی اور بچاؤ کی تدبیروں میں وہ آگے کے کھڈے کو نہیں دیکھتی اور اس کے اندر گر پڑتی ہے۔ چونکہ کیلے کے چھلکے سے نہیں بلکہ کسی اور وجہ سے گرتی ہے تو وہ زیادہ اور اچانک مضحکہ خیز ہوتا ہے۔

۳

اصلی مزاح اور ظرافت کی تلاش میں مجھے اور بھی تگ و دو کرنی پڑی۔ روزناموں کے مزاحیہ کالم، سنڈے اڈیشن کے مخصوص ذکا ہیے، حسب ذیل عنوانات کے تحت شائع ہوتے ہیں اور بے حد مقبول ہیں :-

CAPITOL PUNISHMENT

WASHINGTON IS LEAKING

GOOPHEYS DON'T PAY TAXES.

ALL PROPHET AND LOSS.

HONEYMOON IS OVER.

PLAYBOY JOKES.

شوخ ننگ اور چنچل۔ ستم ظریفانہ

SICK JOKES

BLACK HUMOUR

BLOODY MARY

SICK QUICKIES

SADISTIC

MUTILATION & DEATH

ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ان کے انداز اور اسلوب اسٹڈی کرنے پڑے اور میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جہاں شئے لطیف کی کمی نہ ہو اور مزاح کی حس موجود ہو، وہاں پر احساس شادمانی اور لطف و لطافت بے حساب پائے جاتے ہیں۔ جغرافیائی حدود، لسانی حد بندیاں مانع ہوتی ہیں نہ دخل انداز، صرف مزاج اور موڈ بدلتے ہیں۔

امریکہ میں نسلی اور عمرانی صفات اور اوصاف کے پیش نظر گھڑے ہوئے لطیفے اور فقرہ بازی سے بھرپور کتابیں معتبر اور نامور پبلشرز دھڑا دھڑ شائع کر رہے ہیں۔

چونکہ امریکہ میں ایسے لوگ ہیں کہ جن کے آبا و اجداد یورپ کے مختلف ممالک سے ہجرت کرکے آبسے ہیں۔ ان کی پشت ہا پشت کی امتیازی خصوصیات اور کردار سے برائیاں اور خامیاں چن کر اور بسا اوقات یوں ہی منسوب کرکے ان کو نشانۂ ملامت بنایا جارہا ہے۔ بالعموم انھیں دماغی اعتبار سے پس ماندہ بتایا جارہا ہے، ان کی ہجو اور مذاق کی جاتی ہے۔ استہزاء اور طنز کے تیر چلائے جاتے ہیں

پلٹزر ایوارڈ حاصل کرنے والی مورخ باربرا ڈبلیو ٹچمن اور دیگر دانشور اس کو ناشائستگی اور بدمذاقی پر محمول کرنے لگے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انسانی اقدار اور آدمیت کی برتری ہر قیمت پر ملحوظ رکھی جانی چاہیے نہ کہ اس کو مبتذل بنایا جائے۔ اس قسم کی کتابوں کی مقبولیت امریکی قوم کی دماغی پستی کی آئینہ دار ہے۔

باربرا ٹچمن کا یہ بھی خیال ہے کہ اسی قسم کی فحش کتابوں کی مقبولیت دماغ کو دھکا لگنے کی وجہ سے ہو سکتی ہے نہ کہ BIGOTRY کہیں کہیں یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان لطائف میں ایک طرح کی جارحیت اور سرپرستی کے علاوہ بیشتر احساسِ برتری اور نسلی امتیاز بھی ہے بالخصوص اس حالت میں کہ یہودیوں کے متعلق غیر یہودی پولش کے تعلق سے غیر پولش کچھ کہے۔ ہمارے ہاں بھی سکھوں کے متعلق کوئی غیر سکھ اس قسم کی حکایتیں گھڑے تو یقیناً قابلِ اعتراض ہو سکتی ہیں لیکن ہمارے بڑے عزیز اور سربرآوردہ سکھ دوست خود ہی اپنے سے منسوب کرکے پُرلطف کہانیاں سناتے ہیں جن میں سب کی جھلک ہوتی ہے لیکن ان کی زبان سے یہ بُرا نہیں لگتا۔

LARRY WILDE نے "پولش جوکس" کے عنوان سے پہلے پہلے اپنی تصنیف پیش کی تو پولش امریکن اخباروں نے سخت احتجاج کیا اور لوگوں سے اپیل کی کہ یہ کتاب نہ خریدی جائے۔ اس کے باوجود اس کتاب کے ۲۸ اڈیشن نکلے۔ نہ صرف یہ بلکہ یہودی، اطالوی فرانسیسی سب ہی کے تعلق سے اس قسم کی تصانیف شائع ہوتی رہیں اور مقبولِ عام ہیں All in the family کے عنوان کے تحت اس طرح کے لطائف ٹیلی ویژن پر بھی دکھلائے اور سنائے گئے۔ کسی قسم کا احتجاج ہوا نہ ان کے خلاف کوئی مہم چلائی گئی۔ Bantam Books

کے ناشر جیک ریمانوز کا تجربہ ہے کہ اس طرح کے نسلی اور عمرانی لطائف زیادہ ہی مقبول اور ہردلعزیز ہو چلے ہیں۔

امریکہ میں ظرافت اور لطافت کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ رسائل میں اس قسم کے عنوانات کے تحت لطائف و حکایات طلب کیے جاتے ہیں :۔

WHEE THE PEOPLE

Rx. Laughter the Best Medicine

Life in the U.S./Life's like that

Tit for Tat/Towards More Picturesque speech

Barbed wires.

Spiced Tongue

Humour in Uniform

Table Talk / Tall Talk

Pardon your Slip is showing.

Points to Ponder
Your favourite joke.
Quoteable Quotes/Campus jokes

College Rags

دنیا بھر کے لوگ امریکہ میں جا بسے ہیں۔ یورپ کے ہر ملک کے باشندوں کی دو تین نسلیں آباد ہونے کے باوجود بھی ان کی امتیازی خصوصیات اب بھی نظر آتی ہیں۔ اسی لیے امریکہ میں عمرانی ETHNIC اور LINGUISTIC لسانی صفات سے متعلق مزاح اور ظرافت چسپاں کی جاتی ہے۔ چنانچہ انگلستان سے آئے ہوئے لوگوں کو سمجھا جاتا ہے کہ اب بھی وہ بات کی نزاکت کو دیر سے قبول کرتے ہیں۔ آئرش نزاع پسند ہوتے ہیں، اسکاٹ بخیل، اطالوی بے ڈھنگے بے قاعدہ، جرمن ہٹیلے کٹر اور سخت گیر ہوتے ہیں۔ پولینڈ والے احمق۔ یہودی کنجوس مکھی چوس زبردست۔ امریکی بونگے بھدے۔ فرنچ، ہوس پرست نفس پرست اور افریقہ سے آکر بسے ہوئے کالے سست اور کاہل۔ امریکہ کے اصل باشندے ریڈ انڈین، عقل کے کورے اور اپنی لٹی ہوئی دنیا میں مگن سمجھے جاتے ہیں۔

اصلی ہندوستانیوں کو یہ سانپوں سپیروں، ہاتھیوں کے دیس والے سمجھتے ہیں اور ان

کے نزدیک ہر ہندوستانی ماہر انجینئر اور ڈاکٹر ہے۔ ان کی خصلتوں اور عادتوں کے متعلق بہت سارے کارٹون بنائے گئے ہیں۔

۴

—— اسکاچ انگریز اور آئرش کی جبلت کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ کسی ٹرین یا بس سے اترتے ہوئے آئرش یہ نہیں دیکھے گا کہ اس نے کچھ چھوڑا تو نہیں وہ سیدھے اپنا راستہ لے گا انگریز البتہ کئی بار اپنے اطمینان کی خاطر ادھر ادھر دیکھے گا کہ اس نے بھولے سے اپنا کچھ چھوڑ تو نہیں دیا۔

اسکاچ آگے پیچھے اوپر متلاشی نظروں سے دیکھے گا کہ کسی اور نے بے خیالی سے کچھ چھوڑا تو نہیں۔

انگریز اور اسکاچ افریقی ملک میں متوطن تھے وہاں ان کی کسی غلطی پر اس علاقہ کے حاکم نے کوڑوں کی سزا تجویز کی۔ کوڑے لگانے سے پہلے انگریز سے پوچھا گیا — تمہاری کوئی خواہش ہو تو بتانا۔ اس نے کہا کہ میری پیٹھ پر کینوس باندھ دینا۔ جب یہی سوال اسکاچ سے سے کیا گیا تو اس نے فرمائش کی کہ — اس انگریز کو میری پیٹھ سے باندھ دینا۔

—— اسکاٹ لینڈ کے کسی دیہات میں ایک انگریز مسافر کی موٹر بگڑ گئی۔ برفباری کی وجہ سے اس کو شب بسیرے کے لیے جگہ ڈھونڈھنے پر ایک چھوٹا سا کنٹری فارم دکھائی دیا۔ اس نے گھنٹی بجائی اور مالک مکان سے رات کے قیام کے لیے پلنگ اور بستر مانگا۔ صاحب خانہ نے کہا — رات کی رات میری لڑکی کے ساتھ بستر پر سو جانا، پانچ پونڈ دینا ہوگا۔ انگریز بخوشی راضی ہو گیا۔ صبح کو پانچ پونڈ ادا کرنے کے بعد چلتے وقت مالک مکان نے پوچھا — آرام سے تو سوئے نا؟

مسافر نے کہا "آرام تو تھا لیکن آپ کی لڑکی کا جسم ٹھنڈا برف جیسا تھا۔"

مالک مکان نے کہا "ہاں، اب ہم اس کو دفنانے جا رہے ہیں۔"

—— عیسائی انگریز، یہودی اور ایک مارمن اپنے اپنے کلیسا اور SYNEGOGUE

ی تعمیر و ترمیم کے لیے چندہ جمع کرنے کے بعد سوچنے لگے کہ آخر اتنی محنت کی ہے تو
ہ اپنا حصہ بھی بطور حق محنتانہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ انگریز نے زمین پر ایک گول چکر بنایا
ور کہا کہ جتنا روپیہ جمع ہے اس کو ہوا میں اچھال دیتا ہوں جو حلقہ کے اندر گرے وہ
رچ کے حساب میں اور جو اس کے باہر آ جائے وہ میرا حصہ۔ تجویز معقول تھی اس پر عمل
یا گیا۔ جرمن نے کہا مجھے بھی یہی منظور ہے البتہ جو دائرہ کے اندر ہو وہ میرا اور جو باہر گرے
وہ خانۂ خدا کے لیے۔

اس طرح سے دونوں نے اپنا اپنا حصہ لے لیا۔ جب یہودی کی باری آئی اس
نے کہا میں سارا روپیہ اوپر اچھالتا ہوں، جتنا نیچے گرے وہ سب میرا۔ خدا کو جو رکھ
لینا ہو وہ ہوا میں ہی اپنا حصہ لے لے اور گرنے نہ دے۔

—— یہودی ٹیکسی میں سفر کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ڈرائیور حواس باختہ ہے اور ٹیکسی
بے قابو ہے۔ اس کے سوال پر ڈرائیور نے بتایا کہ بریک فیل ہو چکے ہیں، وہ کار کو روک
نہیں سکتا۔ یہودی نے چلا کر کہا —— اگر کار نہیں روک سکتے ہو تو ٹیکسی کا میٹر تو روک سکتے ہو۔

—— ایک انگریز لڑکی گھر سے بھاگ کر پولک سے شادی کر لیتی ہے۔ ماں باپ اخبار میں
اشتہار دیتے ہیں —— واپس نہ آؤ تو سب کچھ معاف کر دیا جائے گا۔

—— شادی سے پہلے پولک لڑکا اور لڑکی ماہر جنسیات ڈاکٹر کے پاس جنسی تعلقات
کی معلومات کے لیے گئے۔ اس نے ساری تفصیلات بتائیں، طور طریقے سکھانے کی کوشش
کی۔ لیکن لڑکے کے پلے کچھ نہ پڑا تو ڈاکٹر نے عملی طور پر ساری باتیں بتائیں۔ لڑکے نے
سمجھ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا —— شکریہ ڈاکٹر، اب یہ بتائیے کہ میری بیوی کو مہینہ
میں کتنی بار آپ کے پاس آنا ہوگا۔

—— ایک پولک یوں ہی اپنے آپ ہنس رہا تھا۔ اس کے دوست نے وجہ پوچھی تو
کہا —— مجھے حیرت اور تشویش یہ ہے کہ میری غیر حاضری میں پڑوسی جانسن روز میرے
گھر آتا ہے اور میری بیوی سے پیار کرتا ہے تو دس بیس ڈالر دے جاتا ہے حالانکہ جب
میں پیار کرتا ہوں تو بیوی کو کچھ بھی دینے کی ضرورت نہیں محسوس کرتا۔

____ یونگ نوجوان نے اپنے باپ سے کہا کہ میں اپنے پڑوس میں رہنے والی لڑکی میری سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ باپ نے کہا کہ تم اس سے شادی نہیں کر سکتے، دراصل وہ میری ہی اولاد ہے۔ لڑکا مایوس ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد اس نے ایک اور لڑکی پسند کر کے شادی کی اجازت مانگی۔ باپ نے پھر وہی کہا کہ وہ بھی اسی کی لڑکی ہے اور شادی جائز نہیں ہوگی۔

لڑکے نے بیزار ہو کر ماں کو بتایا کہ وہ جو بھی لڑکی پسند کرتا ہے اس کو بہن بتایا جاتا ہے کیا کرے ماں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ تم کچھ پرواہ نہ کرو جس لڑکی سے چاہو بیاہ کر لو۔ اصل میں تم اس باپ کی اولاد ہی نہیں ہو تو کس بات کی فکر ہے۔

____ چنچل، شوخ اور عاشق مزاج اسپانش لڑکی کی شادی ایک سیدھے سادے لڑکے سے ہوئی سہاگ رات کو اس نے اپنے شوہر سے پوچھا۔ ہماری شادی سے بہت ساروں کے دل ٹوٹ گئے ہوں گے اور وہ تم سے رقابت اور حسد کر رہے ہوں گے۔ لڑکے نے کہا۔ ایسی تو کوئی بات نہیں البتہ اس شہر کے بہت سارے نوجوانوں نے میرا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا ہے۔

____ جرمن شرائنڈر ہوٹل میں کمرہ لینے گیا تو لونج میں ایک خوب صورت چنچل لڑکی نے اپنی دلفریب مسکراہٹ سے اس کو مسحور کیا۔ چھیڑ کر بات کرنے پر یہ طے ہوا کہ دونوں مسٹر اور مسز کے نام سے کمرہ بک کرائیں۔ ایک ہفتہ بڑے عیش و عشرت میں گذر گیا۔ جب یہ جرمن کمرہ بک کرنے لگا تو اس کو دو ہزار ڈالر کا بل دیا گیا۔ اس نے تعجب سے پوچھا کہ چھ دن کے دو ہزار ڈالر؟ ہوٹل کے کیشیر نے بتایا کہ آپ ایک ساتھ تو چھ دن لیکن آپ کی بیوی صاحبہ تو یہاں پر مہینہ بھر سے مقیم ہیں۔

____ جنگ عظیم کے زمانے میں ایک جرمن کو شادی کے دن ہی محاذ جنگ پر جانا پڑا۔ ایک عرصہ کے بعد وہ مختصر سی چھٹی پر لوٹا تو بیوی کے ساتھ پیار کرنا چاہا۔ بیوی نے اس کو روکتے ہوئے کہ وہ مہینہ کے ان دنوں میں ہے کہ جب مجبوری رہتی ہے لیکن نوجوان شوہر کی بے قراری دیکھ کر اس نے بیس ڈالر دیے کہ کہیں باہر جا کر اپنی پیاس بجھالے۔ شوہر گیا اور ہشاش بشاش جلد ہی لوٹ آیا۔ بیوی نے پوچھا کہ اتنا جلدی کہاں معاملہ پٹ گیا؟ شوہر نے بتایا کہ پڑوس باہر ہی مل گئی اور اس نے جب یہ ماجرا سنا تو بیس ڈالر کے معاوضہ میں فوراً راضی ہو گئی۔ بیوی نے انتہائی غیظ و غضب میں کہا۔ تم نے مارجری کو بیس ڈالر دے دیے، اس کا شوہر میرے

پاس آتا ہے تو یعوڈی کوڑی بھی نہیں دیتا۔

____ ایک فرانسیسی کی بیوی کی موت پر اس کے قریبی دوست سے بے انتہا غم واندوہ کا اظہار کیا، اس کو کسی کل چین نہ تھا مسلسل گریہ وماتم کر رہا تھا۔ فرانسیسی نے دلاسا دیتے ہوئے کہا اتنا افسوس نہ کرو دوست میں بہت جلد دوسری شادی کرنے والا ہوں۔

____ ایک اور فرانسیسی کا قصہ ہے کہ جس دن اس کی بیوی کا انتقال ہوا، تجہیز وتکفین کے بعد وہ بہت افسردہ اور ملول تھا۔ اس کے دوست نے تسلی دیتے ہوئے کہا تمہیں بہت جلد کوئی اچھی لڑکی مل جائے گی، مہینہ دو مہینہ میں دوسری شادی کر لینا۔ فرانسیسی نے کہا وہ تو ٹھیک ہے مگر میں آج شام کیسے گزاروں۔

____ ساؤتھ سی آئی لینڈ میں جہاں سب ہی حبشی بستے ہیں، ایک شخص مغربی سفید فام مشنری سے شکایت کرتا ہے۔ ہماری ایک کالی عورت نے گورے رنگ کے لڑکے کو جنم دیا ہے اور یہاں پر تمہارے سوا کوئی اور گورا ہے ہی نہیں۔ تم تو ہم کو نیک رویہ اور اچھی عادتیں سکھاتے ہو اور پھر تم خود ہی ایسی بدکاری کے مرتکب ہوتے ہو؟

کرسچین مشنری اس کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ تم کو سائنس کے اعتبار سے ایسی بہت ساری باتیں اور مثالیں ملیں گی کہ جہاں اس طرح پر قدرت بدل دیتی ہے۔ وہ دیکھو سامنے جو بھیڑوں کا گلہ ہے ان میں سب کی سب سفید بھیڑیں ہیں لیکن ان میں ایک کالا بچہ بھی تو ہے۔

مقامی قبیلہ کا شکایت کرنے والا حبشی سہم کر کہتا ہے

"او۔۔ کے پادری صاحب! آپ میری بات نہ کیجیے میں آپ کی بات نہیں کروں گا۔ راز راز ہی رہیں تو مناسب ہے۔"

____ امریکہ کے ایک اخبار میں اشتہار شائع ہوا:۔

"چار لڑکیوں کے ماں باپ کو اولادِ نرینہ کی خواہش ہے جس کے لیے مشورہ درکار ہے۔"

سینکڑوں خطوط اس کے جواب میں وصول ہوئے۔ مقامی امریکن نے لکھا۔ خاندانی منصوبہ بندی کے کلنک سے رجوع ہوئیے۔

کینیڈین نے لکھا "کوشش کیے جائیے۔"

ہندوستانی نے تجویز رکھی "یوگا کا فائدہ اٹھائیے"

فرانسیسی نے پوچھا "کہیے میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

—— امریکی اور روسی اپنے اپنے ملک کی خوبیاں گنا رہے تھے اور بڑائیاں ہانک رہے تھے۔ امریکی نے کہا کہ ہمارے دیس میں ہر قسم کی آزادی ہے بالخصوص اظہار رائے کے معاملے میں کوئی روک ٹوک نہیں۔ پریذیڈنٹ ریگن کے گھر وہائٹ ہاؤس کے سامنے آپ کھڑے ہو کر اس کو بُرا بھلا کہہ سکتے ہیں کوئی آپ کو روکے گا نہیں۔

روسی نے فی الفور جواب دیا —— روس میں بھی ہمیں پوری آزادی ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی کریملن کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر ریگن کو من مانی اچھی بُری کہیں۔

—— سویڈن میں ایک نہایت ہی غریب اور خستہ حال شخص بھوکوں مر گیا۔ اس کے جاننے والے رئیس پڑوسی نے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم میرا اچھا دوست تھا۔ میں اس کی غربت سے بخوبی واقف تھا مگر وہ اتنا حیادار اور شریف تھا کہ کبھی اس نے کسی قسم کی مالی اعانت نہیں مانگی۔ میں اسی لیے اس کی بہت قدر کرتا ہوں۔

—— اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں ایک اطالوی پر مقدمہ چلایا جا رہا تھا۔ اس سے پوچھا گیا کہ اس نے اپنی بیوی کے عاشق کی جان لینے کی بجائے اپنی بیوی کو کیوں مار ڈالا؟ اس نے بتایا کہ اس کے لیے وقت واحد میں ایک جان لینا آسان تھا بجائے اس کے کہ ہر روز ایک عاشق کا خون کیا جائے۔

—— ایک جرمن اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ کشتی میں سیر کر رہا تھا۔ ندی کا دھارا تیز ہوا تو کشتی ہچکولے کھانے لگی۔ بیوی نے پریشان ہو کر پوچھا کہ اگر یہ کشتی ڈوبنے لگے تو تم بچوں کو بچاؤ گے یا مجھے؟

جرمن مرد کا جواب تھا —— مجھے!

—— دو جرمن آپس میں مذہب اور بائبل کی باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے پوچھا:

"صاف اور صریح طور پر بائبل میں ہدایت ہے کہ اپنے پڑوسی سے پیار اور محبت کا سلوک کرو لیکن میں دیکھتا ہوں کہ آپ کی اور آپ کے پڑوسی جیکسن کی سخت لڑائی ہے؟"

پہلے شخص نے جواب دیا "یہ جنگ تو اسی ہدایت پر عمل کرنے کی وجہ سے ہے۔"
یہ پوچھنے پر کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے تو اس نے بتایا "دراصل بات یہ ہے کہ میں اس ہدایت پر پڑوسی کے بجائے پڑوسن سے محبت کرتا رہا ہوں۔"
—— امریکی ریڈ انڈین لوگوں پر پابندی ہے کہ وہ اپنے ریزرویشن کے اندر ہی رہیں کبھی کبھار وہ باہر جا سکتے ہیں۔ ایک بار میاں بیوی نے دوسری اسٹیٹ کے ایک شاندار ہوٹل میں قیام کیا۔ رات کو شوہر نے بیوی سے پانی مانگا۔ بیوی باہر گئی اور جھلا کر واپس آئی کہ پانی ابھی نہیں ملے گا۔ پانی کے کنویں پر کوئی شخص بیٹھا ہے۔ (باتھ روم کے کموڈ کو وہ پانی کا کنواں سمجھ رہی تھی۔)

۵

امریکہ میں مستقل بسے ہوئے ہندوستانی خاطر مدارات، مہمان نوازی اور میزبانی کی روایت کے لئے مشہور ہیں۔ ہیوسٹن کے امراض قلب کے سب سے بڑے دواخانہ میں ایک پردیسی خاتون کے دل کا ایمرجنسی آپریشن ہندوستانی ڈاکٹر نے کیا جو کامیاب رہا اور یہ خاتون صحت مند ہو کر اپنے دیس کو لوٹنے کے لیے دواخانہ چھوڑنے لگی تو اس نے اخراجات کے سارے بل ادا کرنے کے بعد ہندوستانی ڈاکٹر سے آپریشن کی فیس کے متعلق پوچھا جو کئی ہزار ڈالر ہو سکتی ہے۔ ہندوستانی ڈاکٹر نے اس خاتون کو بتایا کہ وہ خاتون امریکہ میں اجنبی ہے اس لیے اس سے آپریشن کی فیس نہیں لے گا، یہی کافی ہے کہ وہ خاتون اپنے دل میں اس کے لیے جگہ رکھے۔ خاتون نے اظہار تشکر کے ساتھ کہا "ڈاکٹر وہ تو اچھا ہوا کہ دل کا آپریشن ہوا ہے اور جو کوئی زچگی کے آپریشن کا کیس ہوتا تو بڑی مشکل ہوتی۔"
ہالی وڈ کی دنیا ہی نرالی ہے وہاں کا معاشرہ آزاد اور بے باک ہے۔ کسی لڑکے سے پوچھیے کہ "تمہارے باپ نے موٹر کار بدل دی ہے" تو اس سے جواب ملے گا "کار نہیں امیں نے اپنا باپ بدل دیا ہے۔"
ایک لڑکی سے سوال کیا گیا "تمہارے بہن بھائی کتنے ہیں؟" اس نے جواب دیا کہ "بھائی بہن تو ایک بھی نہیں البتہ میری اصلی اور پہلی ماں سے اب چار باپ ہیں اور اسی طرح میرے حقیقی

باپ کی جانب سے تین مائیں ہیں۔

ایک لڑکا اپنے دوست سے پوچھتا ہے "تم نے میرے نئے ڈیڈی کو دیکھا کتنے خوب صورت ہیں؟" دوست کا جواب "ہاں میں اچھی طرح جانتا ہوں وہ پہلے میرے ڈیڈی تھے:

ہالی وڈ کی ایک ہیروئن نے شادی کے بعد اپنے نئے اور تازہ ترین شوہر کے گھر کی دہلیز پار کی اور ادھر اُدھر دیکھ کر پوچھا" یہ گھر سارا فرنیچر زبانس وغیرہ جانے پہچانے اور مانوس لگتے ہیں کیا اس سے پہلے بھی ہماری تمہاری شادی ہوئی تھی؟"

ایک مقبول اور ... دار ایکٹر نے اپنی محبوبہ کو شادی کا پیغام دیتے ہوئے کہا "ڈارلنگ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے شادی کرکے میرے بچوں کی ماں بنا قبول کرو" لڑکی نے کچھ سوچ کر کہا "مجھے منظور ہے۔ مگر پہلے یہ تو بتاؤ کہ تمہارے کتنے بچے ہیں!"

ایک فلمی اداکارہ نے اعلان کیا کہ اس نے اپنے شوہر کو لکھ پتی بنا دیا ہے۔ دوست نے پوچھا "تو کیا وہ پہلے کروڑپتی تھے؟"

فلمی دنیا کے دو دوست باغ میں چہل قدمی کر رہے تھے کہ دو عورتیں آتی دکھائی دیں۔ ایک نے کہا "غضب ہوگیا وہ دیکھو سامنے سے میری بیوی اور میری محبوبہ آرہی ہیں۔ دوسرے دوست نے کہا "اُفوہ، یہی تو میں بھی کہنے والا تھا"

فلمی ایکٹر سے کسی نے پوچھا آج کل تمہارے اور ریٹا کے معاشقہ کا کیا حال ہے؟ اس نے جواب دیا "وہ معاشقہ تو چھ ماہ قبل ختم ہوگیا" "کیوں کیا لڑائی جھگڑا ہوگیا؟ تم لوگ آپس میں ملتے جلتے بھی نہیں!" "نہیں یار! ہم تو ایک ساتھ ہیں، شادی جو کرلی ہے ہم نے"

۶

عمرانی اور لسانی لطائف اور چٹکلوں کے ساتھ ساتھ اب ہم آپ کو امریکہ کے SICK QUICKIES BLACK Humour BLOODY MARY کی اصناف کے کچھ نمونے پیش کرتے ہیں ان کو ہم ستم ظریفی کی صنف قرار دے سکتے ہیں:۔

ایک انگریز خاتون کے شوہر کے انتقال کے بعد اس کی تجہیز و تکفین کے وقت پادری

حسبِ روایت مرحوم کی خوبیاں گِنا رہے تھے کہ وہ کتنے شریف اور نیک شہری تھے، ایک بہترین شوہر بھی تھے اور بہت ساری خوبیوں اور نیک صفات کے حامل تھے۔ جب یہ سلسلہ کچھ دراز ہوگیا اور خوبیوں کی فہرست لمبی ہونے لگی تو بیوہ نے بے چینی اور بیزارگی سے کہا:۔

"کہیں یہ لوگ کسی غلط آدمی کو دفنانے تو نہیں لے چلے ہیں"

افریقی قبیلہ کے ایک سردار کو ایک بدیسی حسین اور جوان لڑکی ملی تو ان کی نیت بدل گئی کہ اس کو کھا لیا نہ جائے بلکہ زندہ رکھ لیا جائے۔ ان کا لڑکا بے حد بھوکا تھا اس نے اصرار کیا کہ فوری اس کو لقمۂ تر بنایا جائے۔ بھوک کے مارے وہ تڑپنے لگا تو باپ نے کہا "اچھا تو جلدی جلدی گھر چلو، اس کو تو رکھ لیں گے اور تمہاری ماں کو آج کھالیں گے"

مدت دراز کے بعد دو دوست آپس میں ملے تو ایک نے دوسرے سے پوچھا "کہو یار! تمہاری اور تمہاری بیوی کی لڑائیاں اب بھی چلتی رہتی ہیں اور اَن بَن اسی طرح ہے؟"

دوست نے کہا "نہیں یار! اب تو لڑائی وڑائی کا سلسلہ ہی نہیں" تو کیا تم دونوں میں مصالحت ہوگئی ہے! جی نہیں، میری بیوی کا انتقال ہوگیا۔

بعداز مرگ آخری رسومات کے بعد بیوہ نے اپنے شوہر کے تابوت کے اندر دیدار کیا تو اس کو لگا کہ مرحوم نیلے سوٹ کو زیادہ پسند کیا کرتے تھے اور اس وقت جو کالا سوٹ ان کے مُردہ جسم پر ہے وہ کچھ کِھلتا بھی نہیں تھا۔ کریاکرم کرنے والوں کے منتظم کو اس نے یہ بات بتائی اور خواہش کی کہ لاش کا کالا سوٹ بدل کر اس کو نیلا سوٹ پہنا دیا جائے۔ مُردہ خانہ کے منتظم نے کہا ٹھیک ہے ویسے ہی کیا جائے گا۔ دس منٹ کے اندر اس نے بیوہ کو بتایا کہ فرمائش کے بموجب اس کا شوہر اب نیلے سوٹ میں دفنایا جائے گا۔ بیوہ نے بدلے ہوئے سوٹ کو دیکھ کر اظہارِ حیرت کرتے ہوئے پوچھا "اتنی جلدی انھوں نے سوٹ کیسے بدل دیا؟" منتظم نے کہا "ہم نے جسم کا سوٹ کہاں بدلا، ایک دوسری لاش جس کے جسم پر نیلا سوٹ تھا اس کے دھڑ کو بدل کر اس کا چہرہ آپ کے شوہر کے جسم پر جوڑ دیا ہے"

شوخ، چنچل اور فلرٹ لڑکی کو قتل کے الزام میں پھانسی کی سزا تجویز ہوئی اور جب اُس کو سولی پر چڑھایا گیا تو اس کی آخری خواہش پوچھی گئی۔ اس نے کہا کہ مجھے برہنہ کرکے پھانسی

دی جائے۔ بہرحال آخری خواہش پوری کر دی گئی اور جب یہ مادرزاد ننگی ہو گئی تو حاکم مجاز نے کہا ۔
کیا حسین جسم ہے۔ لڑکی نے کہا "اب یہ سب تمہارا ہے"

ریسٹورنٹ میں ایک صاحب نے کھانے پینے کی چیزیں آرڈر کرنے کے بعد محسوس کیا کہ وہ تو اپنے دانتوں کا چوکٹرہ گھر پر بھول آئے ہیں اور یہی بات باآواز بلند انھوں نے اپنے ساتھی سے کہی۔ قریبی میز پر بیٹھے ہوئے ایک شخص نے اس کی یہ بات سن کر اپنی جیب سے دو ایک چوکٹرے نکالے اور انھیں پیش کیے کہ اگر وہ فٹ ہوں تو کھانے کے لیے استعمال کریں۔ انھوں نے ان میں سے ایک چن لیا اور فٹ ہونے پر خوشی خوشی کھانے لگے۔ جب بل آیا تو پوچھا "کیا آپ دنداں ساز ہیں" اس شخص نے بتایا۔ "جی نہیں، دنداں ساز نہیں بلکہ گورکن ہوں کفن دفن، تجہیز و تکفین کے ادارے کا منتظم"

۷

فی زمانہ امریکہ کی عورتوں میں یہ احساس اجاگر ہو رہا ہے کہ وہ محض وسیلۂ جنس نہیں ہیں اور نہ ہی دوسری صنف ہیں اور کم تر۔ اب وہ سوچنے لگی ہیں کہ ان کے جسم ہمیشہ بکاؤ نہیں بلکہ ان کی اپنی ملکیت ہیں۔

چنانچہ جنسی معاملات میں بغاوت کی جھلک نظر آنے لگی ہے۔

اب چند لطیفے تصویروں کی زبانی :-



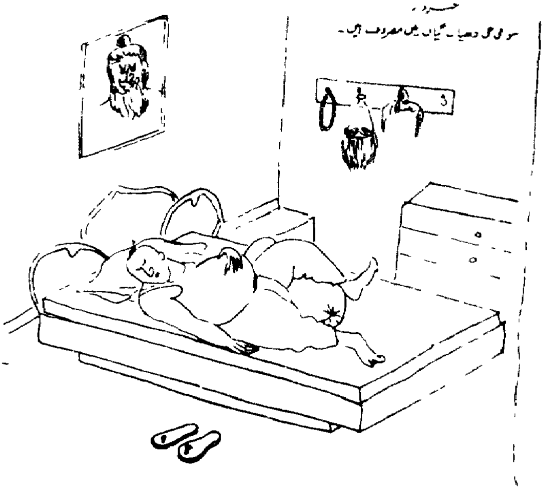
آپ کے دیس میں ماں باپ کی
طے کی ہوئی شادیاں
بہت کامیاب لگتی ہیں

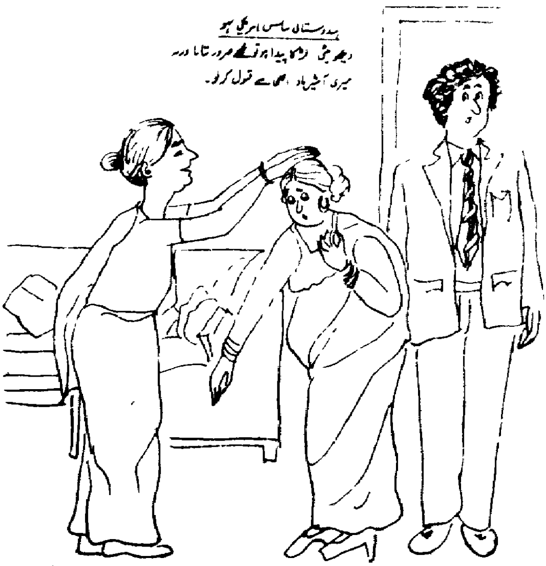


ارے واہ یہ فیلم تو ہم انڈیا میں دیکھ چکے ہیں ۔

تمہارے امریکہ میں شاپنگ کا خوب مزہ ہے
ہاتھ کھلے ہیں اور نوکر چاکر کی کوئی ضرورت نہیں۔



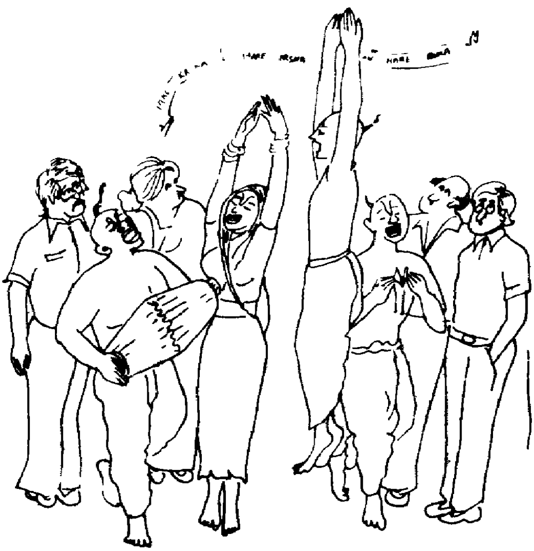

خسرو:
سوامی جی دھیان گیان میں مصروف ہیں۔


ہندوستانی ساس امریکی بہو
دیکھو بیٹی لڑکا پیدا ہو تو مجھے ضرور بتانا ورنہ
میری آشیرباد ابھی سے قبول کرلو۔



ہوائی پرواز

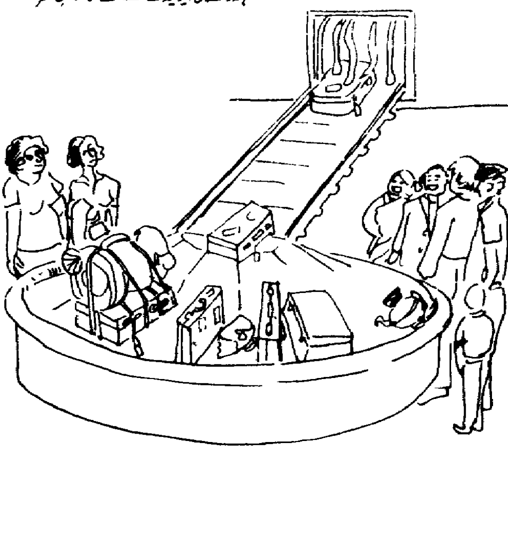
چاول کچے پکے ہیں، چٹنی میں دھنیا زیادہ ہے اور
پھر وہ بیگن کا بھرتا کہاں ہے جس کا ہم نے ٹکٹ
کے ساتھ آرڈر دیا تھا!

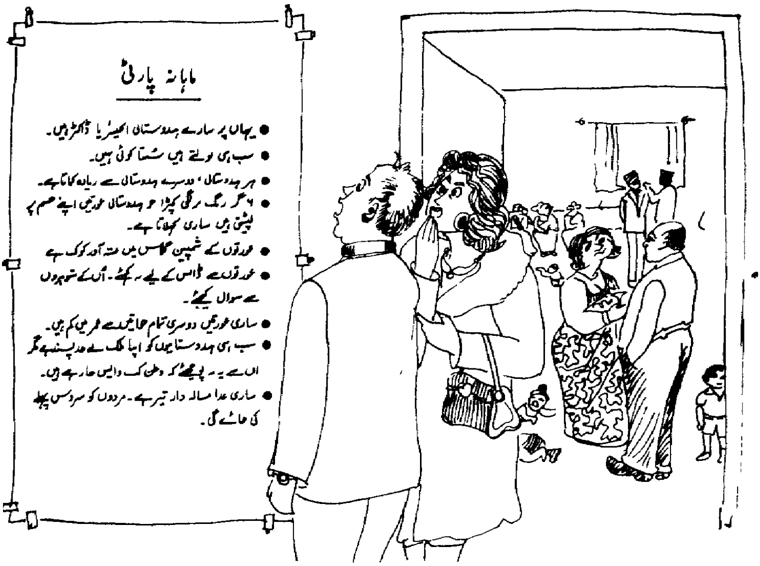


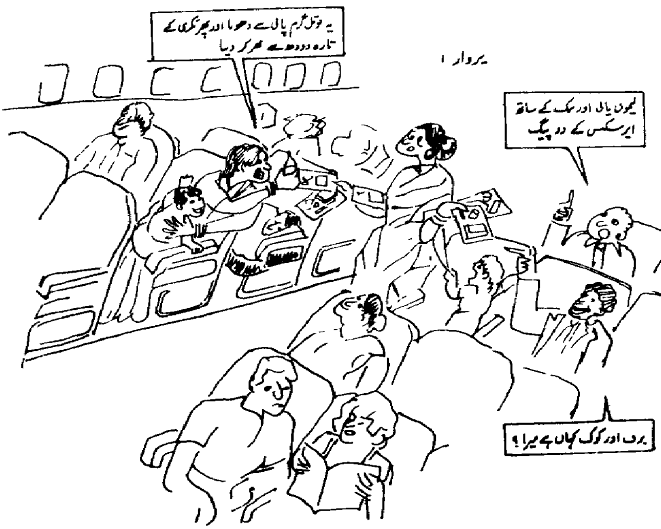
پیارے بچو! یہ انڈیا ہے۔ شیروں، سانپوں، پیروں
ڈاکٹروں، اجیروں کا ملک



ہندوستانی ایرپورٹ — بے تکا سامانِ سفر




ماہانہ پارٹی
• یہاں پر سارے ہندوستانی انجینئر یا ڈاکٹر ہیں۔
• سب ہی بولتے ہیں سنتا کوئی نہیں۔
• ہر ہندوستانی، دوسرے ہندوستانی سے زیادہ کماتا ہے۔
• ۶ گز رنگ برنگی کپڑا جو ہندوستانی عورتیں اپنے جسم پر لپیٹتی ہیں ساری کہلاتا ہے۔
• عورتوں کے شیمپین گلاس میں فنٹا اور کوک ہے
• عورتوں سے ڈانس کے لیے نہ کہئے۔ اُن کے شوہروں سے سوال کیجئے۔
• ساری عورتیں دوسری تمام خواتین سے عمر میں کم ہیں۔
• سب ہی ہندوستانیوں کو اپنا ملک بے حد پسند ہے مگر ان سے یہ نہ پوچھئے کہ وطن کب واپس جا رہے ہیں۔
• ساری غذا مصالحہ دار تیز ہے۔ مردوں کو سروس پہلے کی جائے گی۔


یہ بوتل گرم پانی سے دھویا اور پھر بکری کے تازہ دودھ سے بھر کر دیا
پرواز ۱
لیموں پانی اور نمک کے ساتھ ایرسکس کے دو پیگ
برف اور کوک کہاں ہے میرا؟

حزیں لدھیانوی

"حزیں لدھیانوی تقسیم کے بعد سے لائل پور (حالیہ فیصل آباد) میں مقیم ہیں۔ شعری مجموعہ "لہو کی صدا" شائع ہو چکا ہے۔ "فنون" لاہور میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ "پاکستانی ادب" میں باقاعدگی سے چھپتے رہے۔ یہ کبھی کبھار ان کی نظم/غزل "عوامی جمہوریت" کے پہلے صفحہ پر شائع ہو جاتی ہے جس کی ادارت حبیب جالب کے پاس ہے۔ اس ہفت روزہ کے ایڈیٹر سید مطلبی فرید آبادی مرحوم ہوا کرتے تھے۔"

نیا آفتاب ابھرے گا

اٹھے گی رات کی ارتھی مٹے گی راکھ اس کی
کھلیں گے پھول، نیا آفتاب ابھرے گا
جو سنسناتی ہوئی گولیوں کی زد پر ہے
وہی جلوس تری لاش پر سے گزرے گا

امن کا نشاں

ہوائے تازہ چلے پھر ہی کوئی بات بنے
معاشرے میں تضادات کا دھواں ہے میاں
ہماری جنگ ہے اب ظلم کے اندھیروں سے
ہمارے خون کا علم، امن کا نشاں ہے میاں

حزیں لدھیانوی

چپ کے بنوں سے وادیٔ اظہار کو چلو
اے ہمرہو! ہوا سو ہوا، اب جو ہو سو ہو
کیوں محو ہو کے بیٹھے ہو شاخِ شجر پہ تم
تیغِ ہلال سر پہ چمکتی ہے پنچھیو!
صرصر سے لڑنا، سیج نہ کرنا کبھی قبول
شاخوں سے کٹ بھی جاؤ، جو پھولوں کی پتیو
پھل پھول، برگ، شاخ، شجر سب حنوط ہیں
ٹھہرو مرے چمن میں بھی خوشبو کے قافلو
چاندی کے پیکروں میں کہاں ہے زرِ خلوص
یارو مرے وجود کی بھی کان کھود لو
ہم دیدہ ور تو روشنیوں کے نقیب ہیں
اندھے ہی تم کو پوجیں گے، تاریک سورجو
دو ہاتھ ہی نہیں، مرے ان گنت ہاتھ ہیں
رائی بنا ہی دوں گا تمہیں اونچے پربتو
سب ظلم کے طلسمی درختوں کو چاٹ لو
اب ٹڈیاں سی بن کے اڑو تم ہی کنکرو
کب تک حزیں حیات رہے گی لہو میں تر
کب تک پیو گے خون مسائل کے مقتلو

نظمیں

راشد آذر

زخموں کی زباں

جو گھاؤ سینے پہ ہیں
مجھے ان کا دکھ نہیں ہے
کہ اُن کی ایسی زباں نہیں ہے
جو تم کہو تم سمجھ نہ پائے
تم ان سے نظریں چراؤ لیکن
حقیقتوں کو نظر کا دھوکہ نہ کہہ سکو گے
تم اپنے خنجر چھپاؤ لیکن
لہو پکارے گا آستیں کا
کہ خوں زبانوں کی چھوٹی چھوٹی حدود سے آگے
ضمیر کی چیخ بن گیا ہے
مگر میں گم صم یہ سوچتا ہوں
جو زخم دل میں چھپے ہوئے ہیں
میں ان کا اظہار کس زباں میں کروں
کہ تم اُن کو دیکھ پاؤ
مجھے خدا کے لیے بتاؤ
مجھے خدا کے لیے بتاؤ

نذرِ جن

جس کو لہجے کی درشتی بھی گوارا نہ ہوئی
اُس سے زخموں کا کہاں بوجھ اُٹھایا جاتا
تم پہ کیوں گرز و سناں، تیر و تبر برسائے
ایسے تحفوں سے تمہیں کس نے نوازا آخر
تم تو لیسین گلے کے بھی سزاوار نہ تھے
مارنے والوں نے اک پھول ہی پھینکا ہوتا

ے تلگو زبان کے شاعر جن کا حیدرآباد میں جنوری کے الیکشن کے فسادات میں اشرار کے ہاتھوں بے دردانہ قتل ہوا۔

غزل

راشد آذر

مت سمجھ زندگی میں اک خلا رہ جائے گا
تم نہ آؤ گے تو دل کا دَر کھلا رہ جائے گا
یاد میری جب بھی آئے گی خلش بن جائے گی
بھول جاؤ گے تو دل میں درد سا رہ جائے گا
زندگی جب پڑ گیا خود کو بھلا دینے کا نام
سوچتا ہوں تیری یادوں میں بھی کیا رہ جائے گا
تو مُکر جائے اگر خط کی عبارت سے تو کیا
دل پہ تیرے عکسِ تحریرِ وفا رہ جائے گا
اس جہانِ بے دلی میں دوستی، اخلاص، عشق
اور کیا ان چند رشتوں کے سوا رہ جائے گا
سب فنا ہو جائے گا بس اک صداقت کے سوا
میں تو مٹ جاؤں گا میرا نقش پارہ جائے گا
اس خموشی سے گزر جاؤں گا اس دنیا سے میں
یہ زمانہ مجھ کو آذرؔ دیکھتا رہ جائے گا

غزل

شجاع خاور

سامان میرا عرش بریں پر پڑا رہا
میں بد دماغ اور کہیں پر پڑا رہا

اس کو خدائیوں کی سزا مل گئی مگر
سجدوں کا داغ میری جبیں پر پڑا رہا

کیا بات تھی کہ ملتے رہے دوسروں کو تاج
پھر بھی ہما کا سایہ ہمیں پر پڑا رہا

خانہ بدوشیوں کا ستایا ہوا تھا وہ
دو گز زمیں ملی تو وہیں پر پڑا رہا

مایوسیوں نے گھیر لیا سارا آسماں
کل ساری رات چاند زمیں پر پڑا رہا

غزل

خلش مظفر

کتابوں کے ورق اُلٹا رہی ہے
ہوا تاریخ کو دُہرا رہی ہے

یہ لڑکا سنجد کا تاریخ داں تھا
یہ لڑکی دخترِ صحرا رہی ہے

یہاں سے قافلہ گزرا تھا اک دن
یہاں آباد اک دنیا رہی ہے

کوئی پیاسا گیا ہے اس ندی سے
کسی کے واسطے دریا رہی ہے

کئی راتوں سے میں سویا نہیں ہوں
کئی دن سے مجھے نیند آ رہی ہے

میں اکتایا ہوا ہوں رتجگوں سے
تو مجھ کو جاگنا سکھلا رہی ہے

مرے کمرے کی ہر تصویر اب تو
تری ہمشکل ہوتی جا رہی ہے

ایم منوجہ

نظمیں

ایم منوجہ صاحب پرانے افسانہ نگاروں میں سے ہیں۔
انھوں نے پریم چند والے دور میں اردو افسانے لکھے ہیں۔
ہندی میں "ساریکا" میں چھپتے رہے ہیں ——— مدیر

دور افق کے پار
میرے جیسا اک آدمی
کھا رہا ہے
نان اور کباب
پی رہا ہے
بھینی بھینی تیز شراب
میں جھنجھلا کر
منہ پھیر لیتا ہوں
مشرق میں
دور افق کے پار
میرے جیسا اک آدمی
نیلی وردی میں ملبوس
کھا رہا ہے چاول
اور مچھلی کے کباب

میں پھر جھنجھلا کر
منہ پھیر لیتا ہوں
مغرب کی اور
بُش شرٹ اور جین پہنے
گورا چٹا اک آدمی
کھا کر تخم بقر
مع شیرمال
مست بجا رہا ہے
مضراب
اور جب میں جھنجھلا کر
منہ پھیر لیتا ہوں جنوب کی او
تو دیکھتا ہوں
ایک وسیع سمندر
اور یہ احساس

کہ میں ہوں آزاد
اور چاہوں تو
ڈبا سکتا ہوں
اپنے احساسات
اور اپنی ضرورتوں کو
تہہِ آب ــــــ زیرِ آب

۲

اگر میری شکل
میرے باپ کی شکل سے ملتی ہے
تو اپنی کمزوریوں
اور توانائیوں کا بوجھ
میں کیوں اٹھاؤں
میں نے اپنے سب گناہ
معاف کر دیے ہیں
اور ثواب
اپنے بزرگوں کی سمادھیوں پر
چڑھا دیئے ہیں
اب میں اس پرندے کی طرح
آزاد ہوں
جو انجانے
جنگلوں کے بیچ
اِدھر اُدھر بکھیرتا
پھرتا ہے

آغا سہیل

دروازہ بند ہے

یہاں سے وہاں تک، ایک لمبے کوری ڈور میں جہاں ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا میں تقریباً ٹٹولتا ہوا چلتا ہوں، میرے پیچھے ملی جلی آوازوں کا شور ہے اور یوں لگتا ہے کہ ہر شخص اس لمبے کوری ڈور میں اسی سمت کی طرف چل رہا ہے جدھر میں جا رہا ہوں میرے دائیں ہاتھ اور بائیں ہاتھ دیواریں ہیں ٹٹول ٹٹول کر چلنے میں ہر لمحے نت نئے اندیشوں کے سانپ پھن کاڑھ کر پھنکاریں مارتے ہیں اور ہجوم کا شور ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تاہم ایک آدھ فقرہ کانوں سے ٹکرا ہی جاتا ہے۔

"دروازہ کس نے بند کیا؟"

"پتہ نہیں!"

"اندر سے بند ہے کہ باہر سے!"

"باہر سے!"

"نہیں اندر سے!"

"ارے اندر باہر دونوں سے بند ہے!"

"اچھا!"

"کہتے ہیں چوکیدار نے دروازہ بند کیا ہے!"

"اُس نے کیوں بند کیا؟"

"ہاں ہاں کیوں بند کیا ہے اُس نے؟"

"کیا پتہ کیوں بند کیا ہے!"

"پوچھو اسی سے کیوں بند کیا ہے"

"کون پوچھے؟"

"تم پوچھو"

"میں کیوں پوچھوں؟"

"پھر میں کیوں پوچھوں"

"میں پوچھوں گا جی ـــــ لاؤ میرے سامنے اسے"

"اس کے ہاتھ میں بندوق ہے"

"تو کیا ہوا، بندوق تو ہماری ہی دی ہوئی ہے"

"تو بھائی تمہیں پر دچل جائے"

"تو کیا اناڑی کی بندوق ہے"

"نہیں، کھلاڑی کی بندوق اناڑی کے ہاتھ میں ہے"

"اجی صاحب بات کیسے کیجیے گا دروازہ تو بند ہے؟"

"کیا اندر جو شور ہو رہا ہے اس کی آوازیں اس تک نہیں پہنچتیں؟"

"پہنچتی ہیں، مگر وہ سن سن کر خوش ہوتا ہے اور مونچھوں پر تاؤ دیتا رہتا ہے"

"سنا ہے کہ کسی کی شے پر دروازہ بند ہوا ہے؟"

"اجی میں نے تو درازسے جھانک کر دیکھا تھا باہر"

"اچھا؟"

"ہاں وہاں ایک تو چوکیدار ہے، دوسرے وہ گلو ہے نابینا، جس کی نکڑ پر دوکان ہے اور تیسرے اپنے محلے کی مسجد کے امام صاحب ہیں. جو دونوں کی پیٹھ ٹھونک ٹھونک کر شاباشی دے رہے ہیں"

"حیرت ہے، چوکیدار اور بنیے کا گٹھ جوڑ تو سمجھ میں آتا ہے مگر یہ امام صاحب؟"

"اور صاحب اوپر سے یہ حبس اور پھر واپڑا کی طرف سے بجلی بند"

"بجلی وجلی بند نہیں ہے"

"پھر روشنی کیوں نہیں ہوتی؟"

"بجلی کا کنکشن بند ہے۔"

کچھ لوگ دروازے تک پہنچتے ہیں اور زور زور سے دروازے کو پیٹتے ہیں لیکن ساری کوششیں بے کار جاتی ہیں۔ چیختے چنگھاڑتے اور گالیاں دیتے ہیں لیکن بے سود برصدا، صدا بہ صحرا ثابت ہوتی ہے۔ کچھ عورتیں اور بچے رونا شروع کر دیتے ہیں کچھ بوڑھے فریادیں کرتے ہیں، کچھ دل کے مریض ہیں جو دہائیاں دیتے ہیں اور اللہ رسول کے واسطے دیتے ہیں لیکن کسی پر مطلقاً کوئی اثر نہیں ہوتا۔ دھیرے دھیرے خاموشی کے سینے سے کراہنے کی مانند ایک آدھ آواز ابھرتی ہے۔

"پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔"

"ہوا تھا، لیکن ایسا نہیں۔"

"یہ تو صاحب حد ہو گئی۔"

"حد ہو گئی صاحب حد۔"

"بنیے نے چوکیدار کو رشوت دی ہے۔"

"مگر امام صاحب، امام صاحب کو کیا ہو گیا؟"

"چلو انھیں آواز دیں، دروازے کی دراز سے پکاریں۔"

"ہم اذان نہ دینا شروع کر دیں"——

"اذان اور یہاں؟"

"مسجد تو باہر ہے۔"

"موذن جب خود اذان دے گا تو شاید دروازہ کھل جائے۔"

"اجی وہاں کچھ لوگ موجود ہیں وہ نماز پڑھ لیں گے۔"

"اور ہم؟"

"ہم یہاں پڑھ لیں گے۔"

"یہ تو زیادتی ہے۔"

"زیادتی تو بہر حال ہے مگر جو اللہ کو منظور"
"تو کیا اللہ کو یہ منظور ہے کہ ہم یہاں بند پڑے رہیں؟"
"ہاں بھائی مرضیِ مولیٰ ہمہ اولیٰ"
"یہ غلط ہے"
"کیا؟"
"یہی کہ خیر اور شر دونوں من جانب اللہ ہیں"
"پھر صحیح کیا ہے؟"
"شر شیاطین کی طرف سے اور خیر اللہ کی طرف سے ہے"
"اور صاحب شیاطین ہم خود ہیں، ہمارے اندر ہیں"
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ ہے کہ اللہ کہتا ہے کوشش کرو السعی منی والاتمام من اللہ"
"تو کیا ہم نے کوشش نہیں کی؟"
"کوشش میں کمی کی ہے مسلسل کوشش نہیں کی"
"ٹھہرو مجھے جادو آتا ہے"
"جادو؟"
"ہاں دیکھو ابھی یوں دروازہ کھلے گا"
"کیسے؟"
"کھل جا سم سم —— کھل جا سم سم —— چھو"
ہی ہی ہی ہی ہی ہی
"کیوں ہنسے کیوں؟"
"تمہاری حماقت پر"
"دیکھو بچو" کسی بزرگ کی آواز آئی۔ میں نے اس پر اعتماد نرم اور ٹھنڈی آواز میں بردباری محسوس کی۔

"یہ دنیا میں کوئی پہلی بار نہیں ہوا۔"
"مگر حضرت ہم تو اب گرفتارِ بلا ہیں اس سے بھلا کیونکر نکلیں؟"
"نکلوگے، نکل جاؤ گے، گھبراؤ نہیں۔"
"صاحب ہم اندر گئے اور بس دروازہ بند ہو گیا۔"
"ہمیں صریحًا دھوکہ دیا گیا ہے۔"
"تحمل سے کام لیجیے۔"
ایک صاحب بولے "اور محترم بزرگ کی سنیے۔"
"بچو، بنی اسرائیل کے ساتھ جانتے ہو فرعون نے کیا کیا؟"
"مگر وہاں تو موسیٰ تھے۔"
"ہر فرعونے را موسیٰ سنا ہے؟"
"سنا ہے۔"
"پس اعتماد رکھو۔"
"کیا خاک اعتماد رکھیں، یہاں نہ ہوا ہے نہ روشنی، دم گھٹا جا رہا ہے۔"
"کیا چیخنے چلانے سے کچھ فائدہ ہو گا۔"
"ہو گا۔"
"کیا ہو گا؟"
"کچھ نہ کچھ تو ضرور ہو گا۔"
"دیکھو بچو، یوں ہی بلا وجہ ہاتھ پاؤں مارنے سے کچھ نہ ہو گا، پہلے تدبیر کرو اور منصوبہ بندی سے کام لو پھر جو کوشش ہو گی وہ ضرور کامیاب ہو گی۔"
"ہم ایک دوسرے کا چہرہ تک تو دیکھ نہیں سکتے اِس اندھیرے میں، چہ جائیکہ تدبیر اور منصوبہ بندی۔"
"سنو، ہم بول سکتے اور سن سکتے ہیں، یہ بہت ہے اور یاد رکھو کہ ہر آواز کا ایک چہرہ ہوتا ہے جسے ہم قلب کی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں۔"

"ہمیں تو یہ آواز اچھی لگی۔"

"اس آواز کا چہرہ نورانی ہے۔"

"اس آواز میں ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں کا سا لطف ہے۔"

اس اثنا میں شور میں رفتہ رفتہ کمی ہونا شروع ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ ہر شخص اپنی سوچ کی گہری کھائیوں میں اترنے لگتا ہے، چند ثانیے ہی گزرتے ہیں کہ باہر سے دروازے پر کوئی ہاتھ رکھتا ہے تو اندر ایکدم تہلکہ سا مچ جاتا ہے۔

"شاید دروازہ کھل رہا ہے۔"

"دروازہ کھل رہا ہے۔"

لیکن پھر اتھاہ خاموشی چھا جاتی ہے، ایک شخص تنک کر کہتا ہے۔

"کوئی دروازہ دروازہ نہیں کھل رہا"

"مگر ابھی تو دروازہ ہلا تھا۔"

"ہوا ہوگی۔"

"ہاں شاید ہوا ہوگی، مگر ہوا کہاں سے آئے گی، کیا باہر ہوا چل رہی ہے؟"

"کچھ تو ہے، شاید کسی نے یونہی ہاتھ رکھ دیا ہو۔"

"لوگو! خدا کے لیے کچھ تدبیر کرو، یہاں بہت سے مریض بھی ہیں۔"

"میں نے ایک تدبیر سوچی ہے؟"

"کیا؟"

"وہ یہ کہ کیوں نہ ہم ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر ایک دوسرے کو مضبوطی سے پکڑ کر زور لگائیں۔"

"یعنی بند دروازے پر زور لگائیں؟"

"ہاں ہاں، کچھ تو ہوگا۔"

"سنو یارو! ایک تدبیر مجھے بھی سوجھی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"ڈھونڈو یہاں اگر لوہے کے اوزار مل جائیں، پھاوڑا، کدالیں اور بیلچے وغیرہ"

"وہ کہاں ہیں اور اگر مل بھی جائیں تو کیا ہوگا؟"

"ہم دیوار میں سیندھ لگا لیں گے یا زمین میں سرنگ کھود یں گے یا اوپر سے چھت کھود ڈالیں گے"

"ہی ہی ہی ہی"

"یہ کون ہنسا؟"

"میں ہنسا"

"کیوں ہنسے تم؟"

"اس لیے کہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہمیں پہلے سے معلوم تھا کہ یہاں بند ہو جانا ہے جو اوزار ساتھ رکھتے؟"

"پھر بھی ممکن ہے پڑے رہ گئے ہوں، ڈھونڈھ لینے میں کیا ہرج ہے"

"ہاں ہاں کیا ہرج ہے"

"لیکن یہ تجویز کیا بُری ہے کہ ہم ایک دوسرے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دروازے پر زور لگائیں"

"دونوں تجویزیں اچھی ہیں"

"ٹھہرو ٹھہرو"

"کیوں؟"

"میں نے ابھی ابھی دراز سے جھانک کر دیکھا ہے کہ وہ دروازہ کھولنے کو آرہے ہیں"

"کہاں! وہ تو باہر کھڑے قہقہے لگا رہے ہیں"

"دروازہ کھولو ــــــ ہم یہاں مرے جاتے ہیں"

"دروازہ کھولو ــــــ ہمارا دم گھٹا جا رہا ہے"

"دروازہ کھولو ــــــ یہاں ہمارے ساتھ مریض ہیں، دل کے مریض، کیا تم چاہتے ہو کہ سب مر جائیں؟"

"کوئی جواب آیا؟"

"نہیں۔"

"کاش ہمارے پاس دوربین ہوتی۔"

"کیا اندھیرے میں دوربین سے سب کچھ نظر آجاتا ؟"

"یہ بات نہیں ہے۔"

"پھر کیا بات ہے ؟"

"بات یہ ہے کہ درازمیں دوربین فٹ کرکے دیکھتے کہ کوئی دور دراز سے ہماری مدد کو آرہا ہے کہ نہیں۔"

"کون آئے گا ہماری مدد کو ؟"

"کوئی تو آئے گا۔"

"کسی کو کیا خبر کہ ہم پر کیا گزر رہی ہے ؟"

"خبر ہو بھی تو کیا فرق پڑے گا، سب اپنے اپنے بوجھ اٹھا رہے ہیں، ہمیں تو خود کچھ کچھ تدبیر کرنا چاہیے ؟"

"دیکھو بچو، ہلکان نہ ہو جو اسے منظور ہوگا وہی ہوگا۔"

"پھر وہی بات کہ خیر اور شر من جانب اللہ ہیں۔"

"اے لوگو سنو! ایک نوجوان جوش اور خروش کے انداز میں کہتا ہے" یاد رکھو اس طرح تو یہ دروازہ قیامت تک نہ کھلے گا۔"

"پھر ہم کیا کریں، یہاں تو اندھیرا بھی ہے اور ہوا کا بھی گزر نہیں، نہ کوئی روشندان ہے نہ کھڑکی۔"

"مجھے لگتا ہے کہ ہم سب یہاں سر پٹک پٹک کر مرجائیں گے اور پھر ہماری ہڈیوں کے انجر پنجر کوئی مورخ دریافت کرے گا اور کوئی ماہر علم الانسان یعنی ANTHROPOLOGIST ان ہڈیوں پر ریسرچ کرے گا۔"

"یہ کون بدشگونی پھیلا رہا ہے؟ مایوسی مجھے مطلقاً پسند نہیں۔"

"تو پھر اس کا انجام کیا ہوگا، سوچو؟"

"انجام، کیسا انجام؟ کہہ دیا نا کہ ہم کچھ نہ کچھ تدبیر کریں گے۔"

تمام کوری ڈور میں خاموشی چھا جاتی ہے جیسے ہر شخص ایک بار پھر اپنی اپنی ذات کی تنہائی میں اتر رہا ہو۔ ایک بولتا ہے:

"تم نے کافکا کی وہ کہانی پڑھی ہے؟"

"کون سی؟"

"وہی جس میں چوہے اور چوہے دان ——"

"اچھا اچھا وہ۔"

"تم نے اصحاب کہف کا قصہ سنا ہے؟"

"تم نے ٹائم ٹنل TIME TUNNEL کی کہانی پڑھی ہے جس میں ایک طرف سے داخل ہو اور دوسری طرف نکلو تو وقت یعنی زمان و مکان سب بدل جاتے ہیں۔"

"اچھا؟"

"بھائیو!" ایک طرف سے آواز آتی ہے، سب لوگ خاموش ہو کر کان اسی طرف لگا دیتے ہیں "ایک دوسرے کے کندھوں پر مضبوطی سے ہاتھ رکھو اور دروازے کو ریلو۔"

سب ایک دوسرے کے کندھوں کو ٹٹول ٹٹول کر ہاتھ رکھتے ہیں، کچھ لوگ یا علی کا نعرہ بھی لگاتے ہیں۔ میرے کندھے پر ایک کمزور اور پسینے میں شرابور ہاتھ کہیں سے آتا ہے، میں اپنے آگے والے کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوں، میرے آگے والا شخص مضبوط جُثّے کا آدمی ہے اس کے رگوں اور پٹھوں میں جوان اور گرم خون اُچھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ معاً پورے کوری ڈور میں شور سا اُٹھتا ہے۔

مل گئی —— !

مل گئی —— !!

مل گئی —— !!!

"کیا مل گئی بھئی، ہمیں بھی تو بتاؤ، کیا دروازے کی چابی مل گئی؟"

"دھت تیرے کی، یہ تو لوہے کی ایک کیل ہے صرف"

مجھ سے آگے والے مضبوط پٹھوں کا آدمی سرگوشی میں مجھ سے کہتا ہے :

"مگر مجھے سچ مچ مل گئی ہے"

"کیا؟"

میں اس سے پوچھتا ہوں اور وہ سرگوشی میں مجھے جواب دیتا ہے "کدال"

لیکن آس پاس کے لوگ سن لیتے ہیں اور ان میں سے ایک باآواز بلند کہتا ہے :

"بھائیو! دعا کرو ـــــ کدال مل گئی ہے"

سعید انجم

نیا سال

پبلک ٹرانسپورٹ کی وردی پہن کر عابد نے بیگ اٹھایا اور فلیٹ سے باہر نکل آیا۔ لیٹر بکس دیکھا، خالی تھا۔ بلڈنگ کے سبھی لیٹر بکس خالی ہی لگ رہے تھے۔ ڈاکیہ ابھی آیا نہیں تھا۔ اسے پاکستان پیسے بھیجے کافی دن ہوگئے تھے لیکن رسید ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔ وہ لیٹر بکس بند کرکے عمارت کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ نارویجن ہمسائی بوتلوں کا تھیلا اٹھائے چلی آرہی تھی۔

"ڈیوٹی پر جا رہے ہو؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

عابد نے سر ہلایا۔

"نئے سال کی پارٹی میں شریک نہیں ہوگے؟"

"فارن ورکر صرف ورک کرتا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا "میں نارویجنوں کو پہلے پارٹیوں میں اور پھر پارٹیوں سے گھر پہنچا کر نیا سال مناؤں گا۔"

"نیا سال پیشگی مبارک ہو۔" عابد کی نارویجن ہمسائی نے رحم دلی سے سر اٹھا کر کہا۔

"تمہیں بھی" عابد سر جھکائے آگے بڑھ گیا۔

بارہ بج گئے تو گرجا گھروں کی گھنٹیاں بجنا شروع ہوگئیں۔ ایکے برگ کیمپنگ ایریا کی پہاڑی پر لوگ اپنی کاروں کو اسٹارٹ چھوڑ کر اوسلو شہر کو نئے سال کی روشنیوں میں دیکھنے کے لیے یخ بستہ فضا میں نکل آئے۔ رنگ برنگی آتشبازی چھوٹ رہی تھی۔ انھوں نے بھی پٹاخے چلائے پھلجھڑیاں ختم کیں اور اسٹارٹ کاروں میں واپس آن بیٹھے۔ فضا میں پٹرول اور بارود کی بو پھیل گئی۔

غیر سرمایہ دار اور غیر سوشلسٹ معاشروں سے آئے ہوئے مزدوروں نے مغربی یورپ کے آسمان کو نئے سال کی رات رنگین ہوتے دیکھا۔ پٹرول اور بارود کی بو کو سونگھنا اور اپنے اپنے وطن کو یاد کیا۔ لبنانی ایک لمحے کے لیے بیروت پہنچ گیا، فلسطینی نے شرم الشیخ میں مورچہ لگایا اور پاکستانی نے خود کو یاد دلایا کہ یہ نیا سال اسلامی نہیں ہے۔

پھلجھڑیوں کی روشنیاں ختم ہوگئیں، دھند بڑھنے لگی۔ نائٹ کلبوں کے دروازوں پر لائن آگے کھسک رہی تھی۔ "ہیپی نیو ایر" فلور پر سب چلائے۔ کاگ اڑے، کونے کی میز پر یونی ورسٹی کے طالب علموں کا ایک گروہ پیتے سال کے تجزیے میں مصروف تھا۔ ایک اخبار نویس کسی اچھوتے فیچر کے موضوع کی تلاش میں ان کی طرف کان لگائے بیٹھا بیئر پی رہا تھا۔ ڈرم کی آوازوں سے اسپیکروں کے قریب رکھی میزوں پر پڑے گلاس تھرتھرا رہے تھے۔ کاؤنٹر، میزوں، فلور پر، ہال میں پورے کلب میں ہر جگہ جذبوں کا اظہار شدت سے جاری تھا۔ ایک لڑکا ٹائلٹ میں بیٹھا دیوار پر لکھ رہا تھا "ہم امن سے زندہ رہنے کا حق مانگتے ہیں۔ ناروے سے امریکی اڈے ہٹاؤ"۔

۲

کلب کے کچن کا دروازہ کھلا اور ایک عورت نے اشارے سے مالک کو بلایا جو ایک ٹرالی خالی کر رہا تھا۔ مالک ٹرالی چھوڑ کر کچن میں چلا آیا۔

"اب یہ پیاز کاٹ لو" وہ عورت بولی۔

مالک نے چھری سنبھال کر اپنے دوستوں کو یاد کیا جو یونی ورسٹی ہوسٹل کے میٹنگ روم میں فارن اسٹوڈنٹس یونین کی پارٹی میں نیا سال منا رہے تھے۔ نسلی تعصب کے خلاف یک جہتی کی اس پارٹی میں خالق کھانا تقسیم کر رہا تھا۔ کچھ نارویجن لڑکے لڑکیاں بھی وہاں موجود تھے اور کری میں مرچیں زیادہ ہونے کی وجہ سے سوں سوں کر رہے تھے۔ بیٹلز کے ایک پرانے ریکارڈ کی کیسٹ چل رہی تھی۔ جارج ہیریسن طبلے کی تھاپ پر ستار بجا رہا تھا۔

"دہی ڈال لو" خالق نے ایک سوں سوں کرتے نارویجن کو مشورہ دیا۔

"ناں!" اس نے منہ کھول کر سانس باہر نکالتے ہوئے کہا "مجھے مرچوں والا کھانا پسند ہے۔"

۳

خالق نے اپنے گتے کی پلیٹ پر دہی ڈالا اور پلاسٹک کے کانٹے سے پلاؤ کھانے لگا۔ اسے ایک نارویجن لڑکی کے قریب خالی جگہ نظر آئی وہ وہیں جا بیٹھا۔

"ناروے میں پہلا نیو ایر منا رہے ہو؟"

"تیسرا!" اس نے جواب دیا۔

لڑکی نے شناسا نظروں سے اس کے لیے گلاس میں اپنی بوتل سے کچھ ریڈ وائن ڈال دی۔ جارج ہیریسن کے ستار کی تاریں خاموش ہو چکی تھیں۔

"تم پچھلے سال کہاں تھے؟" نارویجن لڑکی نے پوچھا۔

"ایک نائٹ کلب میں۔" خالق نے جواب دیا۔

"یہاں اوسلو میں؟"

"ہاں!"

"پوری رات؟"

"پورا سال!"

"پورا سال؟؟؟" لڑکی کی آنکھوں میں حیرت امڈ آئی۔

"ہاں! — میں وہاں برتن دھوتا تھا۔"

کسی نے پنک فلائیڈ کے ریکارڈ دی وال کی کیسٹ لگا دی تھی۔ "این اور برک ان دی وال" ANOTHER BRICK IN THE WALL نارویجن لڑکی نے ہونٹوں میں سگریٹ داب لیا۔ خالق نے اپنے لائٹر سے اسے جلا دیا۔ پارٹی میں شریک سب لوگ گفتگو میں مصروف تھے۔ ایک غیر ملکی لڑکا کرسی پر کھڑا تھا۔ وہ کرسی سے نیچے اتر آیا اور بولا "ناروے میں نسلی تعصب ایک لعنت ہے، اس کے خلاف جدوجہد کرنا ہم سب کا فرض ہے۔ آج کی پارٹی میں آنے والے سب لوگوں کو خوش آمدید کہتا ہوں کہ انھوں نے نیا سال ہمارے ساتھ ہماری طرح منانے

کا اظہار کیا۔ "ہیپی نیو ایر، سب چلائے" "ہیپی نیو ایر" غیر ملکی لڑکے نے کیسٹ پلیر کی آواز پھر اونچی کر دی۔

"تم اپنے وطن میں نیا سال کیسے مناتے ہو؟" نارویجن لڑکی نے خالق سے پوچھا۔

"ہم لوگ نیا سال نہیں مناتے!"

"کیوں؟"

"وہاں نیا سال آتا ہی نہیں"

"کیا مطلب؟"

"ہمارے یہاں نیا سال نہیں آتا۔ وقت ٹھہر گیا ہے" خالق نے بتایا۔

کسی نے کھڑکی کھول دی تھی۔ کمرے کی گرم فضا میں خنک لہریں گھومنے لگیں۔ ہوا کے جھونکے سگریٹوں کے دھوئیں سے عجیب وغریب شکلیں بنانے لگے۔ دیوار پر لگے کلاک کا پنڈولم مسلسل حرکت کر رہا تھا۔ کچھ لوگ پلیٹیں خالی کرنے کے بعد کھانے کے دیگچوں والی میز کے قریب کھڑے دور شروع کرنے کے منتظر تھے۔ خالق پلاؤ بانٹنے وہاں آ پہنچا۔

نائٹ کلب کے کچن میں پیاز کاٹتے مالک کی آنکھوں میں پانی رواں تھا۔ اس کے ساتھ کام کرنے والی عورت نے پیازوں سے بھری ایک ٹرے اس کے قریب رکھی اور کٹے ہوئے پیاز لے کر چل دی۔ ہال میں ڈرم زور زور سے بجایا جا رہا تھا۔ فلور پر ناچنے والے گانے والوں کے بہت قریب پہنچتے چلے جا رہے تھے۔ روشنیاں رنگ بدل رہی تھیں۔ اعضاء کی حرکت میں تیزی آتی جا رہی تھی۔ میزوں کے گرد بیٹھے لوگوں میں سے اکثر کے میز پوش تھوڑی بہت الکحل گرنے سے کچھ کچھ گیلے ہو چکے تھے۔ موم بتیوں کے قد چھوٹے ہو گئے تھے کونے کی میز پر بیٹھے یونی ورسٹی کے طالب علم اپنے تجربے میں ڈوب کر بیتے سالوں میں چھلانگ لگا چکے تھے۔

"یہ صنعتی انقلاب کا کمال تھا"

"خام مال کے لیے کالونیالائزیشن شروع ہو گئی تھی"

"ٹھہرے وقت کو رفتار مل گئی تھی"

"یورپ میں انڈرگراؤنڈ ٹرینیں چلنے لگی تھیں۔"

اخبار نویس نے بیئر کا بڑا سا گھونٹ بھرا۔ مگ خالی کیا اور ٹائلٹ کی جانب چل دیا۔

ے یونی ورسٹی ہاسٹل کے سٹنگ روم میں نہ جانے کا افسوس تھا جہاں فارن اسٹوڈنٹس مین نے اسے نئے سال کی پارٹی میں دعوت دے رکھی تھی، وہاں ایشین، افریقن اور لاطینی ریکہ کے طالب علموں کا اجتماع تھا۔

"مغربی یورپ کی امارت کہاں سے آئی؟" ایک کہہ رہا تھا۔

"تو تمہیں معلوم ہے کہ دنیا کی پہلی زیرزمین گاڑی انگلستان میں چلی؟" دوسرا بولا۔

"تم نے کبھی یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ پہلی زیرزمین تحریک کہاں پر چلی؟ تیسرا ۔رہا تھا۔"

"کھڑکی بند کردو!" کوئی چلآیا "کمرہ ٹھنڈا ہوگیا ہے۔"

خالق نے کھڑکی بند کردی اور واپس اپنی جگہ پر آن بیٹھا۔

"چیرز!" نارویجن لڑکی نے گلاس اُٹھایا۔

"تمہاری مہربانی کے نام۔" خالق نے اس کی ریڈ وائن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اُن کے نام جو آج رات بسیں گاڑیاں اور ٹیکسیاں چلا رہے ہیں۔"

"اُن کے نام جو ہوٹلوں میں برتن دھو رہے ہیں۔" خالق نے کہا۔

"تمہاری تو آج چھٹی ہے" نارویجن لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں نے برتن دھونے چھوڑ دیے۔"

"کیوں؟"

"میں نے گھر پیسے بھیجنے بند کردیے ہیں۔"

"کیوں؟"

"ہماری حکومت زرمبادلہ وصول کرتی ہے اور افراط زر کے لیے چھاپے ہوئے نوٹ ے دے دیتی ہے۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟" نارویجن لڑکی نے پوچھا۔

"خالق !"

"میں نے سنا ہے تم لوگوں کے ناموں کا کچھ نہ کچھ مطلب بھی ہوتا ہے؟"

"ہاں ! میرے نام کا مطلب ہے تخلیق کرنے والا۔"

"کچھ تخلیق کرتے ہو؟"

"ہاں ! پیداوار۔ نارویجن صنعت کار کے لیے۔"

"تمہارے اندر تلخی رچی ہوئی ہے، آؤ دوستی کرلیں۔" نارویجن لڑکی بولی۔

"ہماری دوستی تو بہت پرانی ہے" خالق مسکرایا۔

نارویجن لڑکی کی آنکھوں میں حیرت لہرائی۔

"تم نارویجن ہو میں پاکستانی۔ ناروے اور پاکستان کی دوستی بہت پرانی ہے۔"

"ہوسکتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں۔"

"جب یہ مقدس پانی اندر جاتا ہے تو سچ باہر نکلتا ہے۔" خالق نے اپنے گلاس کو دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا "ساٹھ کی دہائی میں روسیوں نے ایک امریکی طیارہ یو ٹو مار گرایا تھا جو اُن کے علاقے میں جاسوسی کررہا تھا۔"

"میں نے کہیں پڑھا تو تھا۔"

"وہ طیارہ پاکستان سے اُڑا تھا اور ناروے آرہا تھا، پشاور کے بڈبیر کے ہوائی اڈے سے بودو ایرپورٹ کے لیے۔"

"واقعی ؟"

"بالکل روس کی وزارت خارجہ نے ناروے اور پاکستان کے سفارت کاروں کو بیک وقت بلایا تھا۔"

"بلایا ہوگا لیکن اے پیداوار کے خالق ! آج تو ماسکو کے ریڈ اسکوائر میں روسی واڈکا پیتے ہوئے اِس واقعے کو قطعاً فراموش کرچکے ہوں گے، ہم کیوں یاد رکھیں ! لڑکی نے گلاس اٹھایا۔

۴

"چیرز!" نائٹ کلب میں بیٹھے یونی ورسٹی کے طالب علموں کا گروہ کورس میں بولا۔

کچن میں پیاز کاٹتی چھری، مالک کی انگلی پر چل گئی۔

"ڈاکٹر کو ٹیلی فون کرو" اُس کے ساتھ کام کرنے والی عورت چلّائی۔

"ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے، یہ ابھی ٹھیک ہو جائے گی" اُس نے انگلی منہ میں ڈال لی۔

"اپنا خون نہیں چوستے" عورت پیار سے سمجھاتے ہوئے بولی۔

اخبار نویس نے اپنا مگ خالی کیا اور ٹائلٹ کی جانب چل دیا۔ وہاں ایک آدمی زیادہ پی جانے کے سبب حلق میں انگلی ڈال کر قے کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک دوسرا آدمی فرش پر گرا پڑا تھا "اِس کا نیا سال تو ٹھیٹر گیا" اخبار نویس نے اپنے آپ سے کہا۔

یونی ورسٹی ہاسٹل کے میٹنگ روم میں نارویجن لڑکی خالق سے پوچھ رہی تھی "تمہارے یہاں وقت کیوں ٹھہر گیا ہے؟"

"اس لیے کہ مغربی یورپ کو رفتار مل گئی ہے" خالق نے جواب دیا۔

وہ زور سے ہنسی "یہ رفتار ہماری نہیں ہے۔ امریکہ سے درآمد کی گئی ہے۔ کوکا کولا، جینز اور پاپ۔ تم دیکھتے نہیں یہ سب کچھ امریکن ہے۔ ایف سولہ کے طیاروں کے ساتھ یہاں تا ہے؟"

"ایف سولہ کے کچھ پُرزے تو تم بھی بناتے ہو"

"امریکن رفتار سے چلنے کے لیے کچھ ذمہ داریاں بھی پورا کرنا پڑتی ہیں"

"نیٹو ہماری ذمہ داری ہے" کلب میں بحث جاری تھی۔

"تمہاری بِتّی کرانا ہماری ذمہ داری ہے" کلب کا منیجر مالک کو بتا رہا تھا جو اپنا خون چوسے جا رہا تھا۔

اخبار نویس نے بئیر کے بھرے مگ کو منہ سے لگایا۔

یونی ورسٹی ہاسٹل کے بیٹھک روم میں ABBA کی کیسٹ چل رہی تھی۔ ایک نارویجن لڑکا قریب بیٹھے غیر ملکی سے پوچھ رہا تھا "یہاں لڑکیاں کیوں کم ہیں؟"

"تو پچھلا نیو ایر تم نے کلب میں برتن دھوتے ہوئے گزارا؟" نارویجن لڑکی خالق

سے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں!"

"ناروے میں تم دوسرا نیو ایر منا رہے ہو نا؟"

"تیسرا!"

"پہلا کہاں گزارا؟"

"اپنے برگ کیمپنگ ایریا کی پہاڑی پر"

"اوہ وہاں ___ اچھا کیا"

"وہاں کاریں ہی کاریں تھیں۔ سب لوگ سڑک کے ساتھ جنگلے پر ٹیک کر نیچے پھیلے ہوئے شہر کو دیکھتے رہے۔ گرجا گھر کی گھنٹیاں بجیں، لوگوں نے آتشبازی کو آگ دکھائی۔ ایک دوسرے کو مبارکباد دی اور واپس لوٹ گئے۔ میں وہاں تنہا کھڑا جانے والوں کے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے، پٹرول اور بارود کی بو سونگھتا رہا"

"ہاں خالق! اپنے برگ ہر سال ایسے ہی ہوتا ہے۔ نئے سال کے قدموں کے نشان وہاں بن جاتے ہیں۔ پھر برف اُن کو ڈھانپ لیتی ہے" نارویجن لڑکی نے کہا۔

"لیکن پٹرول اور بارود کی بو وہاں گھومتی رہتی ہے"

"اس بو نے پوری دنیا کو گھیر رکھا ہے"

"ہاں! پٹرول والوں کو بارود چاہیے اور بارود والوں کو پٹرول"

"بارود تو وہ بھی خریدتے ہیں جن کے پاس بیچنے کو پٹرول نہیں ہے" نارویجن لڑکی بولی۔

"ہاں! جن کے پاس پٹرول نہیں ہے وہ انسان بیچتے ہیں اور بارود خریدتے ہیں"

"آج کل انسان نہیں بکتے، غلامی کا دور ختم ہو گیا ہے" نارویجن لڑکی نے خالق کی تصحیح کی۔

"غلامی کا دور ختم ہو گیا ہے اور فارن ورکر کا دور شروع ہو گیا ہے" خالق اپنی رائے پر قائم تھا۔

"سنو!" نارویجن لڑکی آگے کو جھک آئی "تم لڑتے کیوں ہو؟ ناچتے کیوں نہیں؟"
کلب میں سب ناچ رہے تھے اور مالک پٹی کرانے کے بعد ایک آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔
کچن میں کام کرنے والی عورت نے اسے کافی کی پیالی لاکر دی۔ مالک نے مسکراتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور ڈاکٹر اپنے کاغذات لے کر اُس کے پاس آ گیا۔

۵

"تمہارا نام؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"مالک!"

"پاکستانی ہو؟" اس نے پوچھا۔

مالک نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مالک کا مطلب ہے ملکیت والا" کچن کی عورت نے ڈاکٹر کو بتایا۔

"میں اپنی محنت کا مالک ہوں" مالک نے فخر سے کہا۔

"اب تو بقاء کی جنگ ہے" یونی ورسٹی کے طالب علم ابھی میز پر مصروف تھے۔

"آسائشوں کی بقاء"

"کمپیوٹروں کی بقاء"

"انسانوں کی بقاء"

"اس کے لیے ڈالروں کی ضرورت ہے"

"پٹرول بیچو یا اسلحہ، ڈالر مل جاتے ہیں"

"قرضے پر بھی مل جاتے ہیں"

اخبار نویس نے ایک بڑا سا گھونٹ بھرا اور ٹائلٹ کی جانب چل دیا۔
کیسٹ ختم ہو گئی، ناچنے والے جوڑے اپنی اپنی جگہوں پر آن بیٹھے۔
"تمہارے پھولوں میں خوشبو بہت ہوتی ہے" ایک سفید النسل کہہ رہا تھا۔
"گرم آب و ہوا پھولوں کو خوشبو اور پھلوں کو ذائقہ دیتی ہے" دوسری نسل کا جواب تھا۔

"تمام نبی اور پیغمبر گرم علاقوں میں آئے۔" خالق نے نارویجن لڑکی کو بتایا۔
"امریکی اسلحہ اور عربی پٹرول بھی گرم علاقوں میں پایا جاتا ہے۔" لڑکی بولی۔
"تمہیں گرم علاقے پسند ہیں؟" خالق نے سرگوشی کی۔
"بہت!"
"تم کسی عربی شیخ سے بیاہ کر لو۔"
"اس سے بہتر ہوگا کہ میں کسی امریکن کروڑ پتی کی سکریٹری بن جاؤں۔ لیکن اس وقت تو میلا ناچنے کو جی چاہ رہا ہے۔"
"ناچتے ہیں، ذرا نئی کیسٹ لگنے دو، اتنی دیر تم میری ایک بات سنو۔"
"سناؤ!"
"پٹرول اور بارود کی طاقت کو وقت کی برف ڈھانپ لے گی۔ اب تو ایک اور طاقت ہے جو مستقبل کی بنیاد رکھ رہی ہے۔ ان کے پاس پٹرول ہے نہ اسلحہ و بارود کے کارخانے۔ اُن کے پاس تو اپنا گھر بار بھی نہیں ہے۔ فلسطینیوں سے تم واقف ہی ہو گی؟"
نیا میوزک شروع ہو گیا تھا۔
اخبار نویس نے بئیر کا ایک بڑا گھونٹ بھرا۔ مگ کو خالی کیا اور ٹائلٹ میں جا کر قے کرنے لگا۔
یونی ورسٹی کے طالب علم اپنے تجزیے میں گم تھے۔

۶

مالک نے اپنی کافی ختم کر لی تھی، اب وہ بیٹی سمیت پیاز کاٹ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل پانی بہہ رہا تھا۔
نسلی تعصب کے خلاف منعقد کی جانے والی نئے سال کی پارٹی میں خالق نارویجن لڑکی کے ساتھ ناچ رہا تھا۔
کلاک کی سوئیاں مختلف ہندسوں پر متحرک تھیں۔ گرجا گھروں کی گھنٹیاں ساکن حالت میں اونگھ رہی تھیں۔ ایک برگ کیمپنگ ایریا کی پہاڑی کی یخ بستہ فضا میں جمے قدموں کے

نشانوں کو برف ڈھانپ رہی تھی۔ بارود اور پٹرول کی بو وہاں گھومتی پھر رہی تھی۔ اوسلو شہر کی پبلک ٹرانسپورٹ کی آخری بسیں ڈپو پر کھڑی کی جا رہی تھیں۔ عابد نے اپنی بس کو بند کیا اور اپنا بیگ لیے باہر نکل آیا۔

۷

عابد اپنی عمارت کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور لیٹر بکس دیکھا جو خالی تھا۔ اسے پاکستان پیسے بھیجے کافی دن ہو گئے تھے لیکن رسید ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔ اس نے لیٹر بکس بند کیا اور اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولا۔ اس کی نارویجن ہمسائی کے یہاں نئے سال کی پارٹی شباب پر تھی۔ اس نے وردی اتاری، گھڑی کو الارم لگایا اور بستر پر لیٹ گیا۔ ایک سال اور گزر گیا تھا۔ اس نے بتی بند کر دی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ ریڈیم واچ کے ہندسے چمک رہے تھے اور گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ اس کا ذہن چل رہا تھا۔ پیسے بھیجے کافی دن ہو گئے ہیں لیکن رسید ابھی تک نہیں پہنچی ــــ نہیں پہنچی ــــ نہیں پہنچی۔ باہر برف ہماری قدموں کے نشان ڈھانپ رہی تھی۔

تعزیت

مشہور دانش ور عالم خوندمیری

اردو کے مشہور نقاد اور شاعر سلیم احمد

"اقبال آشنائی" کے مصنف اور بہار یونی ورسٹی مظفرپور میں اردو کے جواں سال استاد

حاتم رام پوری

ہندی کے مشہور شاعر اور ڈراما نویس سردیشور دیال سکسینہ

ہم سے رخصت ہو گئے۔ ادارہ ان کے غم میں سوگوار ہے۔ ان کی ادبی اور علمی خدمات کا اعتراف کرتا ہے اور ان کے پس ماندگان سے تعزیت کرتا ہے۔ ادارہ

سعیدہ گزدر

آدھی گواہی

بیوی :۔ "پہلے کبھی تم اتنے چڑچڑے نہیں تھے ۔ تھکے ہوئے اور نڈھال بھی آتے تو کافی کا ایک پیالہ پی کر تازہ دم ہو جاتے تھے ۔ کہیں ملنے ملانے چلے جاتے تھے ۔ باغ کو پانی دیتے تھے ۔ موسیقی سے دل بہلاتے ....."

شوہر :۔ "اچھا بند کرو اپنا لیکچر ....."

بیوی :۔ "تم کتنے بد دماغ ہو گئے ہو ۔ پہلے مجھے سینما لے جاتے تھے ۔ میرے لیے ریکارڈ خرید کر لاتے تھے ، کوئی اچھی سی چیز پڑھ کر سناتے تھے ۔ اب لگتا ہے کہ تمہاری آواز کو بھی دیمک لگ گئی ہے "

شوہر :۔ افسردگی سے " دیمک تو لگ چکی ہے ۔ کہاں گھمانے لے جاؤں ؟ کون سی جگہ رہ گئی ہے سیر و تفریح کی ؟ تمہیں بتاؤ کیا کرنے کو ہے اِس شہر میں شام کے وقت ؟ اور تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ میرے خلاف تحقیقات ہو رہی ہے "

بیوی :۔ " ہونے دو ۔۔۔ تم اپنے کام سے کام رکھو ۔ کیا بگاڑ سکتے ہیں تمہارا ؟ ایسا اچھا پروفیسر یونی ورسٹی کو ملے گا ؟ کتنی محنت کرتے ہو ، طالب علم کس قدر چاہتے ہیں ....."

شوہر :۔ "مجھ سے میری خوبیاں کیوں بیان کر رہی ہو ؟ میں اپنا جج ہوں کیا ؟ انہیں کمبخت طالب علموں کی خاطر یہ سب کچھ جھیل رہا ہوں " اُٹھ کر فائل میز پر پٹخ دیتا ہے ۔

بیوی :۔ "غصہ کیوں کرتے ہو ؟ تمہارا بلڈ پریشر بڑھ جائے گا "

شوہر :۔ "کسی نے جا کر شکایت لگا دی کہ میں کلاس میں مذہب اور ملک کے خلاف بات کرتا ہوں ....."

بیوی :۔ "شش ..... تم نے پھر شروع کر دیا "

شوہر:۔ "کیا کیا تھا میں نے؟ یہی نا کہ ڈارون کی تھیوری جس طرح میں نے بھی اور پڑھی ہے اسی طرح پڑھاؤں گا تو شاید یونی ورسٹی کے لیے قابلِ قبول نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ متحن تم کو فیل کر دے۔ لہٰذا نصاب کمیٹی کو یہ فیصلہ کر لینے دو کہ ڈارون کا نظریّہ اسلامی تھا یا غیر اسلامی، اور آیا اسے اسلامی بنا کر پڑھانا ہے یا سائنسی۔ اب بتاؤ اس میں ایسی کیا بات تھی کہ میرے اوپر ملک دشمنی اور لامذہبیت کا الزام لگا دیا۔ میرے خلاف رجسٹر کھل گئے۔ میں دہریہ، نئی نسل کے اخلاق کو بگاڑنے والا اور معاشرے میں پھیلی بے راہ روی کا سبب بن گیا۔"

بیوی:۔ "اس قدر اپنا جی کیوں جلاتے ہو؟ تم بھی دوسروں کی طرح رہو۔"

شوہر:۔ "تنگ آگیا ہوں جھوٹ اور منافقت پڑھا پڑھا کر۔ کلاس میں کہہ دیا کہ پڑھائے دیتا ہوں نصاب کے مطابق، لیکن اپنے آپ کو مجرم سمجھتے ہوئے۔ اور یہ کہ تم لوگوں کو بھی اس تعلیم سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ کیا اتنا بھی نہیں کہہ سکتا، اس قدر ذلت برداشت کرنے کے بعد۔"

بیوی:۔ "وہ بے چارے بھی مجبور ہیں، نوکری کرنی ہے انھیں اس کے لیے ڈگری بھی چاہیے۔"

شوہر:۔ "شوق سے لیں ڈگریاں۔ سالے، اُلو کے پٹّھے۔" سخت برہمی سے "نوکری ہی کریں گے، بلکہ غلامی کرتے رہیں گے۔"

"بیوی:۔ "کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ اب گالیاں بھی دینے لگے۔ اور بس کا کیا قصہ تھا؟"

شوہر:۔ چونک کر "تمہیں کون بتاتا ہے سب کچھ؟"

بیوی:۔ "تمہاری اسٹوڈینٹ ہے نا نائلہ! وہ بتا رہی تھی۔ پہلے مجھ سے کچھ نہیں چھپاتے تھے، ایک ایک بات بتاتے تھے اور اب ۔ ۔ ۔ ۔" روہانسی ہو جاتی ہے۔

شوہر:۔ "پہلے اس قدر کبھی ناقابلِ برداشت نہیں تھا۔ اب یہ گورکھ دھندے بھگتا کر آتا ہوں تو جی نہیں چاہتا دُہرانے کو۔ دماغ پھٹنے لگتا ہے۔"

بیوی:۔ "کیا ہوا تھا؟"

شوہر:۔ "سن چکی ہو نائلہ سے پھر پوچھ رہی ہو۔ تم کو بھی اذیت دینے میں مزا آتا ہے۔"

بیوی:۔ "لیکن وہ کہہ رہی تھی کہ خواہ مخواہ سر کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ انھوں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ بس تعزیتی جلسے میں تقریر کی تھی کہ آپ لوگوں کے دو طالب علم ساتھی محض ڈرائیوروں کی

سفّاکا دار اور غیر ذمہ دارانہ ذہنیت کا شکار ہوئے ہیں ورنہ یوں سڑک پر کچل کر نہ مرتے۔ کیا محض نمازِ جنازہ ادا کر دینا کافی ہے! — یہ سوچنے کا موقعہ ہے اور کسی نتیجے پر پہنچنے کا۔ آخر ہم کب تک ایسے بے درد اور غیر انسانی رویوں کو برداشت کرتے رہیں گے؟ ہماری خاموشی حب الوطنی نہیں ہے، یہ فاشزم کے ہاتھ مضبوط کر رہی ہے۔ ہمارے انسانی جذبوں کے لیے ایک چیلنج بن گئی ہے۔"

شوہر:۔ "یہ سب کہا تھا میں نے! — میں تو بھول گیا۔ بُرا نہیں تھا۔ نائلہ ذہین لڑکی ہے۔"

بیوی:۔ "میں نے بھی یہی سمجھا ہے کہ عمدہ تقریر تھی۔ آخر اس میں کیا غلط بات ہے؟"

شوہر:۔ "بس ہونے والی تفتیش میں انہیں ایک نکتہ اور مل گیا کہ میں نوجوانوں کو دہشت گردی کی تلقین کر رہا ہوں، انہیں تخریبی سرگرمیوں پر اُکسا رہا ہوں۔"

بیوی:۔ "عجب اتنی سختی ہے، ہر بات پکڑتے ہیں تو نہ الجھا کرو ہر جھگڑے میں — لیکن تم عدالت میں بھی بیان دینے پہنچ گئے، کوئی دوسرا پروفیسر کیوں نہیں گیا؟"

شوہر:۔ "الجھا نہ کرو۔ کوئی دوسرا پروفیسر کیوں نہیں گیا"۔ نقل لیتے ہوئے "تم بھی یہی کہو گی۔ غنڈے، بدمعاش — بندوقیں اور مشین گنیں لے کر گھس آئیں اور نہتے طالب علموں کو باقاعدہ نشانہ بنا کر میری نظروں کے سامنے ہلاک کر دیں اور میں خاموش رہوں؟ پھر اُلٹا مرنے والوں اور زخمی ہونے والوں کے خلاف تخریبی سرگرمیوں کے الزام میں مقدمہ چلے اور میں خاموش رہوں؟ یہ بھی نہ کہوں کہ یہ معصوم تھے۔ وہ مسلّح غنڈے جیپوں میں بھر کر آئے تھے۔ ایک کو میں نے پہچان بھی لیا"۔ بہت فخر سے۔

بیوی:۔ "تمہارے خلاف کیس اور مضبوط ہو گیا۔ مرنے والوں کے لیے جا کر گواہی دینا کون سی عقلمندی ہے۔ کیا وہ قبروں سے اٹھ کر تمہارا ساتھ دینے آئیں گے؟"

شوہر:۔ بہت سادگی سے "سب تھوڑی مر گئے۔ جو زخمی ہوتے اور جنہوں نے غنڈوں کا مقابلہ کیا اُن میں سے کسی کو دس سال کی قید اور بیس کوڑے، کسی کو سات سال کی قید اور پندرہ کوڑے...... دوسرے برداشت کر سکتے ہوں گے میں نہیں کر سکا۔"

بیوی:۔ "تمہارے برداشت نہ کر سکنے سے کس کو فائدہ پہنچا؟ کسی کو پتہ بھی چلا کہ کس

نے تمہارا ساتھ دیا؟"

شوہر:۔ "میرا ضمیر مجھے لعنت ملامت نہیں کرتا۔ کیا یہ کافی نہیں؟"

بیوی:۔ "وہ کہتے کیا ہیں؟"

شوہر:۔ "ابتدا ہی کی ہے اِس رائے کے ساتھ کہ میں ملک اور اسلام کا دشمن ہوں۔"

بیوی:۔ "ذلیل! اب وہ کریں گے کیا؟" پہلی بار معاملے کی سنگینی کو پوری طرح سمجھتے ہوئے۔

شوہر:۔ "دیکھو..... کچھ بھی..... نوکری سے نکلوا دیں گے۔ وہ تو طے ہے۔ یہ گھر چھین لیں گے۔ میرے واجبات ضبط کر سکتے ہیں۔ ملک دشمنی کے الزام میں قید کر سکتے ہیں۔ کوئی الزام ثابت ہوئے بغیر بھی جو چاہیں کر سکتے ہیں۔"

بیوی:۔ "پھر کیا ہوگا؟ — میں..... میرا کیا ہوگا؟" پریشانی اور وحشت سے۔

شوہر:۔ مسکراتے ہوئے "ڈاکے ڈالنا شروع کر دینا۔ نام بھی تمہارا سلطانہ ہے۔"

بیوی:۔ "چلو مسکرائے تو تم۔ اب کہیں باہر چلتے ہیں، جو ہوگا سو ہوگا۔ میں اس وقت گھر میں بیٹھی تو گھٹن سے مر جاؤں گی۔"

شوہر:۔ "کہاں چلیں؟"

بیوی:۔ "کہیں بھی" — کچھ سوچ کر "چلو نجیب صاحب کے یہاں چلیں، زیادہ دور بھی نہیں۔"

شوہر:۔ "جب سے میں بلیک لسٹ ہوا ہوں وہ مجھ سے کترانے لگے ہیں۔ بہت سے لوگ ملنے سے گھبراتے ہیں، آنکھ بھی نہیں ملاتے۔"

بیوی:۔ "ہاں مجھے یاد آیا، کل دوکان میں مسز نجیب ملی تھیں۔ کس قدر گرم جوشی سے ملتی تھیں مگر کل بالکل دیکھی ان دیکھی کر دی۔ میں بیکی تو مڑ کر دوسری طرف چلی گئیں۔ مجھے خیال ہوا کہ شاید جلدی میں ہیں۔ اب سمجھ میں آیا۔"

شوہر:۔ "یقین نہیں آتا۔ اس قدر شائستہ اور مہذب لوگ..... یہ سب کیا ہو رہا ہے۔" سخت بھنا کر "اتنا خوف و ہراس ہے جیسے ہم لوگ کسی غیر ملکی فوجی تسلط میں رہ رہے ہیں۔"

بیوی:۔ جلدی سے مسکرا کر تسلی دیتے ہوئے "میں تو نہیں کتراتی۔ ہمیشہ تمہارا ساتھ

دوں گی۔ ساری دنیا تمہارے خلاف ہو جائے پھر بھی تمہیں سچا مانوں گی؟" شوہر کے سینے پر سر رکھ دیتی ہے۔

شوہر پیار سے اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے گلے لگالیتا ہے "کہیں چالاکی سے یہ باتیں کہلوا کر میرے خلاف گواہی تو دینے کا منصوبہ نہیں ہے؟"

بیوی کسمساتے ہوئے شوہر کی گود میں لیٹ جاتی ہے "فکر نہ کرو میری تو گواہی بھی آدھی ہے۔"

مصطفٰی کریم

ناکردہ گناہ

"اب کیا ہوگا؟" سیلی نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ مارے گھبراہٹ کے اس کے ماتھے پر پسینہ بہہ آیا تھا۔ اس کی نگاہیں جھکی تھیں۔ سیلی کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ سامنے منیجر کی جانب دیکھے یا پاس کھڑی ماں سے مدد کی درخواست کرے۔ سیلی کی بیساختہ خواہش ہوئی کہ ماں کے بازو اس کے گرد ہوجائیں اور اس وقت محض چند لمحوں کے لیے سہی وہ اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرسکے۔ لیکن ماں بُت کی طرح بے جان تھی، پاس ہوتے ہوئے بھی دور تھی۔

"کیا منیجر مجھے پولیس کے حوالے کر دے گا؟" سیلی نے پھر اپنے آپ سے پوچھا۔ "پھر ماں کیا کرے گی؟ اپنی قسمت کو روئے گی۔ چونکہ اس کی بیٹی مارک اسپنسر سے ایک بکینی (Bikini) چراتے ہوئے پکڑلی گئی تھی۔ میں نے چوری کیوں کی؟ بُرے بھلے کی تمیز اچانک میرے ذہن سے کیوں مٹ گئی تھی؟ آہ — پتہ نہیں کیوں۔ اب جو بھی ہو میں بھگت لوں گی، کسی اور کو میری پرواہ کیوں ہونے لگی؟"

مختلف خیالات سیلی کے ذہن میں چنگاریوں کی طرح اُڑ رہے تھے۔ غیرارادتاً اس کی انگلیاں ڈفل کے بٹن کو کھینچنے لگیں۔ نیلے ڈفل میں اب ایک ہی بٹن رہ گیا تھا۔

منیجر غصّہ بھری ہوئی نگاہوں سے سیلی کو تک رہا تھا۔ سیاہ بال، ماں سے ذرا دبتا ہوا گورا رنگ اور اُداس آنکھیں۔

"بے وقوف لڑکی! کیا تم اس کی قیمت نہیں ادا کرسکتی تھیں؟" میز پر پڑی سرخ بکینی کی جانب تنفرانہ اشارہ کرتے ہوئے منیجر تقریباً گرجا۔ اس نے سچ ہی کہا تھا۔ نائلن کے بنے ہوئے اس لباس کی قیمت مشکل سے تین پاؤنڈ تھی۔

شیلی نے اثبات میں سر ہلانے کی کوشش کی۔ خوف کی وجہ سے اس کی پشت پر ٹھنڈا پسینہ بہہ رہا تھا۔

"کیا تم اسکول جاتی ہو؟" منیجر نے تلخ لہجہ میں پوچھا۔

شیلی ان دنوں اسکول سے فرار ہو کر بازاروں میں گھومتی رہتی تھی۔ حالانکہ اس کا او (ہ) لیول کا امتحان قریب تھا۔ پھر بھی شیلی کا نوکیلا چہرہ اثبات میں ہل گیا۔

"کیا تمہیں اسکول میں چوری کرنا سکھایا جاتا ہے؟" منیجر نے طنز کیا۔

شیلی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

منیجر کی شرربار نگاہیں ماں پر پڑیں۔ جس کا گول چہرہ دیوار کی طرح سفید ہو گیا تھا ماں کے خشک ہونٹ کانپ رہے تھے اور وہ ملتجیانہ منیجر کی جانب دیکھ رہی تھی۔

"تمہارا باپ کہاں کام کرتا ہے؟ میں اسے ساری روداد بتانا چاہتا ہوں۔" منیجر نے شیلی سے دریافت کیا۔

"جناب وہ مر گیا ہے۔ اگر وہ زندہ رہتا تو پھر ایسی حرکت کرنے کی اسے ہمت نہیں ہوتی۔"

ماں جو اب تک مارے ڈر کے خاموش کھڑی تھی اچانک بول پڑی۔ اسے نجات کی مبہم امید ہو گئی تھی۔

منیجر نے اپنا چشمہ اُتار کر میز پر رکھ دیا اور کچھ سوچنے لگا۔ شیلی کے سیاہ بالوں کی وجہ سے وہ سمجھ چکا تھا کہ ملزم لڑکی ایشیائی نژاد ہے۔ منیجر لبرل پارٹی کی مقامی شاخ کا سکریٹری تھا اور تارک الوطنوں کے لیے کچھ ہمدردی رکھتا تھا۔ اس لڑکی کی عمر مشکل سے پندرہ سال ہے۔ اگر میں نے پولیس کو رپورٹ کی تو اس کی زندگی ہمیشہ کے لیے خراب ہو جائے گی اور اس کی ماں بھی ایک مسلسل عذاب میں مبتلا رہے گی۔ چلو اسے بخشتا ہوں۔ منیجر نے سوچا، عینک چڑھائی اور چبھتی ہوئی نگاہوں سے سیلی کو گھورا۔

"نکل جاؤ یہاں سے۔ خبردار ـــ میری مارکٹ کے قریب آئندہ قدم نہیں رکھنا۔" منیجر نے اپنا بھاری ہاتھ اُٹھا کر خبردار کیا۔

"شکریہ جناب۔ بہت بہت شکریہ۔ مجھ پر چھوڑ دیں، میں اسے درست کر لونگی۔"
سیلی کو حقارت بھری نگاہوں سے لمحہ بھر کے لیے ماں نے دیکھا اور ساتھ ہی منیجر کا بڑی عاجزی سے شکریہ ادا کیا۔

سیلی سر جھکائے اپنی ماں کے ساتھ دفتر سے باہر نکل آئی سنیچر کا دن تھا دکانوں کے اندر اور باہر فٹ پاتھ پر خریداروں کی بھیڑ تھی۔ کشادہ سڑک پر ڈبل ڈیکر بس اور کاریں رینگ رہی تھیں۔ ماں اپنی بیٹی سیلی سے بے خبر، غم وغصہ سے مجروح، خاموش اپنے گھر کی جانب چلی جا رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں اس نے پلاسٹک بیگ پکڑا ہوا تھا جن میں اشیائے خورد و نوش بھری تھیں۔ اکتوبر کا مہینہ تھا، آسمان پر گدلے بادل چھائے ہوئے تھے اور ہوا خنک تھی۔ اخروٹ کے درختوں پر پتے زرد تھے۔ دور تک پھیلی ہوئی ان درختوں کی شاخوں میں جیسے نارنجی شعلے بھڑک رہے تھے۔ ماں کے سر پر سنہرے بال اسکارف کے نیچے سے کھسک کر باہر آگئے تھے اور ہوا میں لہرا رہے تھے۔ کبھی کبھی شدتِ غم سے مجبور ہو کر ماں لمبی سی سانس لے لیتی۔

سیلی بے بس سی ہو کر ماں کے ساتھ چل رہی تھی۔ اسے اپنے جرم کا احساس تھا اس کا بھی رنج تھا کہ محض اُس کی وجہ سے ماں کو آج ذلیل ہونا پڑا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ ماں کی گردن میں باہیں ڈال کر معافی مانگ لے۔ اسے بتائے کہ اس کی بیٹی چور نہیں ہے۔ اس کی سیلی کے دل میں ایک عجیب سی الجھن رہتی ہے جو اس کی سوچ کو گڈمڈ کر دیتی ہے۔ یہ الجھن کیا ہے! کیوں ہے؟

ٹریفک لائٹز کے پاس پہنچ کر ماں اور بیٹی رک گئیں۔ روشنی سبز تھی اور موٹریں گذر رہی تھیں۔ ماں نے ایک پلاسٹک بیگ زمین پر رکھ دیا اور جیب سے ننھا رومال نکال کر اپنے آنسو خشک کرنے لگی۔ سیلی کے دل پر چوٹ لگی۔ اس نے ماں کے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھ دیا۔ لیکن معافی کے الفاظ اس کی زبان پر آ کر اچانک گم ہو گئے۔ ماں نے سیلی کا ہاتھ سختی سے جھٹک دیا۔ ٹریفک لائٹ سرخ ہو گئی۔ سڑک پر گذرنے والی

گاڑیاں رک گئیں جس پلاسٹک بیگ کو ماں نے زمین پر رکھ دیا تھا اسے سیلی نے اٹھالیا۔ ماں اور بیٹی سڑک پر سے گذر گئیں۔ دور کہیں بجلی کڑکی اور ہلکی سی بارش شروع ہوگئی۔

ماں اور بیٹی جب اپنے گھر پہنچیں تو شام تاریک ہو چکی تھی۔ سنسان گھر سرد تھا۔ ماں نے ہال کی روشنی نہیں جلائی۔ سیدھی کچن میں چلی گئی۔ اس نے زمین پر پلاسٹک بیگ پھینکا اور قہرآلود نگاہوں سے بیٹی کو دیکھا۔ سیلی دروازے میں سکڑی کھڑی تھی۔ اس نے کچھ بولنا چاہا لیکن ماں کا بھرپور تھپڑ اس کے گال کو جلا گیا پھر تھپڑ اور گھونسے سیلی پر برسنے لگے۔

"نکمی..... بدذات..... خبیث..... کیا اسپتال میں اسی لیے جانوروں کی طرح میں مشقت کرتی ہوں کہ تو مجھے ذلیل کرے۔ کاش تیرا باپ تجھے بھی گجرات لے جاتا اور تو بھی اس کے ساتھ بس کے حادثے میں ہلاک ہو جاتی..... جنگلی سیلی....."

جملے کے خاتمے کے ساتھ ماں کی لات بیٹی کے کولہے میں پیوست ہوگئی۔ سیلی کے جسم میں جیسے کوئی بند ٹوٹ گیا۔

"ماں! تو خبیث ہے..... تو ذلیل ہے..... تو کتیا ہے..... میں سیلی نہیں سلمہ ہوں..... بے شرم ماں مجھے سلمہ پکار..... سلمہ..... سلمہ..... سلمہ... آہ... ماں"

سیلی یا سلمہ ــ فرش پر پٹخے مار مار کر گرج رہی تھی۔

گجرات کے رہنے والے مہاجر نے اپنی بیٹی کا نام سلمہ ہی رکھا تھا اور اس وقت اذیت اور کرب کے لمحے میں اپنا صحیح نام جتا کر بیٹی اپنے باپ کو یاد کر رہی تھی۔ اس یاد میں اس نے اپنے باپ کو زندہ کر لیا تھا۔ اس کے سامنے شاید وہ اپنا مقدمہ پیش کرنا چاہتی تھی۔

اچانک ماں کا ہاتھ رک گیا۔ جمے ہوئے کہر کی سردی جیسے اس کے جسم میں سرایت کر گئی۔ ماں بے جان سی ہو کر سنک کا سہارا لینے پر مجبور ہوگئی۔ سنک میں لنچ کے جوٹھے برتن پڑے تھے جنھیں سیلی یا سلمہ نے صاف نہیں کیا تھا۔ گالیاں سن کر یاں سکتے میں آگئی تھی۔ کھلے منہ پر اس کا ہاتھ پڑا تھا۔ ذلت کے باعث ایک گھٹی ہوئی چیخ اس کے منہ سے نکل گئی۔ مارے بے بسی کے ماں کے گول چہرے پر گرم گرم آنسو بہنے لگے۔

"آہ سیلی! اتنی ظالم نہ بن..... میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے..... میں بھی

سان ہوں..... مجھے بھی تحفظ چاہیے..... تو ایک دن اِس گھر سے اپنے خاوند کے پاس چلی جاؤں گی..... پھر میں کیا کروں گی؟..... خدایا! میں تنہا نہیں رہ سکتی..... آہ! سیلی مجھے کیا ہو گیا ہے۔" ماں سسکیوں کے درمیان بولتی گئی۔ اس کی بیٹی میں کیوں تبدیلیاں آگئی تھیں، ماں یہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ اسکول سے فرار ہو جانا، رات گئے تک بدقماش لڑکے اور لڑکیوں کے ساتھ ڈسکو (Discotheque) میں وقت گزارنا، گھر کے ضروری کاموں کی جانب سے مکمل لاپرواہی۔ یہ سب بُری عادتیں سیلی میں کیوں آگئی تھیں؟ یہ سوال ماں نے اپنے دوست بِل سے بھی کیا تھا، لیکن بِل کے پاس بھی کوئی تشفی بخش جواب نہیں تھا۔ بِل نے بھی سیلی کو سمجھانے کی کئی بار بے سود کوششیں کی تھیں۔

ویران گھر میں ان گنت لمحے گزر گئے۔ خنک تاریکی میں ماں بیٹی ایک دوسرے سے دور دیر تک آنسو بہاتی رہیں۔ سیلی فرش پر سے سسکتی ہوئی اٹھی اور ماں پر بغیر نگاہ ڈالے سیڑھیوں پر پیر پٹختی ہوئی اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ نفرت، غصہ اور ذلت کے شدید احساس سے سیلی جل رہی تھی۔ بغیر لباس تبدیل کیے وہ اپنے بے ترتیب بستر میں گھس گئی۔

کمرے کے باہر سے بارش کی ٹپ ٹپ کی اداس آواز آرہی تھی۔ بند کھڑکی کے شیشوں سے ہنی سکل کی سبک شاخیں بے قراری سے ٹکرا رہی تھیں۔ چار سال پہلے سیلی یاسلمہ کے باپ نے اس پودے کو لگایا تھا اور اب اس کی شاخیں بالائی منزل تک آگئی تھیں۔ گرمیوں میں ہنی سکل کے گلابی پھولوں کی خوشبو سے گھر بھر جاتا اور پھولوں پر منڈلاتی شہد کی مکھیوں کی گنگناہٹ دور سے آتی ہوئی موسیقی سنائی دیتی۔ لیکن اب سردی تھی، پیاری سی دھوپ میں مدت ہوئی رات کا سرد سایہ پڑ چکا تھا۔ اس وقت سڑک پر جلنے والی برقی روشنی کا زرد سا اُجالا کمرے کے باہر تھا۔ کھڑکی پر ہنی سکل کی مغموم دستک تھی، اس کے پھول کُمہلا گئے تھے اور ان کی خوشبو الوداع کہہ رہی تھی۔ سیلی یاسلمہ کچھ دیر تک نم آنکھوں سے کھڑکی کو تکتی رہی پھر سو گئی۔

دن چڑھ آیا تھا جب سیلی کی آنکھ کھلی۔ اس کا سارا جسم گزشتہ شام کی پٹائی کی وجہ سے دکھ رہا تھا۔ کچھ دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد سیلی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ پاس رکھی میز پر خاکستری اسکرٹ اور گلابی بلاؤز چمکیلے پلاسٹک میں لپٹے ہوئے پڑے تھے۔ اس نئے جوڑے کو بل لایا تھا۔ آئندہ ہفتہ بل اور سیلی کی ماں کی شادی ہو رہی تھی۔ اِن نئے کپڑوں کو اسی دن پہننے کے لیے سیلی کے واسطے بل خرید کر لایا تھا۔ سیلی نے اداسی سے سر ہلا دیا۔ اسے اس خلا کا شدید احساس ہوا جو اس نے باپ کے مرنے کے بعد محسوس کیا تھا۔ اس خلا میں اکثر سیلی نے ماں کے توانا بازوؤں میں پناہ لی تھی۔ لیکن آج اس خلا میں ماں کا سایہ بھی نہیں تھا۔

سیلی کے ہونٹوں پر ایک غمگین مسکراہٹ آگئی جیسے کل ہی والد کی موت کی خبر آئی تھی اور وہ زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔ لیکن ماں نے اسے سینے سے لگا کر اس کے غم کو جذب کر لیا تھا۔ اسے ہمیشہ خوش رکھنے کا عہد کیا تھا اور ماں اس عہد کو نبھا تو رہی تھی۔ سیلی کے لیے وہ کھانا بناتی تھی اس کے کپڑے دھو دیتی تھی۔ لیکن کھانا تو ہوٹلوں میں بھی مل جاتا تھا اور کپڑے لانڈریٹ میں بھی دھل سکتے تھے۔

سیلی کو ماں کی اس قربت کی طلب تھی جو ماں سے بن مانگے ہر وقت ملتی رہتی تھی۔ وہ قربت جہاں ماں بیٹی پاس بیٹھی اپنے مشترکہ غم کو معصوم گفتگو کی شیرینیت میں بھلا دیتی تھیں۔ اسکول میں جغرافیہ اور حساب کی مشکلات، لڑکیوں کے نئے فیشن اور سگریٹ نوشی پر رائے زنی، سب کچھ اسی وقت سیلی کرتی۔ قربت کے ان لمحات میں ماں اکثر اس بھیگی شام کا ذکر کرتی، جب وہ کیمسٹ کی دوکان میں نیل پالش اور لپ اسٹک خریدنے پہنچی تھی لیکن پرس میں غیر متوقعہ ناکافی رقم پا کر افسردہ واپس ہو رہی تھی کہ اچانک پاس کھڑے سنولے نوجوان نے رقم بڑھا دی۔ یہ ملاقات محبت کی بنیاد تھی۔ اسی سنولے نوجوان کی بیٹی سیلی یا سلمہ تھی۔ اس طرح کی باتیں سن کر سیلی کو اپنی زندگی کے تسلسل کا احساس ہوتا۔ وہ تسلسل جو زندہ اور تابندہ ایک

ایشیائی جمان اور اینگلوسیکسن خاتون کے ماضی میں دور تک روشن تھا۔ اس احساس کے ساتھ ایک عجیب سی توانائی سیلی اپنے رگ و پے میں دوڑتی محسوس کرتی۔ باپ کے مرجانے کے بعد بھی یہ احساس تازہ تھا۔

لیکن اب اس احساس کو مٹا دینے کی سعی ہو رہی تھی۔ بااخلاق اور ہمدرد بل، جو ماں کا دوست تھا جو سیلی کے لیے بھی تحفے لاتا تھا جو ماں اور بیٹی کی قربت میں غیر ارادتاً حائل ہو گیا تھا۔ جس سے سیلی کوئی اُنسیت نہیں محسوس کر سکتی تھی وہ اب اس کا سوتیلا باپ بننے والا تھا۔

سیلی کے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ آگئی۔ وہ بے دلی سے اٹھی اور غسلخانے چلی گئی جو لینڈنگ پر تھا۔ جب سیلی باہر نکلی تو اس کی نگاہ ماں کے کمرے پر پڑی، دروازہ آدھا کھلا تھا اور ماں کمبلوں میں لپٹی بے خبر سو رہی تھی۔

"ماں کو گر صرف اپنی زندگی کا خیال ہے تو میں بھی اپنی بابت خود فیصلہ کر سکتی ہوں۔" لینڈنگ پر سے اترتے ہوئے سیلی زیرلب بولی اور بڑے اعتماد سے سیڑھیوں پر اتر گئی۔

ہال میں لاؤنج کا دروازہ کھلتا تھا۔ سیلی کی نگاہ لاؤنج کے اندر گئی تو وہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ لاؤنج میں میز پر بل کی قمیص بڑی نفاست سے تہہ کی ہوئی رکھی تھی ساتھ ہی سلائی کا ڈبہ پڑا تھا جس سے قینچی جھانک رہی تھی۔ قالین پر دو کوشن ساتھ رکھے تھے رات جو تماشا لاؤنج میں ہوا تھا اسے جاننا مشکل نہیں تھا۔

سیلی کے دماغ کے سارے تار کھنچ گئے اور زور زور سے بجنے لگے۔ لپک کر سیلی نے سلائی کے ڈبے سے قینچی نکال لی اور فرش پر ساتھ رکھے دونوں کشن کو کتر کتر کر رکھ دیا۔ پھر وہ دیوانہ وار گھر کے باہر نکل گئی جہاں اخروٹ کے خشک زرد پتے درخت سے ٹوٹ کر ہوا میں اُڑ رہے تھے۔

کتابوں کی باتیں

نوید فکر ـــــــــــ سید سبط حسن

ناشر: مکتبہ دانیال، کراچی ۱۹۸۲ء صفحات ۳۰۴ قیمت: ۳۰/-

سید سبط حسن عہد ساز رسالے "نیا ادب" لکھنؤ اور "لیل و نہار" لاہور کے مدیر تا مدیر ہی نہیں رہے ہیں انھوں نے اس سے قبل بھی کئی معرکہ آرا کتابیں لکھی ہیں۔ "موسیٰ سے مارکس تک" اور "ایران" کے بعد ان کی نئی کتاب "نوید فکر" معرکۃ الآرا ہی نہیں صحیح معنوں میں عہد آفریں کتاب ہے اور بلاشبہ عہد حاضر کی اہم ترین کتابوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔ یوں تو ۳۰۴ صفحوں کی یہ کتاب سات مضامین اور ایک مختصر سے پیش لفظ سے عبارت ہے۔ درحقیقت ہند و پاکستان میں جو بعض بنیادی بحثیں چھڑی ہوئی ہیں اور ہماری آپ کی زندگی جن مسئلوں کی براہ راست زد میں ہے انھیں اس کتاب میں زیر بحث لایا گیا ہے۔ یہ مسئلے اور بحثیں کیا ہیں؟ سمیٹ لیا جائے تو باتیں صرف دو ہیں ـــ ایک عقل اور سائنس پر ایقان اور اعتماد کا سوال اور دوسرا یہ مسئلہ کہ ایشیا میں بالعموم اور ہند و پاکستان کا مستقبل سیکولرازم کے ہاتھ میں ہونا چاہیے یا انھیں مذہبی ریاستیں بننا چاہیے۔

شروع کے تین مضامین ـــ تھیوکریسی، اسلامی ریاست اور سیکولرازم ـــ کتاب کے کلیدی مضامین ہیں اور آخری نوٹ ـــ غلطی ہائے مضامین کوثر نیازی سابق وزیر پاکستان کے جنوں پر اعتقاد کے مسئلے پر ہے لیکن دراصل پوری توہم پرستی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے پھر اسلوب ایسا شگفتہ اور دل نشیں ہے کہ پوری کتاب محض علمی نہیں ادبی شاہکار بن جاتی ہے۔ کتاب عقلی استدلال کو وہ نما بناتی ہے اور عقل کا بھرپور دفاع کرتی ہے ایسا دفاع جو آج کل بالخصوص پاکستان

ں ایک بہت بڑی تاریخی ضرورت کو پورا کرتا ہے گو متقشف اور تنگ نظر نام نہاد "مذہبی" مگر درحقیقت
ہم پرست معاشرے میں خوشگوار اور فرحت بخش ہوا کا پہلا جھونکا ہے۔ پیش لفظ میں سبط حسن لکھتے ہیں:

"مصنف کی دلیلیں یا دعوے اگر غلط ہوں تو ان کو بے شک رد کر دیجیے۔ مشتعل ہونا قوت استدلال کے ضعف کی علامت ہوگی، قلم کا جواب زبان قلم سے دینا ارباب فہم کا مسلک ہے۔ اس لیے کہ خیالات کو بہتر خیالات ہی سے شکست دی جا سکتی ہے اور گمراہیاں راستی کی راہ دکھانے ہی سے رک سکتی ہیں نہ کہ احتساب کی آہنی دیواروں سے۔ پاپائے روم کی روحانی سلطنت میں احتساب کا باقاعدہ ایک محکمہ صدیوں سے قایم ہے۔ پرانے زمانے میں تو ممنوعہ کتابیں اور ان کے مصنف دونوں کو آگ میں زندہ جلا دیا جاتا تھا پھر بھی نئے نئے خیالات پیدا ہوتے رہے۔ سرسید اور علامہ اقبال کی تحریروں کے خلاف جو فتوے لگے ان سے جگ ہنسائی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ زمانے نے سچ اور جھوٹ کا فیصلہ کر دیا..... جذباتیت، تنگ نظری اور ناروا داری ذہنوں پر اس قدر حاوی ہے کہ نئی فکر کی تازہ ہوائیں ادھر کا رخ کرتے ڈرتی ہیں.....
یہ روش اگر جلد نہ بدلی گئی تو ہم اپنی نئی نسلوں کو شاہ دولے کے چوہوں کے سوا کچھ میں کچھ نہ دے سکیں گے۔"

شاہ دولے کے چوہوں کا تحفہ نئی نسل کو حسن عسکری صاحب مرحوم جدیدیت کے خلاف اپنی ری کتاب میں بڑے طمطراق سے پیش کر چکے ہیں۔ حسن عسکری نے جدیدیت کے پردے میں ، اور معقولیت، سائنس اور سیکولرازم پر کاری ضرب لگائی اور نئی نسل کو گویا اپنے طور پر لعنتوں سے پوری طرح متنفر کر کے وجدان، جمالیات اور مابعد الطبیعات اور سریت کے پر توہم پرستی کے دروازے کھول دیے۔ اب سبط حسن کی یہ کتاب عقل اور معقولیت ہلا عہد نامہ ہے۔

بلاشبہ کتاب کا سب سے اچھا مقالہ سیکولرازم پر ہے جو پاکستان کا مرکزی مسئلہ ہے یہ مسئلہ محض سیاسی نہیں، علمی اور تہذیبی بھی ہے۔ مصنف نے بڑی خوبی سے پہلے سیکولرازم سور کے آغاز و ارتقا کی تاریخ بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ یورپ کے عہد ظلمت میں کس

طرح سائنسی فکر اور سیکولر تصورات کا چراغ جلانے میں مسلمان حکما اور فلسفیوں کا خصوصاً ابوبکر رازی (ف ۹۲۵ء) اور ابن رشد (ف ۱۱۹۸ء) کا بنیادی حصہ رہا ہے بقول ہمبولٹ "عربوں کو طبیعاتی سائنسوں کا حقیقی بانی سمجھنا چاہیے" (ص ۹۱)

اس کے بعد مصنف نے سیکولرازم کے مرکزی تصورات اور بنیادی عناصر کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ "اس (سیکولرازم) کا کلیہ پہلا فکری آزادی ہے یعنی ہر شخص کو اپنے لیے کچھ سوچنے کا حق۔ ۲. تمام فکری امور کے بارے میں اختلاف رائے کا حق۔

۳. تمام بنیادی مسایل مثلاً خدا یا روح کی لافانیت وغیرہ پر بحث مباحثے کا حق

..... سیکولرازم اس معاشرتی اور تعلیمی نظام کو کہتے ہیں جس کی اساس مذہب کے بجائے سائنس پر ہو اور جس میں ریاستی امور کی حد تک مذہب کی گنجائش نہ ہو۔"

فرد، مذہب اور ریاست کے سہ گانی رشتوں کو سبطِ حسن نے بہت واضح طور پر سمجھایا ہے مذہب کی آزادی کا تعلق فرد سے ہے لہٰذا ریاست کا پہلو اس سے خارج ہے۔ فرد کے شہری حقوق کا تعلق ریاست سے ہے لہٰذا مذہب کا پہلو اس سے خارج ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ریاست مذہب سے جدا ہو (ص ۱۶۲) اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ اسلام ریاست کے قیام سے پہلے پھیلا اور حکومت کے جبر سے نہیں پھیلا ورنہ کم سے کم شمالی ہند میں تو مسلمانوں کے سوا کوئی غیر مسلم نہ ہوتا بقول سبطِ حسن:-

"اگر مودودی صاحب اسلام کے لیے ریاست کی قوت قاہرہ کو ضروری سمجھتے ہیں تو وہ مذہب اور ریاست دونوں کی تاریخ سے ناواقفیت کا ثبوت دیتے ہیں۔" (ص ۱۷۰)

۱. سیکولر معاشرے کے ممتاز ادارے ہیں وہ مقننہ جو آزاد اور غیر جانبدار طور پر منتخب ہوئی ہو۔ ۲. وہ عدلیہ جس کو مرکزی خود مختاری حاصل ہو۔

۳. وہ انتظامیہ جو عدلیہ اور عدالتی حاکمیت کی مطیع ہو اور

۴. وہ پریس جو رائے عامہ کے اظہار و تشکیل کا مقبول حربہ ہے (ص ۱۹۶) اور یہ سب ادارے اسلام یا کسی مذہب کے مخالف نہیں اس کے معاون ہو سکتے ہیں۔

اس تعریف اور تجربے کی روشنی میں ترکی اور ہند و پاکستان میں سیکولر فکر کا جائزہ لیا گیا ہے خاص طور پر ترکی میں کٹرپن اور سیکولر آزاد خیالی کے ٹکراؤ کا بڑا ہی خیال انگیز تجزیہ پیش کیا گیا ہے پھر ہندوستان (اور پاکستان) کی سیکولر فکر کا مختصر جائزہ ہے خاص طور پر غالب سرسید احمد خاں، اقبال اور جناح کی فکر کے سیکولر عناصر اور ان عناصر کی حدبندیاں واضح کی گئی ہیں. مصنف نے صنعتی نظام اور سائنسی طریق فکر اور محض مغربی طرز طعام و لباس میں فرق کیا ہے سرسید پر ان کی یہ تنقید بڑی ہی بصیرت افروز ہے کہ انھوں نے اپنی روشن خیالی اور تعقل پسندی کے باوجود مغربی تہذیب ہی کو مغربی تمدن سمجھ لیا تھا گویا انگریزی سیکھ لی تو مسلمانوں کے سبھی مسایل حل ہو جائیں گے اس لحاظ سے وہ مرزا غالب کی فکری سطح تک نہ پہنچ سکے جنھوں نے سرسید کو مغربی تمدن قبول کرنے کا مشورہ دیا تھا اور صنعتی نظام کی خوبیاں بتائی تھیں، انگریزوں کے طرز طعام و لباس کی ثناخوانی نہیں کی تھی (ص ۱۶۴). اس لیے خرابی اگر ہے تو مغرب سے وابستہ سائنسی فکر یا صنعتی نظام یا مشین یا ٹکنالوجی کی نہیں بلکہ مغرب کے اخلاقی اور روحانی انحطاط کا سبب یہ ہے کہ وہاں کا سرمایہ داری نظام سیکولرازم سے غداری کر رہا ہے . . . . کیا کسی نے سنا ہے کہ سوویت یونین یا چین یا ویت نام یا کیوبا یا ہنگری وغیرہ میں بھی مغرب کے سرمایہ دار ملکوں کی طرح نائٹ کلب اور جوئے خانے کھلے ہوئے ہیں یا عیاشی کے اڈے قایم ہیں یا عورتیں سڑکوں پر کھڑی اپنے جسم کا سودا کرتی ہیں" (ص ۱۶۷)

تھیوکریسی اور اسلامی ریاست کے ابواب میں دو اہم نکات اٹھائے ہیں. ایک پروفیسر قمرالدین خاں کے طویل مضمون "اسلام ایک معاشرہ ہے نہ کہ سیاسی نظام" مطبوعہ روزنامہ "ڈان" کراچی مورخہ ۱۴ اگست ۱۹۸۰ء کے حوالے سے (ص ۵۰ سے ۱۱ تک) واضح کیا گیا ہے قرآن اور احادیث میں کہیں مسلمانوں کو ریاست قایم کرنے کی کوئی ہدایت درج نہیں ہے رسول نے سیاسی حکومت ضرور قایم کی مگر وہ تاریخی صورت حال کا نتیجہ تھی ان کے پیغمبرانہ مشن کا بنیادی مقصد نہ تھی (ص ۶۰) اسلام کا بنیادی مقصد فرد کی اصلاح اور عقیدے کی اصلاح ہے.

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اولی الامر کا جو حکم آیۂ قرآنی میں ہے جس مولانا مودودی اسلام کے پورے مذہبی، تمدنی اور سیاسی نظام کی بنیاد اور اسلامی ریاست کے دستور کی اولین دفعہ قرار

دیتے ہیں۔ اس آیت کا کوئی تعلق اسلام کے مذہبی، تمدنی اور سیاسی نظام سے نہیں ہے بلکہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب خالد بن ولید کے زیر قیادت ان کے مشورے کے بغیر عرب فوج کے ایک افسر عمار نے ایک نومسلم عرب کو لڑائی میں پناہ دے دی تھی اور رسول اکرمؐ نے نومسلم کو پناہ دینا تو درست قرار دیا تھا لیکن یہ حکم بھی صادر کیا تھا کہ سالارِ لشکر کی اجازت کے بغیر کسی کو پناہ نہ دی جائے۔ (ص ۶۲)

سبطِ حسن نے بار بار اس بات کو واضح کیا ہے کہ پاکستان کا قیام مسلم اکثریت والے صوبوں کے حق خود ارادیت کے اصول کے تحت عمل میں آیا تھا جو مغرب کا سیکولر نظریے سے متاثر ہے اس کا کوئی تعلق مذہبی ریاست کے تصور سے نہیں تھا یہ شوشہ جماعت اسلامی نے چھوڑا ہے اس پر جسٹس محمد منیر نے اپنی کتاب "جناح سے ضیا تک" میں تفصیلی بحث کی ہے

کتاب کا سب سے دلچسپ مضمون "غلطی ہائے مضامین" ہے جس میں جنوں کے وجود کے بارے میں توہمات زیر بحث آئے ہیں یہاں بھی مصنف نے اپنا عقلی استدلال برقرار رکھا ہے مثلاً کوثر نیازی کی ان دو دلیلوں سے بحث کی ہے کہ :

۱۔ "کسی شے کا نظر نہ آنا اس کے عدم وجود کی دلیل نہیں بن سکتا۔"

۲۔ "کتنے حقائق تھے جو پچھلی صدی کے لوگوں پر منکشف نہ ہوئے تھے آج ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ کیا پچھلی صدی کے لوگوں کا اسے رد کرنا ان کے عدم وجود کی دلیل ہو سکتا ہے۔"

سبطِ حسن نے واضح کیا ہے کہ منکشف ہونا اور دریافت ہونا دو الگ الگ باتیں ہیں۔ بے شک نظر نہ آنا بے شک عدم وجود کی دلیل نہیں لیکن عدم وجود دلیل بھی تو نہیں بن سکتا۔ قدرت کے خزانے میں بے شک اب بھی ایسی لاتعداد چیزیں ہیں جن کا ہم کو علم نہیں مگر بار ثبوت وجود کے ثابت کرنے والے پر ہوگا کہ اس کے منکر پر اور اس ثبوت کے فراہم کرنے کے لیے اسے مستند وسائل معیار اور طریق کار اختیار کرنے ہوں گے۔

ہندوستان میں شاید یہ حیرت سے پڑھا جائے گا کہ جنات کے وجود کی وکالت ایک سابق وزیر مملکت کریں اور سبطِ حسن جیسے سنجیدہ لکھنے والے کو اس مسئلے پر مقالہ لکھنا

پڑے مگر جو لوگ پاکستان سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہاں توہمات کا کتنا اثر ہے، دیواروں پر عاملوں اور تعویذ گنڈے والوں کے نام کتنی جگہ لکھے ہوئے ہیں۔ بے وجہ نہیں ہے کہ انتظار حسین کی کہانیوں میں جنوں اور پریوں کا ذکر اور منیر نیازی کی شاعری میں چڑیلوں کا ذکر سلیم احمد اور ناصر کاظمی کے یہاں عملیات اور وظائف کا چرچا اتنا زیادہ ہوا ہے کہ ممکن ہے ان حضرات کو ان ارواحِ خبیثہ اور غیر خبیثہ کے وجود پر کوثر نیازی ہی کی طرح یقین بھی ہو۔ عقل پر خطِ تنسیخ کھینچنے کے بعد انسان انہی راستوں پر بھٹکتا ہے۔

غرض عقل کی جہاں داری کے قایل سبھی ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے لیے بالخصوص مسلمانوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ یہ مناسب ہوگا کہ اگر یہ کتاب ہندوستان میں بھی شائع کی جائے۔ (م۔ ح)

"تیسری دنیا۔ فوج اور اقتدار اعلیٰ" (ابتدائی بحثیں) مصنف: عبداللہ ملک

کوثر پبلشرز۔ نیو گارڈن ٹاؤن۔ لاہور ۱۹۸۳ء صفحات ۳۳۶ قیمت: ۳۵/-

ہندوستان میں قیمت: ۵۰/-

فوج اور اقتدار اعلیٰ اس دور کے پاکستان کی دوسری اہم تصنیف ہے۔ فکری طور پر اس کا رشتہ "نوید فکر" سے ملتا ہے۔ "نوید فکر" جمہوریت اور سیکولرازم کے تصورات پر ختم ہوئی تھی اور ان الفاظ کے ساتھ:

> "تھیوکریسی میں سربراہ مملکت اور مذہبی ادارے چکی کے دو پاٹ تھے عوام ان کے درمیان پستے رہتے تھے۔" ص ۲۷

فوج اور اقتدار اعلیٰ ان اداروں کی چکی کے اُن پاٹوں کی تفصیل ہے جو عوام کو پیستے رہتے ہیں۔ عبداللہ ملک نے بڑی خوبی کے ساتھ پہلے یہ واضح کیا ہے کہ عدلیہ کی طرح فوج بھی بظاہر غیر جانبدار سمجھی جاتی ہے مگر درحقیقت برسر اقتدار طبقے کا ہتھیار ہوتے ہیں اور ان کے انصاف اور تشدد سے محروم طبقے زیر نگیں رکھے جاتے ہیں۔ فوج کو خصوصی اہمیت ان ممالک میں حاصل ہے جو سامراجی چنگل سے حال ہی میں آزاد ہوئے ہیں اس کی توجیہہ مصنف نے اس طرح کی ہے :۔

"ان نوآزاد ممالک میں جہاں کا معاشرہ بنیادی طور پر زرعی ہوتا ہے وہاں سیاسی اور سماجی تنظیموں کا وجود نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان معاشروں میں کوئی ڈھنگ کی منظم اور مقبول جماعتیں نشوونما نہیں پاسکتیں۔ اگر سامراجی دور میں سامراج پر دباؤ کے لیے سیاسی جماعتیں منظم ہو بھی جاتی ہیں تو سیاسی آزادی کے بعد جب اقتدار کلیتہً زمیندار طبقے یا افسر شاہی کے ہاتھ میں آجاتا ہے تو پھر سب سے پہلے سیاسی جماعتوں کا جو تھوڑا بہت ڈھانچہ بنا ہوتا ہے وہ تہس نہس ہونے لگتا ہے۔" ص۲۸

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"چنانچہ غیر منظم، منتشر اور آبادھاپی والے معاشروں میں فوج جیسی منظم اور چاق و چوبند جماعت ایسے حالات میں اوپری طبقوں کی بقا اور حفاظت کے لیے ایک دیوارِ آہن بن کر ابھرتی ہے اور فوج کی توپ و تفنگ، اس کی وردی، اس پریڈ، یہ سب خصوصیات ایک طرف رعب اور خوف کو جنم دیتی ہیں تو دوسری طرف سرحدوں کے محافظ کے طور پر فوج کو ایک گونہ تقدس بھی حاصل ہو جاتا ہے۔" ص۲۹

حکومت پر فوج کے قبضے کئی طرح کے ہوتے ہیں اور مصنف نے بجا طور پر لکھا ہے کہ:

"فوجی شب خون کو ایک وسیع پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ فوجی شب خون خواہ ترقی پسند مقاصد کے لیے ہو یا رجعت پسند، اس کے کردار کے یقین کا انحصار جہاں ان ملکوں کے مخصوص سیاسی، سماجی حالات اور طبقاتی توازن پر ہوتا ہے وہاں فوج میں شامل افراد اور فوج کے افسران کے اپنے نظریات، تربیت، طبقاتی کردار اور تعلیم پر بھی ہوتا ہے۔" ص۲۰

مصنف نے ان دونوں پہلوؤں پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالی ہے۔ تیسری دنیا کے حال میں آزاد ہونے والے نوآبادیاتی ممالک میں کس طرح فوجی افسروں کو نظریاتی طور پر متاثر کرنے اور پورے ملک میں ایک رجعت پسندانہ فضا تیار کرنے میں امریکی جاسوسی ایجنسیاں خاص طور پر سی۔آئی۔اے کس طرح کارفرما ہوتی ہیں اس کی تفصیل پر پورا ایک باب قائم کیا گیا ہے اور اہم ماخذوں سے استفادہ کیا گیا ہے مثلاً روتھ فرسٹ کی کتاب "بیرل آف گن" کے حوالے

سے سکتے ہیں۔ "بنیادی اہمیت ایجنٹوں کو نہیں بلکہ مقامی دوستوں اور معاونین کو حاصل ہوتی ہے۔۔۔۔ ضروری نہیں کہ ڈالر ہی مہیا ہوں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ خفیہ ایجنٹوں اور مقامی ایجنٹوں کے درمیان نامہ و پیام بھی ہوں ان کے بغیر بھی مغرب کے پاس ایسے ذرائع موجود ہیں جن سے وہ حکومت کے تختے اُلٹا سکتے ہیں اور نئی حکومت کو برسراقتدار رکھ سکتے ہیں کیونکہ بعض ملکوں اور معاشروں میں ایسے جراثیم موجود ہوتے ہیں جو فوجی آمروں کے لیے اور فوجی اقتدار کے لیے راہ ہموار کر دیتے ہیں"۔ ص۲۳۹

سی۔ آئی۔ اے کے خفیہ کاموں کی تفصیل رچرڈ بسل کی دستاویز کے حوالے سے اس طرح بیان کیا ہے۔ رچرڈ بسل کی دستاویز دراصل اس کا وہ خطبہ ہے جو ۸ر جنوری ۱۹۶۸ء کو اس نے سی۔ آئی۔ اے کے اعلیٰ افسروں کو دیا اسے ریکارڈ کر کے ضبط تحریر میں لایا گیا۔ یہ دستاویز کولمبیا یونی ورسٹی کے ہڑتالی طلبا کے ہاتھ لگ گئی۔ اس دستاویز کے مطابق سی۔ آئی۔ اے کے کام ہیں:۔

۱۔ سیاسی مشیر کی حیثیت اختیار کرنا۔

۲۔ کسی فرد کو مالی منفعت کے ذریعے زیر دام لانا۔

۳۔ سیاسی جماعتوں کو فنڈ اور تکنیکی امداد مہیا کرنا۔

۴۔ مختلف تنظیموں یعنی ٹریڈ یونین اور کوآپریٹیو یونین وغیرہ کو امداد بہم پہنچانا۔

۵۔ خفیہ پروپیگنڈہ۔

۶۔ مختلف افراد کو خفیہ طریقے سے تربیت دینا اور ان کو تبادلہ پروگراموں میں شامل کرنا۔

۷۔ اقتصادی محاذ پر سرگرمی کا مظاہرہ۔

۸۔ نیم فوجی سیاسی کارروائی جس کے ذریعے حکومتوں کو بدلا جا سکے۔ ص۲۴۲

فوجیوں اور خاص طور پر فوجی افسروں کی نظریاتی تربیت کا معاملہ اہمیت رکھتا ہے اور اسی طریق کار سے فلپائن، برما، کوریا، لاؤس، گوئٹے مالا، پیرو، بولیویا اور شاہ کے زمانے کے ایران میں سی۔ آئی۔ اے نے موثر کارروائی کی اور انڈونیشیا، چلی، تبت اور کانگو (زائرے) میں کھلم کھلا مداخلت کی۔ پاکستان کی فوجی حکومتوں پر اس کے سائے واضح ہیں۔

دہشت گردی اور اقتدار کی جنگ (باب ۱۶) میں بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے مصنف نے ثابت کیا ہے کہ مسلح مزاحمت اور انقلابی تشدد گردی یا انفرادی قتل و غارت کے طور طریقے موجودہ دور کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ دورِ قدیم سے اقتدار کی جنگ کا حصہ رہے ہیں۔ اس کی مثالیں حضرت مسیح سے فلسطین سے لے کر تاریخ طبری میں رسول اکرمؐ کے زمانے کے واقعات سے دی گئی ہیں اور عام قاری کے لیے بصیرت اور عبرت سے معمور ہیں۔ (ص۲۹۱ تا ۳۰۴)

اسی طرح تیسری دنیا کے نوآزاد ممالک میں فوجوں کے برسرِ اقتدار آنے کی توجیہہ اور ان ممالک کی اقتصادی پس ماندگی سے چودھویں باب میں مختصر طور پر مگر نہایت جامع اور بصیرت افروز طریقے پر کی گئی ہے۔ سامراج نے ان ممالک میں زرعی نظام کو تباہ کر دیا اور اسے انفرادی ملکیت میں دے کر ایک طرف پوری سماجی زندگی کو تہہ و بالا کر دیا۔ دوسری طرف صنعتی ترقی کی طرف لے جانے والے راستے مسدود کر دیے۔

آخری صفحے پر مصنف کی زیرِ طباعت تصنیف "فوج اور پاکستان" کا اشتہار ہے مگر اس موضوع پر بھی اس کتاب میں خاصے بلیغ اشارے ملتے ہیں جہاں کہیں عوام سیاسی تنظیموں اور سماجی اداروں کے ذریعے ملک کی اقتصادی اور سیاسی زندگی میں فعال نہ رہیں گے وہاں فوج اقتدارِ اعلیٰ پر ضرور اثر انداز ہوگی۔ اس اثراندازی کی مصنف نے چار صنفیں بتائی ہیں:۔

۱۔ اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے امورِ سلطنت میں دخیل ہونا۔
۲۔ اپنی طاقت اور دھمکی اور کبھی کبھی بلیک میل کے ذریعے حکومت کے فیصلوں پر اثرانداز ہونا۔
۳۔ طاقت کے زور پر ایک کابینہ کو ہٹا کر دوسری کابینہ کو برسرِ اقتدار لانا اور
۴۔ کھلم کھلا سول حکومت کو ہٹا کر خود اقتدار سنبھالنا۔

پاکستان میں آخری صورت کئی بار پیش آ چکی ہے اور آج بھی ملک اسی صورت حال سے دوچار ہے۔ مصنف نے کتاب کا خلاصہ ایک جملے میں بیان کر دیا ہے:۔

"تیسری دنیا میں ایک منظم عوامی سیاسی جماعت ہی اس مسلح منظم جماعت کا مقابلہ کر سکتی ہے (جسے فوج کا نام دیا جاتا ہے) اور اس کو پیچھے دھکیل سکتی ہے۔"

یہ دونوں کتابیں ایسی ہیں کہ اردو پڑھنے والوں کو فخر ہوگا کہ ایسی سنجیدہ اور معرکتہ الآرا

کتابیں ان کی زبان میں لکھی گئیں۔ ان کتابوں کے مصنف سبط حسن اور عبداللہ ملک ہی مبارکباد کے مستحق نہیں ان کے پڑھنے والے بھی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ اردو محض افسانے کے افسوں اور شاعری کی جھنکار سے نکلی اور علم کے باوقار حلقے میں پہنچی۔

اسی کے ساتھ ہی عبداللہ ملک کی دو اور کتابیں جو ابھی حال میں دستیاب ہوئی ہیں، دونوں کتابیں نہایت اہم ہیں اور اپنے اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کرتی ہیں۔ (م۔ ع)

"داستان دار و رسن" ۱۹۸۰ء صفحات ۳۳۶

کوثر پبلشرز نے چھاپی تھی

اس کتاب میں انقلاب اور انسانیت کی خاطر ہنس کر جان دینے والے شہیدوں کی داستان بڑے ہی دل نشیں پیرایے میں بیان کی گئی ہے۔ ابتدا میں "میری نسل کا تجربہ اور شعور" کے عنوان سے انقلابی شعور کا تجزیہ اور اس کے لیے قربانی دینے کے جوش اور ولولے کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان مقدس اور لایق صد احترام شہیدوں میں فوجی جہازیوں کی جدوجہد میں کام آنے والا میر داد ہے، پاکستان کے نامور نوجوان شہید حسن ناصر، دنیا کا مشہور انقلابی رہنما چی گویرا، فاشی ظلم و ستم کا شکار جیولس فیوچک، پیرس کا انقلابی گبریل پری، انگلستان کا نوجوان شاعر اور ادیب ڈیوڈ گیسٹ، ہسپانیہ کی جمہوریت کی لڑائی میں شہید ہونے والا برطانوی ادیب رالف فاکس شامل ہیں جنھوں نے اپنے حال کی خوشیاں مستقبل کے نونہالوں کے لیے قربان کر دیں اور قربانی و ایثار کی بیغبرانہ مثالیں پیش کیں۔ ان کی زندگی کی داستان انسانی کردار کی صلابت اور خیر کی صلاحیتوں کے درخشاں ثبوت ہیں۔ آخر میں چین کے شہید ادیب اور یوم مئی ۱۸۸۶ء کے مظاہرے میں شکاگو میں شہید ہونے والے مزدوروں پر دو مضمون بھی شامل ہیں۔ یہ وہ مجاہد ہیں جنھوں نے انسانیت کی تاریخ اپنے خون سے لکھی اور جن کے کارنامے ہمیشہ احترام کے ساتھ یاد رکھے جائیں گے۔

(م۔ ع)

پنجاب کی سیاسی تحریکیں، (تیسرا ایڈیشن) مصنف عبداللہ ملک

کوثر پبلی کیشنز۔ لاہور ۱۹۸۲ء صفحات ۲۲۲ قیمت ۲۵/-

فیروز الدین منصور کے نام معنون یہ کتاب پنجاب کی اہم سیاسی تحریکوں کی تاریخ اور ان کے تجزیے سے عبارت ہے۔ ان جماعتوں میں آر۔ ایس۔ ایس، خلافت احرار اور خاکسار تحریکیں شامل ہیں اس ضمن میں قادیانیوں کا بھی ذکر خاصی تفصیل سے کیا گیا ہے اور احرار کی قادیانی دشمنی کا بھی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ پاکستان بننے سے پہلے پنجاب میں جو قوم پرست تحریکیں موجود تھیں یا مسلم لیگ کے علاوہ جو تحریکیں سیاسی طور پر سرگرم تھیں ان کا تجزیہ کیا جائے۔ مصنف نے احرار کا ہمدردانہ اور کسی قدر جانبدارانہ تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ خلائی خدمت گار اور پنجاب میں دوسری قوم پرستانہ تحریکوں کا ذکر رہ گیا ہے، قادیانیوں کا بھی زیادہ معروضی جائزہ ضروری تھا۔ کتاب کی دوسری جلد میں بقیہ تحریکوں کا جائزہ لیا گیا ہے

مصنف نے بڑی خوبی اور دیدہ ریزی سے مسلم لیگ کے علاوہ پنجاب کی دوسری سیاسی تحریکوں کا جائزہ لیا ہے اور ان تحریکوں کے طبقاتی کردار کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں تاریخ کی ماہیت اور اس کے بنیادی محرکات پر نہایت خیال افروز بحث کی ہے۔ (ص ۱۸ تا ۲۰) (م۔ ح)

ناول

بادشاہ کا خون، ——— مصنف: ڈاکٹر آغا افتخار حسین

دانش کدہ۔ پوسٹ بکس ۱۵۲۰، اسلام آباد ۱۹۸۱ء صفحات ۲۸۳ قیمت: ۲۵/-

کبھی کبھی الفاظ عاجز اور بے بس نظر آتے ہیں خاص طور پر تبصرہ نگار کے الفاظ جن کا بس نہیں چلتا کہ اصل کتاب کی رنگینی، وقار اور معنویت کو قارئین تک پہنچا سکیں۔ تبصرہ کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو کتاب کی اصلی مہک کو قاری تک پہنچانے میں عاجز ہے۔ مثلاً بادشاہ کا خون، کو اس طرح بیان کرنا کہ یہ انقلاب فرانس سے قبل ایک فرانسیسی بادشاہ کی محبوبہ ژین کی کہانی ہے جس نے فرانس میں آزادیٔ خیال کی علمبردار انسائیکلو پیڈی تحریک کی حمایت اور حفاظت کی اور اسے سیحی اور مذہبی تنگ نظری اور کٹرپن کا شکار ہونے سے بچا لیا اور اس کی حمایت میں آخر کار بادشاہ کو بھی ہلا

کر لیا۔ نہایت نا کافی اور ناقص تبصرہ ہوگا حقیقت یہ ہے کہ آج ان تمام ممالک کے لیے جہاں مذہب کی اندھی احیا پرستی اور کٹرپن کی آندھیاں چل رہی ہیں اور عقل دشمن اور دانش مخالف تحریکیں فروغ پا رہی ہیں۔ یہ نیم تاریخی ناول بڑی معنویت، بلاغت اور جاذبیت سے معمور ہے۔ مسیحی پادریوں اور انسائیکلو پیڈی عالموں کی بحثیں ناول کی جان ہے لیکن ڈرامائی لمحے بھی کم نہیں مثلاً وہ لمحہ جب انسائیکلو پیڈیا کی طباعت پر حکومت اور کلیسا کی طرف سے پابندی لگ جاتی ہے اور ایک افسر اپنی جان پر کھیل کر انسائیکلو پیڈیا کے مسودات رات کی تاریکی میں ژرین کی خوابگاہ تک پہنچاتا ہے یا ایک فراخ دل پادری اپنے کو خطرے میں ڈال کر جلائی جانے والی اہم کتابوں کا ایک ایک لفظ نقل کر کے انھیں محفوظ کر لیتا ہے۔

یہ بھی تاریخ کا طنز ہے کہ انسائیکلو پیڈی تحریک کے آزاد خیال مفکرین پر مسیحی پادریوں کے کٹرپن کا عذاب ان کے ذوقِ اجتہاد، دانش دوستی، سائنسی، آزاد خیالی کے سلسلے میں اسلام سے متاثر ہونے پر نازل ہوا تھا اور آج اسی اسلام کے نام لیوا ممالک اسی کٹرپن اور اندھی دشمنی اور ظلمت پرستی کا شکار ہیں۔ پاکستان کے معاشرے کی ذہنی پس ماندگی سے پس منظر یہ مختصر ناول بڑا بلیغ شاہکار نظر آتا ہے۔

اس قسم کے جملے بار بار پڑھے جانے اور غور کرنے کے قابل ہیں:

"جب ہمارے پاس خدائے احکام، انجیل مقدس اور اولیا کی ہدایات کی شکل میں موجود ہیں تو ہمیں کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں۔" (ارک بشپ ص۱۱)

"خیالات کا تصادم ذہین معاشرے کی نشانی ہے۔ دو خیالات کے تصادم سے نیا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اگر معاشرہ جاندار ہے تو نیا خیال بھی کسی خیال سے متصادم ہو کر نیا خیال پیدا کرے گا۔ خطرہ وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں خیال کی حرکت کو جبر کے ذریعے روکنے کی کوشش کی جائے۔" (ص۹۰)

"جب عوام اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو وہ کسی ایک فرد یا چند افراد کو قتل یا زخمی نہیں کرتے بلکہ پورے معاشرے کو بدل دیتے ہیں۔ شرپسند فتنہ برپا کرتے ہیں، عوام انقلاب لاتے ہیں۔" (ص۹۶)

کاش یہ کتاب ہندوستان اور پاکستان کے ہر اردو داں تک پہنچ سکتی۔ (م۔ ح)

چشم تماشا (افسانے) ــــــــــــ نجم الحسن رضوی

ماڈرن بک ڈپو، آب پارہ۔ اسلام آباد ۱۹۸۱ء صفحات ۲۱۱ قیمت ۳۰/-

جس افسانوں کا یہ مجموعہ شگفتہ، دل نشیں اور خیال انگیز ہے۔ قرۃ العین حیدر کے گہرے اثرات کے باوجود یہ افسانے محض تہذیبی سرگزشت نہیں ہیں بلکہ دل و دماغ پر چھا جانے والی صورت حال اور فضا آفرینی کی قدرت سے معمور ہیں۔ بعض افسانے سوچنے سمجھنے والوں کے لیے خاصے ڈراؤنے بھی ہیں۔ ان افسانوں میں مصنف کو چونکا دینے کا شوق نہیں بلکہ آنے والے تہذیبی بحران کی آہٹوں کا دھڑکا بھی ہے جو سب کچھ الٹ پلٹ کر توڑ کر دے گا مگر شاید تعمیر کا جذبہ بہت کم دے پائے گا (رشلڈی بلز) یا پھر آدمی دریا جیسی کہانی جو بڑی دل دہلانے والی کہانی ہے۔ نجم الحسن رضوی اگر اس مجموعے کی آخری کہانی "چشم تماشا" کی تکنیک کا شکار نہیں ہوئے اور تہذیبی مسائل کی للکار کو قبول کر سکے تو یقیناً بڑے افسانہ نگار ہوں گے۔ ان کے یہاں امکانات کی بڑی وسعتیں موجود ہیں اور یہ مجموعہ ان کی واضح شہادت پیش کرتا ہے۔

مجموعے کی سب سے اچھی کہانی حوا، سانتا کلاز اور تاج محل ہے جس میں رسمیات سے بالاتر ہو کر عورت اور مرد کے بچے اور کھرے انسانی رشتوں کے تقدس کو بیان کیا گیا ہے یا پھر ایش ٹرے ہے جس کا رمزیت سے بھرپور اختتامیہ لطیف تاثر کی لکیر چھوڑ تا جاتا ہے یا پھر تانگ روز مرہ ہے جس میں عورت سے مرد کے مختلف النوع اور متضاد تقاضے بیان ہوئے ہیں۔

"وہ سوئی ہوئی ہیروئن کو دیکھتا ہے تو اسے ایسا لگتا ہے کہ وہ تو غائب ہے
اور اس کے پہلو میں ماما سو رہی ہے یا کپڑے دھونے والی عورت یا پھر صفائی کرنے
والی ماسی" (ص ۶۷) (م۔ ح)

"شکست ساغر" (سوانح) ــــــــــــ مصنف۔ یونس ادیب

پاک ٹی ہاؤس لاہور میں ادبی جلسے کے خاتمے پر یونس ادیب سے تعارف ہوا تو انھوں نے

ی احتیاط سے کاغذ میں لپٹی پٹائی اور ٹوپی سے پیک کی ہوئی کتاب عنایت کی۔ ہندوستان
پہنچ کر پیکٹ کھولا تو ان کا مختصر سا سوانح 'شکست ساغر' نکلی۔ اردو میں اس سج دھج کی سوانح
ایسی درد مندی، تیکھے پن اور خوب صورتی سے آج تک نہیں لکھی گئی، گویا پورے معاشرے
کے منہ پر بھرپور طمانچہ ہے جو اپنے دانش وروں اور حساس شاعروں کو گداگروں کی زندگی
بسر کرنے پر مجبور کرتا ہے اور وہ صرف دولت احساس کے امانت دار ہونے کے جرم میں
مصروف شاہراہوں پر کھڑے ٹھیلوں کے پیچھے خون تھوکتے تھوکتے کتے بلیوں کی موت
مرتے ہیں۔

ساغر صدیقی کوئی فرضی کردار نہیں، ایک حساس اور بے حد ذہین شاعر کا نام تھا جو
۔ ہور کے بے حس شہر میں اپنی ذہانت اور بے رحم معاشرے کی بے حسی کی بھینٹ چڑھ گیا
کہ وہ صرف شاعر کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتا تھا اور گھٹیا سمجھوتوں کا اہل نہ تھا۔ کبھی
سی مہتر کی جھونپڑی میں پناہ ملی تو کبھی کوئی عسرت کا مارا اسے وقتی طور پر اپنے یہاں
ٹھالایا۔ اور ٹھیک اُس وقت جب شہر میں رائٹرز گلڈ کے انتخابات پر پانی کی طرح روپیہ
بہایا جا رہا تھا، ساغر سڑک پر خون تھوک رہا تھا اور اپنی آخری سانسوں سے معاشرے کا
طنزیہ لکھ رہا تھا۔ ساغر کی کہانی محفوظ کر کے یونس ادیب نے بڑی ادبی اور تہذیبی خدمت
نجام دی ہے۔ ہر جگہ درد مندی اور دلسوزی نمایاں ہے اور اسلوب کی جاں گدازی نے
سے خاصے کی چیز بنا دیا ہے۔

شاعر کے رنگ و آہنگ کا اندازہ اس کے کلام اور اس کی گفتگو کے ان فقروں سے
ہو جائے گا جو یونس ادیب نے جا بجا نقل کیے ہیں:۔

روشنی کا احترام بہت ضروری ہے۔/ ظہیر کاشمیری، ساغر اتم یہاں کیا کر رہے ہو؟ سلفوں میں
خیال کی حفاظت کر رہا ہوں۔/ فقیر بے رنگ ہے۔ کڑی دھوپ کا سایہ ہے۔/ آرزو کے بے نام گوشوں
میں زندگی عنوان تلاش کرنے پر مجبور ہے۔/ ابھی سوالوں کا جواب نہیں ملا۔ سوال بھی خود ہوں اور
جواب بھی خود ہوں۔/ میں اپنے خیال کا غلام ہوں۔ —— اشعار ملاحظہ ہوں۔

جس عہد میں لٹ جائے فقیروں کی کمائی　　　اس عہد کے سلطان سے کچھ بھول ہوئی ہے

چمن پہ دام پہ دُرویش مسکراتا ہے ہر اک مقام پہ درویش مسکراتا ہے
صراحی بزم میں جب قہقہے اگلتی ہے سکوتِ جام پہ درویش مسکراتا ہے
شفق میں خونِ شہیداں کا رنگ شامل ہے فروغِ شام پہ درویش مسکراتا ہے
ساغر پہ واردات سخن بھی عجیب ہے لغزطرازِ شوق ہوں لب ہیں سلے ہوئے
ساقیا اہتمام بادہ کرو وقت کو سوگوار دیکھا ہے

"کیسے کیسے لوگ" (ڈرامے) دوسرا ایڈیشن ابصار عبدالعلی
سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۸۲ء صفحات ۲۴۰ قیمت ۵۰ روپے

ابصار عبدالعلی لکھنؤ یونی ورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں اور پاکستان ٹی وی پر خبریں پڑھنے والے اور ٹی وی ڈراما نگار کی حیثیت سے مشہور ہو چکے ہیں۔ ان کے ٹی وی ڈراموں کا یہ مجموعہ تین فصلوں پر تقسیم ہے۔ یونانی حکمت، مسلم دانش وری اور یورپی اقوام کی سائنسی ترقی کے مختلف نمایندہ کرداروں کی آپ بیتیاں اِن ڈراموں میں پیش کی گئی ہیں۔ خلاصہ ہے عقل و فہم کی حکمرانی قایم کرنے کے لیے توہم، جہالت، ظلمت پرستی اور مذہب کے نام پر اندھی دانش دشمنی کے خلاف جدو جہد میں انسان نے کتنی عظیم الشان قربانیاں دی ہیں ــــ ان کی ڈرامائی سرنوشت ان ڈراموں میں تحریر ہوئی ہے اور یہ وقت کی اہم ضرورت ہے جب مسلمان عقل کو اپنا دشمن سمجھنے لگے ہیں اور دقیانوسیت کو گلے لگا رہے ہیں اس وقت انھیں یاد دلانا ضروری ہے کہ وہ کبھی عقل اور سائنس کا پیغام لے کر ظلمت پرست دنیا کے سامنے آئے تھے اور سارے سماجی اور فطری سائنس انھوں ہی نے عام کیے تھے وہ اس دانش کے سب سے بڑے علمبردار تھے جس کی مخالفت پر وہ آج کمربستہ ہیں اور یہ روایت ان سے ہوتی ہوئی یورپ کے ان دانش وروں تک پہنچی جنھوں نے بڑی قربانیاں دے کر بھی سائنس اور سائنسی فکر کی آبرو باقی رکھی ــــ آج عقل و دانش کی حفاظت میں اٹھائی جانے والی ہر آواز بڑی مقدس ہے اور ابصار عبدالعلی نے تو اس آواز میں تقدس کے ساتھ ساتھ فن کارانہ تہہ داری اور کیفیت بھی برقرار رکھی ہے۔ (م۔ح)

"مہر دو نیم" (مجموعۂ کلام) ـــــــــــــــــــــــ افتخار عارف

حسین لندن ۱۹۸۳ء صفحات ۱۸۴ قیمت ۴۹/-

نہایت دیدہ زیب طباعت سے آراستہ اور ایک چھوڑ دو دو دیباچوں اور متعدد توصیفی تبصروں کے اقتباسات سے پیراستہ افتخار عارف کا یہ مجموعۂ کلام دراصل خود ان کے تخلیقی سفر کا دیباچہ ہے۔ افتخار عارف نے شاعری میں کھردرے پن اور نثریت کے نحوی ڈھانچے کو برقرار رکھ کر ان گھڑ اور غیر مانوس بحروں کے ذریعے احساس اور ادرک کی شعریت کی بازیافت کی کوشش ہے ان کے یہاں یہ شعوری کوشش ملتی ہے کہ نثری آہنگ جہاں تک ممکن ہو قائم رہے نظموں میں یہ کوشش کم تر اور غزلوں میں زیادہ تر کامیاب ہوئی ہے۔ مگر اس تجربے کے لیے صلابت فکر اور ایقان کی مسلسل اور متواتر پشت پناہی ضروری ہے۔ تذبذب سے یہاں خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔ افتخار عارف کا یہ مجموعۂ کلام اس لحاظ سے اردو شاعری میں ایک نئے لہجے کی بازیافت کا دیباچہ بھی بن سکتا ہے۔ (م۔ ح)

"شہر نا پرساں" (افسانے) ـــــــــــــــــــــــ آغا سہیل

سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۸۳ء صفحات ۱۷۱ قیمت ۲۵/-

چوبیس کہانیوں کا یہ مجموعہ آغا سہیل کا دوسرا مجموعہ ہے، 'بدلتا ہے رنگ آسماں' سے لے کر 'شہر نا پرساں' تک آغا سہیل نے فکری اور فنی اعتبار سے طویل سفر طے کیا ہے۔ ان کہانیوں میں تاریخ کی مہریں بھی ہیں، تہذیب کی توثیق بھی ہے اور افسانہ نگار کے ذات کا استناد بھی۔ فیشن اور فارمولے سے دامن کشاں گزرنے والے فن کار نے اپنے گرد و پیش کو اپنے احساس اور اپنے عرفان کے ذریعے دیکھا اور دکھایا ہے۔ ہندوستان سے کسی پاکستانی جنگی قیدی کی بیوی کی لوٹنے کی داستان (فاصلہ)، یا بابا رمضان کی نئی بستی (نئی بستی)، یا فلسطین کے بارے میں کہانی (کارواں دل کا)، مگر شاید فضا آفرینی اور کردار نگاری کی قدرت کے اعتبار سے "گانٹھ" اس مجموعے کی سب سے خوب صورت کہانی ہے (کاش اس کا عنوان بھی خوب صورت ہوتا) پاکستانی معاشرے کی سبھی کاڑی ترچھی تصویریں یہاں موجود ہیں ـــ توہم پرستی، دولت اور تمول کی تلاش، جمہوریت

کی تڑپ، آزادی اور فلاح کی خواہش (جو "گھڑی" اور "شہر نا پرساں" میں) "گھڑی" میں باپ، ماں اور بیٹا تینوں ایک ہی خواب دیکھتے ہیں کہ ہیلی کاپٹر پولنگ بوتھ جانے کے لیے ان پہاڑوں پر اترا ہے جہاں صرف ایک تنہا آدمی رہتا ہے۔ کہانی "شہر نا پرساں" میں پوری معیشت اور معاشرت پر گفتگو کرنے کے بعد جب ایک کردار ریستوران سے نکلتا ہے :۔

"سایہ حرکت کرتا ہوا سڑک پر واپس آگیا۔ اس نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیے اور پھر لمبا لمبا سڑک پر لیٹ گیا اور سسک سسک کر رونے لگا رونے والے تک پہنچ کر اس نے اس کا چہرہ اٹھایا اور حیرت سے کہا "تم؟" وہ بولا "ہاں۔ میں ہوں میں ابھی تک واپس نہیں گیا تھا سڑک کے چھاتی کے نیچے اس کے دھڑکتے ہوئے دل کی کراہیں سن رہا تھا۔ بہت زخم ہیں۔ صدیوں اور قرنوں سے زخم سہہ رہی ہے بے چاری۔ مگر... مگر تم تو واپس چلے گئے تھے؟" "میں... میں" وہ ہکلایا دراصل میں سمجھا کہ وہ جو سایہ ریستوراں میں نظر آیا تھا "کہیں تم وہ تو نہیں ہو؟" (ص ۱۵۱)

سڑک کی چھاتی کے نیچے دھڑکتے ہوئے دلوں کی دھڑکنیں ان کہانیوں میں جا بجا بکھری ہوئی ہیں۔ بے وجہ نہیں ہے کہ ان کہانیوں کے ہیرو ملاں بھنگی، حمیدا کہار، چور، بابا رمضان، بیگماں غلام حسین جیسے لوگ ہیں جو نچلے طبقے کے کردار ہیں مگر ہیں زندگی کے ارمانوں سے بھرپور۔ ان کی رمز شناسی کا حق ان کہانیوں میں ادا ہوا ہے۔ (م۔ ع)

"آج" (افسانے) ———————— انور سجاد

مکتبۂ عالیہ۔ لاہور ۱۹۸۲ء صفحات ۲۰۰ قیمت ۲۵/-

انور سجاد نے ایک دوسری طرز کے افسانے لکھے۔ اپنی اپنی سہولت کے مطابق بعض نے انھیں علامتی کہا، بعض نے تجریدی۔ دراصل انور سجاد مصور بھی ہیں رقاص بھی، اداکار بھی ڈراما نویس بھی اور ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ڈاکٹر بھی۔ انھوں نے مصوری کی طرح اپنی کہانیوں کو بھی انسانی جسم کی موجودگی سے آزاد کرانے کی کوشش کی اور انھیں احساسِ خیال اور علامت سے آباد کرنا چاہا۔ بعض جگہ کامیاب ہوئے بعض جگہ کہانیاں مہمل ہوگئیں بعض کہانیاں محض انشائیہ بن کر رہ گئیں۔

زیرِ نظر مجموعے میں تینوں قسم کی کہانیاں ہیں ـــ بے شک 'گلاٹے'، 'کونپل' اور 'سازشی' کی سی توانائی، ارتکاز اور کیفیت والی کوئی کہانی اس مجموعے میں نہیں ہے۔ 'نئی کونپل' اور 'سازشی' کہانیاں اس مجموعے میں ہیں جو 'کونپل' اور 'سازشی' ہی کا تسلسل ہیں (افسوس ہے کہ 'کونپل' اور 'سازشی' جیسی کہانیوں کو جنم دینے والے اسباب ہنوز انور سجاد کے دیس میں ختم نہیں ہوئے اس مجموعے کی بہترین کہانی 'ماں اور بیٹا' ہے جس میں ارضِ وطن ہے اور بیٹا وطن کا عسکری سپوت ہے جو کمانڈر کی حیثیت سے اپنا فرض پورا کرتا ہے اور ماں کے فاقہ زدہ بیٹے کو جس پر کوئی تمغہ نہیں گولیوں سے چھلنی کر ڈالتا ہے اور "یہ اطمینان کیے بغیر کہ وہ عورت ٹھیک سے مری بھی ہے یا نہیں اپنے ساتھیوں کو آگے بڑھنے کا حکم دیتا ہے۔" (ص۹۵) کیسی بلیغ مگر کھلی ہوئی رمزیت ہے جو پوری صورتِ حال کو علامتوں میں سمیٹ لیتی ہے۔

یہ سیاسی اور عصری رمزیت ان کہانیوں میں جا بجا بہت واضح ہے۔ مثلاً 'عجائب گھر' میں سیاسی تشدد، 'یوریکا' میں بے بسی اور تحقیر، 'نئی کونپل' میں عورتوں کی تذلیل، 'مرگی' میں شخصیت مسخ کرنے والے اقتدار کی بھیانک سازش۔ غرض آج کا معاشرہ (بالخصوص پاکستان کا فوجی دباؤ اور اسلام کے دقیانوسی عقل دشمن اور ظلمت پسند تصور والا معاشرہ) جس طرح فرد کی عزتِ نفس، خودداری اور جمالیاتی بالیدگی کا خون کرتا نظر آتا ہے وہ ان کہانیوں کا موضوع ہے۔

انور سجاد شاید سنسرشپ سے مجبور ہو کر شاید اپنے ذہنی تذبذب اور فکری الجھاؤ کی بنا پر وضاحت تیکھے پن کو جان بوجھ کر الجھا دیتے ہیں اور کہیں جنس زدگی کی آلودگی ان پر ڈال دیتے ہیں کہیں انھیں ٹیڑھے میڑھے جملوں اور الٹے سیدھے خطوط، دائرے، تصویریں، کٹی پھٹی لاشیں اور انسانی جسم کے قطع کیے ہوئے مختلف ٹکڑوں ان ان کہانیوں پر بکھیر دیتے ہیں تاکہ وہ گنجلک ہو جائیں۔ سنسر کی نظر سے بچیں اور قارئین سے اپنی تکنیک کے انوکھے پن کی داد وصول کر سکیں۔ انور سجاد کی فکر ترقی پسند اور انقلابی عناصر سے خالی نہیں لیکن ابھی زیادہ گہری وابستگی اور زیادہ واضح طبقاتی شعور درکار ہے۔

(م۔ح)

"قیدی سانس لیتا ہے" (افسانے) ——————— زاہدہ حنا

روشن خیال، کراچی ۱۹۸۳ء صفحات ۲۲۲ قیمت -/۲۵

بارہ افسانوں کا یہ مجموعہ زاہدہ حنا کے فکروفن کی نئی منزل ہے۔ ان افسانوں میں قرۃ العین حیدر کی رومانوی فضا اور تہذیبی المیے کی پرچھائیوں کے باوجود گہرے زخم خوردہ احساس سے معمور ہیں۔ آراستگی لفظوں، مناظر اور انسانی رشتوں کی بہت بے کرداری بھی خواب کے سے کردار ہیں مگر جن بھروسیوں نے یہ کہانیاں آباد ہیں وہ ہماری آپ کی ہیں۔ ویت نام میں جان دینے والی امریکی نوجوان کا المیہ ہو (زیتون کی ایک شاخ) یا جنسی زندگی کی الجھنیں (جل ہے سارا جال) یا پھر عصری حقیقتوں کی مجبوریاں (رنگ تمام خوں شدہ) سبھی کہانیوں میں رومانوی خلاف اور کیفیت آفرینی کے باوجود تہذیبی آگہی کا واضح شعور اور ہندوستان اور پاکستان میں بٹ جانے والی معاشرت اور گنگا جمنی وراثت کے قتل عام کی ست رنگی دھنک ان کہانیوں میں بکھری ہوئی ہیں۔ "رنگ تمام خوں شدہ" میں کیپٹن رحیم کے ہاتھوں مور کا شکار عصری حقیقت کا بالخصوص پاکستان کی عصری حقیقت کا کیسا بھرپور اظہار ہے۔

"کیپٹن رحیم کے ریوالور نے تولہ بھر سیسہ اُگلا اور پندرہ سترہ گز دور چبوترے پر ناچتے ہوئے جھنکارتے ہوئے مور نے جھونک کھائی۔ اس کے لاجوردی سبز اور سنہری پَر ہوا میں اُڑے اور خون کے چھینٹے اُڑاتا ہوا بدن پھڑکنے لگا۔ وہ طاؤس تھا یا تموز تھا۔ یہ طاؤس کا قتل تھا کہ تموز کا۔ تموز کی . . . . . موت خزاں کی علامت تھی جس کا ماتم عشتار کے ساتھ تمام کنواریاں اور تمام مزارع کرتے تھے۔" ص ۲۱

(م۔ ع)

"اقبال اور ہمارے فکری رویے" (تنقید) ڈاکٹر سلیم اختر

سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۸۲ء صفحات ۲۴۴ قیمت -/۳۰

مفکر عالم اور ممدوح عالم کے دو واضح حصوں میں منقسم یہ کتاب اقبال کے متعلق گیارہ مضامین کا مجموعہ ہے دیباچہ جگن ناتھ آزاد نے لکھا ہے۔ مضامین سلیم اختر کے عام انداز سے کسی قدر مختلف ہیں۔ نہ تو ان میں اقبال کی تحلیل نفسی کی کوشش ہے نہ اقبال کی توصیف کی قوی جہات

کے عمرانی وجوہ سے بحث ہے۔ زیادہ تر مضامین اقبال کے دفاع میں ہیں۔ مصنف نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے اقبال کے غیر ملکی مداحوں کے تبصرے جمع کیے ہیں اور ان کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ (م۔ ح)

"تفہیم و تعبیر" (تنقید) ——————— نظیر صدیقی

کاروانِ ادب۔ ملتان ۱۹۸۳ء صفحات ۲۸۰ قیمت ۳۰/-

نظیر صدیقی کے تنقیدی اسلوب کی پہچان چبھتے ہوئے بلیغ فقرے تھے جن میں آگہی اور شعور کی چنگاریاں اس طرح سمٹ لی جاتی تھیں کہ شاعر اور شاعری کے ابہام و تفہیم کے دریچے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ بعض اچھے خیال انگیز مضامین کے باوجود پڑھنے والے تاثرات و تعصبات والے نظیر صدیقی کی کمی محسوس کریں گے۔ ان مضامین میں ضرب کلیمی کی کمی بھی ہے حد یہ ہے کہ حسن عسکری کی نہایت گمراہ کن کتاب "جدید یا مغربی گمراہیوں کی تاریخ کا خاکہ" پر بھی ان کا اپنے مضمون "فانوس کی گردش میں کیا کیا نظر آتا ہے" حسب معمول بڑی رواداری، نرمی اور غیر ضروری حد تک مدافعانہ ہے۔ وہ یہ بات واضح نہیں کر پائے کہ عسکری مشرق و مغرب کے مزاج کا مفروضہ فرق یا انسان اور آدمی کا موہوم امتیاز دراصل جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کا امتیاز ہے اور اس کا حل جاگیرداری یا مذہبی دورِ قدیم کی طرف وجدان کے سہارے واپسی نہیں ہے بلکہ مادیت پرست لالچی سرمایہ داری نظام سے آگے قدم بڑھا کر اشتراکی سماج کی تعمیر و تشکیل ہے۔ نظیر صدیقی کے مضامین میں نظریاتی سمت کا فقدان جا بجا نمایاں ہے اور ان کو فکری اور فنی تجربے کی قوت سے محروم کرتا نظر آتا ہے۔ (م۔ ح)

کشور ناہید کی تصانیف:

"ملاموں کے درمیان" (شاعری) مکتبہ عالیہ۔ لاہور صفحات ۲۴۰ قیمت: ۳۰/-

"باقی ماندہ خواب" (نثر) سنگ میل پبلی کیشنز۔ لاہور صفحات ۲۴۴ قیمت: ۴۰/-

"میرے لوگ زندہ رہیں گے" (ترجمہ) مکتبہ عالیہ۔ لاہور صفحات ۲۲۴ قیمت: ۲۵/-

کشور ناہید شاعری حیثیت سے مشہور ہیں۔ ان کی نظموں میں تازگی، ندرتِ ادا، جرأتِ احساس اور جرأتِ اظہار موجود ہے۔ وہ ان جرأت مند پاکستانی شاعرات میں ہیں جنھوں نے عورت کی طرح شاعری کی، مرد کے بنائے ہوئے سانچوں میں خواہ مخواہ ڈھالنے کی کوشش نہیں کی یا کم کی۔ ان کی شاعری میں یہ سب کیفیات موجود ہیں، غزلوں میں زیادہ اور نظموں میں کم۔ اس اعتبار سے ان کی شاعری کا پورا کردار ابھی زیرِ تعمیر کہا جا سکتا ہے ان کی نظموں میں ایسے ٹکڑے بھی ہیں:۔

جب آخری سیاست داں آخری آدمی کو بھی
قتل کر دے گا
جب آخری بچہ بھی چاول کے ایک دانے کی
تلاش میں بلک بلک کر مر جائے گا
جب آخری قطرۂ خون بھی
مادرِ وطن کے تحفظ میں صرف ہو جائے گا
جب دعا کا آخری حرف بھی ختم ہو جائے گا
جب آخری گولی بھی سینے کے پار اُتر جائے گی
میں اپنا سر نیچے سے اٹھا کر
اپنی آخری سانسوں کا حساب کروں گی (خود احتسابی)

یہی آہنگ "ایک کہانی" میں — "ایک اور" اور "سورج — سوا نیزے پر" میں بھی سنائی دیتا ہے۔ صرف ایک اور مثال شاید کافی ہے۔ سیاسی جبر اور تشدد کے خلاف احتجاج کی اس آواز میں ناہید نے عورت پر مرد کے جبر و تشدد کے خلاف احتجاج کی آواز بھی شامل کر لی ہے ان کی غزلوں، نظموں میں خیال آفرینی اور ندرتِ احساس کی کمی نہیں ہے البتہ ارتکاز کی کمی کبھی کبھی کھٹکنے لگتی ہے مگر علامتوں کے ذریعے وقت کی بھیانک سچائیوں کی جھلکیوں کی کمی نہیں:

بات تو علامت سے بھی آگے نکل چکی ہے
چھپکلی کی کٹی دم کی علامت ہو کہ

بوسے نوں کی علامت
اب یہ سب خوف کے دوسرے نام ہیں
ہم لوگوں کو اپنے ہی وطن میں جلا وطن کر دیا گیا ہے
کہ ہم بے روح جاندار قصہ گویائی سے بھی منحرف ہیں
(تیسرے درجے والوں کی پہلی ضرورت)

دیکھیے پاکستان میں حالات کی خوشگوار کروٹ کب کشور ناہید کی شاعری کو خوفناک خواب کے کابوس سے نجات دلا کر شعریت کی نکہت بیز ہواؤں سے ہم کنار کرتی ہے۔

"باقی ماندہ خواب" دورِ حاضر کی فکر و فن کو متاثر کرنے والے ادیبوں کی نمایندہ تحریروں کے ترجموں کا مجموعہ ہے جسے کشور ناہید نے ترجمہ بھی کیا ہے۔ ان میں بعض خطوط ہیں بعض انٹرویو بعض تبصرے۔ ان ادیبوں میں آندرے ژید، ژین پال سارتر، آئنسکو، کامیو، یوتے شنکو، سال بیلو اور پیلو نرودا جیسے نام شامل ہیں۔ دورِ حاضر کے تنقیدی تصورات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ مجموعہ قابل قدر ہے۔

"میرے لوگ زندہ رہیں گے" فلسطینی مجاہدہ لیلیٰ خالد کی سوانح عمری ہے جسے کشور ناہید نے انگریزی سے ترجمہ کی ہے۔ لیلیٰ خالد نے فلسطینی مجاہدین کے محاذ کے حکم سے ۔ ۔ بوئنگ کے جہاز کا اغوا کیا تھا اس اغوا کا پورا حال خاصی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ فلسطینی مجاہدین کے حوصلے، اعلیٰ تربیت اور وطن دوستی کی تصویریں اس دل چسپ دستاویز میں جا بجا ملتی ہیں۔ (م۔ ع)

"سازِ سخن بہانہ ہے" (شاعری) ———— ادا جعفری

کمبائن پرنٹرز۔ لاہور ۱۹۸۲ء صفحات ۱۵۹ قیمت ۳۶/-

ادا جعفری کا چوتھا مجموعہ ان کے اندازِ بیان کا نمایندہ مجموعہ ہے۔ مجموعے میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ نظموں میں ساتھ سویرے، اے موج بلا دیکھ، اور میرے گیت ادھورے ہیں اور غزلوں میں سو دے جائیں بھیگے نین، جیسی غزلوں میں برج اور اودھی کے عام فہم الفاظ اور تراکیب بڑی خوبی

سے استعمال ہوئے ہیں۔ غزلوں میں کہیں کہیں احتجاج اور جرأت فکر کی صلابت اور عصری حسیت کا تیکھا پن بھی نمایاں ہوگیا ہے مثلاً:

کہیں سنگ رہ کہیں سنگ در کہ پتھروں کے نگر میں ہوں
یہ نہیں کہ دل کو خبر نہ تھی، یہ بتا کہ منہ سے کبھی کہا
مرے حرف حرف کے ہاتھ میں سبھی آئینوں کی ہیں کرچیاں
جو زباں سے ہو نہ سکا ادا بہ حدود بے سخنی کہا ص ۱۴۰

ہر اک دریچہ کرن کرن ہے جہاں سے گزرے جہاں گئے ہیں
ہر اک دیا آرزو کا لے کر بطرز شمس و قمر گئے ہیں
خزینے دل کے لٹانے والے دلوں میں بسنے کی آس لے کر
سنا ہے کچھ لوگ ایسے گزرے جو گھر سے آئے نہ گھر گئے ہیں

<u>محصولات</u>

۱۔ "سنگ زیست" (افسانے) ——————— سائرہ ہاشمی

نقوش۔ لاہور ۱۹۸۳ء صفحات ۲۴۸ قیمت ۲۵/-

گیارہ کہانیوں کا یہ مجموعہ بیسویں صدی کے مشرق کے انسانی رشتوں کے نازک اور لطیف لمحوں کی داستان بیان کرتا ہے۔ یہ زیادہ تر متوسط طبقے کے گھرانوں کے لمحے ہیں جن میں قدیم روایت کی جھنکار بھی ہے اور بدلتے ہوئے معاشرے کا کرب بھی۔ جذباتیت کا رنگ البتہ گہرا ہے جسے بدلتا ہوا زمانہ بار بار توڑتا اور مسخ کرتا رہتا ہے۔ اس اعتبار سے مار گزیدہ اس مجموعے کی سب سے نمایندہ کہانی ہے جس میں معاشرے کی تبدیلی فرد کو توڑتی اور اس کی نفسیاتی الجھنوں کو دوچند کرتی ہوئی گزرتی ہے۔ (م۔ ح)

۲۔ "دشمن دار آدمی" (افسانے) ——————— احمد داؤد

ندیم پبلی کیشنز۔ راول پنڈی ۱۹۸۳ء صفحات ۱۴۴ قیمت ۲۵/-

احمد داؤد کے افسانوں کے پہلے مجموعے میں زیادہ جرأت مندی زیادہ جارحانہ فکر اور زیادہ کاٹ اور تیز دھار تھی۔ ان کہانیوں میں وہ پہلے والی بات نہیں ہے وہ ان افسانوں میں ذرا مختلف کوچوں میں نکل گئے ہیں البتہ ایک اجنبی روگ، میں ان کا پرانا فن کار واپس آیا ہے۔ جنس کا موضوع احمد داؤد کو علامت کے طور پر راس نہیں آتا۔ (م۔ع)

۳۔ "دیگر احوال آنکہ" _______________ مختار زمن

مدینہ پبلشنگ کمپنی۔ کراچی ۱۹۸۳ء صفحات ۲۰۸ قیمت ۳۶/-

مزاحیہ اور نیم مزاحیہ انشائیوں اور خاکوں کا یہ مجموعہ دل چسپ اور مزے دار ہے۔ بعض مضامین کی نوعیت تقریباتی ہے مثلاً نیاز اور مجنوں، نثار عزیز، راز مراد آبادی، شبنم رومانی وحیدہ نسیم، جمیل زبیری، نامی اور ابن انشا کے بارے میں یا ان کے متعلق تقریبات کے بارے میں مضامین کتاب کے "رونما" والے حصے میں شامل ہیں۔ اقبال پر مصنف کا مضمون خاص طور پر دلچسپ ہے۔ مصنف علامہ اقبال سے اپنی ملاقات کا حال بیان کرتے ہیں۔ علامہ نے پوچھا "وہاں (پاکستان میں) کیا حال ہے؟"

عرض کیا "حضرت کے ارشاد کے عین مطابق ترقی معکوس ہو رہی ہے"

تیوری پر بل پڑا، بولے "کیا مطلب؟"

میں نے کہا کہ آپ ہی نے اس خواہش کا اظہار فرمایا تھا کہ پیچھے کی طرف لوٹ جاؤ

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

یہ سننا تھا کہ حضرت علامہ میری طرف غور سے دیکھنے لگے۔ غالباً وہ بھی ہماری ترقی پر حیرت زدہ ہوئے۔ پوچھنے لگے کہ "ملت اسلامیہ پاکستان نے کون کون سے منصوبے مکمل کر لیے؟ عرض کیا "حضرت! سڑکیں بہت بنائیں۔ پھر ان میں گڑھے پیدا کیے تاکہ تعمیری کام جاری رہے۔ بند بھی باندھے مگر حضرت کے کلام کی خاطر یہ انتظام بھی کیا کہ جوئے کہستاں سل اور پہاڑوں کے دل چیرتی رہے اور کام جاری رہے۔ بجلی بھی بناتے ہیں مگر اس کے بجھانے کا بھی خاص انتظام

کیے ہیں تاکہ پھر کھانے کا موقع ملے۔ اسکولوں، کالجوں کی عمارتیں بھی پوری نہیں بناتے، مردم شماری کا کام جاری ہے مگر یہ کام بھی نا تمام رکھتے ہیں۔۔۔۔ حضور والا نے۔۔۔ خضر۔۔۔۔ کی جو سنت بنائی تھی قوم اس پر عمل پیرا ہے یعنی

راز حیات پوچھ لے خضر خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے

۔۔۔۔ حضور نے عشق پر زور دیا تھا۔۔۔۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ اب عشق ہمارا کل وقتی مشغلہ ہے۔" (ص ۲۶) (م۔ ع)

۴۔ "غالب اور صفیر بلگرامی" ————— مشفق خواجہ
عصری مطبوعات۔ کراچی ۱۹۸۱ء صفحات ۲۰۳ قیمت ۲۵/-

مشفق خواجہ مشہور مستند اور نامور محقق ہیں جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کا پورا پورا حق ادا کرتے ہیں۔ محنت اور دیدہ ریزی سے اس موضوع کے متعلق تمام اہم معلومات اور شواہد یک جا کرتے ہیں۔ تحقیق کے صحیح طریق کار کے مطابق معلومات و شواہد کا تجزیہ کرتے ہیں تقابل کرتے ہیں اور نتائج تک دلایل و براہین کی روشنی میں رسائی حاصل کرتے ہیں۔

زیر نظر کتاب کا موضوع 'جائزہ مخطوطات اردو' کی طرح وسیع اور وقیع نہیں ہے لیکن خواجہ صاحب نے یہاں بھی موضوع سے متعلق تمام اہم معلومات کی فراہمی اور نتیجے تک پہنچنے کی دیانت دارانہ کاوش میں کمی نہیں کی ہے۔ صفیر بلگرامی، سخن اور غالب کے باہمی تعلقات کا مسئلہ خاصہ متنازعہ فیہ رہا ہے۔ سخن صفیر کے شاگرد تھے بعد کو ان سے منحرف ہوگئے اور خود کو غالب کا شاگرد کہنے لگے۔ صفیر غالب کے شاگرد تھے اور ان سے خصوصی تعلقات کے دعوے دار تھے مگر صفیر کے نام غالب کے خط کو بعض محققین نے جن میں قاضی عبدالودود صاحب بھی شامل ہیں جعلی قرار دیا۔

مشفق خواجہ اس خط کو جعلی نہیں مانتے البتہ اس میں قطع و برید کے منکر نہیں۔ صفیر اور غالب کے تعلقات کے سبھی پہلوؤں پر مصنف نے بڑی محنت سے بحث کی ہے مگر سخن واے

شے کو انھوں نے چھوڑ دیا ہے اس کی طرف صرف چند اشارے ہی کیے گئے ہیں۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ
یں سخن دہلوی اور غالب کے تعلقات (یا موعودہ تعلقات) پر خاصہ مواد موجود ہے پتہ نہیں مصنف
ی نظر اس ذخیرے پر تھی یا انھوں نے جان بوجھ کر تصنیف کو صرف صفیر اور غالب ہی تک محدود
کھا ہے اور سخن والے معاملے کو نظر انداز کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سخن ایک تکون کی اہم جہت
ی حیثیت رکھتے ہیں۔

غالب اور صفیر بلگرامی تحقیق کے آئین و آداب کے نقطۂ نظر سے ایک قابل تقلید تصنیف
ہے اور اردو میں ریسرچ کرنے والے طلبا کے لیے بطور خاص مفید ہوگی۔ (م۔ ح)

۔ "حرف دل رس" (مجموعۂ کلام) ——————— شان الحق حقی

دو اکیڈمی سندھ۔ کراچی ۱۹۸۱ء صفحات ۱۵۰ قیمت ۲۰/-

دتی کے محاورے کا لطف لینا ہو تو شان الحق حقی کی شاعری کا سہارا لازمی ہے۔ اب وہ
ہجہ، وہ نظمیں، وہ روزمرہ، ناپید ہے اور ایسا ناپید کہ پڑھے لکھے بھی اب اس کا مزا کیا اس کا
مفہوم تک بھول گئے ہیں۔ دتی کی اردو قافیہ کی جھنکار نہیں تھی۔ نہ اس میں فارسی زدہ ترکیبوں
عمل دخل تھا نہ وہ محض تکلف اور بناوٹ اور کسی قدر رسمی آئین و آداب سے عبارت تھی اس
مواد ہی کچھ اور تھا جس کا بیان لفظوں میں ممکن نہیں ہاں حقی کی شاعری میں کہیں کہیں تیکھے پن
کے ساتھ اس طرح ظاہر ہو گیا ہے کہ بن وضاحت کیے اس کی پہچان ہو جائے۔ ؎

بس اب آتا ہے موسم رنگ و بو کا پڑا تو خاک پر چھینٹا لہو کا

مرے گلکدے کی حسیں کلی تجھے ڈھونڈھتی ہے نظر مری
یہ خبر ملی ہے کبھی کبھی کہ بہار ہے ترے پاگرے

کس جوگے ہم کس گوں کے جب یہ کلنک آئے جو کوئی ہے پاپ سے لکر وہ پاپی کہلائے
حقی اپنی زمینیں بیش تر خود ایجاد کرتے ہیں پھر ان میں خونِ جگر سے نت نئے شعر کہتے ہیں

انوکھے نقش و نگار کھلاتے ہیں ان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ کہتے ہیں آپ بیتی اور ہو جاتی ہے جگ بیتی۔ کیونکہ ان کی قلبی واردات میں اکثر تاریخ اور تہذیب پر گزری ہوئی ان قیاستوں کی کہانیاں بھی ملتی ہیں جو زخم بن کر سامنے آئی ہیں اور شعر بن کر مہک اٹھی ہیں اور اس عمل کے دوران ان کی شاعری جلال و جمال دونوں مرحلوں سے گزری ہے۔ ؎

چھنک اٹھتی ہیں زنجیریں تو پھر چپ رہ نہیں سکتیں
اگر کھلتے نہیں بند سلاسل ٹوٹ جاتے ہیں

حقی پھسلنے والا ہے راجہ کا وہ محل   ہیں آپ جس سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوئے

دھن میں بہار کی ہمیں دشت جنوں کی سمت   جانا پڑا کہ وہ تو مرا راستہ ہی تھا

طوق و سلاسل میں کیوں اب وہ پہلی سی جھنکار نہیں
کون یہ فصل جنوں ہے یارو کیسی فصل بہاراں ہے

جلے گا اب نہ چراغ ستم کہو کہ نہیں   کہیں گے ہم نہ جفا کو کرم، کہو کہ نہیں
اٹھا رہے ہیں وہ رسم جفا کہو کہ غلط   بڑھا رہے ہیں وہ دست کرم کہو کہ نہیں

حقی نے شائستہ لہجے میں غزل کی متاوست کو باقی رکھا ہے۔ عصری حسیت ان کے ہاں لطیف پیرایے میں نتھر کر اور نکھر کے آئی ہے مگر اپنی نشتریت کو محفوظ رکھے ہوئے ہے اور اس اعتبار سے ان کی غزل روایت اور عصری آگہی کا کم یاب آمیزہ ہے۔   (م ۔ ح)

۱۱۔ "رقص جنوں" (مجموعۂ کلام) ——————— ظہیر کاشمیری

مکتبہ عالیہ۔ لاہور   ۱۹۸۲ء   صفحات ۱۳۶   قیمت ۔/۲۰

پاکستان کے ترقی پسند شاعروں میں ظہیر کاشمیری کا نام ہمیشہ عزت و احترام سے لیا جائے گا گھٹا ٹوپ اندھیروں میں بھی انھوں نے امید اور یقین کی شمعیں روشن رکھیں اور اپنی شاعری کے ذریعے حیات اور آگہی کے اُجالے بکھیرے۔ آج کے دور میں جب ظلمت اور گہری ہے اور امید

اور یقین سے لوگا تا صبر آزما ہی نہیں جاں جوکھوں کا معاملہ بن گیا ہے۔ ظہیر کاشمیری کی شاعری کی جگمگاہٹیں کچھ اور بڑھ گئی ہیں ان میں سخت کوشی، اعتماد اور جارحانہ مقاومت ہی نہیں ہلکا سا طنز بھی در آیا ہے۔

اہل ثروت نے بہت چھاپا   آگہی کو دار پر کھنچوا دیا

وحشیوں کو چاک سینے کا ہنر آ جائے گا
گل بدن لوگوں کو خوشبوئے وفا آ جائے گی
زرد شاخوں پر نہ ہوں گے خشک سالی کے نشاں
جھم جھماتی سر پہ ساون کی گھٹا آ جائے گی

یوں ان کی جفاؤں سے ملی ہم کو بصیرت -   ہم جھک نہ سکے گردش ایام کے آگے

ابھی سرد آہوں کا پہرہ ہے لب پر ابھی اشک خوں ریز سے آنکھ نم ہے
مگر اس کے آتے ہی مجھ کو یقیں ہے گزر جائے گا موسم باد و باراں

پورا مجموعہ ایک خاص قسم کی دلجمعی سے روشن ہے اس میں گھبراہٹ، اکتاہٹ، بیزاری اور تنہائی کے کھنڈر نہیں ہیں۔ انسان پر اعتماد اور انسانیت سے محبت کے پھول ہیں زندگی سر کرنے کا حوصلہ ہے جو محض ایک پوز نہیں، زندگی کا پورا رویہ ہے۔ اس کا واضح اظہار عوام اقت کا سرچشمہ ہیں، جیسے نظموں میں ہوا ہے یا وہ خوب صورت نظم

یہاں کی بے آفتاب صبحیں، خنک ہیں بیگانہ شرر ہیں
یہاں کی بے ماہتاب راتیں، ازل سے ناواقف سحر ہیں
مگر گماں ہے قفس کے پیچھے چراغ فردا کا جل رہا ہے
اداس سورج فصیل زنداں پہ ڈھل رہا ہے

ظہیر کاشمیری نے اپنا لہجہ اور اپنا شعری کردار انہی اقدار سے تراشا ہے۔ ان کے کلام میں کٹے ہوئے سر، گھنڈر اور ریت، ویرانیاں اور عذاب کی امیجری نہیں۔ آنگن، شام، صحرا، ساون کی بہار اور زنجیر و شمشیر کی علامتیں ہیں۔ یہ زندہ اور تابندہ شاعری ایک بار پھر ثابت کرتی ہے کہ تاریخ ساز عوامی قوتوں پر اعتماد سے پھوٹنے والے سرچشمے فن کو کس طرح سیراب کرتے ہیں اور ان میں جمالیاتی کیف، تازگی اور نغمگی بھر دیتے ہیں۔ ؎

وہ جن کے دل میں ہے خورشید آگہی کی کرن
انھیں شکایت شب ہائے تیرہ فام نہیں

اعلان

انتظار اور ابھی!

"پاکستان کا احتجاجی ادب نمبر" کی اشاعت میں تاخیر ہوگئی ہے
زحمت انتظار کچھ دن اور!

ادارہ "عصری ادب"

مراسلات

مکرمی تسلیم!

"عصری ادب" کا سادہ سرورق دیدہ زیب کتابت اور بیجا اشتہارات کے فقدان سے رسالے میں ایک مخصوص خوبی کا مجھے احساس ہوا۔ رسالہ اتنا ضخیم نہیں ہے کہ ہفتوں پڑھنے میں گزر جائیں اور نہ ہی اتنا منحنی ہے کہ قاری اسے ایک سانس میں ختم کر دے۔

شجاع خاور نے لطف الرحمان کے کسی شعر پر اعتراض کیا ہے، کچھ سمجھ نہیں سکا اگر ان کا اشارہ اس شعر کی جانب ہے جو صفحہ ۳ پر موجود ہے تو ان کا اعتراض درست ہے۔ چونکہ شعر شاید کسی غزل کا ہے۔ نہ اس میں قافیہ ہے اور نہ ہی ردیف مکمل ہے پہلا مصرعہ؛ ہمارے ساتھ یہی شرط ہے کہ جو بھی چلے

خود اپنی تیغ پر اپنا لہو سجا کے چلے

دوسرے مصرعے سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ سجا کے وزن اور آہنگ پر پہلے مصرعے میں قافیہ ہونا چاہیے تھا۔ اسی طرح 'کے چلے' دونوں الفاظ ردیف ہیں، انھیں پہلے مصرعے میں موجود ہونا چاہیے تھا اسی لیے یہ شعر صحیح مطلع نہیں۔

سیاسی صورت حال اور آڑے ترچھے آئینے اچھے مضامین ہیں لیکن مضمون نگار کا نام نہیں۔ جذبی پر آپ کے مضامین عمدہ ہیں۔ ان کی ایک دو نمایندہ نظموں کو شامل کرنا چاہیے تھا۔ ان کی غزلوں میں کلاسیکس اور جدیدیت کا حسین امتزاج ہے جواب غزلوں میں نظر نہیں آتا۔ جوش مرحوم پر جگن ناتھ آزاد نے اچھی باتیں کہی ہیں کاش جوش مرنے سے پہلے اپنی سوانح عمری 'یادوں کی برات' تحریر نہ کرتے۔ اس

کتاب کو لکھ کر انھوں نے اپنی ذات پر ستم کیا۔ یہ بھی افسوس کا مقام ہے کہ پاکستان میں معتوب ہونے سے پہلے وہ کوثر نیازی کی شاعری کو وہ رتبہ دے رہے تھے جس کی وہ مستحق نہیں تھی۔ بہرحال مجبوری انسان سے کیا نہیں کراتی۔

مظہر امام کی غزل پڑھ کر چند سوالات ذہن میں آتے ہیں۔ ان کی غزل کا شعر ہے:

کئی تھے جلوۂ نایاب مجھ سے پہلے بھی
کس آسرے پہ ترا نقش جاوداں کرتے

اس شعر کا دوسرا مصرع اگر اس طرح ہوتا:

"کس آسرے ترا نقشِ جاوداں کرتے"

تو میرے خیال میں معنوی اعتبار سے یہ مصرع شاعر کے مصرع سے مختلف نہیں ہوگا۔ نیز 'پہ' کے ہٹ جانے سے مصرع میں مزید روانی آگئی ہے۔

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے:

سفینہ ڈوب رہا تھا تو کیوں نہ یاد آیا
تری طلب، ترے ارمان کو بادباں کرتے

اگر طلب ہے تو ارماں بھی یقیناً ہوگا اور یہ ارمان کچھ غیر سا، نامحسوس سا نہیں بلکہ ہر لمحہ موجود اور توانا احساس ہوگا۔ اسی لیے اس ارمان کی حیثیت بادبان سے کم نہیں ہوگی۔ اس خیال کو مدنظر رکھیے تو ارمان کو بادبان بنا لینے کی اطلاع خواہ مخواہ کی تکرار ہے بہرحال پوری غزل میں سادگی ہے، حسن ہے اور صوتی سطح پر آہنگ کا خوشگوار احساس ہے۔

ولی الحق انصاری کی غزل مزید بحث کی محتاج ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ غزل کا ہر شعر معنوی اعتبار سے دوسرے شعر سے مختلف ہوتا ہے۔ پھر بھی یہ اختلاف ایک غزل کی مخصوص فضا کو برہم نہیں کرتا۔ بہ الفاظ دیگر ہر غزل میں معنوی اختلاف کے باوجود ایک مربوط فضا ہوتی ہے۔ محترم شاعر کا پہلا شعر یا مطلع ہے:

نظر آتا نہیں یاں کچھ بھی حجابوں کے سوا
کچھ نہیں ہے رخِ عالم پہ نقابوں کے سوا

اچھا شعر ہے، معنی واضح ہے۔ اس غزل کا ایک اور شعر ملاحظہ کیجیے:

آج تو زاغ و زغن چھائے ہوئے ہیں لیکن
کل فضا میں نہ کوئی ہوگا عقابوں کے سوا

اگر ہم پہلے شعر کی اطلاع کو تسلیم کریں تو زاغ و زغن بھی حجاب ہو سکتے ہیں اور یہ عقاب بھی نقاب پوش تسلیم کیے جائیں گے۔

"سویا ہوا خدا" ہیئت کے لحاظ سے کافی کمزور ہے۔ ہر فن کے کچھ نہ کچھ اصول ضرور ہوتے ہیں۔ فن کاران اصولوں سے کسی حد تک انحراف ضرور کرتا ہے لیکن اتنا بھی نہیں کہ ان اصولوں کی منطق کو بالکل نظر انداز کر دے، مختصر افسانہ نظم کے بہت قریب ہے۔ گو شاعری کی طرح یہ تجریدی نثر نہیں۔ لیکن اس میں بھی بے شمار باتیں اشارے اور کنائے میں کہی جاتی ہیں۔ ان ہی کی مدد سے کردار نگاری کی جاتی ہے، پس منظر پیش کیا جاتا ہے اور واقعات کے تسلسل نیز ان کے ربط پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ مختصر افسانہ میں ایک ہی کردار کی گنجائش ہوتی ہے، اس کا رنگ و روپ نکھرتا ہے۔ دوسرے کردار اگر آتے ہیں تو ان حیثیت ثانوی لیکن اس حد تک اہم ضرور ہوتی ہے کہ افسانے کے مخصوص کردار کے تانے بانے کو بننے میں مدد کریں۔

"سویا ہوا خدا" میں افسانہ "میں"، یا افسانہ نگار بہ حیثیت کردار موجود ہے۔ اسے غلط نہیں کہا جائے گا۔ پھر وہ جوان لڑکی ہے جسے نشہ آور دواؤں کی عادت ہے بلکہ وہ عالم نشہ میں ہے۔ یہ بھی بالکل درست ہے۔ افسانے کا یہی اہم کردار ہے۔ ان دو کے علاوہ بھائی، بھاوج، بہن، اردلی، نوکر ہیں۔ ان سب کی رائے زنی ہیں اور یہ سب غیر ضروری ہیں۔ ان کی موجودگی سے قاری کی توجہ اس مجبور لڑکی کی جانب پوری طرح نہیں جاتی، اس کی توجہ پر بار بار ضرب پڑتی ہے۔ پھر اچانک افسانے کا کردار "میں" غائب ہو جاتا ہے اور قاری کے سامنے ایک مکالمہ آ جاتا ہے۔ وہاں وہ لڑکی اپنی ماں کے

سلہ شاعری کی ایک صنعت یہ بھی بیان کی گئی ہے۔

سامنے ایک موثر تقریر کرتی ہے جس سے علم ہوتا ہے کہ وہ نشہ آور دواؤں کی عادی کیوں بنی۔ اگر آپ صرف اس تقریر کو سننے دیں اور افسانے کا باقی حصہ حذف کر دیں پھر بھی ایک مکمل کہانی افسانچے کی صورت میں موجود ہے۔ لیکن مختصر افسانہ یا طویل مختصر افسانہ میں تقریر یا RHETORIC کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا چونکہ اس طرح قاری کو زبردستی کسی واقعے کو مان لینے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

'میں' کا اچانک غائب ہو جانا غیر منطقی ہے۔ افسانے کے اختتام پر دادی اچانک آتی ہیں۔ قاری نہیں سمجھ پاتا کہ اس جہاندیدہ بزرگ خاتون کو اپنے خاندان کی آلودگی کا علم کیوں نہیں ہے۔

جوگندر پال 'کتھا نگر' قاری کو لے جاتے ہیں۔ جہاں پر محلہ مختصر ہے۔ اس قسم کے افسانچے مقبول صنف نہیں ہیں اور نہ کبھی مختصر افسانوں میں ان کا شمار ہوگا۔

'اگلے برس' میں آمنی ایک مجبور اور فراق زدہ DEMENTED یا نیم پاگل کردار ہے۔ لیکن افسانہ نگار نے اس میں MELODRAMA لاکر سخت زیادتی کی ہے۔ یہاں بھی ثانوی کردار کی بھرمار ہے جن کے بغیر افسانے کا ارتقا ہو سکتا تھا نیز آمنی کے خاوند کا فسادات میں مارے جانا، پھر اس کا دل نکال کر پاکستان لے جانا اور وہاں دفن کرنا، یہ سب FANTASIA ہیں جس سے نئے افسانہ نگاروں کو سخت گمراہی ہوگی۔ یہ افسانہ بھی خواہ مخواہ طویل بنایا گیا ہے اس لیے افسانہ اکتا دیتا ہے اور اس کے تاثر میں بہت کمی ہو جاتی ہے۔

خیر اندیش   مصطفےٰ کریم

(برطانیہ اسکابی۔ سکاربرو)

عصری ادب

(سال میں چار بار)

(جنوری تا اپریل ۱۹۸۴ء)

پاکستانی اردو ادب نمبر ۲

نگران

محمد حسن

مدیران

سید بہاء الدین احمد

ڈاکٹر روشن آرا

قیمت

سالانہ: تیس روپے — فی شمارہ: دس روپے

ادارۂ تصنیف۔ ڈی ۷، ماڈل ٹاؤن۔ دہلی

[illegible]

ساتھیو، ہاتھ بڑھاؤ کہ ہیں ہم آج بھی ایک
کون کر سکتا ہے تقسیم ادب کی جاگیر

علی سردار جعفری

فہرست

حرفِ آغاز

ہندوستان کے ادبی حلقوں میں یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ پاکستان کا ادب ٹیڑھا میڑھا ہے۔ وہاں ہر لفظ علامت ہے اور ہر خیال فلسفہ، ہر ادیب ذات کی شناخت کے لیے سمادھی لگائے بیٹھا ہے۔ ایسی باتیں کرتا ہے جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتیں اور پھر ہر بات کا سلسلہ یورپ کے فلسفیوں یا خود دورِ قدیم کے صوفیوں سے جا ملاتا ہے۔ شاعر ہے تو علامتوں میں الجھا ہوا ہے افسانہ نگار ہے تو اس کے افسانے کٹے ہوئے سر، نکلی ہوئی آنکھیں اور چٹختی ہوئی کھوپڑیوں سے آباد ہیں، نقاد ہے تو عقل کے خلاف جہاد کا پرچم بلند کیے ہوئے ایسی بلند آہنگ باتوں میں الجھا ہوا ہے جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتیں۔

یہ تصور بر زیادہ تر کم علمی پر مبنی ہے۔ سچا اور کھرا پاکستانی ادب اکثر ہندوستان کے ادبی حلقوں تک پہنچتا ہی نہیں۔ جو کچھ پہنچتا ہے اس کی پبلسٹی اور مریضانہ پبلسٹی ہم تک پہلے پہنچ جاتی ہے۔ سچ ہے کہ ترقی پسند اور صالح ادب پر غالباً ۱۹۵۲ء میں پابندی لگی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیاں ممنوع قرار دی گئیں اور ادب و دانش کے قاتل کمین گاہوں میں مطمئن ہو کر بیٹھ رہے۔ مگر خیال زنجیریں پہننے پر بھی کسی کے روکے رکتا نہیں ہے بقول مجروح "رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ"۔

دراصل پاکستانی اردو ادب میں جو رمزیت اور علامتی انداز پیدا ہوا ہے وہ بھی وہاں کے حالات کا نتیجہ ہے۔ جبر کا جواب ادب نے اکثر علامتوں کے ذریعے دیا ہے۔ جب برملا اظہار ممکن نہ ہو تو ادیب علامتی طرزِ بیان اختیار کرتا ہے۔ ہندوستان کے ادیبوں نے اس رمز کو نہیں سمجھا اور پاکستانی ادیبوں کی تقلید میں ابہام اور علامت پرستی کو اپنا تو لیا مگر یہ

موش کر دیا کہ ان علامتوں کے پیچھے جبر سیاست نے جو گل بوٹے کھلائے تھے ان سے ان کی معنویت اور بلاغت کو نیا حسن ملا ہے۔ یہاں رمزیت فیشن یا تکنیک نہیں ہے ضرورت ہے۔ قلید کرنے والے اس رمز کو بھول گئے۔

پاکستانی ادب کی ہر علامت کے پیچھے کرب آگہی میں ڈوبی ہوئی دھڑکن ہے، تڑپ ہے اور خونِ جگر کی وہ تراوش ہے جس کے بغیر بقول اقبال سبھی نقش ناتمام رہتے ہیں۔ پاکستانی ادب کا مسئلہ تکنیک نہیں، اظہار کی آزادی، باضمیری اور طہارت فکر ہے اور ان اقدار سے پیدا ہونے والی صلابت اور پاکیزگی عصری ادب کے احترام کی حقدار ہے۔

معذرت

پچھلے شمارے میں منوجہ صاحب کے افسانے کے عنوان کے ساتھ ایک شعر شائع ہوا تھا۔

جلتے ہوئے مکانوں کے منظر بتائیں گے
کیا بات تھی کہ روٹھ گئے زندگی سے ہم

یہ شعر غلطی سے منظر سلیم کے ساتھ منسوب ہوگیا۔ دراصل یہ شعر وسیم بریلوی کا ہے۔ ادارہ غلطی کے لیے معذرت خواہ ہے۔

آڑے ترچھے آئینے

قاتلوں کو مبارک ہو مسعت دشمناں کو نوید ہو کہ عہد حاضر میں قلم مصلوب ہوا شعر و سخن بسوا ہوئے، علم ودانش کے سر سے تاج کجکلاہی گرا، نواگروں کے لبوں پر مہریں لگیں، مغنی سرمہ بہ گلو ہوئے، شرا ور نے تلوار کی دھار پر پارہ پارہ ہوئے، فکر و احساس گریباں چاک ہوئے، حرف حرف لفظ لفظ بے آبرو ہوا اور کاروبارِ شوق کارِ فضول ٹھہرایا سامان تجارت۔ اور یہ سب لفاظی خطابت یا شاعرانہ مبالغہ نہیں، ننگی بوچی حقیقت کا بے کم وکاست بیان ہے۔ یقین نہ ہو تو چاروں طرف بکھرے ہوئے آڑے ترچھے آئینوں کا کوئی ٹکڑا اٹھا لیجیے اور علم ودانش ادب اور فن، شعر و نغمہ اور فکر و احساس کی شکلیں دیکھیے۔ ہم نے ان کی اور اپنی کیا شکل بنالی ہے!

تحریر کی دنیا میں جاسوسی اور رومانی ناولوں سستی کتابوں اور فحاشی اور گندگی، جرم اور تشدد سے معمور "ادب" کا راج ہے کہ تجارت کی قلمرو میں ان کا سکہ چلتا ہے۔ سنجیدہ ادب کبھی دولت کی کنجی نہیں بنا مگر کم سے کم اس کی آبرو قایم تھی اب "عزت سادات" بھی گئی۔ آوازوں کی دنیا میں سستے اور گھٹیا فلمی نغموں کا راج ہے یا تیسرے درجے کی غل غپاڑے کا ایسے میں بھلا خونِ جگر نذر کرنے والے شاعروں اور ادیبوں، نغمہ گروں اور نواسنجوں کو کون پوچھتا ہے۔ ملکِ دانش ور، ادیب اور شاعر اپنے منصب سے ایسا بے دخل ہوا کہ اس کی جگہ ارباب نشاط کی صف میں یا خوشامدیوں کے انبوہ میں ہی رہ گئی ہے اور یہاں بھی اسے اپنی جگہ پر جمے رہنے کے لیے ہر لمحے اقتدار والوں کی شان میں نت نئی تعریفوں کے پُل باندھنے پڑتے ہیں اور اپنے

کو مصلحتوں کی نذر کرنا پڑتا ہے اور اپنی خود داری کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ یہی نہیں خود کو بے شمار رسوائیوں کے لیے آمادہ کرنا پڑتا ہے۔

اس مول تول سے کہیں بڑا خطرہ ادب اور دانش میں عقل اور معقولیت کو درپیش ہے۔ بڑے خوب صورت اور دل آویز پردوں میں عقل دشمن فلسفے پیش کیے جا رہے ہیں اور IRRATIONALISM کو دورِ حاضر کا نجات دہندہ عقیدہ بنایا جا رہا ہے تاکہ عقل پر سے اعتماد اٹھ جائے اور ادیب اور دانش ور اربابِ اقتدار کی پیدا کردہ اس گمراہی پر ایمان لے آئیں کہ حقیقت وہی ہے جو موجود ہے اور تاریخ یا تو محض اندھے اتفاقات کا سلسلہ ہے یا ہر دور تاریک تر دور کا دیباچہ ہوتا ہے۔

اردو ادب کے سیاق و سباق میں غور کیجیے تو ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ ادیبوں کا ایک حلقہ عقل دشمنی کو متبادل نظامِ فکر کے طور پر رائج کرنے کی تگ و دو میں لگا ہوا ہے۔

پاکستان نے تو اس کا سیدھا سادہ حل یہ نکال لیا کہ ۱۹۵۲ء کے لگ بھگ ہی ترقی پسند ادیبوں کی تحریک پر پابندی لگا دی اور دقیانوسیت اور رجعت پسند، ظلمت پرست سبھی تصورات اور نظام ہائے فکر کو پھلنے پھولنے کے موقعے فراہم کر دیے۔ چنانچہ ایک صاحبِ قلم اٹھے اور انھوں نے انسان کی عقل ہی کو اس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیا۔ جذب و جنوں کی وکالت کی اور آنکھ بند کر کے اپنے فن میں کھو جانے کو عینِ عرفان قرار دیا۔ انھوں نے تصوف کا ایک ذاتی نسخہ ایجاد کر لیا۔ جو خدمتِ خلق سے بھی بے نیاز تھا اس میں گنجائش اگر تھی تو اندھے عقیدے کی یا مراقبہ یا اوراد و وظائف کی یا ذات کی مابعد الطبیعاتی تلاش کی —— گویا عقل کا چراغ گل، دانش کی پگڑی غائب —— اور سریت کا بول بالا۔

دوسرے صاحب اٹھے تو روحانیت کا پرچم اٹھائے پرانے یگوں کے سفر پر نکل کھڑے ہوئے کہیں مہاتما بدھ سے ٹکرائے تو کہیں یوگیوں سے کہیں خوابوں کی تعبیریں بتانے والے عاملوں سے کہیں مجذوبوں سے۔ پیغام ایک ہی تھا کہ دنیا دکھی ہے۔ وقت ظالم ہے اور وجود دراصل خود ایک ظلم ہے، پرانے کیا کر پائے جو نئے کر پائیں گے لہٰذا ارتقا کا ذکر، انقلاب اور مستقبل کے تصورات محض فریب ہیں۔

رہا سہا کام تلقین شاہ کے ذریعے پورا ہو گیا۔ اردو ادب نے پہلی بار ارباب اقتدار کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ جن محتسبوں کا مذاق اڑانا اردو شعر و ادب کی روایت رہی ہے اب انھیں کا بول بالا ہوا۔ سائنس، حکمت و دانش، عالمی تاریخ، غرض عقل و فہم مضحکہ ٹھہرے اور محض اعتقاد اور ندمے عقیدے پر ادب کی پوری کائنات گردش کرنے لگی۔

ہندوستان میں معاملہ اتنا سیدھا سادہ نہیں۔ یہاں پاکستان کی دیکھا دیکھی اسی قسم کے عقل دشمن تصورات کو باعزت مقام دلانے کے لیے نئے حربے استعمال کرنے پڑے۔ اول یہ کہ ادب کا تعلق نہ تہذیب اور سماج سے، نہ سماجی معنویت سے ادب تو اپنی ذات کی پہچان میں مبتلا ایک ماورائی مخلوق ہے دوسرے یہ کہ عقل کے پیدا کردہ سارے نظام ناکام ہو چکے۔ اب نجات ہے تو شاید روحانیت یا محض ماورائیت یا محض DECADENT ادب میں۔

ظاہر ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے ان عقل دشمن، علم برداروں کا باہمی ربط ہے اور گہرا ربط ہے رسالے ان کے وسایل ان کے پلیٹ فارم ان کے ارباب اقتدار کے انعام و اکرام ان کے، بقول اکبر الہ آبادی — آنکھیں میری باقی ان کا۔

آج ادب کی سامنے سب سے بڑا خطرہ اسی عقل دشمنی سے تحفظ کا ہے۔ بطور خاص اردو کے ادیبوں کے سامنے وہی چیلنج ہے جو فرانسیسی انقلاب سے پہلے عہد تاریک کے یورپ کے سامنے تھا جہاں کلیسا اور بادشاہ نے متحد ہو کر ہر قسم کی روشن خیالی اور تعقل پسندی کا راستہ روک دیا تھا جس کے تدارک کے لیے بڑی قربانیاں دے کر اور رسوائیاں سہہ کر "والٹیر" اور "دیدیرو" اور ان کے ساتھیوں نے انسائیکلوپیڈیائی تحریک چلائی تھی کہ وہ عہد متوسط کی ظلمت پرستی اور اندھی عقیدہ پرستی سے نکل کر تعقل کی روشنی علم و دانش کو زندہ اور تابندہ رکھ سکیں۔ آج پھر اردو ادب ضمیر کی خریداری اور خلوص کی تجارت ہی کے خطرے سے نہیں ادبا فکر آلودگی فکر اور افکار فکر کے خطرات سے دوچار ہے۔

محمد حسن

پاکستانی ادب کی دو آوازیں

ہندوستانیوں کے نزدیک پاکستان ایک ایسا ملک نہیں جو محض اتفاقیہ وجود میں آ گیا ہو۔ آج ۲۷ سال بعد بھی اس کے پیچھے کارفرما تصورات اور محرکات کا جائزہ ایک تاریخی فریضہ ہے کہ تاریخ محض ماضی کی تماشائی نہیں مستقبل کی تعمیر کا سبق بھی ہے تاریخ سے عبرت بھی ملتی ہے اور نصیحت بھی۔ پاکستان کے بارے میں کوئی فیصلہ کوئی ہندوستانی بالخصوص کوئی ہندوستانی مسلمان اپنے نفع نقصان کے پیش نظر کرے تو کوئی معقول بات نہ ہوگی۔ قبل تقسیم والے ہندوستانی مسلمانوں کو بحیثیت مجموعی فائدہ ہوا ہو یا نقصان، دیکھنا یہ ہوگا کہ پاکستان کے نظریے کے پیچھے کارفرما تصورات کس حد تک تاریخ کی کسوٹی پر پورے اترے۔

کوئی یہ کہے کہ پاکستان دو قوموں کے نظریے کی بنیاد پر بنا تو بظاہر بات معقول معلوم ہوتی ہے لیکن اگر ایسا ہوتا تو آج بھی بھارت میں ہندو اور مسلمان دونوں کیوں ساتھ ساتھ رہتے نظر آتے ہیں۔ اگر قومیں مذہب کی بنیاد پر بنتی ہیں تو پھر پاکستان سے بنگلہ دیش کیوں کٹ کر الگ مملکت بن گیا۔ کوئی مانے یا نہ مانے سچ یہ ہے کہ دو قوموں کا نظریہ اور اسلام کا نعرہ مسٹر جناح نے صرف سیاسی مصلحتوں کی بنا پر لگایا تھا تاکہ وہ مذہبی جوش سے سیاست میں کام لے سکیں ورنہ پاکستان

نوٹ:۔ اس مضمون میں قبل تقسیم ملک کے لیے ہندوستان اور بعد تقسیم کے لیے بھارت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کہ التباس نہ ہو۔ (م۔ح)

دراصل مسلم اکثریت والے صوبوں کا الگ وفاق قائم کرنے کا نام تھا یعنی معاملہ صرف یہ تھا کہ برطانوی ہندوستان کی بعض ریاستوں (جو مسلم اکثریت کی تھیں) الگ مرکز چاہتی تھیں گویا پاکستان ریاستوں کی علاقائی خودمختاری کی بنیاد پر قائم ہوا تھا گو اس کے قیام کے لیے مذہبی نعرے بلند کیے گئے تھے۔

علاقائی خودمختاری کی یہ جنگ آج بھی، ۳۷ سال بعد بھی اسی طرح جاری ہے، بھارت میں بھی ـــ اور پاکستان میں بھی۔ اسی علاقائی خودمختاری کے نتیجے میں بنگلہ دیش پاکستان سے الگ ہوکر نیا ملک بن گیا پختونستان کا مسئلہ پیدا ہوا۔ ایک یونٹ والی ایوب خانی اسکیم پارہ پارہ ہوئی اور بلوچستان کی خودمختاری کی جنگ چھڑی، سندھ میں بحالی جمہوریت کی تحریک اسی کا حصہ ہے جے سندھ بھی اسی کا نتیجہ ہے

بھارت میں علاقائی خودمختاری کی مانگ نے تیلگو دیشم کو آندھرا پردیش میں فتح حاصل کی، کشمیر میں نیشنل کانفرنس کا یہی نعرہ ہے، پنجاب میں خالصتان کے پیچھے اور آنند پور ریزولیوشن میں یہی جذبہ کارفرما ہے کہ تین شعبے مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہیں باقی معاملات میں علاقائی ریاست آزاد ہو۔ مدراس میں تمل ناڈو کی تمام تحریکوں کی مانگ یہی ہے، آسام کا مسئلہ بھی اسی طرز کا ہے، مغربی بنگال کی سیاست انقلابی ہے اور ریاست کا یہی رخ ہے۔ غرض ہر علاقہ علاقائی خودمختاری کی مانگ کر رہا ہے اس اعتبار سے دیکھا جائے تو، ۳۷ سال پہلے مسٹر جناح نے جو علاقائی خودمختاری کی آواز بلند کی تھی اس کے مذہبی رنگ و آہنگ سے قطع نظر بنیادی طور پر آنے والے دور کی پیش گوئی تھی۔ یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ۱۹۴۶ء میں کیبنٹ مشن پلان کے تحت مسٹر جناح اور کانگریس دونوں نے یہ اصول تسلیم کر لیا تھا کہ ہندوستان کے ہر علاقے کو خودمختاری کا حق حاصل ہوگا اور اگر بعض علاقے چاہیں تو مرکز سے الگ ہوکر اپنا علیحدہ وفاق قائم کر سکتے ہیں۔

ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی نے اسی بنیاد پر علاقائی خودمختاری کے اصول کی حمایت کی تھی جسے غلطی سے پاکستان کی حمایت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے

کوئی اشتراکی تحریک مذہب کی بنیاد پر قوموں کی تشکیل کو تسلیم نہیں کر سکتی اور ہر اشتراکی بلکہ ہر جمہوری مزاج والا مختلف تہذیبی اور لسانی علاقوں کی خود مختاری کے مطالبے کی ضرور حمایت کرے گا اس لیے اشتراکی تحریکوں کو اپنے اس دور کے نقطۂ نظر پر شرمندگی کا نہیں فخر کرنے کا موقعہ ہے کہ انھوں نے ۳۰ سال پہلے تاریخ کا یہ رخ دیکھ لیا تھا۔

بھارت اور پاکستان آج بھی قومیتوں کے سوال سے دوچار ہیں اور ان کا حل جبر نہیں علاقائی خود مختاری اور رضامندی اور رضاجوئی ہے۔ یہ بات پاکستان کے ارباب دانش اور ارباب اقتدار کے یاد رکھنے کی ہے کہ ان کے ملک کی تشکیل نہ مودودی صاحب نے کی ہے نہ کسی فوجی جنرل نے، نہ کسی تنگ نظر کٹھ مُلّا نے، سیاسی جوش و خروش کے لیے مذہب کا نام ضرور لیا گیا۔ دو قوموں کے نظریے کی دھوم دھام رہی لیکن حقیقت ان کی بنیاد علاقائی خود مختاری کے اصول پر ہے اور جس اصول پر پوری مملکت کی بنیاد ہے اسے وہ مملکت خود اپنی مختلف علاقائی ریاستوں کو محروم نہیں کر سکتا۔

آئیے اب پاکستانی ادب پر ایک نظر ڈالیں۔ ادب فکر و دانش سے الگ نہیں۔ پاکستان کے ارباب اقتدار نے پہلے دن سے آج تک اپنے ملک کو صحت مند اور ترقی پسند خیالات سے جبراً محروم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ۱۹۵۲ء تک ہندوستان اور پاکستان کے ترقی پسند ادیب مشترکہ طور پر ایک مشترکہ جدوجہد میں شریک رہے اور یہ جدوجہد ظلمت پرستانہ خیالات کے خلاف جہاد کی جدوجہد تھی۔ جو سیاسی نہیں فکری اور ادبی تھی مگر راولپنڈی "سازش" والے مقدمے کے بعد پاکستان میں ترقی پسند فکر پر قدغن لگا دی گئی۔

اس سے قبل ہی تاثیر، صمد شاہین، ممتاز شیریں اور حسن عسکری نے پاکستانی ادب اور اسلامی ادب کا نعرہ لگا کر پاکستان کے اردو ادب کا رشتہ برصغیر کی ترقی پسند فکر سے کاٹنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ کوشش یہ تھی کہ پاکستان کا ادیب اسلام یا مسلمان کے نام پر اپنی حکومت کے پیچھے صف آرا ہو جائے اور ہر بھارتی کو بھارتی حکومت یا بھارت کی ہندو حکومت کا حصہ سمجھے۔ سوال آج بھی یہی ہے کہ کیا ہر ملک کا ادیب — خصوصاً بھارت اور پاکستان کا اردو ادیب — اپنے اپنے ملکوں

کی حکومتوں سے پہچانا جائے گا، کیا وہ اپنی اپنی حکومتوں کی سیاسی اور ثقافتی پالیسیوں کا طرفدار، وکیل یا نمایندہ ہوگا یا ہر ملک کے اندر دو گروہ، دو اکائیاں، دو آگاہیاں ہیں۔ ایک اہل اقتدار کی اور ایک عوام کی ـــ ارباب اقتدار چاہیں لڑیں یا ملیں وہ بھارت اور پاکستان دونوں میں ایک ہی برادری کے ہیں دوسری اکائی، آگاہی اور دوسرا گروہ عوام کا ہے، ادیبوں کا ہے، زیردستوں کا ہے اور اس کی اپنی ہم آہنگی رفاقت اور اتحاد متعلقہ حکومتوں کی استحصالی پالیسیوں کے باوجود قائم رہے گا۔

اسی لیے جب یہ کہا جاتا ہے

ساتھیو ہاتھ بڑھاؤ کہ ہیں ہم آج بھی ایک

تو اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ بھارت میں پاکستان ضم ہو جائے اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہوتا کہ پاکستان یا اس کے علاقائی منطقے اپنی پہچان کھو دیں اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہوتا کہ بھارت اور پاکستان کی حکومتیں محبت اور رفاقت کے بندھن میں بندھیں گی۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ دونوں ملکوں کے مظلوم عوام کے درمیان اٹوٹ رشتہ ہے اور ان سے یعنی بھارتی اور پاکستانی زیردستوں سے عہدِ وفا استوار رکھنے والے ادیبوں اور فن کاروں کے درمیان بھی یہی اٹوٹ رشتہ قائم ہے اور قائم رہے گا۔ اہل سیاست سرحدیں کھینچتے رہیں زیردستوں کا اتحاد قائم رہے گا اور زیردستوں کے نغمے گانے والوں کا اشتراک جاری رہے گا۔

اس بات کی بار بار کوشش کی گئی ہے کہ ہر ملک کے ادیب مختلف حالات میں اپنی اپنی حکومتوں کے سیاسی موقف کی تائید کریں اور اگر ان دونوں ملکوں کی حکومتیں لڑ پڑیں تو ادیب بھی اپنی اپنی حکومت کی حمایت میں قلم بکف نکل پڑیں دھرم ویر بھارتی ہندوستانی ادیبوں اور خاص طور پر بھارت کے ترقی پسند اردو ادیبوں پر گرجتے برستے رہے کہ وہ ۱۹۶۵ء کی لڑائی میں رجز اور قصیدے لکھ کر نہ لائے پاکستان میں جوش اور فیض کو بھی یہی لعن طعن سننی پڑی مگر سچ بات ہی یہ ہے کہ زیردستوں کی سیاست، ان کے احساس و ادراک کو ارباب اقتدار

کی سیاست اور ان کے موقف سے الگ ہونا ہی چاہیے اور یہی بھارت اور ہندوستان کے زیر دستوں اور ادیبوں کی نہیں بین الاقوامی سطح پر تمام ترقی پسند طاقتوں اور بالخصوص ترقی پسند ادیبوں اور فن کاروں کے اتحاد کی بنیاد ہے۔

پاکستان میں ترقی پسند فکر کے اس اتحاد پر سب سے پہلا حملہ ممتاز شیریں اور صمد شاہین کے رسالے "نیا دور" کراچی میں ہوا۔ اعتراض یہ تھا کہ پاکستانی ادیب فسادات کا ذکر کرتے ہوئے توازن اور غیر جانب دارانہ سیکولر اندازکیوں برقرار رکھتے ہیں اور کھل کر اس کی ذمہ داری ہندوؤں پر اور بھارتی حکومت پر کیوں نہیں ڈالتے۔ کشمیر کے مسئلے پر محمود ہاشمی کے رپورتاژ چھاپے گئے اور حکومت وقت کے موقف کی کھل کر تائید کی گئی۔

دوسرا حملہ ڈاکٹر تاثیر نے کیا انھوں نے تو ایک سوال نامہ اور منشور مرتب کرنے کی کوشش کی تاکہ پاکستانی ادیب کھل کر یہ بات کہیں کہ "پاکستان کا نیاپن اس بات کا طالب ہے کہ اس کے ساتھ ہماری وفاداری غیر مشروط ہو"۔

(پاکستانی ادب۔ مرتبہ: رشید امجد۔ ۱۹۸۱ء، ص ۱۰۶، جلد ۱)

مقصد سیاسی تھا مگر مطلب برآری ہوئی ادب اور فن کی دہائی دے کر ترقی پسند ادیبوں کی انجمن پر پابندی لگی اور حلقۂ ارباب ذوق کا غلغلہ بلند ہوا۔

حسن عسکری نے تیسرا محاذ کھولا آدمی ذہین تھے پاکستانیت کا نعرہ انھیں بدلتی ہوئی حکومتوں کے گرداب میں لے جاتا، اسلامی ادب کا نعرہ لگا کر احساس ہوا کہ اسلام پر ملاؤں کا حق عسکری صاحب سے زیادہ ہے اور ان کی تعبیر اور تشریح کا تابع ہونا پڑے گا اور یوں بھی یہ بات نئی نسل کو پسند نہ آسکے گی لیکن اگر وجدان کا تذکرہ چھڑے اور تصوف اور مابعد الطبیعات کا ذکر کیا جائے اور رشتہ اس کا مغرب سے بالخصوص فرانسیسی انحطاط پسندوں سے جوڑا جائے تو بات جدید بھی ہو جائے گی اور مولوی سے اور ادلتی بدلتی حکومتوں سے بھی نجات مل جائے گی۔

ان کے پیچھے چلے ہوئے آئے سلیم احمد جنھوں نے ادھورے آدمی کا نچلا دھڑ ڈھونڈ نکالنا شروع کیا تاکہ اسے جنس اور گوشت پوست میں الجھا کر اعلیٰ تر فکر و دانش کے تقاضوں سے محروم کیا جا سکے اور دھیان تاریخی الفاظ کے بجائے تاریخی تنزل کے ماتم پر مرکوز ہو سکے۔

اسی صف میں ذرا پیچھے پیچھے تھے انتظار حسین اور ناصر کاظمی جنھوں نے اردو ادب سے عقل اور معقولیت کو خارج کر کے عقل دشمنی اور ظلمت پسندی کو پرکشش اور باوقار بنانے کی مہم چلائی اور 'خیال' اور 'سات رنگ' کے ذریعے اسے عام کیا کہ یہی تصورات اس مرگ مقدر MEDIEVAL دور کے ساختی سماج کے نشان تھے جو ارتقا کے سامنے پسپا ہو رہا تھا۔ اُجڑی حویلیاں، امام باڑوں کی آخری موم بتیاں، خوابوں کی تعبیریں، توہم پرستیاں، داستانوں میں مکھی بننے والے کردار، دوپہر کی نوجوانوں سرگوشیاں، کچی عمر کی محبتیں، دیواروں پر ڈھلتی ہوئی دھوپ، آسیب زدہ ڈیوڑھیاں۔ غرض مقصد یہ تھا کہ خدارا اپنی اپنی ذات اپنے اپنے طبقے کی توہم پرستیوں کی طرف واپس چلے جاؤ، عقل کی مشعل ہاتھ سے رکھ دو جو روشنی پھیلاتی ہے اور ظلمت بھری پرچھائیاں کو چھین لیتی ہے۔ بعد کو یہی راستہ موڑ کھا کر سریت اور بدھ مت کی روحانی اور طلسماتی علامت پرستی اور جدید مغربی فکر کے وجودی اور 'انحطاطی' عناصر کی طرف گیا ہے اور ان سب کا ملغوبہ ان افسانوں میں نظر آیا۔

ناصر کاظمی نے فکر سے میر کی یاسیت اور ہلکے پھلکے نجی نوحے میں پناہ ڈھونڈھی انھیں کٹے ہوئے پیڑوں، ہجرت کرتے ہوئے پنچھیوں کا غم تھا اور میر کے غم کے پردے میں دراصل وہ اُجڑے ہوئے دورِ متوسط اور اس کی ظلمت پسندی کا ماتم کر رہے تھے آخر آخر تصوف اور مزار پرستی کے ایسے شکار ہوئے کہ مقبروں سے آوازیں آنے لگیں۔ غرض کوشش یہ تھی کہ توجہ اس جاگتی جگمگاتی فکر سے ہٹ جائے جو ترقی پسندی کی دین تھی اور عہد متوسط کے جاگیردارانہ ظلمت پسند چھوٹی موٹی معاشرے کی بساط تہہ کر رہی تھی۔

اسی راہ سے منیر نیازی کی چڑیلیں اور آسیب فن میں داخل ہوئے اور انور سجاد کی پلاٹ سے بغاوت اور کٹے پھٹے سروں اور دھڑوں کی امیجری افسانے میں در آئی۔ دونوں نے بعد کو اسے نئی معنویت دی مگر اس کا ذکر آگے آئے گا اس زمانے تک تو سارا زور یہ تھا کہ ادب میں جمود ہے اور جمود ہے تو اس بنا پر ہے کہ ادیب نے زمانے کا غم مول لے رکھا ہے ادب کو محض ادب ہونا چاہیے ادیب کو محض اپنے نجی وجدان سے اور اپنی ذاتی شناخت سے واسطہ رکھنا چاہیے اور بس!

اسی دوران ایوب خانی اقتدار کا زمانہ آیا رائٹرز گلڈ بننے لگے اور ادیب کو معاشرے میں اس کی ذمہ داریاں سمجھائی جانے لگیں۔ ان ادیبوں کو جو ادب برائے ادب کے بڑے زور دار مبلغ تھے اچانک اپنی قومی ذمہ داریاں یاد آنے لگیں۔ پھر ۱۹۶۵ء کی جنگ آگئی جسے احمد ندیم قاسمی نے پاکستان کی تہذیبی شناخت کا 'لمحۂ منور' قرار دیا۔ جمیل الدین عالی 'جیوے جیوے پاکستان' کے ترانے لکھنے لگے اور انتظار حسین اور انور سجاد جو اس وقت تک ادب کی سماجی ذمہ داری سے منکر تھے اچانک صف مجاہدین میں نظر آنے لگے بقول فتح محمد ملک:

"۳ر دسمبر ۱۹۵۹ء کو ادیبوں نے (اپنے کنونشن کے عہدنامے میں، م۔ح) مارشل لاء کے نفاذ کے بعد تشکیل پانے والے معاشرے کی تعمیر میں حصہ لینے کا عہد کیا تھا..... اس ... سے دو باتیں واضح طور پر سامنے آجاتی ہیں ایک یہ کہ مارشل لاء کے نفاذ سے پہلے (وہ) ... معاشرے کی تکمیل میں حصہ نہیں لے رہے تھے... دوسری بات یہ کہ..... ادیب احساسِ ذمہ داری اور خود شناسی سے محروم تھے۔" (پاکستانی ادب۔ راولپنڈی ۱۹۸۱ء ص [illegible])

تنقید کا ایک اور رنگ لے کر وزیر آغا بھی میدان میں آئے انھوں نے تہذیب کی ARCHE TYPE میں کھوج شروع کی اور ادب کو ادبیت ہی سے نہیں تہذیبی روایت سے مشرف کرنا شروع کیا گویا ادب کے جو رشتے ترقی پسند تحریک نے دانش سے استوار کیے تھے وہ توڑ کر انھیں مابعد الطبیعات یا نفسیات کے پُراسرار شعبوں سے جوڑا جانے لگا اس کے بعد ۱۹۷۷ء میں پاکستان اور اس کی ادبیات جب باقاعدہ مشرف بہ اسلام ہونے لگے

تو اس کو صرف وحید قریشی جیسے دانش ور اور اشفاق احمد جیسے تخلیقی فن کار ہی ملے۔ امجد اسلام امجد، عطاء اللہ قاسمی اور دو ایک نام اور جوڑیے بھاری بھرکم نام ہیں لیکن ان کے بعد کی صفیں خالی ہیں۔

مگر یہ تصویر کا محض ایک رخ ہے۔ ادب کی بھی تو اپنی جدلیت ہوتی ہے۔ کسی دور کا ادب بھی محض یک سُرا نہیں ہوتا اس بھی دو آوازیں ہوتی ہیں۔ ایک شاید وہ جو بہت گونجتی گرجتی ہے دوسری وہ جو ممکن ہے اتنی گونجتی گرجتی نہ ہو مگر آنے والے دور کی امانتیں اپنے جلو میں لیے ہوئے چلتی ہے، عقل و دانش کے ادب کی مشعلیں بجھانے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ وہ بھی تھے جو مخالف ہواؤں میں چراغ جلاتے ہی رہے اور پہچاننے والے انھیں کے نام سے پاکستانی ادب کو پہچانتے ہیں۔ ظاہر ہے ان میں پہلا نام فیض احمد فیض کا ہے جن کی آواز زندانوں کی دیواروں سے بھی چھن چھن کر حوصلہ اور اعتماد جگاتی رہی جنھوں نے اپنا اٹوٹ رشتہ اپنے ملک ہی کے نہیں پوری انسانیت کے زیردستوں سے بے محابا جوڑ دیا ان میں ابن انشا کی آواز تھی جو کہیں کہیں لڑکھڑاتی بھی مگر اپنی ڈگر سے بہت دور نہیں گئی ان میں سید سبط حسن کی تحریریں تھیں جو اپنی سمت و رفتار کا واضح شعور رکھتی تھیں، ممتاز حسین کی تنقیدیں تھیں جنھوں نے اگر قربانی دی تو صرف اتنی کہ خاموشی کی سِل کبھی کبھی اپنے سینے پر رکھ لی مگر قلم کی عصمت کو داغ دار نہ کیا کوئی غلط بات نہ لکھی اور ظلمت پرستی کے ہاتھوں سودا نہ کیا۔ ظہیر کاشمیری کے نغمے تھے جو اسی طرح بے محابا گونجتے رہے فارغ بخاری کی نظم و نثر تھی جو اسی طرح جگمگاتی رہی۔ مجنوں گورکھپوری کی نثر اور جوش ملیح آبادی کی شاعری تھی جو ظلمت پسندی کے بوجھ کے نیچے دب کر خاکستر نہ بن سکی اور اپنی تب و تاب سے راہ دکھاتی رہی شبنم رومانی کی لطیف ایمجری تھی عبیداللہ علیم کی شاعری کا کَس بَل ہے۔

پھر وہ مجاہدانہ رنگ تھا جس کی نمایندگی احمد فراز کے کلام سے ہوئی رنگیں و مانی غزلیں کہنے والا شاعر ظلمت پسندی اور استبداد سے سمجھوتہ نہ کر سکا تو اپنے دل کی باتیں کہنے لگا۔ جو

ارباب اقتدار کو گراں گزریں اور اس کی آواز نے انقلابی آہنگ اختیار کیا۔

جیالا انقلابی شاعر حبیب جالب ہے جسے قید و بند ڈرا نہ سکے اور جس نے زیر دستوں کی حمایت میں ہر صعوبت مسکراتے ہونٹوں اور جھومتے ہوئے نغموں کے ساتھ برداشت کی اور ترقی پسندی کی انقلابی آن بان کو برقرار ہی نہیں رکھا اسے نئی تب و تاب دی۔

افسانوی ادب کی آبرو "دھنک" والے غلام عباس اور "خدا کی بستی" شوکت صدیقی نے قائم رکھی ان دونوں نے برسوں پہلے آنے والے دور کے بڑھتے ہوئے سائے دیکھ لیے تھے۔ "دھنک" تو پیغمبرانہ پیش گوئی ثابت ہوئی۔ "آنے والے لوگ" والے افسر آذر، "بارش کا پہلا قطرہ" اور "جب پھوپی کھوئی گئی تھی" والی رضیہ فصیح احمد، "ریت پر گرفت" والے رشید امجد اور "مفتوح ہوائیں" والے احمد داؤد، کتنے ہی ایسے نام تھے جنھوں نے عقل و دانش کے مجاہدے کو جاری رکھا اور ادب کی بہترین روایات کو پروان چڑھایا۔ ڈرامے میں علی احمد کا عوامی تھیٹر اپنے جرأت مندانہ اقدام کو جاری رکھے رہا۔

شاعری میں خواتین کی شاعری نے نئی کروٹ بدلی۔ کشور ناہید کی نظموں میں نیا آہنگ پیدا ہوا پھر "پتھر کی زبان"، "بدن دریدہ" اور "دھوپ" مجموعے چھپے پھر پروین شاکر کا لہجہ ابھرا ادا جعفری تک کی نظموں میں یہ رنگ نمایاں ہونے لگا شہرت بخاری کی متوازن اور دھیمی دھیمی شاعری کی لے تیز ہونے لگی شان الحق حقی کی غزلوں میں بھی یہ لہجہ جا بجا در آیا :

بڑھا رہے ہیں وہ دست طلب کہو کہ نہیں

حسن عابد کے کلام میں یہ رنگ اور تیکھا ہوا اور احسن علی خاں کی غزلوں میں انکار کا لہجہ تیز ہونے لگا۔ سرور بارہ بنکوی کی غزلوں میں مستقبل پر یہ اعتماد اور رات کے کٹ جانے کا یقین صبح کی پہلی کرن کی طرح جگمگایا :

ہے افق سے ایک سنگ آفتاب آنے کی دیر
ٹوٹ کر مانند آئینہ بکھر جائے گی رات

نثری نظموں میں یہ آہنگ شائستہ حبیب کے ہاں سب سے زیادہ نمایاں ہے جو فاطمہ حسن اور بعض دوسری شاعرات کے ہاں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔

ظلمت پسندی اور رجعت پسند خیالات کو بے نقاب کرنے کی سب سے بڑی ذمہ داری ادبی تنقید کی تھی۔ حسن عسکری کے نظریات کو رد کرنے کی ابتدا تو قبل تقسیم ہی ممتاز حسین کی تحریروں سے ہو چکی تھی۔ صفدر میر نے اس سلسلے کو اور آگے بڑھایا۔ عبداللہ ملک اور سبط حسن کے مضامین نے ان نظریات سے براہ راست ٹکر نہیں لی مگر ان کے مقابلے میں دانش کے وسیع دائرے کو اس طرح وسعت دی کہ یہ نظریات خود کو مہمل اور بے معنی نظر آنے لگیں۔ حال میں اس قسم کے رجحانات پر محمد علی صدیقی نے مختلف مضامین میں تنقید کی ہے اور ان کے لسانیاتی تسامحات پر روشنی ڈالی ہے۔ احمد ہمدانی نے اپنی "قصہ نئی شاعری کا" میں اس قسم کے نظریات کا ادبی اور فکری سطح پر محاسبہ کیا ہے۔ عتیق احمد نے اپنے مضامین میں اس فکری چیلنج کو قبول کیا ہے اور ان کے تضادات نمایاں کیے ہیں لیکن ابھی یہ کام باقی ہے۔ سحر انصاری بھی اپنے مضامین میں ترقی پسند فکر کے مختلف پہلو پیش نظر رکھتے ہیں۔

مجموعی طور پر ناول اور طنز و مزاح کی اصناف ظلمت پرستی کی یلغار سے محفوظ رہیں۔ طنز و مزاح نے تو مشتاق یوسفی کی تحریروں میں انتہائی عروج کی منزل طے کر لی جو شاید اردو ادب کو میسر ہو سکتی تھی۔ یوسفی کی رسائی اردو نثر کی معراج تک ہوئی ہے اور یہ معراج نثر نگاری کی معراج بھی ہے اور طنز و مزاح کی بھی کہ اسے عالمی ادب کے سامنے فخر و انبساط کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ ابن انشا سے جس لہجے کا آغاز ہوا تھا وہ یوسفی کی تحریروں میں کمال تک پہنچا۔

اندازہ ہوگا کہ پاکستان کا اردو ادب ایک نئے فکری چیلنج سے دوچار ہے اور یہ چیلنج تخلیقی اور تنقیدی دونوں سطح پر پھیلا ہوا ہے اس کا تعلق ان زنجیروں سے ہے جو فکر کو پہنائی گئی ہے پاکستان کے صالح اردو ادب کی ساری کوشش یہی ہے کہ وہ فکر و فن کو گھٹن سے آزاد کرائے اور دانش عصر سے منور فضاؤں میں پرواز کرے کہ اسی طرح وہ اس عالمی برادری میں وقار حاصل کر پائے گا جو ملک و قوم کی سرحدوں کے باوجود انسانیت

کے ضمیر کی طرح ناقابلِ تقسیم ہے۔

اس مختصر سے جائزے سے یہ بھی واضح ہوگا کہ علامتوں کا استعمال کسی ایک مکتبۂ ادب کا نشان نہیں ہے البتہ ایک گروہ ایسا ہے جو اسے ماورائی اور طلسماتی فضا کے لیے استعمال کرتا ہے دوسرا وہ ہے جو اس میں عصری معنویت پیدا کرتا ہے اور علامت کو محض حالات کے جبر سے اختیار کرتا ہے یا کم سے کم اسے انقلابی حسیت کے لیے استعمال کرتا ہے۔ ایسے بھی ہیں جنھوں نے علامت کو اپنے فن کا امتیاز قرار دیا ہے اور دونوں راہیں کھلی رکھی ہیں کبھی فلسفیانہ ابہام کو برتتے ہیں تو کبھی انقلابی حسیت کو علامتوں سے ظاہر کرتے ہیں انور سجاد اس کی مثال ہیں لیکن دھیرے دھیرے ہیئت پرستی کی بجائے انقلابی حسیت کا آہنگ ان کے ہاں غالب آتا جارہا ہے گو اس کی سمت بہت واضح نہیں ہے۔ بعض بظاہر سیدھے سادے اشعار میں بھی عصری معنویت اور پاکستان کا فکری بحران کس بلاغت سے ادا ہو جاتا ہے اس کا اندازہ اس قسم کے اشعار سے ہوتا ہے:

اے کاش تم اتنا جان سکو اس سکہ نے کیا آزاد کیا

عبیداللہ علیم

اک چیل ایک ممٹی پہ بیٹھی ہے دھوپ میں
بستی اجڑ گئی ہے مگر پاسباں تو ہے

منیر نیازی

نیرنگیِ سیاستِ دوراں تو دیکھیے
منزل انھیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

محسن بھوپالی

غرض پاکستانی ادب دو دائروں کا ادب ہے ابھرنے والے احتجاج اور بے محرد شعور کی انقلابی حسیت کا ادب اور ظلمت پسند ماورائی الجھنوں کے حوالے کا ادب۔

آج جو رنگ غالب ہو لیکن انحطاط کے فلسفہ طرازوں کی آب و تاب کا تذکرہ کرتے وقت بھی پاکستانی ادب کی پکی اور کھری آواز کو بھی نظر میں رکھنا چاہیے کہ یہی وہ سرگم ہے جس پر مستقبل اپنے نغموں کی بنیاد رکھے گا۔ یہ سچ ہے کہ پاکستان کے اردو ادب میں یہ ترقی پسند فکر یہ عوامی رابطے کا آہنگ، یہ کاٹ یہ مجاہدانہ آن بان پاکستان کی علاقائی زبانوں کے ادب کے مقابلے میں مدھم ہے۔ پنجابی، سندھی، بلوچی اور پشتو کی ادبیات اس معاملے میں اردو سے کہیں آگے ہیں اور ان میں ظلمت گستری اور انحطاط کی فلسفہ طرازی قدم جما نہیں پائی ہے مگر اس سب کے باوجود پاکستان کا اردو ادب اس آواز سے خالی نہیں ہے جو احباب پاکستان کے اردو ادب کو عسکری، انتظار حسین اور وزیر آغا کے نام لکھ چکے ہیں انھیں یاد دلانا بے جا نہ ہوگا کہ سچے اور کھرے پاکستانی ادب کی پہچان فیض، احمد فراز، حبیب جالب، سبط حسن، ممتاز حسین سے کی جانی چاہیے۔ ان نواگروں اور نغمہ سنجوں کی آواز ہے جن سے مستقبل کا یہ تقاضا ہو سکتا ہے:

کام آئے گی یہ دولت کل جشن بہاراں میں
دامن کو بچا لینا خوشبو جو صبا مانگے

پاکستان کے اردو ادب میں احتجاج، انقلاب اور صحت مند انسانی قدروں کی آواز مختلف سطحوں پر سنائی دیتی ہے ہر صنعت میں اس آواز کو صاف سنا جا سکتا ہے۔ تفصیلی تجزیہ ضروری ہے مگر یہاں اس کی گنجائش نہیں۔ سرسری سا تذکرہ تنقید، شاعری اور افسانوی ادب کی اصناف کا ممکن ہے:

تنقید میں مریضانہ تصورات کا رد تصوراتی اور فکری سطح پر ممتاز حسین، صفدر میر، محمد علی صدیقی، عتیق احمد، احمد ہمدانی، امین فعل نے کیا۔ سحر انصاری اور انجم اعظمی کے مضامین میں بھی صحت مند فکر نے راہ پائی۔ ڈاکٹر سلیم اختر نزاعی معاملات میں نہیں پڑے مگر ان کے مضامین میں توازن اور اعتدال قایم رہا۔ صحت مند اقدار کی وسیع تر پس منظر توضیح اور انھیں ادب کے دائرے سے اور آگے بڑھا کر سماجی علوم اور پورے معاشرے کی نظام اقدار سے مربوط کرنے کا کام سید سبط حسن اور عبداللہ ملک نے اپنے تصانیف کے ذریعہ انجام دیا۔

شاعری میں یہ روایت فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی اور ظہیر کاشمیری سے ہوتی ہوئی حبیب جالب، احمد فراز تک پہنچی ان میں جیالے اور طرحدار شاعر بھی ہیں جن کے لہجہ کا انقلابی آہنگ نمایاں ہے اور ایسے بھی ہیں جن کے ہاں احتجاج کی چنگاریاں شعلے کی طرح نہیں زیریں لہر کی طرح موجود ہیں۔ مرحومین کے ذکر سے قطع نظر اور تقدیم اور تاخیر سے بے نیاز ہو کر یہ فہرست بنائی جائے جو مختصر ہوتے ہوئے بھی خاصی طویل ہو گی:۔

قتیل شفائی، افتخار جالب، زہرہ نگاہ، شہرت بخاری، فارغ بخاری، عارف عبدالمتین، شان الحق حقی، کشور ناہید، ادا جعفری، پروین شاکر، شائستہ حبیب، اختر حسین جعفری، پرتو روہیلہ، تبسم کاشمیری، جون ایلیا، رئیس امروہوی، حسن عابد، حسن عباس رضا، حمایت علی شاعر، شبنم رومانی، صہبا لکھنوی کے نام اس مختصر سی فہرست میں بھی شامل ہوں گے ان کے علاوہ ظہور نظر، جمیل الدین عالی اطہر نفیس، ناصر شہزاد، منیر نیازی، ظفر اقبال، احمد مشتاق، شہزاد احمد اور عبید اللہ علیم جیسے شعرا کے کلام میں سماجی آگہی کی تڑپ مختلف شکلوں میں نمایاں ہے۔ آخر میں شبی فاروقی کی نظم "معلمہ" ہے جو نئے فکری آہنگ کی آئینہ دار ہے جس میں معلمہ سے یہ سوال کیا گیا ہے کہ آخر اقتصادیات اور معاشیات کے فروغ نے آزادئ فکر کو کیوں مصلوب کر دیا ہے اور انسانی رشتوں کو روپے کی میزان پر کیوں تولنے پر مجبور کر دیا ہے۔

افسانوی ادب میں شوکت صدیقی (ناول: جانگلوش)، غلام عباس (ناولٹ: دھنک)، جمیلہ ہاشمی (تلاش بیاباں)، رشید امجد (ریت پر گرفت)، احمد داؤد (غیر مفتوح ہوائیں)، رضیہ فصیح احمد (بارش کا پہلا قطرہ)، افسر آذر (آنے والے لوگ)، یونس ادیب (شکست ساغر)، انور سجاد (کونپل) سعید گزدر (آگ گلستان نہ بنی)، یونس جاوید (ایک بستی کی کہانی)، آغا سہیل (بند دروازہ اور شہر نا پرساں)، زاہدہ حنا (قیدی سانس لیتا ہے) ساگر ہاشمی

اور دیگر افسانہ نگاروں کے یہاں یہ کرب نئے نقش و نگار پاتا ہے۔ اس ضمن میں خالد اختر کا مزاحیہ ناول "چاکی واڑہ میں وصال" قابل ذکر ہے اور اپنی منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح سید شبیر حسین کا ناول "جھوک سیال" کا بھی [illegible] کہ یہ پاکستان کی دیہی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

ڈرامے میں میرزا ادیب سے لے کر علی احمد تک ایک پورا سلسلہ ہے جس میں پاکستانی معاشرے کے مختلف پہلوؤں سے عکاسی ہوئی ہے۔

اعلان بابت ملکیت "عصری ادب"

نام رسالہ :-	"عصری ادب" سہ ماہی
مقام اشاعت :	ڈی ۷، ماڈل ٹاؤن۔ دہلی ۹
زبان :-	اردو
نام ایڈیٹر :-	سید بہاء الدین احمد
قومیت :-	ہندوستانی
نام مالک :-	سید بہاء الدین احمد
قومیت :-	ہندوستانی

میں سید بہاء الدین احمد اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا معلومات بالکل صحیح اور درست ہیں۔

سید بہاء الدین احمد

محسن

حبیب جالب : پاکستان کا نڈر انقلابی شاعر

پاکستان کا جیالا، نڈر، بے باک، نغز طراز ــــ حبیب جالب، قید و بند کی صعوبتوں میں اعتماد اور حوصلے کی مشعل بلند رکھنے والا فن کار جسے ایمنسٹی انٹرنیشنل نے ضمیر کا قیدی تسلیم کیا یعنی ایسا قیدی جو اپنے عقیدے اور اپنی اقدار کی بنا پر حبس بے جا کی سزا بھگت رہے ہیں ــــ جرم : جرم بے گناہی ــــ سزا: ارباب اقتدار میں رسوائی اور عوام کے دربار میں سرخروئی۔

پاکستان میں نت نئی حکومتیں آئیں اور گئیں مگر حبیب جالب ان آتی جاتی پرچھائیوں کے پیچھے نہیں دوڑے۔ ہر حکومت نے کبھی کھلم کھلا کبھی ڈھکے چھپے اس کی قیمت لگانی چاہی سودا لگانا چاہا، مگر حبیب جالب ہر بار بچ نکلے، اپنے قلم کو پاک صاف، اپنی فکر کو بے داغ اور اپنے فن کو آبرومندانہ بچالے گئے۔ عوام کے بیچ میں ان کے جیالے نغمے اسی طرح اعتماد اور امید کی کرنیں بکھیرتے رہے۔

"برگ آوارہ" کا حبیب جالب محبتوں کا شاعر ہے۔ چاہتا ہے کہ زندگی لطافتوں سے بھر جائے، محبتوں کا جواب محبتوں سے ملے۔ فاقے، جہالت، ظلم اور ناانصافی سے نجات پاکر انسانیت بچوں کی سی معصومیت کے ساتھ ہنسے اور صبح کی آزاد کرن کی طرح ہر چہرہ کھل اٹھے اور جہاں کہیں اس مسکراہٹ کو زخمی پاتا ہے چیخ اٹھتا ہے، جہاں کہیں بدنمائی اور استحصال پاتا ہے تڑپ اٹھتا ہے۔ حبیب جالب کی داستان فکر و فن بس اتنی ہی سی ہے مگر اس معمولی سی اور معمول کے مطابق خواہش کی تکمیل کے لیے اس نے کیا کچھ نہیں جھیلا اور کمال یہ ہے کہ جب جون ۱۹۸۲ء میں اس HAUNTED شاعر سے ملاقات ہوئی تو

اس کے چہرے پر ناگواری اور بیزاری کی ہلکی سی شکن بھی تو نہ تھی، اس نے تو زندگی سے پیار کرنا ہی سیکھا تھا اور اس کے ساتھ یہ اعتماد بھی کہ آخرکار زندگی کو یہ سب برکتیں حاصل تو ہونی ہیں، استحصال اور استبداد کتنی ہی دردناک اور قیامت برپا کرنے والے کیوں نہ ہوں آخرکار ہیں تو پرچھائیاں ہی۔ اس کا ادراک اور اعتماد حبیب جالب کے کلام کو جس طرح منور کرتا ہے وہ کسی دوسرے اردو شاعر کو میسر نہیں۔ یہی جالب کا ہنر بھی ہے۔ یہی کرب بھی، یہی وجہ نشاط بھی ہے اور یہی عذاب کا سبب۔

دل کی بات لبوں پر لا کر اب تک ہم دکھ سہتے ہیں
ہم نے سنا تھا اس بستی میں دل والے بھی رہتے ہیں

کٹی اب کٹی منزلِ شامِ غم   بڑھائے چلو یا فگارو، قدم

ہم سادہ دلوں پر یہ شبِ غم کا تسلط
مایوس نہ ہو اور کوئی دم ہے مری جاں

آج ہمارے حال پہ ہنس لو شہر کے عزت دارو
کل کو تمہارے حال پہ ہم کو اشک بہانے ہوں گے

غزلیں تو کہیں ہیں کچھ ہم نے ان سے نہ کہا احوال تو کیا
کل مثل ستارہ ابھریں گے ہیں آج اگر پامال تو کیا

ان اشعار میں ایک ایسے شاعر کی آواز گونجتی ہے جو زندگی پر یقین نہیں ایمان رکھتا ہے جسے عوامی جدوجہد کی کامیابی پر پورا بھروسہ ہے، جسے اعتماد ہے کہ آخرکار فتح استحصال کی نہیں، سماجی انصاف کی ہوگی مٹھی بھر ظالموں کی نہیں بلکہ کروڑوں مظلوموں کی ہوگی۔ اور خوب صورتی، جمالیاتی کیف اور محبت اور خلوص کی حکمرانی اسی فتح یابی پر منحصر ہے۔ یہ راستہ تن آسانی اور رومانی تخیل پرستی سے طے نہیں ہو سکتا۔ راہ میں بہت سے سخت مقامات آتے ہیں حبیب جالب نے ان سبھی مقامات کی سختیوں کو جھیلا ہے۔ تنہا پسِ زنداں کبھی رسوا سرِ بازار

بازار میں اس پر پولیس نے ڈنڈے برسائے، جیل میں سخت اذیتیں دی گئیں مگر اس کے باوجود حبیب جالب کے نغموں میں کڑواہٹ نہیں، مستی اور غنائیت ہے۔ رات کے اندھیرے نہیں صبح کی پہلی کرنوں کی ضوافشانیوں کے خواب ہیں۔ ہاں، طنز کی مسکراہٹ اور کاٹ کہیں کہیں ان کی نظموں میں نشتریت جگاتی ہے۔ "روئے بھگت کبیر"، "بھئے کبیر اُداس" "یہ وزیران کرام" جیسی نظموں میں یہ طنز بہت نمایاں ہے۔

"مستقبل" میں آنے والے دنوں کی چاہت اور ارمان، زمانۂ حال کا کرب اور درد مل کر ایک عجیب سرمستی کا لہجہ اختیار کر لیتا ہے ؎

تیرے لیے میں کیا کیا صدمے سہتا ہوں
سنگینوں کے راج میں بھی سچ کہتا ہوں
میری راہ میں مصلحتوں کے پھول بھی ہیں
تیری خاطر کانٹے چُنتا رہتا ہوں

تو آئے گا، اسی آس پہ جھوم رہا ہے دل
دیکھ اے مستقبل!

حبیب جالب کے نئے مجموعے "سر مقتل" میں یہ رنگ اور زیادہ تیکھا ہو گیا ہے۔

مستقبل کا وژن حبیب جالب کے ہاں صاف اور واضح ہے اور اسی وضاحت اور صراحت کا اظہار انداز بیان میں بھی ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں براہ راست لہجہ ہے۔ ترسیل میں الجھن اور ژولیدگی نہیں ہے بلکہ دل میں اتر نے والا انداز ہے جو نغمگی اور سرمستی میں ڈھل کر دل نشیں آہنگ کی کیفیت اختیار کر لیتا ہے۔ اردو شاعری میں یہ آواز نئے کس بل، نئے اعتماد اور نئے عہد پر محکم یقین اور مستحکم ایمان کی آواز ہے۔ یہ دولت کم یاب بلکہ نایاب ہے۔ یہ اس گلاب کی سرخی ہے جو ایک شہر آشوب کہانی کے اس مقتل سے خون سے کھلا جو رات بھر کا تارہا اور اپنے خون سے گلاب کی رنگ آمیزی کرتا رہا۔ حبیب جالب کے ہر شعر میں اسی خون جگر کی تراوش ہے۔ درد و کرب سے آباد لمحوں سے کھلایا ہوا گلزار ہے۔ ایسا گلزار جس کی سیر ہمارے ادب کے لیے مسرت اور شوکت کا سرمایہ ہے۔

ممتاز

قصرِشاہی سے یہ حکم صادر ہوا لاڑکانے چلو
ورنہ تھانے چلو
اپنے ہونٹوں کی خوشبو لٹانے چلو گیت گانے چلو
ورنہ تھانے چلو
منتظر ہیں وہاں پر تمہارے شکاری وہاں کیف کا ہے سماں
اپنی آنکھوں کا جادو جگانے چلو مسکراتے چلو
ورنہ تھانے چلو
غنچہ و گل کا رنگیں تبسم ہو تم اشک انجم ہو تم
اپنے جلووں سے محفل سجانے چلو مے پلانے چلو
ورنہ تھانے چلو
حاکموں کو بہت تم پسند آئی ہو ذہن پر چھائی ہو
جسم کی لو سے شمعیں جلانے چلو غم بھلانے چلو
ورنہ تھانے چلو

ظلم سے تار

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسے دستور کو صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا

میں بھی خائف نہیں تختۂ دار سے
میں بھی منصور ہوں کہہ دو اغیار سے
کیوں ڈراتے ہو زنداں کی دیوار سے
ظلم کی بات کو۔ جہل کی رات کو
میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا

پھول شاخوں پہ کھلنے لگے تم کہو
جام رندوں کو ملنے لگے تم کہو
چاک سینوں کے سلنے لگے تم کہو
اس کھلے جھوٹ کو ذہن کی لوٹ کو
میں نہیں مانتا۔ میں نہیں جانتا
ایسے دستور کو۔ صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا۔ میں نہیں جانتا

تم نے لوٹا ہے صدیوں ہمارا سکوں
اب نہ ہم پر چلے گا تمہارا فسوں
چارہ گر دردمندوں کے بنتے ہو کیوں
تم نہیں چارہ گر۔ کوئی مانے مگر
میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا
ایسے دستور کو صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا

حبیب جالب

حبیب جالب

اکڑ اکڑ کے نہ چل اِس زمیں پہ کمال میں رہ
تیرا حساب نہ ہوگا، نہ اس خیال میں رہ
دل و زباں میں اگر ارتباط رکھنا ہے تو
زہنس کے رنج اٹھا، مت کسی ملال میں رہ
رضائے اہلِ کرم بھی یہی ہے اے جالب
نہ کر سوال مگر حالتِ سوال میں رہ

نہ گفتگو سے، نہ وہ شاعری سے جائے گا
عصا اٹھاؤ کہ فرعون اسی سے جائے گا
اگر ہے فکرِ گریباں تو گھر میں جا بیٹھو
یہ وہ عذاب ہے دیوانگی سے جائے گا
جگا نہ شہر کے صاحب کو خواب سے جالب
اگر وہ جاگ اٹھا، نوکری سے جائے گا

حبیب جالب

فرنگی کا جو میں دربان ہوتا
تو جینا کس قدر آسان ہوتا
میرے بچے بھی امریکہ میں پڑھتے
میں ہر گرمی میں انگلستان ہوتا
میری انگلش بلا کی چست ہوتی
بلا سے جو میں اُردو دان ہوتا
جھکا کے سر کو ہو جاتا جو سَر میں
تو لیڈر بھی عظیم الشان ہوتا
زمینیں میری ہر صوبے میں ہوتیں
میں واللہ صدرِ پاکستان ہوتا

ناممکل

بہت میں نے سنی ہے آپ کی تقریر مولانا
مگر بدلی نہیں اب تک مِری تقدیر مولانا
خدارا شکر کی تلقین اپنے پاس ہی رکھیں
یہ لگتی ہے مِرے سینے پہ بن کر تیر مولانا
حقیقت کیا ہے، یہ تو آپ جانیں یا خدا جانے
سنا ہے جمی کارٹر آپ کا ہے پیر مولانا
زمینیں ہوں وڈیروں کی مشینیں ہوں لٹیروں کی
خدا نے لکھ کے دی ہے یہ تمہیں تحریر مولانا
کروڑوں کیوں نہیں مل کر فلسطیں کے لیے لڑتے
دعا ہی سے فقط کٹتی نہیں زنجیر مولانا

حبیب جالب

تم سے پہلے وہ جو اک شخص یہاں تخت نشیں تھا
اُس کو بھی اپنے خدا ہونے پہ اتنا ہی یقیں تھا
کوئی ٹھہرا ہو جو لوگوں کے مقابل تو بتاؤ
وہ کہاں ہیں کہ جنہیں ناز بہت اپنے تئیں تھا
آج سوئے ہیں تہہِ خاک نہ جانے کتنے
کوئی شعلہ کوئی شبنم کوئی مہتاب جبیں تھا
اب وہ پھرتے ہیں اسی شہر میں تنہا لیے دل کو
اک زمانے میں مزاج ان کا سرِ عرشِ بریں تھا
چھوڑنا گھر کا ہمیں یاد ہے، جالبؔ نہیں بھولے
تھا وطن ذہن میں اپنے کوئی زنداں تو نہیں تھا

حبیب جالب

علامہ اقبال کے جشن صد سالہ کے موقع پر ہونے والے مشاعرے میں جالب اسٹیج پر آئے تو انھوں نے کہا ——— "علامہ اقبال ڈیوٹی لگا گئے تھے: ع

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو

اور میں ڈیوٹی بھگتانے کے نتیجے میں کوئی پندرہ مرتبہ جیل جا چکا ہوں ——— بہرحال عرض ہے:

لوگ اٹھتے ہیں جب تیرے غریبوں کو جگانے
سب شہر کے زردار پہنچ جاتے ہیں تھانے
کہتے ہیں یہ دولت ہمیں بخشی ہے خدا نے
فرسودہ بہانے، وہی افسانے پرانے
اے شاعرِ مشرق، یہی جھوٹے یہی بدذات
پیتے ہیں لہو بندۂ مزدور کا دن رات

حبیب جالب

بھئے کبیر اُداس

اک پٹڑی پر سردی میں اپنی تقدیر کو روئے
دوجا زلفوں کی چھاؤں میں سکھ کی سیج پہ سوئے
راج سنگھاسن پر اک بیٹھا اور اک اس کا داس
بھئے کبیر اُداس

اونچے اونچے ایوانوں میں مورکھ حکم چلائیں
قدم قدم پر اس نگری میں پنڈت دھکے کھائیں
دھرتی پر بھگوان بنے ہیں دھن ہے جن کے پاس
بھئے کبیر اُداس

گیت لکھائیں پیسے نا دیں فلم نگر کے لوگ
ان کے گھر باجے شہنائی لیکھک کے گھر سوگ
گائیک سُر میں کیوں کر گائے کیوں کاٹے گھاس
بھئے کبیر اُداس

کل تک تھا جو حال ہمارا حال وہی ہے آج
جالب اپنے دیس میں سکھ کا کال وہی ہے آج
پھر بھی موچی گیٹ پہ لیڈر روز کریں بکواس
بھئے کبیر اُداس

حبیب جالب

مستقبل

تیرے لیے میں کیا کیا صدمے سہتا ہوں
سنگینوں کے راج میں بھی سچ کہتا ہوں
میری راہ میں مصلحتوں کے پھول بھی ہیں
تیری خاطر کانٹے چُنتا رہتا ہوں
تو آئے گا، اسی آس پر جھوم رہا ہے دل
دیکھ اے مستقبل

اک اک کر کے سارے ساتھی چھوڑ گئے
مجھ سے میرے رہبر بھی منہ موڑ گئے
سوچتا ہوں بیکار گلہ ہے غیروں کا
اپنے ہی جب پیار کا ناتا توڑ گئے
تیرے بھی دشمن ہیں میرے خوابوں کے قاتل
دیکھ اے مستقبل

جہل کے آگے سر نہ جھکایا میں نے کبھی
سفلوں کو اپنا نہ بنایا میں نے کبھی
دولت اور عہدوں کے بل پر جو اینٹھیں
ان لوگوں کو منہ نہ لگایا میں نے کبھی
میں نے چور کہا چوروں کو کھل کے سر محفل
دیکھ اے مستقبل

فیض احمد فیض

ماتمِ جشنِ امید

جشن ہے ماتمِ امید کا، آؤ لوگو
مرگِ انبوہ کا تہوار مناؤ لوگو
عدم آباد کو آباد کیا ہے میں نے
تم کو دن رات سے آزاد کیا ہے میں نے
جلوۂ صبح سے کیا مانگتے ہو
بسترِ خواب سے کیا چاہتے ہو
ساری آنکھوں کو تہِ تیغ کیا ہے میں نے
سارے خوابوں کا گلا گھونٹ دیا ہے میں نے
اب نہ لہکے گی کسی شاخ پہ پھولوں کی حنا
فصلِ گل آئے گی نمرود کے انگار لیے
اب نہ برسات میں برسے گی گہر کی برکھا
ابر آئے گا خس و خار کے انبار لیے
میرا مسلک بھی نیا میری طریقت بھی نئی
میرے قانون بھی نئے، میری شریعت بھی نئی
اب فقیہانِ حرم دستِ صنم چومیں گے
سروِ قد مٹی کے بونوں کے قدم چومیں گے.....

حصارِ ستم

احمد فراز

مرے غنیم نے مجھ کو پیام بھیجا ہے
کہ حلقہ زن ہیں مرے گرد لشکری اس کے
فصیلِ شہر کے ہر برج، ہر منارے پر
کماں بدست ستادہ ہیں عسکری اس کے
وہ برق لہر بجھا دی گئی ہے جس کی تپش
وجودِ خاک میں آتش فشاں جگاتی تھی
بچھا دیا گیا بارود اس کے پانی میں
وہ جوئے آب جو میری گلی کو آتی تھی
سبھی دریدہ دہن اب بدن دریدہ ہوئے
سپردِ دار و رسن سارے سر کشیدہ ہوئے
تمام صوفی و سالک سبھی شیوخ و امام
امیدِ لطف پہ ایوانِ کج کلاہ میں ہیں

معززین عدالت حلف اٹھانے کو
مثالِ سائل بزم نشستہ راہ میں ہیں
تم اہلِ حرف کہ پندار کے ثنا گر تھے
وہ آسمانِ ہنر کے نجوم سامنے ہیں
بس اس قدر تھا کہ دربار سے بلاوا تھا
گداگرانِ سخن کے ہجوم سامنے ہیں
قلندرانِ وفا کی اساس تو دیکھو
ہمارے ساتھ ہے کون آس پاس تو دیکھو
سو شرط یہ ہے کہ جو جاں کی امان چاہتا ہو
تو اپنے لوح و قلم قتل گاہ میں رکھ دو!
وگرنہ اب کے نشانہ کمان داروں کا
بس ایک تم ہو سو غیرت کو راہ میں رکھ دو"

یہ شرط نامہ جو دیکھا تو ایلچی سے کہا
اسے خبر نہیں تاریخ کیا سکھاتی ہے
کہ رات جب کسی خورشید کو شہید کرے
تو صبح اک نیا سورج تراش لاتی ہے
سو یہ جواب ہے میرا مرے عدو کے لیے
کہ مجھ کو حرصِ کرم ہے نہ خوفِ خمیازہ
اسے ہے سطوتِ شمشیر پر گھمنڈ بہت
اسے شکوہِ قلم کا نہیں ہے اندازہ
مرا قلم نہیں کردار اس محافظ کا
جو اپنے شہر کو محصور کر کے ناز کرے

مرا قلم نہیں کاسہ کسی شبک سر کا
جو غاصبوں کو قصیدوں سے سرفراز کرے
مرا قلم نہیں اوزار اس نقب زن کا
جو اپنے گھر کی ہی چھت میں شگاف ڈالتا ہے
مرا قلم نہیں اس دزدِ نیم شب کا رفیق
جو بے چراغ گھروں پر کمند اچھالتا ہے
مرا قلم نہیں تسبیح اس مبلغ کی
جو بندگی کا بھی ہر دم حساب رکھتا ہے
مرا قلم تو امانت ہے میرے لوگوں کی
مرا قلم کہ عدالت مرے ضمیر کی ہے
اسی لیے جو لکھا وہ تپاکِ جاں سے لکھا
جبھی تو لوچ کماں کا زبان تیر کی ہے
میں کٹ گروں کہ سلامت رہوں یقیں ہے مجھے
کہ یہ حصارِ ستم کوئی تو گرائے گا
تمام عمر کی ایذا نصیبیوں کی قسم!!
مرے قلم کا سفر رائگاں نہ جائے گا!!

غزل

شان الحق حقی

جلے گا اب نہ چراغِ ستم، کہو کہ نہیں
کہیں گے ہم نہ جفا کو کرم، کہو کہ نہیں

یہ سرنوشت ازل ہے تو میٹ دو اس کو
کہاں کی لوح کہاں کا قلم، کہو کہ نہیں

ابھی تو مل نہیں پایا وجود ہی کا سراغ
اجل دکھائے جو راہِ عدم، کہو کہ نہیں

اٹھا رہے ہیں وہ رسمِ جفا، کہو کہ غلط
بڑھا رہے ہیں وہ دستِ کرم، کہو کہ نہیں

وہ پھر اٹھائیں گے نکتے، کہو کہ نامنظور
وہ دینے آئیں گے پھر دل کو دم، کہو کہ نہیں

ہم آپ اس رہِ ظلمات سے نکل لیں گے
بھروگے تم نہ رفاقت کا دم، کہو کہ نہیں

بہار باغ میں آتی ہے گھیر لو اس کو
یہاں سے اب جو اٹھائے قدم، کہو کہ نہیں

گیا دلوں سے محبت کا مان کب سے گیا
نہیں جہاں میں وفا کا بھرم، کہو کہ نہیں

نگاہِ آخرِ بسمل میں کچھ تو تھا آخر
کہ ہے تمہاری بھی آنکھوں میں نم، کہو کہ نہیں

دباؤ دہر کا مشکل ہے ٹالنا حقی
تم اپنے آپ ہی سے کم سے کم، کہو کہ نہیں

تم سے پہلے

فارغ بخاری

تم سے پہلے بھی مقتل سجائے گئے
ہم سے پہلے بھی سولی پہ میلے لگے
تم سے پہلے بھی رونق قفس میں رہی
ہم سے پہلے بھی زنداں بسائے گئے
تم سے پہلے بھی قدغن تھی اظہار پر
ہم سے پہلے بھی پہرے لبوں پر رہے
تم سے پہلے بھی تھے دشمن زندگی
ہم سے پہلے بھی عنقا تھی تابندگی
تم سے پہلے بھی موسم لہو نام تھا
ہم سے پہلے بھی رقص جنوں عام تھا

افتخار عارف

ہوا چپ رہی

شاخِ زیتون پر کم سخن فاختاؤں کے اتنے بسیرے اجاڑے گئے
اور ہوا چپ رہی
بے کراں آسمانوں کی پہنائیاں بے نشیمن شکستہ پروں کی تگ و تاز پر بین کرتی رہیں
اور ہوا چپ رہی
زرد پرچم اڑاتا ہوا لشکرِ بے اماں گل زمینوں کو پامال کرتا رہا
اور ہوا چپ رہی
آرزو مند آنکھیں، بشارت طلب دل، دعاؤں کو اُٹھے ہوئے ہاتھ سب بے ثمر رہ گئے
اور ہوا چپ رہی
اور شبِ حبس کے قہرماں موسموں کے عذاب ان زمینوں پہ بھیجے گئے
اور منادی کرا دی گئی
جب کبھی رنگ کی، خوشبوؤں کی، اُڑانوں کی، آواز کی اور خوابوں کی توہین کی جائے گی
یہ عذاب ان زمینوں پہ آتے رہیں گے

پرانی کہانی، نیا دور

شائستہ حبیب

اس دن ہمارے ویہڑے میں میرے بھائی کی بارات چڑھنے والی تھی
سارا گھر قلعی کروایا گیا تھا
دروازوں پر نئے نئے روغن کی خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی
گھر کے کونے کھدرے میرے ماں نے دھومانجھ کر صاف کیے تھے
اور برسوں کا میل اور گند گھر سے نکال کر
دور جوہڑ میں پھینک دیا تھا
ہمارے ویہڑے کے اندر کھڑے سرو کے درخت کے اردگرد
بے شمار ننھی منی سرخ مرچیں لگائی گئی تھیں
جو رات ہونے پر جگ مگ کر رہی تھیں
پورے صحن میں دریاں بچھائی گئی تھیں اور بیچ میں ڈھولک پڑی تھی
کچھ مہندی کی خوشبو ساری لڑکیوں کے ہاتھوں اور کپڑوں سے آرہی تھی
بستی کی ساری لڑکیاں میری سہیلیاں تھیں اور وہ میرے ویر کو گھوڑی چڑھانے کے
لیے آئی ہوئی تھیں
ان کی چوڑے والی بانہوں میں پھول کھل رہے تھے

ڈھولک کی مسلسل آواز اور گھوڑی گاتے گاتے
وہ زندگی کی علامت لگ رہی تھیں
میری ماں بوندی والے لڈو کی تھالیاں سارے ویہڑے میں تقسیم کر رہی تھی
ویہڑے کے ایک طرف کونے میں چارپائیوں کی اوٹ کر کے
گاؤں کا میراثی بھائی کو کھارے چڑھا رہا تھا
اسے دہی اور تیل مل کر نہلایا جا رہا تھا
میری بڑی بہن کا بڑا لڑکا اس کے ساتھ شہ بالا بن کر
دہی اور تیل ملا کر نہلایا جا رہا تھا
میرے بھائی کے یار اس کے کپڑے اور سہرے لے کر ایک طرف خوش گپیاں کر رہے تھے
میرا بھائی جب تیار ہو کر سہرا باندھ کر آیا تو وہ
سورج کی طرح چمک رہا تھا
اس کے ساتھ میرا چاند سا بھانجا چمک رہا تھا
سارے ویہڑے میں روشنی ہی روشنی بھر گئی
بستی کی ساری عورتوں نے بڑھ کر میرے بھائی کی بلائیں لیں
میرے بھائی کے چہرے پر ایک مردانہ مسکراہٹ تھی
وہ بستی کی سب سے خوب صورت لڑکی کو بیاہنے جا رہا تھا
میرا باپ بستی کے مردوں سے مبارک بادیں وصول کر رہا تھا
میرا باپ بستی کا سردار تھا
امارت کی وجہ سے نہیں اونچے نسب کی وجہ سے نہیں
زور آور ہونے کی وجہ سے نہیں
میرا باپ محنتی آدمی تھا اور بستی کا چمار بھی اس کے برابر ایک ساتھ آ کر بیٹھتا تھا
بستی کے لوگوں نے میرے باپ کو ایک بڑا انسان ہونے کی وجہ سے اپنا سردار چنا تھا
میرا بھائی بھی میرے باپ کے نقش قدم پر چل رہا تھا

وہ بھی بستی کی آنکھ کا تارا تھا
میرے بھائی کی بارات ہمارے ویہڑے میں سجی تھی
بستی کا ہر چھوٹا بڑا آدمی ہمارے گھر آیا تھا
بارات تیار ہو گئی تھی
میری سہیلیوں نے خوب اونچی اونچی آواز سے بھائی کی زندگی کے لیے دعائیہ گیت
گائے تھے

ڈھولک بج رہی تھی
مہمانوں کو میٹھا دودھ پیش کیا جا رہا تھا
میری ماں اور بہنوں نے دوپٹے کے نیچے بھائی کو بٹھایا
اور آیات پڑھی گئیں
دوپٹے کے اوپر سے بتاشوں اور چھوہاروں کی بارش کی
جس کو سارے باراتیوں نے لوٹ لوٹ کر کھایا
میرے بھائی کا خوبصورت سفید گھوڑا گھر کے باہر دروازے پر اپنے شہسوار کا منتظر تھا
دوست بھائی کو باہر لائے۔ انھوں نے
اس کو سجے ہوئے گھوڑے پر بٹھایا
میرا بھائی بے حد خوب صورت لگ رہا تھا
اس کے پیچھے شہ بالا بیٹھا تھا
ڈھول اور گانوں اور خوشی کے شور کے ساتھ بھائی رخصت ہوا
ہم اپنی ماں اور بہنوں کے ساتھ دروازے کی دہلیز پر کھڑے اس کو جاتے دیکھتے رہے
بارات جا رہی تھی، بستی کی سب سے خوب صورت لڑکی کو لینے
جگ جگ جیے، جوانیاں مانے
میری ماں مسلسل دعا پڑھ رہی تھی
[illegible]

ہم رات تک ڈھولک بجاتے رہے
ہم نے گھر کے دروازے کی دہلیزوں کے دونوں طرف سرسوں کا تیل ڈال کر اپنے بھائی
اور بھابی کا انتظار کرنا شروع کیا
شام ہو گئی ۔ وہ نہ آئے
اندھیرا پڑنے لگا، ڈھولک کی لے تیز ہونے لگی
باہر کڑھائیوں میں لڈو اور گرم چائے تیار ہونے لگی
باراتیوں کے استقبال کے لیے
رات اور گزر گئی، کوئی نہ آیا
بستی کے بزرگ لوگ دور تک پیدل چل کر بارات کی آمد کا پتہ کرنے گئے مگر ناکام
لوٹ آئے
رات اور گہری ہو گئی
تب کچھ لٹے پٹے باراتی واپس آئے
راستے میں ڈاکوؤں نے میرے بھائی کی بارات لوٹ لی تھی، انھوں نے سارے
باراتیوں پر گولیاں برسائیں
انھوں نے میرے بھائی کے گلے میں رسّی ڈال کر
اسے گھوڑے سے نیچے گرایا
انھوں نے اس کی لاش کو پورے جنگل میں گھسیٹا اور
سارا مال لوٹ کر بھاگ گئے
میرا باپ زخمی ہو کر واپس آیا
میدان جنگ میں اس کا جوان اور زور آور بیٹا
بغیر ہتھیار کے مارا گیا
بے چارہ نہتا جوان
وہاں شبالا بھی دولہا کے ساتھ قربان ہو گیا

وہاں کوئی رونے والا نہ رہا تھا
انہوں نے سب ہی گردنوں پر بندوقوں کی نالیاں رکھ دی تھیں
اس دن سے اب تک میری ماں اپنے دولہا بیٹے کا انتظار شام کو گھر کی دہلیزوں پر
سرسوں کا تیل ڈال کر کرتی ہے
ہمارے ویہڑے میں بستی کی ساری لڑکیاں جمع ہیں اور بھائی کے انتظار میں ڈھولک
بجائے جا رہی ہیں
چائے تیار ہو رہی ہے اور لڈو بانٹے جا رہے ہیں
بستی کی وہ خوب صورت لڑکی جو میری بھابی تھی
اپنے گھر میں دُلہن بن کر اپنے دولہا کا انتظار کر رہی ہے
ہم سب انتظار کر رہے ہیں
وہ اتنا ہی شہ زور اور قدآور تھا کہ اسے
موت نہیں چھین سکتی
وہ آئے گا ایک نہ ایک دن ضرور آئے گا
میری ماں کہتی ہے۔

مجید امجد

نظم

بستے رہے سب تیرے بصرے، کوفے
اور تیرے پر بازاروں گزرا
سر... سرور کا

قید میں منزلوں منزلوں روئی
بیٹی ماہ عرب کی
اور ان شاموں کے نخلستانوں میں گھر گھر، روشن رہے الاؤ

چھینٹے پہنچے تیری رضا کے، ریاضوں تک خون شہدا کے
اور تیری دنیا کے دمشقوں میں بے داغ پھریں زرکار عبائیں

سامنے لہو بھرے طشتوں میں ماتھے مقتول گلابوں کے چہرے فرشوں پر
اور ظلموں کے درباروں میں آہن پوش ضمیروں کے دیدے بے نم تھے

مالک تو ہی عطا کر
زیر لب ترتیلیں، ان ناموں کی، جن پر تیرے لبوں کی مہریں تھیں

منیر نیازی

ایک بہادر کی موت

زخمی دشمن حیرت میں ہے
ایسا بھی ہو سکتا تھا
اس کو شاید خبر نہیں تھی
اب وہ گہری حیرت میں ہے
آسمان پر رب ہے اس کا اور صدائیں یاروں کی
آس پاس شکلیں ہیں اس کے لہولہان سواروں کی
دل میں اس کے خلش ہے کوئی شاید گئی بہاروں کی
کھیل ذرا ہونی کے دیکھو اور جفا اغیاروں کی
فتح کے بدلے موت ملی اسے گھر سے دور دیاروں کی

حسن عباس رضا —— [illegible]

وہ شہر
جس کی کنواریوں کے گلاب پیکر
اصیل خواجہ سراؤں کے
بے صفات جسموں سے منسلک ہوں

وہ شہر، جس میں
بدن کا سونا
رفاقتوں کی بجائے
سورج کی حدتوں سے پگھل رہا ہو

وہ شہر جس میں
صداقتوں کو شہید کرنے
قدم قدم پر
ستم صلیبیں گڑی ہوئی ہوں

جہاں جہالت
ذکاوتوں سے خراج مانگے
تو ایسے شہرِ غنیم جاں کو
تباہ ہونے سے کوئی
کیوں کر بچا سکے گا ـــــ!

غزل

ظفر اقبال

خدائی خوار پھریں قدرتِ خدا دیکھیں
خطا کریں نہ کریں ہم مگر سزا دیکھیں

عمل کو چھوڑیے اتنی بھی اب نہیں توفیق
کہ اہلِ شہر کوئی خواب بھی نیا دیکھیں

نئے سفر میں ٹکٹ ایک ہے تماشے دو
کہ زندگی کریں اور موت کا مزا دیکھیں

ہمیشہ دوسروں کے حرف گیر رہتے ہیں
بجائے اس کے کہ اپنا بھلا بُرا دیکھیں

ہماری دربدری ناپسند ہے ان کو
مگر وہ اپنے بھی حالات کو ذرا دیکھیں

وہ در سے اٹھنے بھی دیتا نہیں ظفر ورنہ
اٹھیں یہاں سے تو گھر کوئی دوسرا دیکھیں

اختر حسین جعفری (گوجرانوالا)

پھر بہار آئی

پھر بہار آئی، پھر آئے مقتلوں میں فاتحہ خوانی کے دن۔
درد کس کا پرفشاں ہے
سرنگوں کس کا علم
آبِ جُو کی سطحِ خوابیدہ پہ کس باغِ جناں کا پھول ہے ـــ
خون میں ڈوبا ہوا
عشق پیچاں کیسا نکلا ہے درونِ سنگ سے
جو کسی مقراض سے کٹتا نہیں
پھر بہار آئی، پھر آئے مقتلوں میں فاتحہ خوانی کے دن
بے صدا قبروں کی لوحیں
مرثیے لکھنے کے دن
پھر وہی پوروں میں خارِ آگہی کی پرورش
پھر وہی مہرِ منقّل پر شبانہ دستکیں
اور چمن آرائیوں میں تازہ تر صف بندیوں میں اس کا لشکر ڈھونڈنا
اس کا چہرہ، اس کا پرچم ڈھونڈنا۔ خون میں ڈوبا ہوا

ایک نغمہ پاکستان کے لیے

جیوے پاکستان

کوچہ کوچہ قاتل ہے تو قدم قدم مقتول
نخوت، نفرت دھونے اٹھی راہ گزر کی دھول
ہر ذرہ ہے یہاں مجاہد ہر قطرہ نرشول
گھوڑوں کی ٹاپوں سے بڑھ کر آزادی کی تان

جیوے پاکستان

جئیں ترے بے باک ترانے، جئیں ترے جاں باز
جیویں تیری ماہ جبینیں، جئیں بتِ طناز
جئیں ترے باغی متوالے، جیویں نغمہ طراز
جن کا لہو کوڑوں سے برسا بن کر لال نشان

جیوے پاکستان

مشعل مشعل خون جلانے والو تمہیں سلام
آگ میں تپ کر پھول کھلانے والو تمہیں سلام
فیض، فراز اور جالب جیسے جیالو تمہیں سلام
وہ اٹھے سندھی، پنجابی، اٹھے بلوچ پٹھان

جیوے پاکستان

کیسی کالک تھی جس کو تم نے اپنے خون سے دھویا
اندھیارا ہنستا تھا ہر سو، دیکھ سویرا رویا

کیسا بوجھ تھا کرب کا جس کو تم نے برسوں ڈھویا
خوابوں کے گلزار کھلا دو، دھرتی ہے ویران

جیوے پاکستان

فوجی بوٹوں نے جو راہیں کی تھیں پارہ پارہ
اب ان پر چمکے گی عظمت، جاگے گا اجیارا
داغے جانے والی پیشانی سے پھوٹے گی نور کی دھارا
آزادی ہی دین ہے یارو، آزادی قرآن

جیوے پاکستان

ایسا تشنج تھا برسوں سے سانس بھی تھی دشوار
ایسا سناٹا تھا کہ ہر اک لب پہ تھے پہرے دار
ہر اک چہرہ شرمندہ تھا گھائل تھے افکار
تم نے سب کی آن بچالی دے کر اپنی جان

جیوے پاکستان

جبر کے نیچے دبے ہوئے تھے صدیوں کے ارمان
آنکھیں آہن پوش، شکنجے میں تھے قلم، زبان
ہاتھ رہن تھے مزدوروں کے، خوار ہوئے تھے کسان
بے بس تھے سب عالم فاضل سکتے میں تھا گیان
آج اچانک دھرتی سے ابھری اقبال کی تان

"تیری بے علمی نے رکھ لی بے علموں کی لاج
عالم فاضل بیچ رہے تھے اپنا دین ایمان"

جیوے پاکستان

۱۹۸۳ء


بیس نکات کی
یہ کہانی
گاؤں گاؤں
میں بجلی پانی

مشتاق احمد یوسفی

حویلی

کانپور سے ہجرت کر کے کراچی آئے تو دنیا ہی اور تھی۔ بے روزگاری اور بے گھری اس پہ سترادہ۔ اپنی حویلی کے پانچ چھ فوٹو کھچوا لائے تھے۔ "ذرا یہ سائڈ پوز دیکھیے اور یہ شاٹ تو کمال کا ہے" ہر آئے گئے کو یہ فوٹو دکھا کر کہتے "یہ چھوڑ کر آئے ہیں" جن دفتروں میں مکان کی الاٹمنٹ کی درخواستیں دی تھیں ان کے بڑے افسروں کو بھی کٹہرے کے اس پار سے ثبوت استحقاق دکھاتے "یہ چھوڑ کر آئے ہیں" واسکٹ اور شیروانی کی جیب میں کچھ اور ہو یا نہ ہو حویلی کا فوٹو ضرور ہوتا تھا۔ کراچی کے فلیٹوں کو کبھی ماچس کی ڈبیا، کبھی ڈربے اور کبھی کابک کہتے۔ لیکن جب تین مہینے جوتیاں چٹخانے کے باوجود ایک کابک میں بھی سر چھپانے کو جگہ نہ ملی تو آنکھیں کھلیں۔ احباب نے سمجھایا "فلیٹ ایک گھنٹہ میں مل سکتا ہے، کسٹوڈین کی ہتھیلی پر پیسہ رکھو اور جس فلیٹ کی چاہو چابی لے لو" مگر قبلہ تو اپنی ہتھیلی پر پیسہ رکھوانے کے عادی تھے۔ وہ کہاں مانتے۔ مہینوں پلاٹ الاٹ کرانے کے سلسلے میں بھوکے، پیاسے، پریشان حال سرکاری دفتروں کے چکر کاٹتے رہے۔ زندگی بھر کسی کے مہمان نہ رہے تھے۔ بیٹی داماد کے یہاں رہنے کا عذاب بھی سہا۔ آدمی جب کسی گھلا دینے والے کرب یا آزمائش سے گزرتا ہے تو ایک ایک ساعت ایک ایک برس بن جاتی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے،

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

صبح سر جھکائے، ناشتہ کر کے نکلتے۔ رات کے کھانے کے وقت کہہ دیتے کہ ایرانی ہوٹل میں کھا آیا ہوں۔ شیروانیاں ڈھیلی ہو گئیں، پیروں میں ٹھیٹ پڑ گئے۔ بیمار بیوی رات کو درد سے کراہ بھی نہیں سکتی تھی کہ سمدھیانے والوں کی نیند خراب ہوگی۔ ململ کے کرتوں کی لکھنوی کرسائی تیل میں جب گئی، چوڑیاں پڑنے کے بعد کرتے کی آستینیں انگلیوں سے ایک ایک انگل آگے نکلی

رہی [illegible]ر چار دن نہانے کو پانی نہ ملا۔ موتیا کا عطر لگائے تین مہینے ہوگئے۔

ہر دکھ، ہر عذاب کے بعد زندگی آدمی پر اپنا کوئی راز کھول دیتی ہے۔ بودھ گیا کی چھاؤں تلے بدھ بھی ایک دکھ بھری تپسیا سے گزرے تھے۔ جب پیٹ پیٹھ سے لگ گیا، آنکھیں اندھے کنوؤں کی تہہ میں بے نور ہوگئیں اور ہڈیوں کی مالا میں بس سانس کی ڈوری اٹکی رہ گئی تو گوتم بدھ پر بھی ایک بھید کھلا تھا۔ جیسا اور جتنا دکھ آدمی بھوگتا ہے ویسا ہی بھید اس پر کھلتا ہے۔ دنیا کی خاطر کشٹ اٹھاتا ہے تو دنیا اس کو راستہ دیتی چلی جاتی ہے۔

سو گلی گلی خاک پھانکنے اور دفتر دفتر دھکے کھانے کے بعد قبلہ کے قلب پر کچھ القا ہوا۔ وہ یہ کہ قاعدے قانون نیک نیت لوگوں نے کمزور دل والوں کی رہنمائی کے لیے بنائے ہیں۔ جو شخص ہاتھی کی لگام ہی تلاش کرتا رہے وہ کبھی اس پر چڑھ نہیں سکتا۔ مختصر یہ کہ جو بڑھ کر تالا توڑ لے مکان اسی کا ہے۔ کانپور سے چلے تو اپنی جمع جتھا، شجرہ، اسپرنگ سے کھلنے والا چاقو، اختری بائی فیض آبادی کے تین ریکارڈ، کبوتروں کی چھتری، صراحی کے سبز کیریئر اسٹینڈ کے علاوہ اپنی دکان کا تالا بھی ڈھو کر لائے تھے۔ علیگڑھ سے خاص طور پر بنوا کر منگوایا تھا۔ تین سیر سے کم کا نہ ہوگا۔ مذکورہ بالا القا کے بعد بزنس روڈ پر ایک اعلیٰ درجہ کا فلیٹ اپنے لیے پسند فرمایا۔ ماربل کی ٹائیلز، سمندری ہوا کے رخ کھلنے والی کھڑکیاں۔ اس کے زنگ آلود تالے پر اپنے علیگ تالے کی ایک ہی چوٹ سے فلیٹ میں اپنی آبادکاری بلا منت سرکار کر لی اور اپنے نام کی ایک بہت بڑی تختی دوبارہ پینٹ کروا کے لگا دی۔ پہلے اس پر "کسٹوڈین متروکہ املاک" کا نام لکھا ہوا تھا اور قبلہ عالم جلال میں اسے وہیں سے کیلوں سمیت اکھاڑ لائے تھے۔ تختی پر نام کے آگے مقطع کانپوری بھی لکھوا دیا۔ پرانے واقف کاروں نے پوچھا "آپ شاعر کب سے ہوگئے؟" فرمایا "میں نے آج تک کسی شاعر پر دیوانی مقدمہ چلتے نہیں دیکھا نہ قرقی ہوتے دیکھی۔"

فلیٹ پر قابض ہونے کے کوئی چار ماہ بعد قبلہ اپنے چوڑی دار کا گھٹنا رفو کر رہے تھے کہ کسی نے بڑے گستاخانہ انداز سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ مطلب یہ کہ نام کی تختی کھٹکھٹائی۔ جیسے ہی انھوں نے جھنجھلا کر دروازہ کھولا، اس نے خود کا تعارف اس طرح کروایا گویا اپنے عہدے کی چپراس ان کے چہرے پر اٹھا کے دے ماری "افسر محکمہ کسٹوڈین، ایویکیوی پراپرٹی!" اس نے ڈپٹ کر کہا "بڑے میاں! الاٹمنٹ دکھاؤ!" قبلہ نے واسکٹ کی جیب سے حویلی کا فوٹو نکال کر جواب

دیا" یہ چھوڑ کر آئے ہیں!" اس نے فوٹو کا نوٹس دیتے ہوئے قدرے درشتی سے کہا" بڑے میاں! سنا نہیں؟ الاٹمنٹ آرڈر دکھاؤ!" قبلہ نے بڑی رسان سے اپنا سلیم شاہی جوتا اتارا، اور اتنی ہی رسان سے کہ اس کو گمان تک نہ ہوا کہ کیا کرنے والے ہیں، اس کے منہ پر مارتے ہوئے بولے "یہ ہے ہمارا الاٹمنٹ آرڈر! کاربن کاپی بھی ملاحظہ فرمایئے گا؟" اس نے اب تک یعنی تادم تبدیل رشوت ہی رشوت کھائی تھی، جوتے نہیں کھائے تھے۔ پھر کبھی ادھر کا رخ نہیں کیا۔

بڑے جتن سے لی مارکیٹ میں ایک چھوٹی سی لکڑی کی دکان کا ڈول ڈالا۔ بیوی کے جہیز کے زیور تک اونے پونے بیچ دیے۔ کچھ مال ادھار خریدا۔ ابھی دکان ٹھیک سے جمی بھی نہ تھی کہ ایک انکم ٹیکس انسپکٹر آ نکلا۔ کھاتے، روکڑ بہی اور رسید بک طلب کیں۔ دوسرے دن قبلہ ہم سے کہنے لگے "مشتاق میاں! سنا آپ نے؟ مہینوں جوتیاں چٹخاتا، دفتروں میں اپنی اوقات خراب کرواتا پھرا، کسی نے پلٹ کر نہ پوچھا، دل لگی دیکھیے کل ایک انکم ٹیکس کا تیس مار خاں آیا تو کبوتر کی طرح سینہ پھلائے، میں نے سالے کو یہ دکھا دی، یہ ہے ہماری روکڑ بہی! یہ چھوڑ کر آئے ہیں!" چندرا کے پوچھنے لگا "یہ کیا ہے؟" ہم نے کہا "ہمارے ہاں اسے محلسرا کہتے ہیں۔"

سچ جھوٹ کا حال مرزا جانیں کہ انہی سے روایت ہے کہ اس محلسرا کا ایک بڑا فوٹو فریم کروا کے اپنے فلیٹ کی کاغذی سی دیوار میں کیل ٹھونک رہے تھے کہ دیوار کے اس پار والے پڑوسی نے آ کر درخواست کی کہ ذرا کیل ایک فٹ اوپر ٹھونکیں تاکہ دوسرے سرے پر میں اپنی شیروانی لٹکا سکوں۔ دروازہ کھولنے اور بند کرنے کے جھونکوں سے اس زنگیائی کیل پر ساری محلسرا پینڈولم کی طرح جھولتی رہتی تھی۔ گھر میں ڈاکیہ یا نیا تہتر بھی آتا تو اسے بھی دکھاتے "یہ چھوڑ آئے ہیں!"

اس حویلی کا فوٹو ہم نے بھی بارہا دیکھا۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ کیمرے کو موتیا اتر آنے لگا ہے لیکن کیمرے کے ضعف بصارت کو قبلہ اپنے زور بیان سے دور کر دیتے تھے۔ یوں بھی ماضی ہر شے کے گرد ایک رومانی ہالہ کھینچ دیتا ہے۔ گزرا ہوا دور بھی سہانا لگتا ہے۔ آدمی جب سب کچھ چھن جائے تو وہ یا تو سست ملنگ ہو جاتا ہے یا کسی میں پناہ لیتا ہے ... اگر دور قریب ہیم تو دم نکل جائے آدمی کا

ر اور حویلی بھی ایک ایسی ہی پناہ گاہ تھی۔ جس سے تصویریں بے ادب نگاہوں کو دستِ درازی کا لائق دے، لیکن جب قبلہ اس کی تعمیراتی نزاکتوں کی تشریح فرماتے تو اس کے سامنے تاج محل بالکل سیدھا سپاٹ گھروندہ معلوم ہوتا تھا۔ مثلاً دوسری منزل پر ایک دروازہ نظر آتا تھا جس کی چوکھٹ اور کواڑ جھڑ چکے تھے، قبلہ اسے فرانسیسی دریچہ بتاتے تھے۔ اگر یہاں کوئی ولایتی دریچہ تھا تو یقیناً یہ وہی دریچہ ہوگا جس میں لگے ہوئے آئینہ جہاں نما کو توڑ کر ساری کی ساری ایسٹ انڈیا کمپنی دندناتی گزر گئی۔ ڈیوڑھی میں داخل ہونے کا جو بے کواڑ پھاٹک تھا وہ دراصل شاہجہانی محراب تھی۔ اس کے اوپر ایک ٹوٹا ہوا چھجّہ تھا جس پر سرِ دست ایک چیل قیلولہ کر رہی تھی پر راجپوتی جھروکے کے باقیات بتائے جاتے تھے جس کے عقب میں ان کے دادا کے وقتوں میں ایرانی قالینوں پر آذربائیجانی طرز کی قوالی ہوتی تھی۔ فرش اور دیواریں قالینوں سے ڈھکی رہتی تھیں۔ فرماتے تھے کہ جتنے پھول بیلے پستے، ویسے ہی باہر بغیچے میں تھے۔ یہاں اطالوی محل کے کارچوبی پر زرِ برانداز پر گنگا جمنی منقش اُگالدان رکھے رہتے تھے جن میں چاندی کے ورق میں لپٹی ہوئی گلوریوں کی پیک جب تھوکی جاتی تھی تو بلوریں گلے میں اترتی چڑھتی صاف نظر آتی تھی جیسے تھرمامیٹر میں پارہ۔ حویلی کے چند اندرونی کلوزاپ بھی تھے۔ کچھ کیمرے کی آنکھ اور کچھ چشمِ تصور کے رہینِ منت۔ ایک سہ دری تھی جس کی دو محرابوں کی دراڑوں میں بازنطینی اینٹوں پر کابھوری چڑیوں کے گھونسلے نظر آتے تھے۔ ان پر MOORISH ARCHES کی تہمت تھی۔ ان کے پہلو میں ایک چوبی گھڑونچی فوٹو میں نظر آتی تھی جسے شاہجہانی طرز کا نمونہ بتاتے تھے، شاہجہانی ہو یا نہ ہو، اس کے مغل ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا، اس لیے کہ اس کا ایک پاؤں تیموری تھا۔ حویلی کی غلام گردشیں فوٹو میں نظر نہیں آتی تھیں لیکن ایک ہمسائے کا بیان ہے کہ ان میں گردش کے مارے خاندانی بڑے بوڑھے رُلتے پھرتے تھے۔ حویلی کے شمالی حصے میں ایک ستون جو مدتیں ہوئیں چھت کا بوجھ اپنے اوپر سے اتار چکا تھا، ROMAN PILLARS کا نادر نمونہ بتایا جاتا تھا۔ حیرت ہوتی تھی کہ یہ چھت پہلے سے کیوں نہ گری۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ چاروں طرف گردن گردن ملبے میں دبے ہونے کی وجہ سے، اس کے گرنے کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ اس غیر موجود چھت پر جہاں اب چمگادڑیں بھی نہیں لٹک سکتی تھیں، قبلہ ان کڑیوں کی نشاندہی کرتے تھے جہاں دادا کے زمانے میں اطالوی

فانوس لٹکا کرتے تھے۔ جن کی چھپی روشنی میں وہ گھنگھرالی مُحَرّیاں بجتیں جو کبھی دو کوہان والے باختری اونٹوں کی محمل نشینوں کے ساتھ آئی تھیں۔ اگر یہ فوٹو ان کی RUNNING COMMENTARY کے ساتھ نہ دیکھے ہوتے تو کسی طرح یہ قیاس ذہن میں نہیں آسکتا تھا کہ تین سو مربع گز کی ایک اوکھڑتی حویلی میں اتنے فنونِ تعمیر اور ڈھیر ساری تہذیبوں کا ایسا ازدحام ہوگا کہ عقل دھرنے کی جگہ نہ رہے گی پہلی مرتبہ فوٹو دیکھیں تو خیال ہوتا تھا کہ کیمرہ ہل گیا ہے۔ پھر ذرا غور سے دیکھیں تو حیرت ہوتی تھی کہ یہ ڈھنڈار حویلی اب تک کیسے کھڑی ہے۔ مرزا کا خیال تھا کہ اب اس میں گرنے کی بھی طاقت نہیں رہی۔

قبلہ کبھی ترنگ میں آتے تو اپنے اکلوتے بے تکلف دوست سے فرماتے کہ جوانی میں مئی جون کی ٹھیک دوپہریا میں ایک حسین دوشیزہ کا کوٹھوں کوٹھوں ننگے پیر ان کی حویلی کی تپتی چھت پر آنا اب تک یاد ہے۔ یہ بات ہماری سمجھ میں آج تک نہ آئی اس لیے کہ ان کی حویلی سہ منزلہ تھی، جب کہ دائیں بائیں پڑوس کے دونوں مکان ایک ایک منزلہ تھے۔ حسین دوشیزہ اگر ننگے پیر بھی ہو تب بھی یہ ممکن نظر نہیں آتا، تاوقتیکہ حسینہ ان کے عشق میں دوشیزہ ہونے کے علاوہ دو لخت بھی نہ ہو۔

فوٹو میں حویلی کے سامنے ایک چھتنار پلکھن بھی دکھائی دیتا ہے: جن پڑھنے والوں نے یہ درخت نہیں دیکھا وہ اس کی تصویر قرۃ العین حیدر کے "کارِ جہاں دراز ہے" میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ ہم نے بھی اس درخت کا فوٹو ہی دیکھا ہے) جس کا تخم ان کے جدِ اعلیٰ سمند سیاہ زانو پر سوار کارچوبی چنے میں چھپا کر مغلوں کے زمانے میں دمشق سے لائے تھے۔ قبلہ کے قول کے مطابق ان کے پردادا کے ابا جان کہا کرتے تھے "بے سر و سامانی کے عالم میں یہ ننگِ خلائق، ننگِ اسلاف، ننگِ وطن، برہنہ سر ننگے پیر، گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر ننگی تلوار ہاتھ میں لیے، خیبر کے سنگلاخ ننگے پہاڑوں کو پھلانگتا، واردِ ہندوستان ہوا!" جو تصویر وہ لفظوں سے کھینچتے تھے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس وقت بزرگوار کے پاس ستر پوشی کے لیے گھوڑے کی دم کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ جائداد، منقولہ غیر منقولہ، مال و متاع، سب کچھ وہیں چھوڑ آئے۔ البتہ اثاث البیت کا سب سے قیمتی حصہ یعنی شجرۂ نسب اور پلکھن کا تخم ساتھ لے آئے۔ گھوڑا، تخم اور شجرے کے بوجھ سے رانوں سے نکلا پڑ رہا تھا۔

زندگی کی دھوپ جب کڑی ہوئی تو آئندہ نسلوں نے اسی شجر اور شجرے کے سائے تلے بسرام

کیا قبلہ واپنے بزرگوں کی کرامات و لطافت پر بڑا ناز تھا۔ ان کا ہر بزرگ نادرِ روزگار تھا اور ان کے شجرے کی ہر شاخ پر ایک نابغہ بیٹھا تھا۔

قبلہ نے ایک نوٹ اس پلکمن کے پیچھے ٹھیک اس جگہ کھڑے ہو کر گاڑا تھا جہاں ان کا نال گڑا تھا۔ فرماتے تھے کہ اگر کسی تخم ناتحقیق کو میری حویلی کی ملکیت میں شبہ ہو تو نال نکال کر دیکھ لے جب آدمی کو یہ معلوم ہو کہ اس کا نال کہاں گڑا ہے اور پرکھوں کی ہڈیاں کہاں دفن ہیں؟ تو وہ [illegible] کی طرح ہو جاتا ہے جو کسی کے بغیر صرف بوتلوں میں پھلتا پھولتا ہے۔ اپنے نال پر کھول اور پلکمن کا ذکر اتنے فخر اور کثرت سے کرتے کرتے یہ احوال ہوا کہ پلکمن کی جڑیں شجرے میں اتر آئیں جیسے گھٹنوں میں پانی اتر آتا ہے۔

وہ زمانے اور تھے جب بزرگ اصلی امپورٹڈ یعنی ماوراء النہری نہ ہوں۔ کوئی شخص خود کو عزت دار نہیں سمجھتا تھا۔ قبلہ کے بزرگوں نے جب وطن چھوڑا تو آنکھیں نم اور دل گداز تھے۔ بار بار اپنا دستِ افسوس زانو کے اسپ پر مارتے اور ایک دوسرے کی داڑھی پر ہاتھ پھیر کے استغفر اللہ، استغفر اللہ کہتے تھے۔

تازہ ولایت جس سے ملے، اپنے حسنِ اخلاق سے اس کا دل جیت لیا۔ ع

پہلے جاں، پھر جانِ جاں، پھر جانِ جاناں ہو گئے

پھر یہی لوگ رفتہ رفتہ ع پہلے خاں، پھر خانخاں، پھر خانخاناں ہو گئے

حویلی کے آرکی ٹیکچر کی طرح ان کے امراض بھی شاہانہ ہوتے تھے۔ بچپن میں دائیں گال پر ایک لمبا آموں کی فصل میں پھنسی نکلی تھی جس کا داغ ہنوز باقی تھا۔ چہرے پر اچھا لگتا تھا۔ کہتے تھے اورنگ زیب پھوڑا نکلا تھا۔ ساٹھ کے پیٹے میں آئے تو شاہجہانی حبسِ بول میں مبتلا ہو گئے۔ فرماتے تھے کہ غالب مغل بچہ تھا۔ ستم پیشہ ڈومنی اپنے زہرِ عشق سے مارا مگر خود اسی مرض والے عارضے میں مرا۔ اپنے والد مرحوم کے بارے میں فرماتے تھے کہ اکبر سنگرہنی میں انتقال فرمایا، مزار اس سے آنتوں کی ٹی بی تھی۔ مرض تو مرض قبلہ کی ناک تک اپنی نہ تھی، رومانی بتاتے تھے۔

سعید انجم

ایک مختصر کتاب

انتساب: اس لکھاری کے نام جو اس تلخیص کے اصلی مواد کو تحریری شکل دے سکے۔

تمہید: لاہور میں سورج حسب معمول نکلا اور میں ہر روز کی طرح پرانی انارکلی پہنچا۔ ایک تُکّہ کھایا اور لسی پی پھر مال روڈ سے ویگن بس پر سوار ہو گیا۔ میں چھت کا ڈنڈا پکڑے کھڑا تھا کہ وہ ہوا جو معمول کے مطابق نہ تھا۔ بس کے اگلے دروازے سے ایک پری داخل ہوئی۔ اس کے پَر نہیں تھے۔ وہ اُڑنے کی بجائے بس کا ڈنڈا پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ میرے تمام حواس اسے پری قرار دے رہے تھے اور مجھے اپنے باحواس ہونے کا پورا احساس تھا۔ ایک جگہ بس رُکی تو پری چلی گئی۔ اس لمحے مجھے معلوم ہوا کہ نیند کی کیفیت میں جو نظر آتا ہے وہ ہم جاگتے ہوئے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ سوتے میں دیکھے خوابوں کو جاگتی کیفیت میں تلاش کرنا اِس کتاب کا محرک ہے۔

فصل اوّل: میں سوتا تھا کہ جاگتا، مجھے یاد نہیں۔ میرے ابا کی آواز تھی یا میرے کسی ہم عمر کے باپ کی سب مجھے صحیح معلوم نہیں لیکن اُس نے جو کچھ کہا وہ یوں تھا:
میری چٹلی داڑھی کا خیال کرو۔ میرے بڑھے جتّے کو دیکھو۔ اپنے ہتھ پیر استعمال کرو اڑنے اپنا مغز برتو، میرا بڑا دل کرتا ہے کہ اس کمرے کے سامنے برآمدہ ہو چھت پر ایک پنکھا چلے، شیشے کے جگ گلاس ہوں، ٹھنڈے سوڈے اور میٹھے دودھ کا دور چلے۔ تم موٹر سائیکل پر چڑھ کر جاؤ اور ایر کنڈیشنڈ دفتر میں بیٹھو۔ ارے تمہارا دل کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا، رگ پٹھے نہیں پھڑکتے، خون جوش نہیں مارتا، کچھ کر کے دکھانے کو جی نہیں چاہتا، کوئی پھرتی کوئی کج وج؟ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ تم جوان ہونے

سے پہلے ہی بنے ہوتے ہو تمہاری ریڑھ کی ہڈی بول گئی ہے، تمہاری آنکھیں پیلی زرد ہو گئی ہیں، تمہیں یرقان ہو گیا ہے، بولنے سے تم یوں ڈرتے ہو جیسے لقوہ ہو گیا ہو، لگتا ہے تم نے مجھے دودھ سوڈا نہیں پلانا؟ میں ہی کہیں سے کبوتر کی یخنی ڈھونڈھ کے لاؤں گا۔

فصل دوم: میرا خواب ایک کہانی کی صورت تھا۔ یہ کہانی میں نے خود پڑھی تھی یا کسی نے مجھے سنائی تھی، کچھ یاد نہیں لیکن اس کہانی کی کیفیت بہت خوابناک تھی جو بعد میں میری نیند کا حصہ بھی بن گئی۔ کہانی کا نام تھا الہ دین کا چراغ۔ ان گنت اشیاء تھیں جن کے نام اور کام سے میں واقف تھا لیکن وہ میری پہنچ سے باہر تھیں۔ کہانی نے ان کے حصول کا طریقہ مجھے بتا دیا تھا۔ چراغ رگڑو تو جن حاضر۔ آگے بس حکم دینا تھا۔ چنانچہ میں چراغ کو رگڑتا اور جن کو حکم دیتا اور خواہش پوری ہو جاتی۔ ضرورت تشنہ رہ جاتی — آنکھ کھل جاتی۔ نیند میں رگڑے چراغ کو جاگتی کیفیت میں تلاش کرنا میری منزل قرار پائی۔ چراغ کہاں تھا؟ چراغ؟؟؟؟

فصل سوم: بلیک آوٹ۔ بھاری بوٹوں کی دھمک۔ رضا کاروں کی سیٹیاں۔

بند کرو۔ بتی بند کرو۔
روشنی! — اُدھر۔ اُدھر۔
جاسوس۔ وطن دشمن۔ غدار۔
سائرن کی آواز
پاک پروردگار رحم کر
امی مجھے کچھ نظر نہیں آتا
چپ! بمباری ہونے والی ہے
ابو میں کیا کروں؟
کود جاؤ، چھلانگ لگا دو۔ خندق میں چھپ جاؤ
میرا دم گھٹ رہا ہے

مجھے بو آ رہی ہے
مجھے بھوک لگ رہی ہے
روشنی کب ہوگی؟
توبہ استغفار کرو۔ سائرن بج چکا ہے
یہ سائرن کون بجاتا ہے؟
پرے ہٹ کمینے۔ تیری ماں بہن نہیں ہے؟
یا اللہ خیر۔ اہدنا الصراط المستقیم
میری چادر۔ میری چادر
کون ہے؟۔ کون ہے بے؟؟۔ بولتا کیوں نہیں
کچھ نظر نہیں آتا
دیا سلائی جلا کر دیکھو
احتیاط کے ساتھ۔ بلیک آوٹ ہے
ہاں ہاں۔ مگر اسے بھی تو دیکھو کون ہے
بھاری بوٹوں کی دھمک۔ رضاروں کی سیٹیاں
بند کرو۔ بتی بند کرو
وطن دشمن۔ غدار۔ ایجنٹ۔

<u>فصل چہارم</u>: جہاں چراغ تھا وہاں ہزاروں لاکھوں کروڑوں انسان جمع تھے۔ سب نے الہ دین کی کہانی پڑھ یا سن رکھی تھی۔ ان کی ضرورت کی چیزیں ان کے سامنے تھیں لیکن ان کی پہنچ سے باہر تھیں۔ وہ خواب دیکھتے اور تشنگی لیے جاگ اٹھتے۔ تب دوسری کہانی میری زندگی میں آئی۔ مجھے یاد نہیں میں نے خود پڑھی تھی یا کسی نے مجھے سنائی تھی۔ کہانی کا نام تھا سلیمانی ٹوپی۔ سر ڈھانپو اور سب کی نظروں سے غائب۔ خود سب کچھ دیکھو مگر کوئی دوسرا تمہیں نہ دیکھ سکے گوہر مراد پانے کا سب سے آسان طریقہ یہی تھا۔ اگر ضرورت کی اشیاء چوکس پہرہ داروں کی

نیز نظروں کی زد میں بھی ہوں تو کیا پروا! سلیمانی ٹوپی پہنو اور من مرضی کی شے اٹھا کر چل دو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ میرے خواب میں الہ دین کے چراغ کو اٹھانا بھی شامل تھا۔ اب جاگتی کیفیت میں سلیمانی ٹوپی کا سراغ لگانا میری اگلی منزل ٹھہری۔

فصل پنجم: سڑک کے کنارے ایک درخت تھا جس کے پیچھے ایک الف ننگا شخص بیٹھا بڑبڑاتا رہتا۔ کچھ لوگ اسے پاگل سمجھتے اور باقی پہنچا ہوا بزرگ۔ غیب کی باتیں اور مستقبل کی صورت حال سب کچھ اس کی پہنچ میں تھا۔ لوگ سوال کرتے اور مراد پاتے۔ بے مراد لوٹنے والے اسے پاگل کہنے والوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ میں بھی وہاں پہنچا۔ الف ننگا شخص زور سے ہنسا۔ لوگ ڈر گئے۔ وہ اتنا ہنسا کہ اس کے ننگے بدن کے سب بال کھڑے ہو گئے پھر وہ خود کھڑا ہو گیا۔ لوگوں کی صفیں ٹوٹنے لگیں بچے چیخنے لگے، عورتوں نے توبہ استغفار شروع کر دی، لوگ گڑگڑائے "سائیں جی" وہ ہنستا چلا گیا۔ پھر اس نے قریب رکھے کٹورے کو اٹھا لیا جس میں پانی بھرا تھا اس نے پانی میرے سر پر انڈیل دیا اور گونجدار آواز میں چلایا "جاگو۔ جاگو۔" میں تو سوتے میں دیکھے خوابوں کو جاگتی کیفیت میں تلاش کر رہا تھا۔ وہ پہنچا ہوا بزرگ تھا یا جنونی دیوانہ کہ محض بہروپیہ۔ اس نے میرے خوابوں کو میرے لیے مشکوک بنا دیا۔ جانے میں نے اپنے خواب سوتے میں دیکھے تھے یا جاگتے میں؟۔ یہ کھوج میری راہ تک رہی تھی۔

فصل ششم، میں سو کر اٹھا تو پرانی انارکلی پہنچا۔ ایک کلچہ کھایا پھر لسی پی۔ مال روڈ سے اومنی بس لی کہ ایک مولانا ساتھ آن بیٹھے۔ کاندھوں پر رومال، آنکھوں میں سرمہ، منہ میں پان اور چہرے پر نورانی داڑھی، سر پر مکلف پگڑی، خس کی خوشبو میں پوری طرح بسی ہوئی۔

"کیا کرتے ہو میاں؟" انھوں نے پوچھا۔

"خواب دیکھتا ہوں۔"

"سوتے میں یا جاگتے ہیں؟"

"ابھی تو معلوم نہیں؟"
"لاحول ولا قوة۔ تم دم کراؤ؟"
"سائیں الف ننگے سے؟"
"لاحول ولا قوة۔ کسی مرد خدا سے۔ نماز پڑھتے ہو؟"
"جی نہیں۔"
"گرفتار ہو جاؤ گے۔ نماز پڑھا کرو۔ سب مرادیں پوری ہو جائیں گی۔"
"سلیمانی ٹوپی میری مراد ہے۔"
"مل جائے گی۔ وظیفہ کرو۔"
"کونسا وظیفہ؟"
"کسی روز مسجد میں آجاؤ، بتا دوں گا۔" مولانا نے پتہ بتا دیا۔

فصل ھفتم: مسجد سے نکلا تو ایک عورت نے روک لیا اور بولی "تمہیں کیا ہو گیا ہے پتر؟ چنگا بھلا تمہارا منہ ہے اور سوہنی نکھری تمہاری جوانی۔ اس مولوی کے چکر میں کیوں پڑ گئے ہو؟ مجھ بدنصیب کو دیکھو اور اس حرام کے تخم سے بچو۔ میرے گھر والے کو الٰہ دین کے چراغ کا چسکا تھا اور اس مولوی نے وظیفہ بتایا۔ اس نے وظیفہ پورا کر لیا۔ چراغ پر بھی دم پڑھ پڑھ لیا پر جن کو نہیں آنا تھا نہیں آیا۔ اس کنجر نے اسے بتایا کہ جن اللہ کی مرضی سے آئے گا اور اللہ قربانی سے خوش ہوتا ہے۔ کسی پیاری چیز کی قربانی دے کر اللہ کو پیار آئے۔ اس کنجر نے اپنے پتر کو چھری پھیر دی۔ اس کے گوشت کا پلاؤ پکا کر پورے محلے کو کھلا دیا۔ اسی مولوی نے ختم پڑھایا تھا۔ تمہاری چڑھدی جوانی کو کس وظیفے کی لوڑ ہے؟ مجھے دیکھو! پتر کا پلاؤ پک گیا اور گھر والا جیل میں بیٹھا ہے۔ تم کیا چاہتے ہو کہیں تم الٰہ دین تو نہیں ہو؟ تمہارا منہ متھا تو جنوں والا نہیں ہے۔ سائیں الف ننگے کول جاؤ، تمہاری ساری مشکلیں دور ہو جائیں گی۔ وہ آپ جیج کے یار ہا ہے ۔ اللہ تیرا بھلا کرے۔"

فصل ہشتم: دربان نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ میں نے ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو کا حوالہ دیا اور اسے گھڑی دکھائی۔ اس نے میرا نام لیا۔ میں نے سر ہلایا۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ خنک فضا، نیم تاریک نیم روشن کمرہ، کونے میں ایک قوس نما میز جس کے پیچھے ایک خوشنما چہرہ، مسکراہٹ، میرے نام کی گنگناہٹ آرام دہ صوفہ، انٹرکام پر رابطہ آٹومیٹک دروازے کے راستے قالینوں پر پھسلتا ایک کشادہ کمرے کی طویل میز کے سامنے پہنچتا ہوں دروازہ بند ہوتا ہے۔ ایک کاؤچ میں دھنس جانے کا اشارہ ہوتا ہے۔ سوئی سے لے کر لوہے کے گارڈر تک کی امپورٹ کی گفتگو ٹیلی فون پر ختم ہوتی ہے۔ ایک دوسرے رنگ کے ٹیلی فون پر بتی جلتی ہے۔ صاحب انٹرکام پر فون اندر بھیجنے کی ہدایت کرتا ہے۔ کرسی گھومتی ہے۔ تھری پیس سوٹ کے اوپر جڑا ہوا چہرہ میری آنکھوں میں دیکھتا ہے اور ایک کیسٹ پلیئر کی آواز سنائی دیتی ہے "سلیمانی ٹوپی اور الہ دین کا چراغ دراصل ایک ہی قوت کے دو نام ہیں۔ وہ قوت ہم سمندر پار سے منگواتے ہیں اور طلب گاروں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اس قوت کا کچھ معاوضہ ہے۔ آپ کے پاس ادا کرنے کے لیے کیا ہے؟ ایسی ہر قسم کی ہیرا پھیری کے کوائف تو آپ لائے ہی ہوں گے۔ دکھایئے تو ذرا؟"

فصل نہم: ان کے سر پر سلیمانی ٹوپی نہیں ہے۔ وہ سب کو دیکھ سکتے ہیں لیکن کوئی دوسرا ان کو دیکھنے کی ہمت نہیں کرتا۔ وہ وردی پہن کر من مرضی کی شے اٹھا لیتے ہیں اور کوئی چوں نہیں کرتا۔ ان کے پاس الہ دین کا چراغ نہیں ہے لیکن وہ حکم دیتے ہیں تو ایک جن کی بجائے پوری پلٹون متحرک ہو جاتی ہے۔ اس شہر کو تو بیت العافیت ہونا تھا۔ یہ تو سوتا جاگتا شہر بن گیا۔ یہ معلوم بھی نہیں ہوتا کہ یہ سوتا کہاں ہے اور جاگتا کہاں ہے۔ سونے والوں کے درمیان لوگ جاگتے ہیں اور جاگتے انسانوں کے بیچ لوگ سوتے ہیں۔ عافیت کہاں ہے؟ جہاں سچائی ہے۔ سچائی کہاں ہے؟ گھر میں تو نہیں ہے۔ کہیں باہر ہے۔ کسی برگد کے پیڑ تلے۔ کسی غار کی کھوہ میں۔ سچائی کی تلاش میں غار حرا کا سفر کیا گیا۔ برگد تلے گوتم کو نروان ملا۔ سچائی کہیں باہر ہے۔ سفر سفر سفر

حرکت حرکت۔ پاسپورٹ، ویزا، ٹکٹ، سلیمانی ٹوپی اور الٰہ دین کا چراغ ایک ہی قوت کے دو نام ہیں۔ سمندر پار سے منگواتے ہیں۔ سانڈے اپنے بلوں سے جھانکتے تھے اور چھپکلیاں، مگرمچھوں کی صورت ڈراتی تھیں۔ سمندر پار سے دوناموں والی ایک قوت آئی۔ اک کے بوٹے اور کیکر کے درخت سبز گھاس کے وسیع قطعوں میں بدل گئے۔ رستوں پر سرخ بجری بچھ گئی کناروں پر چونے کی سفید لکیریں لگ گئیں۔ پام کے گملے سج گئے، گلاب موتیے اور رات کی رانی کی خوشبو پھیل گئی۔ تتلیاں، جگنو۔ بارش کے بعد کی تازہ ہوا۔ بیر بہوٹیاں، مخمل کے سرخ رنگ ہاتھ پھیر لوں؟ کون ہے؟ جنگلی گنوار، پکڑو پکڑو۔ اک کے بوٹے کیکر کے درخت چھپکلیاں، مگرمچھوں کی صورت منہ کھولے لیٹی ہیں۔ آواز کہیں قریب سے آرہی ہے۔ میری چٹی داڑھی کا خیال کرو۔ میرے بڑے بیٹے کو دیکھو۔

<u>فصل دہم</u>: اللہ اللہ سرزمین حجاز۔ سبحان تیری قدرت ضرور جاؤ بچہ۔ ضرور جاؤ۔ تیل کے چشمے وہاں سے پھوٹے جہاں پانی ملنا بھی مشکل ہوا کرتا تھا۔ یہ فضل خداوندی اور شان ربوبیت ہے۔ ایک در بند ہوتا ہے تو سو در کھلتے ہیں تم نوکری کی تلاش میں پھرے اور ناکام رہے۔ اب اللہ کی شان دیکھو۔ یہ سعودی عرب کا ویزا۔ محنت کرو اور خوب کماؤ۔ عمرہ اور حج اضافی نعمتیں۔ مقدس کھجوریں کھاؤ تو گٹھلیاں جمع کرتے رہنا۔ اللہ بخشے تمہاری نانی کہتی تھی کہ گھر میں برکت رہتی ہے۔ پانچ گٹھلیاں تو اب بھی ایک شیشی میں موجود ہے۔ اب تو ہم تھوڑا سا آبِ زم زم بھی گھر میں رکھ سکیں گے۔ جاؤ بچہ ضرور جاؤ۔ سرزمین حجاز میں روزی کمانے کا موقع ملے تو سمجھو دونوں جہان کی نعمتیں اسی دنیا میں مل گئیں۔ اس ویزے کو چوم کر آنکھوں سے لگاؤ — اور ہاں سنو! میرے لیے دو گز کپڑا بھی لیتے آنا کفن بغیر کسٹم کے لانے کی اجازت ہے۔

<u>اختتامیہ</u>: پہلی چھٹی پر واپس وطن پہنچا تو ٹریولر چیک بھنانے گھر سے نکلا۔ پرانی انارکلی کے چوک میں رک گیا۔ ایک کلچہ کھایا اور لسی پی پھر مال روڈ کی

طرف چل پڑا کہ امریکن ایکسپریس سے کیش لیتا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو وہ دیکھا جس کی توقع نہ تھی۔ امریکن ایکسپریس کے کاؤنٹر کے پیچھے وہ پری بیٹھی تھی۔ وہی جس کے پر نہیں تھے، جو اڑنے کی بجائے بس کا ڈنڈا پکڑے کھڑی تھی اور مجھے اپنے باحواس ہونے کا پورا احساس تھا۔

"پری جی!" جانے میری آواز نکلی کہ نہیں نکلی۔

"فرمائیے؟" وہ بولی۔ وہ سچ مچ مجھ سے مخاطب تھی۔

"آپ کب سے یہاں پر ہیں؟"

"سالوں سے۔ آپ کے پاس کتنے ڈالر ہیں؟"

"سالوں سے۔ کیوں؟" جانے میں نے کہا یا نہیں کہا۔

"میرے خوابوں کا شہزادہ سعودی عرب میں ہے۔" جانے اس نے کہا یا نہیں کہا۔

کتابوں کی باتیں

"بے آواز گلی کوچوں میں" (مجموعۂ کلام) احمد فراز
نیشن پبلی کیشنز۔ لندن - ۱۹۸۲ء صفحات ۱۱۲ قیمت: درج نہیں

'محصور آوازوں' کے نام منسوب یہ مجموعۂ کلام دھندلی نظر اور ہکلاتے ہوئے لہجے سے محفوظ ہے اور یہ ان عیوب سے پاک ہونے کی قیمت شاعر نے خون جگر سے ادا کی ہے اپنے وطن کی ان گلیوں سے جلا وطن ہوا جس کے ہر موسم اسے پیارے تھے منصب اور مرتبے سے محروم ہوا قصے کا آغاز فتح محمد ملک کی زبانی سنیے:

"نعتیہ مشاعرہ ختم ہوا تو ریٹائرڈ جنرل شاہد حامد کرسئ صدارت سے اتر کر سیدھے احمد فراز کے پاس آئے اور ڈپٹ کر بولے "فراز! تم باز نہیں آتے۔ یہ تم نے کیا پڑھا ہے؟"

"میں نے وہی پڑھا ہے جو میں لکھتا ہوں" فراز اس غیر متوقع وار سے سنبھل کر بولے۔

"میں پوچھتا ہوں، یہاں تم نے ایسی چیز کیوں پڑھی؟" شاہد حامد صاحب جوش غضب میں بھنا اٹھے۔

"میں تو وہی پڑھوں گا جو میں لکھتا ہوں" فراز نے مختصر مگر فیصلہ کن جواب دیا۔

"میں تمہیں سمجھوں گا" شاہد حامد صاحب کہ وزیر اطلاعات تھے ہوا کے گھوڑے پر سوار ہوئے اور یہ جا وہ جا مگر سارا ہال سناٹے میں آ گیا اور میرے ذہن میں فراز کی نعت کے شعر گونجنے لگے:

میرے رسول کہ نسبت تجھے اجالوں سے
میں ترا ذکر کروں صبح کے حوالوں سے

تو روشنی کا پیمبر ہے اور مری تاریخ
بھری پڑی ہے شب ظلم کی مثالوں سے"

(تحسین و تردید، اثبات پبلی کیشنز راولپنڈی ۱۹۸۴ء ص ۱۳۵)

غرض یہ عصمت فن کی باضمیر شاعری ہے جس پر فراق صاحب کا یہ جملہ صادق آتا ہے کہ انقلاب سیاسی ہی نہیں جمالیاتی ضرورت ہے تاکہ انسانوں کو ان کا صحیح قدر اوران کی جبلتی خوب صورتیاں اور فطری احساس حسن واپس مل سکے۔ احمد فراز، فیض کے مماثل حالات سے گزرے ہیں اس لیے جا بجا فیض کی پرچھائیاں ہیں لیکن کمال یہ ہے کہ فیض کے اثرات کے باوجود فراز اپنی منفرد آواز پانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

فراز کی شاعری، دراصل دھندلی ہوتی ہوئی سرحدوں کی شاعری ہے یہ سرحدیں اول تو جمالیات اور معاشرے کے درمیان ذات اور کائنات کے درمیان ہیں فراز نے درد کی اس کائنات کی توسیع کر لی ہے مطالبہ تو صرف اتنا تھا کہ:

کب ہم نے کہا تھا ہمیں دستار و قبا دو
ہم لوگ نوا گر ہیں ہمیں اذنِ نوا دو

یہ نغمہ گری بھی اس رومانی مزاج جاناں جاناں والے شاعر کا ہے جو محبتوں اور وفاداریوں کا شاعر ہے جسے اس شعر کی بنا پر یاد رکھا جاتا تھا،

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

اور جمالیاتی SELF-FULFILMENT اور تکمیل ذات چاہنے والے اس شاعر کی زبان بندی ایک ایسے معاشرے نے کی جو رسول خدا کی تعریف کی بھی اجازت نہیں دے سکتا کوئی نعت بھی لکھے تو محتسب کے مقرر کردہ اسلوب کے مطابق ہونا ضروری ہے زبان بندی کی ہر تڑپ جا بجا بڑے موثر اور دل دوز انداز میں چیخ بن کر نہیں شعر بن کر ابھری ہے اور شعر بھی نہایت شائستہ مزاج اور بالیدہ فکر شاعر کا۔

فراز اپنا مقدر سنگ ساری، ص ۳۱، ۱۴۳، عہد کے آئینہ گر ہو،

ہم آئینے لائے ہیں سر کوئے رقیباں — اے سنگ فروشو یہی الزام لگا دو

اور اس صورت حال سے گزرتے ہوئے درد و کرب بھی بہت ہے۔ نشاط و کیف بھی بہت' اداسی اور افسردگی بھی وافر ہے اور حوصلہ اور اعتماد بھی بے انتہا۔ ان چاروں کیفیات کو "بے آواز گلی کوچوں میں" دیکھیے :-

درد و کرب :

اس موسم میں گل دانوں کی رسم کہاں ہے — لوگو اب پھولوں کو آتش دان میں رکھنا

درخت ماؤں کی مانند انتظار میں ہیں
طیور لوٹ کے آئے نہ آشیانوں میں

اب کے ہم پر کیسا سال پڑا لوگو — شہر میں آوازوں کا کال پڑا لوگو

کہاں کی آنکھیں کہ اب تو چہروں پہ آبلے ہیں — اور آبلوں سے بھلا کوئی کیسے خواب دیکھے
عجب نہیں ہے جو خوشبوؤں سے ہے شہر خالی — کہ میں نے دہلیز قاتلاں پر گلاب دیکھے

نشاط و کیف کا عالم یہ ہے :

قاتل اس شہر کا جب بانٹ رہا تھا منصب — ایک درویش بھی دیکھا اسی دربار کے بیچ

نبھائی وضع بسمل انتہا تک
نہ مانگا قاتلوں سے خوں بہا تک

جانے کس زعم میں مقتل کو سجائے تم ہو
مجھ کو کیا قتل کرو گے مرے سائے تم ہو

گلیوں میں بارود کی بو — پھر بھی خون مہکتا ہے
دیکھوں تو بیاض شعر میری — اک حرف بھی سرنگوں نہیں ہے

ایک قطرہ تھا کہ اوڑھے تھا خدائی ساری　　　اک ستارہ تھا کہ افلاک پہن کر نکلا

اداسی اور افسردگی کی یہ کیفیت ہے کہ :

جاناں دل کا شہر نگر افسوس کا ہے　　　تیرا میرا سارا سفر افسوس کا ہے
کوئی موسم قرینے کا نہ آیا　　　ہواؤں کے سخن نامعتبر ہیں

شہر کتاب اجڑ گیا حرف برہنہ سر ہوئے
نغمے ہے سر بہ در گلو شعر وطن بدر ہوئے

مجھے تو ڈر ہے کہ شیخ حرم کے ہاتھوں سے　　　کہیں مری طرح رسوا رسول و رب بھی نہ ہوں

اور اعتماد اور حوصلے کی یہ انتہا ہے :

کل تاریخ یقیناً خود کو دہرائے گی　　　آج کے اک اک منظر کو پہچان میں رکھنا

اک بوند تھی لہو کی سر دار تو گری　　　یہ بھی بہت ہے خوف کی دیوار تو گری

وہ دن بھی آئے صلیب گر بھی صلیب پر ہوں
یہ شہر اک روز پھر سے یوم حساب دیکھے

یہ راز نعرۂ منصور ہی سے ہم پہ کھلا　　　کہ چوب منبر مسجد صلیب شہر بھی ہے
کڑی ہے جنگ کہ اب کے مقابلے پہ فراز　　　امیر شہر بھی ہے اور خطیب شہر بھی ہے

جنھیں زعم کمانداری بہت ہے　　　انھیں پر خوف بھی طاری بہت ہے

پیچ رکھتے ہو بہت صاحبو دستار کے بیچ　　　ہم نے سر گرتے ہوئے دیکھے ہیں بازار کے بیچ

دوسری سرحد رومانیت اور کلاسیکیت کی ہے جسے فراز کی شاعری نے بڑی آہستگی سے

عبور کر لیا۔ یہ آخری شعر جو نقل ہوا میر کے انداز کا ہے مگر میر کی یاسیت نہیں مقاومت کا شعر ہے گویا میر کے لہجے کو خلاقانہ طور پر برتا اور اپنایا ہے۔ یہی حال دوسرے ممتاز اسالیب کا بھی ہے جنھیں فراز نے جب برتا ہے بالکل اپنا بنا کر برتا ہے۔

تیسری سرحد رنگ و آہنگ کی ہے احمد فراز کی پوری شاعری رنگوں کے احساس سے سرشار شاعری ہے۔ نغمہ سے بھی زیادہ فراز کو رنگ عزیز ہیں رت جگے، روشنیاں، قاصد کبوتر کی متحرک تصویریں، عفریت، ٹیڑھی ترچھی پگڈنڈیاں، حرفوں کے مرغولے دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوتے ہوئے چہرے، غرض ہر جگہ تصویریں اور رنگ بکھرے ہوئے ہیں جو نت نئے مرقع سجاتے ہیں اور جمالیاتی طرفگی کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ نغمہ، آواز اور آہنگ سے وابستگی کی سرحد بعد کو آتی ہے اور یہاں بھی فراز کی آواز اور آہنگ سے وفاداری واضح ہے۔ ناچتی گاتی ردیفوں کی کھنک (اس دن تھا، بیا دجاناں، بے ادب بھی نہ ہوں جیسی ردیفوں کا استعمال) قافیوں کا کھٹکا اور خاص طور پر آواز کا شعور اشعار میں مضمر ہے مثلاً زنجیر پا کا بے آواز ہونا اور اس قسم کے مترنم مصرعے

محفل محفل مقتل مقتل سب بسمل جلاد ہے کون

اسی میلان کے گواہ ہیں۔

مجموعے میں ناموجود، دوسری ہجرت، بن باس، فیض کے فراق میں، پہلی آواز، آشیاں گم کردہ، پچھلا پہر، بیا دجاناں، غزالاں تم تو واقف ہو، پاس کیا تھا، اے شہر میں تیرا نغمہ گر ہوں، ندیم آنکھیں ندیم چہرہ، قاصد کبوتر، عفریت، میرے عصر کے موسیٰ، جلاد، چلو اس شہر کا ماتم کریں، حرف کی شہادت، دشمن کا قصیدہ، ہواوں کی بشارت، مت قتل کرو آوازوں کو، شہر آشوب اور محاصرہ عنوان کی ۲۳ نظمیں بھی شامل ہیں۔ فنی اعتبار سے ان میں کساؤ کم ہے اور کہیں کہیں صراحت اور تکرار زیادہ ہے۔ پھر غزلوں کا سا ارتکاز پیدا نہیں ہوا ہے گو احساس واحد ہے مگر اظہار میں وہ چستی نہیں آسکی ہے مختصر یہ کہ جاناں جاناں، کے شاعر نے "بے آواز گلی کوچوں میں" پہنچتے پہنچتے فکر و فن کی ایک پوری اقلیم سر کر لی ہے اور عصمت فکر اور جرأت اظہار میں امتیاز و افتخار

پیدا کیا ہے۔ (م۔ح)

"آئینہ خانہ" (مجموعۂ کلام) — اختر حسین جعفری

التحریر اردو بازار۔ لاہور ۱۹۸۱ء صفحات ۱۶۰ قیمت ۲۵/-

اختر حسین جعفری کا "آئینہ خانہ" اکتا دینے والی یکساں شاعری میں ایک چونکا دینے والا دھماکہ ہے آخر کار ایک ایسا شاعر تو ملا جس کے پاس بیان کی ندرت اور احساس کی تازگی ہے، ہر لفظ میں طرح داری اور ہر مصرعہ میں نئی تراش ___ اور یہ محض اسلوب زدگی کا مظاہرہ نہیں پوری شخصیت میں رچی بسی انفرادیت کا اعجاز ہے۔ زمین کا اولین مکتوب کے عنوان سے لکھا ہوا مصنف کا دیباچہ خود ایک جاگتا جگمگاتا عہد نامہ ہے اور آج کے تخلیق کاروں اور نام نہاد تنقید نگاروں کی اُلجھی ہوئی تحریروں سے کتنا مختلف ہے وہ لکھتے ہیں :۔

"شاعر.... (کو) ہر وقت مستقبل سے متحارب صورت حال میں جینا چاہیے"۔

آگے لکھتے ہیں :۔

"(جو شاعر) ارتقا کے راستے پر مزید قدم اٹھانے سے غیر ارادی طور پر گریزاں اور خود اپنے مستند تخلیقی تجربوں کو دہرا کر ادب میں زندہ ہوتا ہے۔ اس عالم میں دھنک کا مکالمہ سنتا ضرور ہے مگر اس تجربے کے اظہار کے لیے نئے نئے شعری پیرہن تلاش نہیں کرتا، بھونڈی چادر میں کچھ اور چاک ہو یا ہوتے ہیں مگر چشم سوزن کو تازہ لہو کے تار دستیاب نہیں ہوتے اور بالآخر بادلوں کے نام زمین کے کسی تازہ مکتوب کی نقل اس شاعر تک نہیں پہنچتی"۔ (ص ۵)

غرض یہ ایک ایسے شاعر کا مجموعۂ کلام ہے جو ارتقا سے مایوس نہیں، ارتقا کا مجاہد ہے جو ہر وقت مستقبل کو سنوارنے کے لیے حال سے متحارب ہے جو ابلاغ کی ناکامی پر ماتم نہیں کرتا بلکہ نت نئے آئینے تراشتے اور مرقع سجاتا ہے اور ابلاغ کو نئی شعری

اور جمالیاتی ہی نہیں فکری انبساط اور بصیرت سے منور کر دیتا ہے۔ نثر ہو یا نظم اس مجموعے کا حرف حرف تازہ پھولوں سے بھری کیاری کی طرح جگمگاتا ہے اور ہر تصویر ہر امیج اور ہر آواز رنگ، نور اور مستی سے سرشار ہے۔ پھر علامتوں کا وہ بلیغ اور وجد آفریں استعمال ہے کہ پڑھنے والا دور تک ان کی معنویت میں ڈوبتا چلا جاتا ہے۔ چند مثالیں دیکھیے :

کیا زرد شجر کو خط بھیجیں
کیا اس موسم سے میل کریں
جس کے مہتاب تہِ دریا جس کے سورج گرداب میں ہیں
جس کے انجم کشتی کشتی ساحل ساحل زنجیر ہوئے

داماں صبا صد کار رفو
چشم سوزن میں جمع لہو سے تار نکالیں لیلائیں
بخیہ بخیہ درہم ٹانکیں، پیراہن جن کے رہن ہوئے
کیا ان شاخوں سے بات کریں
کیا میل کریں
کیا خط بھیجیں

'پھر بہار آئی' کے یہ مصرعے پڑھیے اور ان کی بلاغتوں پر غور کیجیے :

پھر بہار آئی، پھر آئے مقتلوں میں فاتحہ خوانی کے دن
بے صدا قبروں کی لوحیں
مرثیے لکھنے کے دن
پھر وہی پوروں میں خار آگہی کی پرورش
پھر وہی صبح مقفل پر شبانہ دستکیں
اور چمن آرائیوں میں تازہ تر صف بندیوں میں اس کا لشکر ڈھونڈنا
اس کا چہرہ، اس کا پرچم ڈھونڈنا، خون میں لتھڑا ہوا

مذہبی حوالوں بالخصوص کربلا کی علامتوں کے سہارے شاعری کا چلن عام ہو چلا ہے مگر اختر حسین جعفری کی شاعری محض ان آراستہ علامتوں یا تازہ کار بلکہ لالہ کار تصویری مرقعوں یا تمثالوں کی شاعری نہیں ہے تجربے کی لالہ کاری کی شاعری ہے۔ اس کا رشتہ ابن عربی اور ایذرا پاونڈ سے اتنا نہیں جتنا خود ان حالات و واردات سے ہے جن سے پاکستانی شاعری دوچار ہے اور جنھیں اس نے احساس کی پوری نزاکت اور اظہار کی پوری گزند کے ساتھ جھیلا ہے۔ شاعری اختر حسین جعفری کے لیے بڑا بھرپور تجربہ ہے زندگی کی ساری کرب ناک تہہ داریوں کا تجربہ جو ایک سربمہر معاشرے کی گھٹن اسے فراہم کر سکتی ہے۔

تازگی اور نادرہ کاری کی مہریں ہر مصرعے پر لگی ہوئی ہیں اور یہ نیا پن اتنا تازہ اور اتنا شاداب ہے کہ اس کی مثال معاصر اردو شاعری میں نایاب ہے۔

دور معاصر کی رمزیت کے ہی ذریعے ان اشعار کو سمجھا جائے تو "سولی سے عیسیٰ اترے تو" والی نظم کیسی بلیغ معنویت اور کیسے شاداب استعاروں سے سرشار ہے:

سولی سے عیسیٰ اترے تو تیز ہوا کا زور تھمے
قاتل ہاتھوں کا زخم بھرے
تخت سے عیسیٰ کب اُترے گا
عہد ہمارا عہد ملامت، عہد خجالت
ایک اپاہج کی بیساکھی کتنے لنگڑوں کے کام آئے۔ (ص ۳۰)

معاصر ادب کا ستارہ شناس کہاں سے اظہار کی دولت لائے کہ "آئینہ خانہ" کی صحیح شعری اہمیت اور اس کی بخشی ہوئی تراکیب، استعارے اور انداز و اسالیب بیان کا حساب کتاب رکھ سکے اور اس کی معنویتوں کا شمار کرے لیکن بلاشبہ آئینہ خانہ کی اشاعت فیض اور احمد فراز کے بعد اردو شاعری کا سب سے بڑا واقعہ ہے اور اس مجموعے کی اشاعت نے اردو شاعری کو نئی تمثال، نئی تراکیب اور تازگیٔ ادا کا اتنا بڑا خزانہ بخش دیا ہے جس کا اندازہ فوری طور پر لگانا دشوار ہے۔ اختر حسین جعفری

اپنی اس کاوش میں کامیاب ہوئے ہیں جس کا تذکرہ ان مصرعوں میں کیا گیا ہے:

اڑائیں فکر کے باغوں سے تتلیوں سے پرے
پروں نے جن کے چھپالی ہے اصل اندیشہ
وہ روشنائی وہ خوشبوئے غم کشید کریں
مشام جاں نے جو قرطاس پر نہیں دیکھی

قرطاس پر اس خوشبوئے غم کی کشید پر وہ بھی مبارکباد کے مستحق ہیں اور اردو شاعری بھی جسے یہ دولت بیدار ملی۔ (م۔ح)

"گرد راہ" (سوانح عمری) ــــــــــــ اختر حسین رائے پوری
مکتبہ افکار کراچی ۱۹۸۴ء صفحات ۳۱۸ قیمت ۵۴/-

اختر حسین رائے پوری اپنے تاریخ ساز مضمون "ادب اور زندگی" سے شہرت دوام پا گئے اور 'ادب اور انقلاب' کے تنقیدی مضامین اور 'محبت اور نفرت' کے افسانوں کی نئی ترقی پسندانہ جہت کی بدولت بقول سجاد ظہیر ان کا شمار ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ یہ آپ بیتی اہم ضرور ہے کہ اس میں مختلف مشاہیر اور مختلف ممالک کا حال احوال ملتا ہے مگر اختر حسین رائے پوری کی شخصیت اور کردار کی جو تصویر اُبھرتی ہے وہ کسی واضح نظریاتی وابستگی والے دانش ور کی نہیں ہے بلکہ ایک ایسے ذہین اور باخبر انسان کی ہے جسے بھانت بھانت کے بڑے آدمیوں کو شیشے میں اتار لینے کا فن آتا ہے اور جس کی زندگی کٹی ہے تو کسی اعلیٰ اقدار کی کھوج یا ان کی خدمت کے بجائے خود اپنی ہی عظمت اور ذہانت ناپنے میں۔ اس اعتبار سے سوانح عمری خاصی مایوس کن ہے۔ 'پاکستان ناگزیر تھا' والا باب اس کا ثبوت ہے کہ مصنف نے سوشلزم تو کیا نیشنلزم اور سیکولرزم کے تصورات کو بھی اپنایا نہیں تھا۔ 'گرد راہ' میں افراد کی دل کشی اور اقدار کی کمی غالب ہے۔ (م۔ح)

جہنم کنڈلی (ناول) ——————— فہیم اعظمی

اسباق پبلی کیشنز۔ ۲۳۶ سی پلازہ، حسرت موہانی روڈ کراچی ۱۹۸۴ء صفحات ۲۶۹ قیمت ۴۵/-

نہایت خوب صورت اور دیدہ زیب، یہ کتاب مصنف نے نہایت محبت اور خلوص سے بھیجی۔ کئی وزنی اور باوقار رائیں بھی شریک اشاعت ہیں مگر درحقیقت یہ محض فضول کاوش ہے۔ یہ نہ ناول بن سکا ہے نہ کوئی فکری دستاویز۔ اس ادھ کچری تحریر کے لائق مصنف کو ابھی کچھ دیر اور انتظار کرنا تھا کہ افکار و احساسات کوئی واضح شکل اختیار کر پاتے۔ (م۔ ح)

"تخلیقی ادب" ماہنامہ اسلوب مرتبہ: ڈاکٹر مشفق خواجہ

۳ ڈی ۶ ۹/۲۶ ناظم آباد، کراچی ۱۹۸۳ء صفحات ۸۴۰ قیمت: ۷۵/-

نہایت صاف ستھرا، سلیقے سے مرتب کیا ہوا یہ شمارہ ایک بار پھر مشفق خواجہ کی دیو قامتی کا ثبوت ہے۔ اس بار جمیل الدین عالی اور وزیر آغا پر خصوصی مطالعے۔ عالمی ادب پر خصوصی گوشہ، نظیر صدیقی کا سفرنامہ، فانی اور غلام رسول قہر کے شخصی خاکے، اختر الایمان، سردار جعفری، اختر انصاری، ظہیر کاشمیری کی نظمیں، ادا جعفری کے ہائیکو، ممتاز مفتی، رشید امجد اور انتظار حسین کے افسانے اور ممتاز حسین کا مضمون شاعری اور شخصیت شریک اشاعت ہیں۔ ممتاز حسین کا مضمون نہایت وقیع اور فکر انگیز ہے۔ غرض پورا مجلہ کیفیت اور سلیقہ مندی کا نمونہ ہے۔ مشفق خواجہ لائق مبارک باد ہیں کہ تخلیقی ادب کے اس تیسرے شمارے کے ساتھ کرکٹ کی اصطلاح میں ان کی ہیٹ ٹرک مکمل ہوئی اور بڑے سلیقے سے مکمل ہوئی۔ (م۔ ح)

"معاصر" (۲) مرتب: عطاء اللہ قاسمی و حبیب اللہ خاں

۳۰۴ الفیصل پلازہ۔ لاہور ۱۹۸۴ء صفحات ۱۰۱۸ قیمت ۵/-

یہ بھاری بھرکم مجلہ پھر پاکستان کی اردو سے محبت اور بامعنی پرسوز اور باوقار

ادبی اظہار کی تڑپ کا اظہار ہے۔ مجلہ بھاری بھر کم ہے مگر دور تک فکر و احساس کی راہیں روشن کر دینے والی چنگاریاں کم ہیں۔ بہت کم ہیں بلکہ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے کہ پاکستان میں جیسے ہر اردو تحریر چھپ جاتی ہو اور ہر چھپنے والے کو بلا لحاظ قدو قامت احترام اور محبت یا کم سے کم توجہ ضرور مل جاتی ہو۔ یہ فال نیک نہیں، کساد بازاری کی دلیل ہے لیکن جہاں معنی خیز اور ارتقا انگیز فکر پر قدغن ہو یا اس کی کمی ہو وہاں یہ سب کچھ قدرتی سا ہے زیادہ تر تحریریں اسی قماش کی ہیں۔

حمد اور نعت اب پاکستان کے ادبی رسائل کی رسم بنتی جارہی ہیں لیکن قسم لے لیجیے جو ان میں ذرا بھی شعریت ہوتی ہو۔ اس کے علاوہ اگر کوئی فکری سمت ان مضامین سے برآمد ہوتی ہے تو وہ اپنے گنیوں یا اسلام کا وہ تصور ہے جو وجدان سے قریب اور عقل سے پرے ہے۔ جمیل الدین عالی کی نظم 'اما بعد' کے یہ مصرعے کیسے بلیغ ہیں:

اے خدا
تو نے اتنا دیا
اب مجھے تاب اظہار دے
سچ کا آزار دے
حسن گفتار دے

افسانوں میں احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، انور سجاد، خالدہ حسین۔ شاعری میں احمد ندیم قاسمی، منیر نیازی، شہزاد احمد، پروین شاکر، ثروت حسین، حسن رضوی، امجد اسلام امجد، انیس ناگی اور اختر حسین جعفری کی تازہ تخلیقات۔ خصوصی مطالعے میں احمد ندیم قاسمی، منیر نیازی، انتظار حسین کا ناول 'بستی' وزیر آغا کا سومنات' حلقۂ ارباب ذوق لندن کے مطالعے ہیں۔ تنقیدی حصہ کمزور ہے۔ مذہب کے تصور پر احسان دانش کا مضمون اور ایمانیات کے ذیل میں سورۂ ابراہیم پر ابوالخیر مودودی کا مضمون اور حسب توقع تفسیر قرآن اور فلسفۂ جدید پر محمد حسن عسکری کے ایک فرانسیسی ترجمۂ قرآن کے دیباچے کا ترجمہ مظفر علی سید نے شائع کیا ہے۔

سلیم احمد اور فتح محمد ملک کے درمیان مراسلت شائع کی گئی ہے جس میں فتح محمد ملک جیسے سلجھے ہوئے سنجیدہ ادیب نے اقبال کے نقطۂ نظر کو اس طرح سمجھا ہے کہ:

"جی ہاں، میں اس بات کے حق میں ہوں کہ بھارت کے مسلمان پاکستان ہجرت کر آئیں یا پھر بھارت کے کسی مسلمان اکثریتی علاقے میں ایک اور پاکستان قائم کریں۔ فکر اقبال کی روشنی میں بھارتی مسلمانوں کو کسی صورت میں بھی بھارتی قومیت کا نظریہ قبول نہ کرنا چاہیے۔ آج بھی بھارتی مسلمانوں کے لیے اسلامی لائحۂ عمل یہی ہے کہ وہ متحدہ بھارتی قومیت کا نظریہ اپنانے کے بجائے جداگانہ مسلمان قومیت پر اصرار کریں۔ اقبال کے تصور اسلام کی رو سے اسلام کے اخلاقی مسلک کو اسلام کے سیاسی مسلک سے الگ کرنا اور متحدہ بھارتی قومیت کی تعمیر کی خاطر اسلام کے سیاسی مسلک کو ترک کر دینا ناممکن ہے۔ یہ بات ۱۹۳۰ء میں بھی سچ تھی اور آج ۱۹۸۱ء میں بھی سچ ہے۔" ص ۳۹۴

گویا ہندوستانی مسلمانوں کو اب ایک یا دو اور پاکستان بنانے پر اصرار کرنا چاہیے۔ فتح محمد ملک اگر اقبال کی ان مسخ شدہ "تعلیمات" کا رخ اگر بنگلہ دیش کے مسلمانوں یا کم سے کم اپنے ملک کے بلوچی اور سندھی مسلمانوں ہی کو سمجھاتے تو بہتر ہوتا۔ حیرت اور افسوس ہے کہ پاکستان کے ارباب فکر اب تک اپنے مسلک کی بنیادی خامیوں پر غور نہیں کر پائے ہیں۔ قومیں محض مذہب کی بنیاد پر نہ کبھی بنی ہیں نہ بن سکتی ہیں اور نہ اقبال سے منسوب اس بیان میں کوئی صداقت ہے کہ "وطن پرستی دہریت کا شاخسانہ" ہے (۳۹۶) اور اسلام میں زمین سے وابستگی کی گنجائش نہیں (یہ بھی خوب ہے کہ پاکستان سے محبت تو حب وطن کہلائے اور دوسرے ملکوں کے مسلمان اگر اپنے وطن سے محبت کریں تو وہ غیر اسلامی ٹھہریں)

یوں بھی پورے رسالے کے مضامین کا نظریاتی رخ ہندوستان دشمن ہے۔ کوئی صاحب ہیں سراج منیر، ان کا فرمان ہے:

"جس طرح پاکستان کی تخلیق ایک عظیم تاریخی اور اجتماعی تجربہ ہے اس
طرح ہندوستانی ادب کے لیے ہندوستان کی آزادی کوئی روحانی
واردات نہیں بن سکی اور اس طرح اجتماعی تجربے کا خانہ ہندوستان
کے اردو ہی کیا دوسری زبانوں کے ادب میں بھی خالی ہے چنانچہ اس
کا اثر یہ ہوا ہے کہ شاعری کی سطح پر اجتماعی تجربے کی غیر موجودگی سے
پیدا ہونے والے خلا کو انفرادی یا گروہی آشوب کے ادب نے پُر کیا
ہے اور اس کا معیار ہمارے سامنے ہے۔"

صاف ظاہر ہے کہ سراج منیر صاحب کو ہندوستان کی دیگر زبانیں تو درکنار ہندوستان کے اردو ادب کی بھی واقفیت نہیں ہے اور اگر ہے تو ان کی آنکھوں پر تعصب کا چشمہ اور عقل و فہم پر ہی نہیں ذوق شعر پر بھی مہریں لگی ہوئی ہیں وہ "عظیم" "تاریخی" اور "اجتماعی" کے الفاظ بے سوچے سمجھے برتتے ہیں اور ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچتے کہ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد (تحریک پاکستان کے برعکس) صدیوں پر پھیلی ہوئی تحریک تھی اور کم سے کم ۷۵ برس کی عوامی شرکت کا نتیجہ تھی پھر قیامت یہ ہے کہ پاکستانی ادب کے صحت مند حصے سے وہ جان بوجھ کر آنکھیں بند کرنے پر مجبور ہیں یا خود کو مجبور پاتے ہیں ورنہ وہ یقیناً جانتے ہوں گے کہ ادب کی جاگیر اب بھی تقسیم نہیں ہوئی ہے اور توانا فکر کی لہریں اور تخلیقی جہاں آفرینیوں کی صداقتیں ہندوستان اور پاکستان کے ادب (صرف اردو ہی کے نہیں سبھی زبانوں کے ادب) کو سمیٹے ہوئے ہے وہ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ انھوں نے جب یہ الفاظ لکھے وہ غلط ہی نہیں ہیں جھوٹ بھی ہیں:

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ممتاز حسین اور ان کے شاگردان رشید نے
جو رویہ اختیار کیا تھا یعنی تنقید لکھنے کے لیے نقاد کو ہر طرح کے
شعری ذوق اور فہم سے پاک رکھنے کا جو اہتمام کیا تھا وہ پورا ذخیرہ
کا ذخیرہ ہو چکا ہے اب نئی تنقید اس وقت تک مفید نہیں ہو سکتی

"جب تک اس میں روایتی نقطۂ نظر اور شعری روایت کا مکمل فہم اس
کے ضروری شعبہ ہائے علم پر دسترس کے ساتھ موجود نہ ہو" (ص۴۳)

اول تو ممتاز حسین نے کبھی شعری ذوق اور فہم سے بیزاری پر زور نہیں دیا۔ ابھی سراج منیر کو اپنے ذوق شعری کا ثبوت دینا ہے اور ان کے اس مقالے سے بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا دوسرے متعلقہ علوم سے واقفیت اور آگہی کے سلسلے میں (اگر محض دینیات یا رہنے گنیوں نہیں ہیں تو) ممتاز حسین اور ان کے شاگردوں کی سطح تک ابھی انھیں اور ان کے متاثرین کو رسائی حاصل کرنا باقی ہے محض اتفاق نہیں کہ تمام رجعت پسندی کے ڈھنڈورچیوں کے باوجود آج بھی پاکستان کی اردو تنقید میں جو نام معتبر ہیں وہ ممتاز حسین، محمد علی صدیقی، عتیق احمد، احمد ہمدانی اور شہزاد منظر کے ہیں شاعری میں جو نام آج بھی معتبر ہیں وہ فیض احمد، احمد فراز، جالب کے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا نقطۂ نظر بدلے تو سراج منیر کو ہندوستان ہی کے نہیں پاکستان کے اردو ادب میں بھی نئی اور صحیح توانائیوں اور معنویتوں کا احساس اور عرفان ہوگا۔

ہندوستان دشمنی کی مزید مثالیں رفیق ڈوگر کے "اے آب رود گنگا" کے تبصرے میں بھی ملیں گے (ص۵۹)۔ غرض "معاصر (۲)" عبرت کا سامان بھی ہے اور غور و فکر کا بھی۔ (م۔ح)

یہ پرچہ پریس جارہا تھا کہ فتح محمد ملک کے تنقیدی مضامین کا دیدہ زیب مجموعہ "تحسین و تردید" مطبوعہ اثبات پبلی کیشنز، پوسٹ بکس ۲۴۸، راولپنڈی، ۱۹۸۴ء صفحات ۳۰۳، قیمت ۴۵/-، موصول ہوا۔ تفصیلی تبصرے کے بغیر اس کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اس کے لیے شکریے کے ساتھ محض اس کی وصولیابی کی اطلاع دی جاتی ہے۔ ادارہ

رفیقوں کو خراج عقیدت

نامور اور عہد ساز محقق :	قاضی عبدالودود
عہد آفریں نقاد :	کلیم الدین احمد
قوم پرست انسان دوست شاعر اور صحافی :	ساغر نظامی
بچوں کے ادیب، نقاد اور مدیر "الفاظ" :	اطہر پرویز
مشہور شاعر اور فن کارانہ خودداری کے محافظ :	نازش پرتاپ گڑھی
ماہر اقبالیات :	عالم خوندمیری
اردو کے مشہور نقاد اور شاعر :	سلیم احمد
اقبال آشنائی کے مصنف اور بہار یونیورسٹی میں اردو کے جواں سال استاد :	حاتم رامپوری
ہندی کے مشہور شاعر اور ڈراما نگار :	سرویشور دیال سکسینہ

کی وفات پر ادارہ "عصری ادب" اظہار تعزیت کرتا ہے اور پس ماندگان سے اظہار ہمدردی کرتا ہے۔

[illegible]

پاکستانی ادب کے نئے رجحانات

۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء سے نہیں تو ۵ جولائی ۱۹۷۷ء سے شروع ہونے والے دور کو بھٹو کا دور کہا جا سکتا ہے۔
یہ دور ابھی تک جاری ہے۔

۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو حبیب جالب خاموش ہوا اور مارشل لاء ریگولیشنوں اور آرڈیننسوں نے پہلا شعر کہا۔ ایک کی خاموشی اور دوسرے کے کلام بلاغت نظام کے پیچھے اور اوپر ذوالفقار علی بھٹو کی قدآور شخصیت کا سایہ ہے۔

۴ اپریل ۱۹۷۹ء کے بعد یہ سایہ بڑھتا جا رہا ہے۔

۲

جالب تو شروع سے ہی بھٹو کے خلاف تھا۔ اس کی مخالفت کو بھٹو کے دورِ حکومت شروع ہونے کے بعد اور جلا ملی۔ حالات کی پیچیدگیاں ایسی تھیں اور خود بھٹو کی سیاست کے بعض رخ ایسے تھے کہ جالب ایسے شاعروں اور ادیبوں اور بھٹو کے درمیان ذہنی فاصلہ بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ حیدرآباد جیل کے دروازے وا ہوئے۔

لیکن بعض لوگ ایسے تھے جو بھٹو کی ۱۹۷۱ء سے پہلے کی سیاست سے ہم آہنگ ہو کر آئے تھے جو اسے پاکستان کے لئے ایک نئے مستقبل کا باب سمجھتے تھے، ۱۹۷۲ء کے بعد جوں جوں سیاست آگے بڑھتی گئی ان کے اور بھٹو کے درمیان فاصلے بڑھتے گئے۔ ایسے لوگوں میں عباس اطہر کا نام لیا جا سکتا ہے۔ استعارے یا مثال کے طور پر عباس اطہر کے ہاں بھٹو سے مایوسی کا اظہار ملتا ہے۔ ایسے جیسے کسی بت کے پاؤں تلے کے نکل آئے ہوں۔ ایسے ہی پھر کیا مسئلہ کی تخلیق بھی ہو سکتی ہے۔ جس میں طلسم کے ٹوٹنے اور اس کے بعد پیدا ہونے والی تلخی ملتی ہے۔ امیدوں کے ٹوٹنے اور آدرشوں کے لٹنے کا ذکر ہے۔ مگر جالب کی شاعری میں "میں نہ کہتا تھا" کا لہجہ اور مبارزت کی کہانی ہے تو عباس اطہر کے قبیلے کے ہاں "یہ تم نے کیا کر دیا؟ تم ایسے نہ تھے!"

فیض احمد فیض کے ہاں مایوسی ایک اعتماد کو جنم دیتی ہے۔ ایسا اعتماد جو مخدوم محی الدین سے کہلواتی ہے کہ جگنو بھی جا کر تیرا اقتدار کب سے ہے۔ ان کے ہاں بھی ایک گونہ مایوسی کی کسک ملتی ہے لیکن تدریجی شعور سے [illegible]
[illegible]

اور جب عوام دشمن طبقوں اور ان کی نمائندگی کرنے والی سیاسی جماعتوں نے اسلام اور جمہوریت کے نام پر ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لیے تیاریاں شروع کیں تو بائیں بازو اور آزاد خیال عناصر کے ایک حصے نے جس میں جمہوریت نواز ترقی پسند حلقے شامل تھے ان کا ساتھ دینا مناسب سمجھا۔ ایک عام بے اطمینانی نے دانشوروں کے ایک بڑے حصے کو متاثر کیا۔ ظفر اقبال کی اس دور کی شاعری میں یہی بے اطمینانی موجود ہے اس نے طنز کا حربہ استعمال کیا کہ اس کے ذریعے آدرش اور حقیقت، کہنے اور کرنے کے فاصلے کی پیمائش کی جا سکتی ہے۔

اب یہ ادیب اور شاعر سمجھتے تھے کہ وہ جمہوریت اور عوامی خوشحالی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

یہ درست ہے کہ درمیانے طبقے، نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے یا اس طبقے کی ذہنیت رکھنے والے دانشوروں کی ایک بڑی تعداد برسراقتدار جماعت کی سیاست اور طرزِ حکومت سے بیزار تھی۔

مگر اُنہوں نے یہ خیال نہ کیا کہ بھٹو کا متبادل فرقہ پرستی، جہالت، تنگ نظری کا جمہوریت دشمنی اور عوام دشمنی میں غوطے کھانے والی قیادت بنے گی۔ جو زمانہ وسطیٰ کے فرسودہ فلسفے کے بل بوتے پر اسلام کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے نوآبادیاتی نظام کے تحت پروان چڑھنے والی مُردہ دل، نیم جان، لکھ پتی سرمایہ داری کا تحفظ کرنا چاہے گی۔

۴

جولائی ۱۹۷۷ کی فوجی کارروائی نے بعض ادیبوں اور شاعروں کی آنکھیں کھول دیں۔ لیکن بیشتر ایسے تھے جو سمجھتے تھے کہ روشن مستقبل ایک حسینہ کی مانند گلی کی نکڑ پہ ٹھہرا ہے۔

گلی موجود ہے اور اس کی نکڑ بھی۔ لیکن حسینہ نہیں آئی۔

حسینہ آتی بھی کیسے؟ اُس نے تو وعدہ ہی نہیں کیا تھا آنے کا۔ یہ تو کسی من چلے نے اس کی جانب سے فرضی پیغام ملنے کا پہنچا دیا تھا۔ اس میں حسینہ کا کیا قصور؟

اب جو چلنے والے نے انتظار کے پہاڑ سے نیچے جھانک کر دیکھا تو لوگ تھے کہ ٹکٹکی کے کٹہرے تھے اور جلاد تھے کہ بڑھے آ رہے تھے ہاتھوں میں چابک لئے۔ کوڑے پڑ رہے تھے۔ سر اٹھا کے چلنے کی بات بھی نہ تھی کہ گرفت ہوتی، چلنے پر بھی ممانعت تھی۔

بیشتر دانشور جو جبر سے ناواقف تھے جلد ہی سنبھل گئے۔ لیکن ایسے بھی تھے جو حیدرآباد جیل کے دروازے ایک بار پھر وا ہونے سے یہ سمجھ بیٹھے کہ عوام قید خانے سے رہا ہو گئے۔

سنبھلنے والے ادیبوں کے ہاں پھر ایک بار مایوسی اور اداسی گھٹن پیدا ہونے لگی۔ اکتوبر ۱۹۷۷ کے انتخابات ملتوی ہونے، اور بھٹو پر ایک قتل کے سلسلے میں مقدمہ کے شروع ہونے، محنت کش عوام کے حقوق پر پابندیوں، بھٹو حکومت کے ترقی پسندانہ اقدامات کی اُلٹے پاؤں واپسی، سرمایہ داری کے نظام کو انیسویں صدی کے آزادانہ نشوونما کے اصول پر چلانے کی کوشش، فرقہ پرستی کو فروغ دینے، انسانیت دوست نظریات کے فروغ پر پابندی، بالخصوص ترقی پسند دانشوروں کا [illegible] دانش گاہوں سے اخراج اور ان کو دور کرنے کی کوششوں نے ہمارے دانشوروں اور ادیبوں کی آنکھیں کھول دیں۔

ایک تلخ حقیقت سے پہچان پوری طرح ہونے لگی۔

میں نے [illegible] واردات کو اقتساب ۔ میں شائع ہونے والی نگارشات کے تجزیے سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تجزیہ ظاہر ہے کہ جولائی ۱۹۹۰ء سے اپریل ۱۹۹۱ء کے عرصے کی تمام تحریروں کا احاطہ نہیں کرتا لیکن اقتساب ۔۲ ۔ کی اس عہد کے اجتماعی شعور کو سمجھنے کے لئے ایک استعارے کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔

"اقتساب ۔ ۱ کا اقتساب"

جبر کے ماحول میں پرندے تک اپنے گھونسلوں میں مرجاتے ہیں۔
اور پرندے اپنے گھونسلوں میں مر رہے ہیں۔
نہ صرف پرندے مرجاتے ہیں بلکہ نثر گھبرا کر شاعری میں پناہ لیتی ہے
اور نثر شاعری میں پناہ لے رہی ہے۔

یہ ہے تاثر جو اقتساب ۱ ۔ میں پاکستانی لکھنے والوں کی تحریروں سے ابھرتا ہے۔ ایک حیرت انگیز مماثلت ہے ان لوگوں کے لہجے میں۔ افسانہ ہو یا نظم سیدھی سادی کھلی کھلائی بات، صاف صاف بیچ کو پہلے کہنے والی بات نظر نہیں آتی۔ اس کے برعکس استعاروں میں بات ہوتی ہے۔ ایک کہانی کے ذریعے دوسری کہانی سنانے کی کوشش ہوتی ہے۔ اور لکھنے والا اس آس پر لکھتا ہے کہ جو بات وہ کہہ رہا ہے، بہر حال! اس کے قاری تک پہنچ جائے گی۔ ادیب اور قاری دونوں لفظوں کی اس سازش میں شریک ہوتے ہیں کہ ایک کا کرم پیغام دوسرا اپنی زبان میں ترجمہ کر لیتا ہے جو پیغام دینے والے اور پیغام لینے والے کی اصل پوشیدہ زبان ہے۔ کہ دونوں کی واردات ایک ہے۔

اور موسم ہا؟ حبس، گھٹن، حبس کو کہیں کہیں امید کی ہلکی ہلکی سنہری کرن کاٹتی ہوئی گزر جاتی ہے، جو موسم کی سپیدی میں تبدیل ہونے کے لئے بے قرار ہے لیکن تبدیل نہیں ہو پاتی۔ پانی ہے تو بہت زیادہ ہے کہ اس میں لوگ پھنس جائیں یا آگ کا ذکر ہے۔ یہ وہ استعارے ہیں جو بار بار نظر آئیں گے۔

نثر کی لیجئے ۔

"باہر مینہ برس رہا تھا اندر حبس بہت تھا" انتظار حسین طوفان نوح کی کہانی کا سہارا لیتا ہے، اور مختلف صدیوں کو لیتے ہوئے ایک اور مقام ملنے کی کوشش کرتا ہے۔

"رات ہے، تاریک، اندھیری کالی رات، بارش ہے، بجلی ہے، طوفان ہے، ماں اور بچہ" ... مسعود اشعر "پھر کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا ..... بچے کی سانس رک چکی ہے" اور آخر میں ایک سطر کا پیراگراف، "صفحہ ۱۵۱۔ لڑکی کو ایسی باتیں نہیں لکھنا چاہئیں۔"

مستنصر حسین تارڑ "درخت" کے استعارے سے کام لیتا ہے۔

اکرام اللہ "سیاہ آسمان" باقس اور زندگی کے مدغم جانے کی بات کرتا ہے۔

محمد منشا یاد کے ہاں مکان کی تعمیر اور اس کے اصلی وارث کی اس سے محرومی کی داستان ہے۔ وہ وارث جو ایک دن اس پر قبضہ کرے گا۔

مظہر الاسلام کی آواز چوری ہو گئی ہے۔

احمد داؤد کا عجائب گھر ہو: "سمندر کی غلاظت کو شہر کے دامن میں گرنے سے روکنا چاہا مگر لہروں کے غلاظت پر ملبے جیسی مات نے اسے کشتی کا مسافر بنا دیا۔"

انور سجاد کے ہاں ماں اپا ہج ہو جاتی ہے اور بچہ دشمن کی صف میں ہوتا ہے دشمن کی فوجوں کا کمانڈر۔ انتظار حسین کے ہاں طوفان گھر سے امنڈتا ہے اظہر ایک کے لب پر یہ خبر تھی کہ تنور ان کے گھر کا گرم ہے ٹھنڈا ہوا اور پانی اس سے اُبلنے لگا۔ اور سیلاب باہر سے امنڈے تو اسے روکا جا سکتا ہے مگر جب گھر کے اندر سے پھوٹ پڑے تو کیوں کر اس پر بند باندھا جائے؟

صفر کی سطح پر یا منفی جہت کی طرف لڑھکنے والا معاشرہ جسے ادیب اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا ہے اور جب جبر ہو تو مظہر الاسلام کی آواز چوری ہو ہی جائے گی، اور اکرام اللہ کے ہاں لوگ سروں کے گرد کٹہرے پہنے گھسیٹے حتیٰ کہ بچے کٹہروں کے ساتھ پیدا ہونے شروع ہو جائیں گے۔ اور پھر وہ ایک اشارہ دیتا ہے قاری کو مگر مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں! "لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک مخلوق خدا اذیت میں مبتلا ہے گا

اس صورت حال کے بارے میں بیشتر ادیبوں کا رویّہ مثبت ہے۔ بعض اوقات یہ رویّہ واضح طور پر کہہ کر مبہم ہوتا ہے۔

جیسا کہ اکرام اللہ کے ہاں: "باقس نے کہا "دوستو! اپنے اپنے جام بنام زندگی خالی کرو اور پھر بھرواور لنڈھاتے چلو۔ میں زندگی کو پہلے بھی کئی بار اپنے پرستاروں سے مایوس ہو کر روٹھ کر جاتے دیکھ چکا ہوں۔ غائب قدم ہو وہ واپس آئے گی۔ اور ہم اس کی فضا میں بہت بڑا جشن بپا کریں گے ... تمہارے سروں کے گرد کسے ہوئے آہنی کٹہرے کوئی حقیقہ تا ہم تو نہیں رکھ سکتا۔"

ہم سب یک زبان ہو کر پکارے "تب تک کیا کریں؟"

"تنہا ہو رہے۔ جام نوش کرو!" اس نے نہایت متانت سے جواب دیا۔

"پتہ نہیں وہ باقس تھا کہ میوز تھی کہ دونوں تھے!"

اکرام اللہ نے فیض کی یاد دلا دی کہ رد قسمتیوں کے شہر والوں کو برتیز کرنے کے لئے کہہ رہا تھا۔

انور سجاد کے ہاں: "اس کے ساتھیوں کے ہتھیاروں کی نالیوں کا رُخ اپنی طرف دیکھ کر اس عورت کا سینہ، نحیف و نزار، فاقہ زدہ سینہ، جس پر کوئی تمغہ نہیں، اور جس میں ایک دل فخر سے دھڑکتا سنائی دیتا ہے، پودے فخر سے پھول جاتا ہے۔" یہاں فخر سے دھڑکنے والا ماں کا دل موت کے خلاف، زندگی دشمن قوتوں کے خلاف مزاحمت کی نشانی ہے، امید کا پھول ہے جو غاصبانہ قبضے کا منہ چڑا رہا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کا درخت ایک جانی پہچانی صورت حال کا استعارہ ہے۔ شاید ایک شخص کہ جس کا نام لینا گناہ ہے۔ اسے ایک لکڑ ہارا کاٹ رہا ہے۔ لکڑ ہارا کہتا ہے کہ وہ اس کی جگہ ایک اور درخت اُگا دے گا۔ "لیکن لکڑ ہارے تو درخت کاٹتے ہیں اُگاتے نہیں!" "ٹھیک ہے" تارڑ کہتا ہے "لوگ جانتے ہیں کہ پودے کی چھاؤں اتنی گھنی نہیں ہوتی مگر پھر بھی ندی کو پار کرنے والے مسافروں کی اکثریت اب اس کے سائے تلے آ کر آتی

اور کہانی ختم ہوتی ہے تو کہیں اَب .... جب بلندی پر تالیاں بجاتے چیڑ اور زمین میں دور تک گڑی ہوئی جڑوں کے درمیان صرف ایک درخت باقی رہ گئی تو بیدم کلہاڑے کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ چلا گیا۔ اور اب آہستہ آہستہ درخت کے گہرے زخم بھر رہے ہیں۔ کیونکہ جس وجود کی جڑیں زمین میں دور تک پھیلی ہوں زمین اُسے کبھی اپنے سے جُدا نہیں کرتی!"

فہمیدہ ریاض کا "عورت اور چیتا" کئی طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

جیسے دوسرے افسانے لیکن چیتے کے جبر کے بعد" عورت پہر چڑھے تک گہری آرام دہ نیند سوتی رہی" کہ پرانے المیہ کے اصول کے مطابق' دکھ سے دانش مندی حاصل ہوتی ہے۔ دکھ سے نکھار کی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔

مسعود اشعر اور احمد داؤد کے ہاں ماحول جدید' صنعتی تجارتی دور کا ہے۔ جب کہ باقیوں کے ہاں ماحول اور سیٹنگ اتنی عمومی ہے کہ قدیم' انتہائی قدیم' ابتدائے آفرینش کی معلوم دیتی ہے۔ جہاں افراد اتنے عمومی ہو گئے ہیں کہ "ہر شخص" (ایوری مین) بن گئے ہیں۔ تجرید نے یلغار کر دی ہے۔

نظم میں فیض سے آغاز ہوتا ہے۔ ذہنوں کو جھٹکا دے کر حقیقت سے آنکھیں چار کرنے کی تلقین:-

ستم سکھلائے گا رسمِ وفا' ایسے نہیں ہوتا۔

اور

ہر شب' ہر گھڑی گزرے قیامت یوں تو ہوتا ہے\
مگر ہر صبح ہو روزِ جزا ایسے نہیں ہوتا

اور پھر

جو تم کہتے ہو سب کچھ ہو چکا' ایسے نہیں ہوتا\
(تم یہ کہتے ہو وہ جنگ ہو بھی چکی / جس میں رکھا\
نہیں ہے کسی نے قدم)

یا

کس کھوج میں ہے تیغِ ستم لگی ہوئی

یا پھر افسانوں والی گھٹن جو فیض کو غریب الدیار بننے پر مجبور کر دیتی ہے:

ہر اک اجنبی سے پوچھیں\
جو پتہ تھا اپنے گھر کا\
جو ملا نہ کوئی پرسان\
بہم التفات کرنا

اور قاسمی:

میں تیری ذات سے مایوس نہ ہونا چاہوں\
تو جو یاد آئے تو تنہائی میں رونا چاہوں

اور

عدم نے ارتقا ہے میرے رند شب کی یکسانی

منیر نیازی کے ہاں:

خواہشیں ہی خواہشیں ہیں اور جز کوئی نہیں
گھر بنانا چاہتا ہوں میرا گھر کوئی نہیں

مسعود اشعر کا تنگ گھر، اکرام اللہ کے فلیٹ، منیر نیازی کا بے گھر ہونا، محمد منشا یاد کے مکان کی تعمیر اور عینی کا غریب الوطن ہونا!

ظہور نظر کے ہاں بھی جبر کا احساس ہے، لیکن اس کا تاریخی شعور بھی ہے!

سزا قبول مگر اتنا سوچ لو کہ یہاں
جو تم سے پہلے تھے با اختیار وہ بھی تھے

ظہیر کاشمیری فیض کی طرح، فریب خوردگی کی منزل سے آگے چلا گیا ہے:

رابطہ آشنا نہ بڑھا سایۂ دیوار کے ساتھ

اور شہادت کی روایت کا تسلسل، جس کو شاعر برقرار رکھے ہوئے ہے:

کھل گئے پھر لب منصور انا الحق کے لئے
پھر چلے آتے ہیں وحشی رسن و دار کے ساتھ

احمد فراز ظہور نظر کی طرح کہتا ہے!

بزم مقتل جو سجے کل تو یہاں امکاں بھی ہے
ہم سے بسمل تو رہیں آپ سا قاتل نہ رہے

اور ایک استعارہ ہے جو صلیب کا ہے۔ جسے شاعروں نے بار بار دہرایا ہے۔
احمد فراز کہتا ہے:

آؤ جس بیٹے کو ہم نے سولی لٹکایا ہے
اس کے لہو لہان بدن پہ بین کریں

اسی صلیب کے استعارے کے ساتھ قاتل اور قتل کے استعارے اور تلازمے ہیں جو غزل کی عمومیت کے باوجود خاص معنی اختیار کر گئے ہیں۔

وہ جو قاتل تھے وہ سینے نفس بیچتے دیکھا
وہ جو مجرم ہیں انہیں اہل عدالت دیکھا

خیرت بخاری کے ہاں بھی سانحے کی چاپ اور مایوسی کا پرتو ہے، لاشوں پر گریہ کرنے کا دکھ ہے، لیکن اس کے ساتھ:

جب گھر سے نکل آئے پھر کس کا پتہ کرنا

اور

قاتل پہ مجسّدنے کو کچھ اشک بچا رکھنا

عباس اطہر نے بابِ حسین اور بیٹے، بیٹے کی پھانسی کے حوالوں سے بات کی ہے:

موت کی کوٹھڑی میں اس کا جنم دن آیا
اور اس کے چاروں طرف بے گناہوں کے، مظلوموں کے آنسوؤں کا سمندر ہے۔

سر پہ دعاؤں کا اُمڈا ہوا بہنوں کا
اور بیٹیوں کے دوپٹوں کا سایہ ہے
اس کا خدا
حق پہ ڈٹے ہوئے
آگے بڑھتے ہوئے لشکروں کا خدا ہے

اور پھر

مر گئے موت سنانے والے

اور کشور ناہید کہتی ہے:

سُنو
آگ کو آگ نہیں بجھا سکتی

اور

میرا جی کرتا ہے
وہ جو سب میرے قاتل ہیں
میں انہیں ہوا کی طرح نگل جاؤں

مجھے سزا دو
کہ پھر تمہاری سزا کی میعاد ختم ہوگی۔

سلیم شاہد:

یہ مجرم منصفوں کی قید میں ہے
قتل اوروں نے کئے ہم خون بہا دیتے ہے

محسن احسان: حکمرانی ہے ندو بام پہ سناٹوں کی

جاوید شاہین: ہوا ئے تیز کی زد میں شجر اکیلا تھا

افتخار عارف: مصاحبین شاہ مطمئن ہوئے کہ سرفراز سر بریدہ بازوؤں سمیت شہر کی
فصیل پر لٹک رہے ہیں۔

پہنچی عدالت کے ہاں خیرات ہے گا ہوئے شہر انصاف کی طرف سفر ہے اور قاتل بھی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ احتشام جیل کو شہر کے اندر پھیلتے دیکھتا ہے اور اقبال ساجد لہو کے قطرے بدن کے طائر بیچ پوچھو تو ان سب لکھنے والوں کے رویئے اور جذباتی سانچوں کو گل نصیر نے ایک جگہ اختصار سے بیان کیا ہے۔

یقین کرو کہ میں خود اپنے دل کا حال نہیں جانتا
کبھی تو وہ نازوں اور اداؤں کا شکار ہوتا ہے
اور کبھی نالہ و فریاد کرنے لگتا ہے
کبھی پتھر اور فولاد کی طرح سنگین اور سخت ہوتا ہے
اور کبھی حسیناؤں کے عارض گلگوں کی طرح نرم اور نازک بن جاتا ہے۔

اس میں اتنی ترمیم کر لینی چاہیے کہ جس دور کی ہم بات کر رہے ہیں اس میں ناز و ادا اور عارض گلگوں حقیقت نہیں خواب ہیں جو بیت گئے اور جن کے لوٹ آنے کی امید ہے یا پھر یہ دور ہے پتھر اور فولاد کی طرح سختی کا۔
شاعر اور ادیب طاؤس و رباب کی واپسی کے منتظر ہیں۔

پاکستان سے باہر نکل کے جائیں تو ہمیں اظہار اور مواد کا تنوع ملتا ہے۔ سید محمد سید جو حقیقت پسندی بھی ہے اور ایمائیت بھی اور ان کا احتجاج بھی مزاحمت نظر آتی ہے لیکن امید کی زندگی کریں تیتے لگتی میں یا تیتے کے قریب ہیں۔ نرودا اس کے لئے نظم لکھ سکتا ہے اور گانے کی دعوت دے سکتا ہے، مرد و د اشانن گراڈ کا حوالہ دے سکتا ہے۔ باقر مہدی کے ہاں حکمرانوں کی ثقافت پر چوٹ ہو سکتی ہے۔ ایسے کے ظرافت سے عاری مرقعوں جن سے ہم پاکستان میں دو چار ہوئے ہیں کے بجائے طنز اور مزاح بھی نظر آتے ہیں۔ ن۔ غ۔ رشید تکفین کی انتظامیہ کا ذکر کر سکتا ہے۔ سنیل گنگوپادھیائے کارڈ کا مالفلوں کا خواب بیچتے بے انقلاب زندہ باد کہتا ہے۔ اور پرسو کھ کھو پادھیائے "کلکتہ احسان فراموش ہے" کی مثال دیتا ہے۔ نارائن سُرسے بھیلاتی کی دہکتی جبلی۔ طرز شہیف کینیڈا کا ناصر کے ساتھ ڈیو وغیرہ" کا اظہار کر سکتا ہے، لوک سبھا میں حجم تیزوں کو اپنا موضوع بنا سکتا ہے۔
پیاسنگھ کہتا ہے ا

ہمیں پوچھنا ہے اس بارش میں
اسلاموں کے پہلے دن کس نے کیے تھے قتل
کس نے چھین لیں ہم سے ہماری عورتیں
اسلاموں کے پہلے دن کس نے غلام بنا لیے ہمارے بچے
اس بارش میں ہمیں کوئی سوال نہیں چھوڑنا ہے اگلے وقتوں کے لیے۔

فلان بھائی [illegible] سب انقلابی اپنے بچے نظر آتے ہیں! اور جنگ [illegible] ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے۔ اور دلیر دیپک دشمن کو بھائی اتارنے کی دھمکی دیتا ہے۔

یہ ہندوستان تھا نظموں میں۔ اور یہی حال افسانوں کا۔ بلراج مینرا کا افسانہ ختم ہوتا ہے "تھوڑی دیر بعد مجھے خبر دی گئی! ہمارے تین رفیق ہلاک ہو گئے ہیں! دو لاپتہ ہیں اور باقی سب محاذ پر!" آخری کیفیت کا ارتقا یوں ہے:

پہلے لفظوں کی کمان ادھڑ گئی
پھر ہر حس اک معنی بنی
پھر ہر حس معنی سے تجربہ بنی
پھر معنی کو لفظ دینے کا وقت آیا

اجیت کور کے "دھوپ" اور گوربچن سنگھ بھلر کے "خون" میں انسانیت دوستی کی فتح دکھائی دیتی ہے۔

فلسطین کا سپاہی خواب دیکھتا ہے۔ عمودی سمت سیدھے سیدھے دشمن سے پیار کرنا، اور مجاہد عورت زیتون کے تنے پر مزاحمت کی تاریخ کھودتی رہے گی۔

ایران کا شاعر رضا براہینی تیسری دنیا کے نوجوان کا ذکر کرتا ہے جو ہینڈ گرنیڈ، بارود کا کھانا کھاتے ہیں اور اور ایٹم بم بنانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ فلسطین کی تفتیش اور تشدد کی کہانیوں کے مقابل رضا براہینی اُس ایرانی خاتون کو خراج پیش کرتا ہے جو شاہ کے دور میں جیل میں مقید رہی۔

اسی طرح نیتو، ناظم حکمت، لنگسٹن ہیوز وغیرہ وغیرہ

ہمارے ہاں کی دھندلاہٹ ہندوستان، فلسطین، ایران، ویت نام، وغیرہ کی صاف شفاف تصویروں کے مقابلے میں عجیب نظر آتی ہے۔

۴، اپریل ۱۹۷۹ء۔ ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دے دی گئی۔

اس کے ساتھ مارچ ۱۹۷۷ء سے شروع ہونے والا دور اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔

ملک کے ذی حس حصے کو پھانسی نے جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ ذی حس لوگ اکثریت میں تھے۔

ذی حس عوام کے فنکاروں کا ضمیر نوحے اور مرثیے میں چھلک پڑا۔

شہادت کے گرد گھومنے والے ادب کی نمائندگی فوری طور پر خوشبو کی شہادت میں ہوئی۔ اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

خوشبو کی شہادت کے تجزیے میں میں نے شہادت کے فلسفے اور اس کی نفسیات سے بحث کرنے کی کوشش کی ہے:

خوشبو کی شہادت

شہادت اور موت میں اتنا ہی فرق ہے جتنا زندگی اور موت میں۔
جب کوئی مرے اور لیقین یہ گمان ہو کہ تم مر گئے ہو تو ایسی موت کو شہادت کہتے ہیں۔
اس کے ہر اک زخم سے میرا لہو بہتا رہا۔
کرب کی جلتی ہواؤں میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ (فارغ بخاری)
موت جسم کی ہوتی ہے اور شہادت روح کی، خیال کی، جذبہ کی۔
شہادت موت بھی ہے، اور گواہی بھی:
شہادت موت ہے جسم کی اور گواہی زندگی کی۔
خود موت جا رہی ہے قتیل اس سے لگا ہیں
دیوانہ تو اب بھی درِ قاتل پہ کھڑا ہے

بقول ابوالکلام آزاد "جب سرمد کو شہادت گاہ لے چلے، تمام شہر ٹوٹ پڑا اور اس قدر ہجوم تھا کہ راستہ چلنا دشوار ہو گیا تھا۔ عشق کی نیرنگیوں کا کیا کہیئے! جہاں کا مام پسند تماشا خونریزی کا ہے اور جہاں قربانی بڑھ کر کوئی دل پسند کھیل نہیں۔ جب کوئی مردِ سرکٹ پڑھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ دولہا کی سواری جا رہی ہے اور براتیوں کا ہجوم ہے کہ شانہ سے شانہ چھلتا ہے۔"

مقتل سجے تو دیکھنا اہل ہوس کے رنگ
شہر ایل میں رونق احباب دیکھنا (فارغ بخاری)

شہادت کو دیکھنے والے تماشبین بھی ہوتے ہیں، اور بے بس بھی اور وہ جو اپریل کے ان تاریک اجالوں میں اتر گیا، کوئی اس کو اس سفر سے نہ روک سکا۔ سب بے بسی سے دیکھا کئے۔

چھپ چھپ کے وہ خلوت میں تڑپتے ہیں غم سے
سفاکی حالات کا یہ چارہ نہیں تھا (فارغ بخاری)

مصلوب محبوب ہوتا ہے۔
لوح جبیں پہ نقش تھا اک روشنی کا پھول
عنوان شوق آنکھ تھی، چہرہ کتاب تھا
ادا جعفری کی نظم اس رات کی کیفیت بیان کرتی ہے۔
رات کو دو ٹکڑوں میں بانٹو
اُسے جگا دو.........
سارا شہر بلکتا ہے
پھر بھی کیسا سکتہ ہے
سب کے بازو بیخ بستہ
سب کا جسم دکھتا ہے

مردوں کے سمندر نے رخ موڑ دیئے لیکن
ہم رشت پہ سفروں سے تیرا بھی سفیر جاتا
فغاں تھا تمہاری بستیوں کے جسموں کی
وہ جب چلا تو سمندر بھی ہاتھ ملتا تھا (ک، ن)

اوروں کو الزام میں کیا دوں
میں بھی تو گھر دل نکلا تھا
شرمندہ ہوں میں بھی یارو!
میں نے بھی تو کچھ نہ کیا تھا (احمد وحید اختر)

میرا ہی قتل ہوا مجھ کو خبر ہو نہ سکی
میں کہ آسودگی شب کا طلبگار
دیر تلک سویا رہا۔ (ج، ش)

وقت کے ہاں بے رحمی ہے کہ وہ جینے کی صلیب اس کی کھڑاؤں اور اس کے اثاثے کو تقسیم کرنا چاہتا ہے

آؤ۔ ہم سب بیٹے ہیں
لیکن اس کا حرف تھا سب کچھ
حرف کہاں سے لائیں۔

پس شہید ہو جانے والے اور زندہ رہنے والے میں یہی فرق ہوتا ہے کہ مرنے والا ہوتا ہے۔ پیچھے زندہ رہ جانے والا عام سا انسان۔
سوچنے والا سوچتا ہے، اور محسوس کرنے والا محسوس کرتا ہے کہ کیا بیتی ہوگی۔ اسے پر جو پھانسی کی طرف لے جایا گیا مصلوب ہونے والا اور نوحہ گر دونوں ایک ساتھ صلیب کی طرف جاتے ہیں۔
تم ژنوں، سفاک راتوں میں بھی اس کے ساتھ تھا میں بڑے حساس لمحوں میں بھی اس کے ساتھ تھا۔
الوداعی ہچکیاں میری نظر میں چھپ ہیں۔
میں دم رخصت سلاخوں میں بھی اس کے ساتھ تھا

(فارغ)

کس قیامت کا وہ نقشہ ہوگا
دار کی سمت وہ چلتا ہوگا
کیا خبر رات کی تاریکی میں
کتنے جلادوں نے گھیرا ہوگا
(احمد وحید اختر)

جذبات کو بھ...

کی ایک کوشش ۔

ہماری جیب پہ تیری قبا پہ کیا گزری!

فارغ بخاری کی غزل کی ردیف "کیا گزری" اس کے موضوع کا تعین کرتی ہے۔ اُف کی طرح کی "ردیف گیا" ہے۔

ستم کا آشنا تھا وہ سبھی کے دل دکھا گیا
کہ شامِ غم تو کاٹ لی سحر ہوئی چلا گیا

شہادت کی یہی تو خاصیت ہے کہ گواہی ہوتی ہے زندگی کی۔

دلوں سے وہ گزر گیا شعاعِ مہر کی طرح
گھنے اداس جنگلوں میں راستہ بنا گیا

اور شہرت بخاری،

نظر سے وہ چھپ گیا لیکن وہ ہر دل میں دھڑکتا ہے
زمین و آسماں میں کون اس کو بھول سکتا ہے
وہ سورج ہے کہ بادل کی تہوں میں بھی چمکتا ہے
دیا درویش کی کٹیا کا آندھی میں بھی جلتا ہے

وہ شب کہ جس کا بدن آسمان کا گریہ تھا
قیامتوں نے بھی ایسا نہ دیکھا تھا

کہ ان کی اس غزل کی ردیف "تھا" ہے

دُعا کے شہر میں مایوسیوں کی بھری
زبانِ خواب، فقط آبلوں کا صحرا تھا

مصلوب کرنے والے کے ظلم پر بھی نگاہ جاتی ہے

منتِ دیر پہ بھی دل نہ پسیجا اس کا
خلق نے سنگ سے جھرنوں کو اُبلتے دیکھا
(پرویز چشتی)

اور ادراک بھی ہوتا ہے ظلم کی رعایت کا

ظلم کی بیل پہ چہکے نہ عنایات کے پھول
جبر کی سخت رخ پہ انصاف نہ چلتے دیکھا
کفِ افسوس نہ جلاد کو ملتے دیکھا

اور پھر جامی عدیل کی ان سطروں میں کتنا طنز ہے اور کتنا کرب!

کتاب رب نے اتاری تھی اپنے بیٹے پر
خطا پرستوں نے اس پر صلیب نازل کی

اور سلیم شاہد نے کہا!

قتل اوروں نے کئے ہم خود سزا دیتے رہے
سوچوں کو کالے پانی کی سزا دیتے رہے

اعزاز افضل کا تجربہ میرے لہجے کی ردیف کے تحت ترتیب پاتا ہے۔

اپنی چوکھٹ پہ صلیبوں کا جنازہ رکھ کر
خون رونے لگی یہ مقتل کی فضا میرے لیے

سلیم شاہد!

سیاہ رات میں روشن کتاب چھوڑ گیا
چلا گیا مگر اپنے خواب چھوڑ گیا
وہ شاخ شاخ مہکتے گلاب چھوڑ گیا
وہ درس گاہوں میں تازہ نصاب چھوڑ گیا

اور مصلوب ہو کے خواب دیکھا گیا کہ زندگی کی گواہی اسی کو کہتے ہیں۔

ہزار جبر ہو لیکن یہ فیصلہ ہے اٹل
وہ ذہن ذہن پہ اک انقلاب چھوڑ گیا (سلیم شاہد)

خشک ذہنوں پہ اگی اب کے فصل خیال
عہد بے فیض میں شاداب یہ ہنر اس کا ہے
ہر شب نئے ستارے بناتا ہوں اس کے گرد
روشن دلوں میں چاند سر شام اس کا ہے
آغاز میرے واسطے انجام اس کا ہے (ر۔ع۔ش)

سلیم شاہد کہتا ہے۔

کاتتا رہتا ہوں میں رات بھر اس کے لئے
اک نیا ملبوس بن جائے سحر اس کے لئے

اور پھر اک حقیقت منتظر کی لباس مجاز میں آنے کی خواہش۔

ترا درد اب وصال ہے کہ یہ حال ہے
مہکا کرتا ہے باد صبا کبھی آئے تو (سلیم شاہد)

اور پھر میت ختم کرنے کے لئے اشتباہ بھی ہے کہ
زمین تپے گی ابھی اس کے خون کی گرمی سے
وہ بے قرار لہو قبر میں اچھلتا تھا
مکافات عمل سے کس طرح ممکن مفر ظالم
اسے رونا پڑے گا عمر بھر جو آج ہنستا ہے
قاتل پہ بھی رونے کو کچھ خشک بچا رکھنا

اور ا۔ ف کی ایک غزل کا تو موضوع ہی ہے۔

اپنی ہی آواز کو بے شک کانوں میں رکھنا
لیکن شہر کی خاموشی کو دھیان میں رکھنا
اس دریا کے آگے ایک سمندر ہے
اور وہ بے ساحل ہے اُس کو دھیان میں رکھنا

گو تم بہ جبر جسموں کو زنجیر کر چکے۔
لیکن ہر ایک دل پہ حکومت اسی کی ہے
مر کر بھی جس کی قبر پہ پہرہ لگا رہا
ہیبت اسی کی دل پہ جلالت اسی کی ہے

لیکن وہ کون تھا؟ اور میں کیوں اس کے ساتھ مصلوب ہوا؟ یہ غزلوں اور نظموں کا موضوع بن گیا ہے۔

عباس اطہر "پہاڑی کی آواز" میں بتاتا ہے کہ وہ کون تھا۔

وہ آسمان کا پیغام بن کر
پہاڑی پر اترتا تھا
سنو میری اُمت کے لوگو
خدا آسمانوں پہ ہے
اور نیچے زمین پہ ہم سب برابر ہیں (عباس اطہر)
اسی سے پہاڑی پہ ہلچل مچی

اور یہی حامد جیلانی کی نظم کا موضوع ہے۔

مجھے یاد ہے کہ سماعت کے وقفے میں تو نے کہا تھا۔
سنو اے عزیزو
فلک بحر و بر اور فضا کوئی شئے ملک غیر ہے۔
یہ سب کچھ خدا کا ہے سب کے لئے ہے۔ (حامد جیلانی)

اور پھر حامد جیلانی بھی ساتھ
مذاق انعدی اور اطاعت کے ہمراہ
ہر عورت اپنے مردہ وارث کی آنکھوں کی پتلی میں جمی ہوئی تصویر کو ڈھونڈنا چاہتی ہے۔
اور اسے اپنے قبیلے پر غصہ آتا ہے جو اپنا نسب صحراگردوں سے ملاتا ہے لیکن جس کے لئے ایک ہزار رطل انسانوں کے بدلے اک اونٹ سے پیار زیادہ ہے۔
نظموں میں ظہیر کاشمیری ذکر کرتا ہے
اداس سورج کے فصیل زنداں پر ڈھلنے کا
نزول احساس درد ہے۔
فارغ بخاری شہادت کے تاریخی پس منظر کو غزل کے استعارے میں دیکھتا ہے
ہر شہادت یہ ظاہر کرتی ہے کہ اگر شہید ہونے والا شہید نہ ہوتا تو سلسلہ خود ختم ہو جاتا۔ اس لئے شہید ہونے والے کو شہید ہونا ہی تھا۔ اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ شہید حال اور مستقبل کے درمیان کھڑا ہوتا ہے کہ اس کے بغیر اندھیرا نہیں اجالا ہوتا ہے۔
لیکن یہ اجالا اتنا سستا نہیں اتنی آسانی سے نہیں آتا اس کے لئے خون صد ہزار انجم ہوتا ہے ایسا کہ ساکی اظہار تک پھیل جاتا ہے جب کائنات ایک زلزلے سے تہہ و بالا ہوتی ہے۔
صبح کی شہادت کے بعد بارش ہوتی رہی اور یہی کلاسیکی المیہ میں ہوتا ہے اور یہی تاریخ کا سبق ہے اور یہی فیض کی نظم کا موضوع تھی۔
لیکن فیض کو یقین ہے کہ شہید کے خون سے تاریکی صبح کی سفیدی میں بدل جاتی ہے ہم دیکھیں گے۔

لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوح ازل میں لکھا ہے۔
جب ظلم و ستم کے کوہ گراں
روئی کی طرح اڑ جائیں گے۔
اور راج کرے گی خلق خدا
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو۔
یہی نوشتۂ وقت کے بقول نہیں لیکن یہ تو ہوگا۔
ہم دیکھیں گے۔
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے۔

اور یہی شہادت کا مفہوم ہے کہ وہ زندگی کی گواہی دیتی ہے۔ پہلے سے بعز زندگی کی انسان کو افضل سمجھتی ہے اور اسی کی زندگی کا اقرار کرتی ہے۔ بجلیوں کو کڑکنے سے کون روک سکتا ہے کہ یہ تقاضۂ قدرت ہے۔

"خوشبو کی شہادت" مسلسل نظم ہے جس نے ہمارے ثقافتی ایپائیوں صلیب، صحرا، حسین، منصور، دشت، صحرا، مدنی کے گھر، اور قرآن اور اسلام کی تاریخ کے حوالوں کو ایک جذباتی واردات میں سمو دیا ہے۔
"خوشبو کی شہادت" کے موضوع پر ابھی بھی جا رہا ہے اور اُس وقت تک لکھا جاتا رہے گا جب تک لکھنے والے حادثے سے سنبھل نہیں جاتے۔

"انتساب ۲" میں خوشبو کی شہادت جاری ہے۔

"انتساب ۱" سے جو سفر شروع ہوا "خوشبو کی شہادت" کے راستے سے ہو کر "گندا" اور "انتساب ۲" تک پہنچا ہے۔ بے لبی، گھٹن اور حبس کی سرنگ میں سفر جاری ہے اور اس شہادت سے پیدا ہونے والے جذبوں کی شدت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ عبداللہ ملک بھی ان جذبوں کی شدت سے بلبلا اٹھتا ہے اور نثر نظم کہہ ڈالتا ہے۔

پھانسی نے سکھنے والوں کو ان کی زنجیروں کا ادراک بخشا اور گھٹن کو اتنا جابر بنا دیا کہ بالآخر درد کو نکلنے کی راہ باہر نکلا۔

"انتساب ۱" میں ہمارے ہاں کی دھندلاہٹ ہندوستان، فلسطین، ایران، ویت نام وغیرہ کی صاف شفاف تصویروں کے مقابلے میں عجیب نظر آتی ہے۔ یہ دھندلاہٹ ابھی تک چھائی ہوتی ہے، جیسے وسلر کی تصویروں میں لندن دھند میں لپٹا ہوا تھا۔

افراد اور اشیاء کے خدوخال واضح نہیں، چہرے اور جگہیں ایک دوسرے سے ممیز نہیں۔ ادیب عمومیت کا سہارا لے رہا ہے۔

اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں، یا تو یہ کہ ابھی عوامی جدوجہد کے ہیرو اور جدوجہد کے مقام واضح شکل ہی اختیار نہ کر پائے ہوں۔ اس لیے ادیب کے لئے ان کو پیش کرنا بھی مشکل ہو یا یہ ہو سکتا ہے کہ ہیرو اور مقام واضح شکل تو رکھتے ہوں لیکن کسی وجہ سے ادیب کے لیے ان کا اظہار ممکن نہ ہو یا مشکل ہو۔

میرے خیال میں موجودہ صورت حال میں دوسری وجہ زیادہ قرین قیاس ہے۔

ہمارے ادیب جن کا ہم ذکر کر رہے ہیں درمیانے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس دور کی عوامی جدوجہد جس کا بنیادی اور پہلا مرحلہ جمہوری حقوق کی بحالی ہے، کے ساتھ ان کا رشتہ وہی ہے جو عام طور پر جدوجہد کے ابتدائی حصہ میں ہوا کرتا ہے۔ یعنی ذہنی ہم آہنگی کا، لیکن اس کے ساتھ عمل نہیں۔

اسی لئے ہمارے ادیبوں کو سروں کے گرد لوہے کے کڑوں کا احساس تو ہے لیکن وہ انتظار میں ہیں کہ جلد یا بدیر یہ کڑے اتریں۔ حال اور مستقبل کے درمیان عمل کا پل باندھنے کی ہم میں ہمت نہیں ہے۔ ہم بیٹے کی آمد کو خیر مقدم کہتے ہیں۔ اس کے مصلوب ہونے پر نوحہ خوانی کرتے ہیں اور جینے کی واپسی کا انتظار کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں انتقام کا اظہار بھی ہے لیکن یہ انتقام کیا ہے اس کا اظہار نہیں کرتے۔ عمل کی بات ہے اور ابھی ہمارا ادیب اس عمل میں داخل نہیں ہوا۔ عمل کی سرزمین کا ایک جغرافیہ ہوتا ہے، ایک تاریخ ہوتی ہے۔ جو اس سرزمین پر قدم رکھے گا وہ اس جغرافیے اور اس تاریخ کو جانے گا۔

اور چونکہ ویت نام، فلسطین اور ہندوستان، اور اسپین اور چلی میں ادیب برسرِپیکار ہیں اس لئے وہ جدوجہد کے خدوخال پہچانتے بھی ہیں اور پیش بھی کرتے ہیں۔

ہمارے ادیبوں کے کام کو ایک اور عامل نے بھی پیچیدہ کر دیا ہے۔ جہاں آزادی اظہار رائے ہے وہاں ادیب کے ہاں اپنے شعور کا بھرپور اور بے باکانہ اظہار ہے۔ لیکن جہاں یہ آزادی مفقود ہے، وہاں فن پر گھٹن اور بے بسی چھائی رہتی ہے، اور کبھی اجتماعی حادثے کی شکل میں نوحہ خوانی ہوتی ہے لیکن جوں جوں عوام کی آزادیوں کے لئے جدوجہد آگے بڑھتی ہے، اور وطن کی سرزمین پر شجاعتوں اور شہادتوں کی کہانیاں پنجاب کے میدانوں میں پکنے والی گندم کی کھیتی کی طرح بڑھتی اور پکتی ہیں، ان کا اظہار بھی بڑھتا چلا جاتا ہے کہ اظہارِ رائے کی آزادی کی حد بھی آدمی ہی بڑھاتا چلا جاتا ہے، لیکن ایسے جیسے جنگ میں مصروف فتح حاصل کرنیوالی فوج۔

لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے ملک میں بھی ایسے ادیب اور شاعر ہوں جو پچھلے طبقوں سے عمل میں جڑے ہوئے ہوں، اور ان کا احتساب اور خوشبو کی شہادت میں گزر نہ ہوا ہو!

احتساب میں ان کا گزر ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ ایسا ادب احتساب پر احتساب کی نذر ہو جائے گا۔

سو ایک جبر ہے جس کا ذکر ہو سکتا ہے اور وہ بھی ایمائی انداز میں۔

ویسے، ایک امریکی نقاد نے کہا تھا: "جہاں آزادی مفقود ہو وہاں سیاست لوگوں کا مقدر بن جاتی ہے"۔

سو سیاست مقدر بنا ہی چاہتی ہے۔

اب جس لمحے میں، جس دور میں ہم جی رہے ہیں یہ بھٹو کا لمحہ ہے، یہ اس کا دور ہے، ہم چاہیں یا نہ چاہیں یہ اس کا دور ہے اس لئے بہت سے ادیب، اہل علم و دانش اس دور کی اہمیت کو سمجھنے سے انکار کرتے ہیں وہ حاکموں کی مانند یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ بھٹو ایوب خان ہے، یحییٰ خان ہے کہ اس کو مسندِ اقتدار سے اُتارا اور عالم نے اسکو فراموش کر دیا وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ بھٹو ایک مظہر ہے۔ چنانچہ آج جب ہمارا شاعر، ادیب، افسانہ نگار، نقاد اس بھٹو کی اس دور کی بات کرتا ہے اُس کو اپنے جذبات کا سمبل بناتا ہے تو بہت سارے ادیب ناک بھوں چڑھاتے ہیں کل ان کو فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلے لکھے گئے، ادب میں ایک بھیڑ چال نظر آتی تھی اور آج پھر وہ اس عظیم ادب کو محض بھیڑ چال کہہ رہے ہوں یا پھر کچھ اخبارات میں ادبی خبریں گھڑنے والے "احتساب" پہ احتساب کئے جانے کی اپیلیں کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں لیکن تاریخ کے ادب کو کون زنجیریں پہنا سکا ہے۔

چڑھ گرد جام کہ شاید ہو اسی لحظہ رواں
روک رکھا ہے جو اک تیر قضا نے کب سے
فیض پھر کب کسی مقتل میں کریں گے آباد
اب یہ ویراں ہیں شہیدوں کے فصیلے کب سے

بشکریہ "احتساب" لاہور

سید سبط حسن

سیکولرازم

ملائیت

لاہور - ۱۳- اپریل ۱۹۸۱ء

مولانا محمد عبداللہ درخواستی، امیر نظام علماء پاکستان نے فرمایا کہ سیاسی رہنماؤں، کارکنوں اور مولویوں کو چاہیے کہ ملک میں سیکولرازم کے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے متحد ہو جائیں۔ وہ کل شام جامعہ مدینہ کریم پارک میں علماء سے خطاب کر رہے تھے ۴

علم و حکمت کا درخت بہتوں کو شجر حیات سے گمراہ کر دیتا ہے اور جہنم کے عذابوں کی تمہید ہوتا ہے۔ پادری بوناوِن ترا

(۱۲۲۱ء - ۱۲۷۴ء)

سیکولرازم

جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم یہ کیسے مان لیں کہ بیماریاں اُڑ کر لگتی ہیں جب کہ شرعی قوانین اس سے انکار کرتے ہیں تو اُن کو ہمارا جواب ہے کہ وبائی امراض کا وجود تجربے، تحقیق، حواس خمسہ کی شہادتوں اور معتبر روایتوں سے ثابت ہے۔ وبا کی حقیقت اس وقت واضح ہو جاتی ہے جب کوئی محقق یہ دیکھتا ہے کہ مریض کو چھونے والا خود اسی مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے جبکہ دور رہنے والا اس مرض سے محفوظ رہتا ہے وبائی مرض کپڑوں، برتنوں اور زیوروں کے ذریعہ دوسروں کو لگتا ہے۔

ابن خطیب غرناطوی (۱۳۱۳ء - ۱۳۷۴ء)

کہتے ہیں کہ سقراط جب زہر کا پیالہ پی چکا تو اس کے شاگرد کریٹو نے پوچھا کہ اے استاد بتا کہ ہم تیری تجہیز و تکفین کن رسموں کے مطابق کریں۔ "میری تجہیز و تکفین ؟" سقراط

۴- مولانا درخواستی زندگی میں ایک آدھ بار ضرور بیمار پڑے ہوں گے اور کسی ڈاکٹر یا حکیم نے اُن کا علاج بھی کیا ہوگا۔ لیکن اُن سے اگر عرض کیا جائے کہ حضور والا آپ کی شفایابی کے ذرائع سیکولر تھے تو وہ ہرگز نہ مانیں گے۔

ہنسا اور پھر سنجیدہ ہو کر کہنے لگا کہ کریٹو! میں نے تم لوگوں کو تمام عمر سمجھایا کہ لفظوں کو اُن کے صحیح معنی میں استعمال کیا کرو مگر معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔ کریٹو! یاد رکھو کہ لفظوں کا غلط استعمال سب سے بڑا گناہ ہے۔

ہمارے مُلک میں اِن دنوں سیکولرازم کی اصطلاح کے ساتھ یہی ناروا سلوک ہو رہا ہے۔ مُلاؤں کا تو ذکر ہی کیا اچھے خاصے پڑھے لکھے سیاسی لیڈر اور اخباروں کے ایڈیٹر حضرات بھی لوگوں کو سیکولرازم سے بدگمان کرنے کی غرض سے اُس کے معنی و مفہوم کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں اور یہ تاثر دینا چاہتے ہیں گویا سیکولرازم طاعون کا چوہا یا چھوت کی بیماری ہے جس سے ہر شخص کو بچنا چاہیئے۔ ان کے خیال میں سیکولرازم ایک مغربی نظام ہے جس سے بے دینی، دہریت اور بداخلاقی پھیلتی ہے اور فتنہ و فساد کے دروازے کھلتے ہیں لہٰذا سیکولر خیالات کا سدِّباب نہایت ضروری ہے ورنہ اسلام اور پاکستان دونوں خطرے میں پڑ جائیں گے۔ آیئے اس جھوٹ کا جائزہ تاریخی سچائیوں کی روشنی میں لیں۔

سیکولر اور سیکولرازم خالص مغربی اصطلاحیں ہیں۔ لاطینی زبان میں "سیکولم" SECULUM کے لغوی معنی "دنیا" کے ہیں۔ قرونِ وسطیٰ میں رومن کیتھولک پادری دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک وہ پادری جو کلیسائی ضابطوں کے تحت خانقاہوں میں رہتے تھے۔ دوسرے وہ پادری جو عام شہریوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ کلیسا کی اصطلاح میں آخرالذکر کو سیکولر پادری کہا جاتا تھا۔ وہ تمام ادارے بھی سیکولر کہلاتے تھے جو کلیسا کے ماتحت نہ تھے اور وہ جائداد بھی جس کو کلیسا فروخت کر دیتا تھا۔" آج کل سیکولرازم سے مُراد ریاستی سیاست یا نظم و نسق کی مذہب یا کلیسا سے علیحدگی ہے اور سیکولر تعلیم وہ نظام ہے جس میں دینیات کو تعلیم سے الگ کر دیا جاتا ہے۔[۱]

انسائیکلوپیڈیا امریکانا میں سیکولرازم کی تشریح اور زیادہ وضاحت سے کی گئی ہے۔ انسائیکلوپیڈیا امریکانا کے مطابق "سیکولرازم ایک اخلاقی نظام ہے جو قدرتی اخلاق کے

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا جلد ۲۰ صفحہ ۲۶۴

اُصول پر مبنی ہے اور الہامی مذہب یا مابعد الطبیعیات سے جُدا ہے۔ اس کا پہلا کلیہ فکر کی آزادی ہے یعنی ہر شخص کو اپنے لئے کچھ سوچنے کا حق۔ ۲۔ تمام فکری اُمور کے بارے میں اختلاف رائے کا حق۔ ۳۔ تمام بنیادی مسائل مثلاً خدا یا رُوح کی لافانیت وغیرہ پر بحث مباحثے کا حق۔ سیکولرازم یہ دعوےٰ نہیں کرتا کہ موجودہ زندگی کی خوبیوں کے علاوہ کوئی اور خوبی نہیں ہے۔ البتہ اس کا مقصد وہ مادّی حالات پیدا کرنا ہے جن میں انسان کی محرومیاں اور افلاس ناممکن ہو جائیں۔" [۱]

ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی انگلش اُردو ڈکشنری کے مطابق سیکولرازم اُس معاشرتی اور تعلیمی نظام کو کہتے ہیں جس کی اساس مذہب کے بجائے سائنس پر ہو اور جس میں ریاستی اُمور کی حد تک مذہب کی مداخلت کی گنجائش نہ ہو [۲]

سیکولر خیالات بہت قدیم ہیں لیکن سیکولرازم کی اصطلاح جارج جیکب ہولی اوک GEORGE I. HOLYOAKE نامی ایک آزاد خیال انگریز نے ۱۸۴۰ء میں وضع کی۔ وہ شہر برمنگھم کے میکنکس انسٹی ٹیوٹ میں اُستاد تھا۔ برطانیہ کے مشہور خیالی سوشلسٹ رابرٹ اوون (۱۷۷۱ء/ ۱۸۵۸ء) کے ہم نوا ہونے کے جُرم میں برطرف کر دیا گیا تھا اور کُل وقتی مبلّغ بن گیا تھا۔ اُن دنوں لندن سے آزاد خیالوں کا ایک رسالہ "ندائے عقل" نکلتا تھا۔ ۱۸۴۱ء میں جب رسالے کے اڈیٹر کو دینِ مسیح کی بے حُرمتی کے جرم میں ایک سال قید اور سو پونڈ جرمانے کی سزا ہو گئی تو ہولی اوک کو رسالے کا اڈیٹر مقرر کر دیا گیا لیکن ابھی چند ہی مہینے گذرے تھے کہ ہولی اوک کو بھی ایک تقریر کی پاداش میں چھ ماہ قید کی سزا بھگتنی پڑی۔ جیل سے نکلنے کے بعد وہ آزاد خیالی کے حق میں مسلسل تقریریں کرتا اور رسالے لکھتا رہا۔ ۱۸۵۱ء میں اُس نے لندن میں سنٹرل سیکولر سوسائٹی کے نام سے ایک انجمن قائم کی۔ ہولی اوک کا موقف یہ تھا کہ

۱ : انسان کی سچی رہنما سائنس ہے۔

---

[۱] جلد ۲۲ صفحہ ۵۲۱
[۲] صفحہ ۱۰۹۱

۲ : اخلاق مذہب سے جدا اور بُرانی حقیقت ہے۔

۳ : علم و ادراک کی واحد کسوٹی اور سند عقل ہے۔

۴ : ہر شخص کو فکر اور تقریر کی آزادی ملنی چاہیئے۔

۵ : ہم کو اس دنیا کو بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

سیکولرازم کو معاشرتی نظام کے لئے درست سمجھنے سے دیندار بیدین اور تھا اربت دہریہ نہیں ہو جاتا لہٰذا سیکولرازم سے اسلام کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے اور نہ اس سے پاکستان کی بقاء و سالمیت پر ضرب پڑتی ہے بلکہ ہمارا خیال یہ ہے کہ سیکولر اصولوں ہی پر چل کر پاکستان ایک روشن خیال، ترقی یافتہ اور خوشحال ملک بن سکتا ہے۔ سیکولرازم کا مقصد معاشرے کی صحت مند سماجی اور اخلاقی قدروں کو پامال کرنا نہیں ہے بلکہ سیکولرازم ایک ایسا فلسفہ حیات ہے جو خرد مندی اور شخصی آزادی کی تعلیم دیتا ہے اور تقلید و روایت پرستی کے بجائے عقل و علم کی اجتہادی قوتوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے چنانچہ سیکولرازم کی تبلیغ کرنے والوں کی برابر یہی کوشش رہی ہے کہ انسان کے عمل و فکر کو توہمات کے جال سے نکالا جائے۔ یہ کوئی انوکھا فلسفہ نہیں ہے۔ ہمارے صوفیائے کرام بھی یہی کہتے تھے کہ سچائی کو خود تلاش کرو، خود پہنچانو اور جو رشتہ بھی قائم کرو خواہ وہ خالق سے ہو یا مخلوق سے معرفت حق پر مبنی ہو نہ کہ انعام کے لالچ اور سزا کے خوف پر۔ حضرت رابعہ بصری کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک روز وہ بصرے کی سڑک پر سے گذر رہی تھیں اس حال میں کہ ان کے ایک ہاتھ میں مشعل تھی اور دوسرے میں پانی کی صراحی۔ لوگوں نے سبب پوچھا تو انہوں نے کہا کہ میں جنت میں آگ لگانے اور دوزخ کو بجھانے جا رہی ہوں تاکہ مسلمان جزا اور سزا کی فکر سے آزاد ہو کر خدا سے بے لوث محبت کرنا سیکھیں۔

جو لوگ عقل و اجتہاد کی بجگہ تقلید و اطاعت پر زور دیتے ہیں وہ خود مذہب کی تاریخ سے ناواقف ہیں۔ ذرا سوچئے کہ اگر حضرت ابراہیمؑ نے روایت پرستی کا شیوہ اختیار کیا ہوتا، اپنے آبائی مذہب پر قائم رہتے اور اس کو عقلی دلائل سے رد نہ کرتے تو دین ابراہیمی کہاں ہوتا۔ غالب نے اسی نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ؎

با من میاویز اے پدر فرزند آزر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر، دین بزرگاں خوش نہ کرد

غالب تو حضرت کے سے راہ بزرگی پیروی کو بھی لازم نہیں سمجھتا بلکہ ان کو اپنا ہم سفر خیال کرتا ہے۔

سیکولرازم کی بنیاد اس کلیئے پر قائم ہے کہ ضمیر و فکر اور اظہار رائے کی آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے۔ لہٰذا ہر فرد بشر کو اس کی پوری پوری اجازت ہونی چاہیئے کہ سچائی کا راستہ خود تلاش کرے اور زندگی کے تمام مسائل پر خواہ اُن کا تعلق سیاسیات اور اقتصادیات سے ہو یا مذہب و اخلاق سے، فلسفہ و حکمت سے ہو یا ادب و فن سے، اپنے خیالات کی بلاخوف و خطر ترویج کرے۔ طاقت کے زور سے کسی کا منہ بند کرنا یا دھمکی اور دھونس سے کسی کو زبردستی اپنا ہم خیال بنانا حقوق انسانی کے منافی ہے اور اس بات کا اقرار بھی کہ بحث و مباحثے میں ہم اپنے حریف کی دلیلوں کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔

جبری زبان بندی کے نتائج بھی معاشرے کے حق میں بڑے مہلک ثابت ہوتے ہیں۔ ملک کی فضا میں گھٹن اور اُمس کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ قوم کی کمر جھک جاتی ہے اور اس کے سجدے بقول اقبال طویل ہو جاتے ہیں۔ خوف اتنا بڑھ جاتا ہے کہ شاخ گل کا سایہ بھی سانپ بن کر ڈرانے لگتا ہے۔ لوگ اقتدار کی خوشنودی ہی کو زندگی کا مقصد بنا لیتے ہیں۔ اور سوچنا، سوال کرنا، شک کرنا، یا انکار کرنا (جو علم و معرفت کی پہلی شرط ہے) ترک کر دیتے ہیں۔ خوف سے بزدلی، بزدلی سے تابعداری اور تابعداری سے غلامانہ ذہنیت جنم لیتی ہے جرأت و بیباکی کا نام و نشان باقی نہیں رہتا۔ تلاش و جستجو اور تحقیق و تفتیش کا جذبہ ماند پڑ جاتا ہے تجربے کے بازو شل اور مشاہدے کی آنکھیں کور ہو جاتی ہیں۔ ایجاد و تخلیق کے سوتے سوکھ جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ ایک ایسی نسل وجود میں آتی ہے جو ذہنی طور پر مفلوج اور عملی طور پر پسپا اور اپاہج ہوتی ہے۔ بھیڑوں کا یہ گلہ جو نہ خود بین ہوتا، نہ جہاں بین، بقاء و ترقی کی جدوجہد میں اُن قوموں کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے جو اپنی تخلیقی قوتوں میں اضافے کی مسلسل کوشش کرتی رہتی ہیں۔ اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہیں۔

فکر و عمل کی قوانین قدرت سے ہم آہنگی کا نام سیکولرازم ہے۔ اور اگر قوانین قدرت کی خلاف ورزی کی جائے تو انسان کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ انسانی تخلیق کا ہر عمل چونکہ قوانین قدرت کے مطابق ہوتا ہے لہٰذا شعر کہنا ہو یا تصویر بنانا، کھڈی پر کپڑا بُننا ہو یا ہوائی جہاز اُڑانا ہم اپنے کاموں کے دوران سیکولر انداز اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ہم مانیں یا نہ مانیں لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ہمارے عمل کی ذمہ داری ہم پر ہے اور اس میں کسی ماورائی طاقت کا دخل نہیں ہے۔ ہم یہ کہہ کر قتل کے الزام سے ہرگز بچ نہیں سکتے کہ ہم کو خواب میں قتل کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ بیماریوں کا علاج اور حفظان صحت کے طور طریقے بھی سیکولر اُصولوں ہی پر وضع ہوتے ہیں۔ مگر پرانے زمانے میں انسان قوانین قدرت سے بہت کم واقف تھا لہٰذا مظاہر قدرت سے ڈرتا تھا۔ اُن کی پوجا کرتا تھا اور اُن کے لطف و کرم کا طالب رہتا تھا۔ کانسے کی تہذیب کے زمانے میں وادیٔ نیل، وادیٔ دجلہ و فرات اور وادیٔ سندھ میں بڑی بڑی تہذیبیں اُبھریں اور انسان نے اپنے آرام و راحت کے لئے بیشمار نئی نئی چیزیں بنائیں لیکن اُس کا شعور ہنوز تجرباتی تھا استدلالی نہ تھا۔ وہ اپنی ایجادوں اور دریافتوں سے کوئی سائنسی کلیہ یا نظریہ اخذ نہ کر سکا۔ اُس کا عمل سیکولر تھا لیکن اُس کی سوچ سیکولر نہ تھی۔

مغرب میں سیکولر خیالات کی ابتدا آیونیا (مغربی ترکی) کے نیچری فلسفیوں سے ہوئی جو یونانی الاصل تھے۔ طالیس، انکسی مانڈر، ہرقلاطیس اور دیمقراطیس وغیرہ مظاہر قدرت کی تشریح خود عناصر قدرت کے حوالے سے کرتے تھے۔ کسی نے کہا کہ کائنات کا اصل اُصول پانی ہے، کسی نے کہا نہیں آگ ہے، کسی نے کہا ہوا ہے اور کسی نے کہا ایٹم ہے۔ ان میں بیشتر یونانی خداؤں کے قائل تھے لیکن دنیاوی حقیقتوں کی تشریح وہ سیکولر انداز میں کرتے تھے۔ یونان کی شہری ریاستوں بالخصوص ایتھنز کا نظام ریاست بھی سیکولر تھا البتہ لوگ دیوتاؤں کی باقاعدہ پرستش بھی کرتے تھے۔

یونان کے زوال کے بعد جب مغربی سیاست کا مرکز روم منتقل ہو گیا تو نظم و نسق کے تقاضوں کے سبب ارباب اختیار کو وہاں بھی سیکولر طرز عمل اختیار کرنا پڑا۔ ابتدا میں

قانونی دستاویزیں روم کے پروہتوں کے قبضے میں رہتی تھیں۔ قوانین کی تشریح اور تاویل کا حق انہیں کو حاصل تھا اور قوانین سے متعلق مذہبی مراسم کی ادائگی بھی انہیں کی اجارہ داری تھی۔ لہذا پروہت جن کا تعلق اُمرا کے طبقے سے تھا اپنے ان وسیع اختیارات سے خوب فائدے اٹھاتے تھے۔ ۴۵۱ ق۔م میں جب روم میں پروہتوں کی دراز دستیوں کے خلاف بغاوت ہوئی تو رومن سینٹ نے قوانین کو بارہ لوحوں میں قلم بند کر کے اپنی تحویل میں لے لیا۔ اور تب رومن لا کا سیکولر دور شروع ہوا۔ ملکی قوانین سینٹ بنانے لگی۔ تیسری صدی قبل مسیح میں پروہتوں کے بجائے جب وکیل عدالتوں میں پیش ہونے لگے تو امور ریاست میں پروہتوں کا اثر اور کم ہو گیا۔

پہلی صدی عیسوی میں رومی معاشرے میں ایک نیا مشرقی عنصر داخل ہوا جس نے یورپ والوں کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔ یہ عنصر عیسائی مذہب کا تھا۔ حضرت مسیحؑ کا حکم تھا کہ خدا کا حق خدا کو دو اور قیصر روم کا حق قیصر روم کو۔ اُن کے شاگردوں نے پیغمبر خدا کی ہدایت پر عمل کیا مگر قیصر روم کو مسیحی تعلیمات کسی صورت گوارہ نہ تھیں چنانچہ پطرس اور پال نے جب روم میں تبلیغ شروع کی تو اُن کو صلیب دے دی گئی۔ دوسرے کئی مبلّغوں کا بھی یہی حشر ہوا اور عام عیسائیوں پر جو عموماً غریب یا غلام ہوتے تھے ہولناک مظالم توڑے گئے۔ تقریباً تین سو سال تک یہی عالم رہا لیکن اس بیداد کے باوصف عیسائی مذہب کی مقبولیت بڑھتی رہی اور آخر کار شہنشاہ قسطنطین (۳۳۷-۲۷۴ء) کو اعلان کرنا پڑا کہ عبادت کی آزادی سے کوئی شخص محروم نہیں کیا جائے گا اور ہر فرد بشر کو اختیار ہو گا کہ اُلوہی امور کا تصفیہ اپنی مرضی سے کرے۔ مگر ۳۱۲ء میں جب قسطنطین خود عیسائی ہو گیا تو غیر مسیحی آبادی پر ستم ڈھایا جانے لگا۔ ۳۴۶ ق۔م میں تمام غیر مسیحی عبادت گاہیں بند کر دی گئیں۔ پرانے رومن دیوتاؤں کو قربانی پیش کرنے کی سزا موت قرار پائی اور عبادت گاہوں کی جائدادیں ضبط کر کے کلیسا کے حوالے کر دی گئیں۔ جو کل تک مظلوم و مفلس تھے دفعتاً صاحب جاہ و حشم بن گئے۔ روم کلیسا کا صدر مقام قرار پایا کیونکہ پطرس اور پال کی ہڈیاں وہیں دفن تھیں۔ پاپائے روم پطرس کا جانشین اور عیسائیوں کا روحانی پیشوا تسلیم کر لیا گیا۔ کلیسا کا دور اقتدار شروع ہو گیا۔

شہنشاہ قسطنطین نے اس سے پہلے ہی شمالی یورپ کی وحشی قوموں کے حملے سے بچنے کی غرض سے اپنا دارالسلطنت روم سے قسطنطنیہ (استنبول) منتقل کر دیا تھا جو یقیناً زیادہ مرکزی اور محفوظ جگہ تھی۔ اُس کی موت کے بعد تاج و تخت کے لئے جھگڑے شروع ہو گئے اور سلطنت دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک قسطنطنیہ کی بازنطینی سلطنت اور دوسری مغربی سلطنت جس کا صدر مقام روم تھا۔

مگر مغربی سلطنتِ روما کے قدم ابھی جمے نہ تھے کہ مشرقی یورپ سے گوتھ اور ہن قوموں نے بڑے پیمانے پر ترک وطن کر کے مغربی یورپ پر یلغار کر دی۔ ۴۱۰ء میں انہوں نے روم کو بھی تاخت و تاراج کر دیا۔ لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا یہ سلسلہ پچاس ساٹھ سال تک جاری رہا۔ اِس اثنا میں گوتھ قوم نے اسپین، فرانس اور اٹلی کے کئی علاقوں میں اپنی ریاستیں بھی قائم کر لیں اور شہنشاہ روم گوتھ سرداروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن گئے۔ ۴۷۶ء میں ایک سردار نے آخری شہنشاہ آگسٹولس کو تخت سے اُتار دیا اور خود حکومت کرنے لگا۔ مغربی سلطنت روم ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔

اِن وحشی قوموں نے کلاسیکی روم کا ہزار سالہ تہذیبی سرمایہ نیست و نابود کر دیا اور کچھ عرصے بعد یہاں قدیم علم و ادب کے آثار بھی باقی نہ رہے۔ یورپ بربریت کے اندھیرے میں ڈوب گیا۔

البتہ سلطنت روما کا زوال رومن کلیسا کے حق میں بڑی نعمت ثابت ہوا۔ قسطنطنیہ کی مانند اگر روم میں بھی کوئی مضبوط مرکزی حکومت ہوتی تو رومن کلیسا کی حیثیت وہاں وہی ہوتی جو بازنطینی سلطنت میں پادریوں کی تھی۔ وہ شہنشاہ کی اطاعت پر مجبور ہوتے اور کبھی یہ دعوےٰ کرنے کی جرأت نہ کرتے کہ کلیسا ریاست سے ارفع و اعلیٰ ادارہ ہے۔ روم میں شہنشاہیت کے خاتمے اور وحشی قوموں کے حملوں کی وجہ سے یورپی معاشرے میں جو خلا پیدا ہوا اُس سے کلیسا کو اپنی سیاسی طاقت بڑھانے میں بڑی مدد ملی۔ پادریوں نے اطالوی تہذیب کی بچی کھچی نشانیوں کو وحشی گوتھوں کی دست برد سے بچایا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تاریکی اور خلفشار کے اس دور میں پطرس کے جانشین مغربی یورپ کے علم و ثقافت کے مینارۂ نور

ثابت ہوتے تھے[4]۔ یہ پادری لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ سالگرہ اور دوسرے مذہبی تہواروں کے دن تاریخ کا حساب کر سکتے تھے۔ پیدائش، شادی بیاہ اور موت کی رسمیں ادا کرتے تھے اور حکام کے روبرو مصیبت زدوں کی داد فریاد پیش کر سکتے تھے غرضیکہ عہدِ تاریک میں عوام کا واحد سہارا اگر کوئی تھا تو یہی پادری تھے۔ کلیسا نے قرونِ وسطیٰ میں عقیدت مندوں کے دلوں میں گھر کر لیا اور اس کا اثر و اقتدار بڑھا تو اس کے معقول اسباب تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کلیسا نے اس صورتِ حال سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور آگے چل کر معاشرتی ترقی کی راہ کا روڑا بن گیا۔

یورپ کے نئے حاکموں نے بھی کلیسا سے کوئی تعرض نہ کیا بلکہ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی کیونکہ پادریوں کے تعاون کے بغیر وہ حکومت نہیں کر سکتے تھے۔ دوسری طرف کلیسا نے بھی وفاداری ہی میں عافیت سمجھی (مذہبی پیشواؤں کو اقتدار سے سمجھوتہ کرنے میں عموماً زیادہ دیر نہیں لگتی خواہ اقتدار کسی کے قبضے میں ہو) رومتہ الکبریٰ کے دور میں حکام اور امرا و رؤسا پادریوں کو بالکل خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اس کے برعکس نئے حاکم جو اجڈ اور توہم پرست تھے پادریوں کی باتیں بڑی عقیدت سے سنتے تھے۔

مغربی مورخ قرونِ وسطیٰ کو عہدِ تاریک سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک پانچویں صدی اور پندرھویں صدی عیسوی کا درمیانی زمانہ معاشرتی اور تہذیبی سرگرمیوں کے لحاظ سے انتہائی پستی کا زمانہ تھا لیکن معاشرتی ادوار کا سن و سال متعین نہیں کیا جا سکتا۔ معاشرتی دور کوئی تاریخی واقعہ نہیں بلکہ ارتقائی عمل ہے جس کی ابتدا یا انتہا کی نشان دہی ممکن نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرونِ وسطیٰ کی شام آہستہ آہستہ ہوئی اور نئی زندگی کی پو آہستہ آہستہ پھٹی۔ چنانچہ یورپ میں سیکولر اداروں اور فکروں کی نشو و نما تیرھویں صدی عیسوی میں شروع ہو گئی تھی۔ یہ بڑی تاریخ ساز صدی تھی۔ اسی صدی میں اٹلی میں ابھرتے ہوئے سرمایہ داری نظام نے طاقت پکڑی اور سیکولر افکار مسلم اسپین اور سسلی کی راہ سے یورپ میں داخل ہوئے مگر تاریخ کی ستم ظریفی دیکھئے کہ

۴

4. H.A.L. Fisher : History of Europe, Vol. I, P. 186, London 1972

جس مذہب کے عظیم دانش وروں، الکندی، ابوبکر رازی، ابو علی سینا، ابن ہیثم، خوارزمی، البیرونی اور ابن رُشد نے مغرب کو سیکولر خیالات اور نظریات کی تعلیم دی اُسی مذہب کے نام لیوا آج سیکولرازم پر اسلام دشمنی کی تہمت لگا رہے ہیں۔

انگریز مورخ پروفیسر فشر کو اس بات پر بڑی حیرت ہے کہ سیکولر خیالات اٹلی میں شروع ہوئے جو کلیسائیت کا سب سے مضبوط قلعہ تھا۔ تیرھویں صدی کی فکری تحریکوں پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ

"یہ اُلٹی بات ہے کہ اٹلی جو کلیسا کا مرکز تھا پورے تاریکی دَور میں مغربی ملکوں میں سب سے زیادہ سیکولر تھا۔"[۱]

لیکن یہ ہرگز اُلٹی بات نہیں بلکہ سیدھی بات ہے اس لئے کہ جنگ صلیبیہ کے دوران صنعت و حرفت اور تجارت نے دوسرے تمام مغربی ملکوں سے پہلے اٹلی میں ترقی کی۔ صلیبی جنگوں کا بظاہر مقصد عیسائیوں کے مقدس شہروں۔ یروشلم، بیت لحم وغیرہ۔ کو مسلمانوں کے قبضے سے چھڑانا تھا لیکن اصل مقصد مشرقی بحرروم کی تجارت پر اور تجارتی راستوں پر قبضہ کرنا تھا۔ صلیبی سورما فلسطین و شام کو تو آزاد نہ کرا سکے البتہ مشرقی بحرروم کی تجارت پر اٹلی کی ری پبلکن ریاستوں کا غلبہ ہو گیا۔ یہ ریاستیں بالخصوص وینس، میلان، فلورنس اور جینوا شہری ریاستیں تھیں۔ ان کا دار و مدار تجارت اور صنعت و حرفت پر تھا۔ کلیسا کا اثر ان علاقوں میں برائے نام تھا بلکہ کلیسا سے اکثر اُن کی ٹکر ہوتی رہتی تھی۔ کلیسا چونکہ ملک کا سب سے بڑا زمیندار تھا لہٰذا اُس کا مفاد فیوڈلزم سے وابستہ تھا جب کہ ری پبلکن ریاستیں سرمایہ داری نظام کی حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔

سیکولر درس گاہوں کی ابتدا اگر اٹلی میں ہوئی تو یہ بھی کوئی اتفاقی امر نہ تھا بلکہ صنعت و تجارت کی ترقی کا تاریخی تقاضہ تھا۔ اٹلی کے بینکروں، جہاز سازوں اور ریشمی، اُونی ملوں کے مالکوں کو تربیت یافتہ اور ہنرمند کارکنوں کی ضرورت پڑتی تھی مگر تعلیمی ادارے کلیسا کے

---

[۱] ایضاً صـ ۲۶۰

ماتحت تھے جو فنی تعلیم کے سخت خلاف تھا لہٰذا سرمایہ دار طبقے کو مجبوراً سیکولر درس گاہیں قائم کرنی پڑیں۔ کلیسا نے اس اقدام کی شدت سے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی اور دیکھتے ہی دیکھتے اٹلی کے قریب قریب ہر بڑے شہر میں سیکولر یونیورسٹیاں کھل گئیں۔" ان یونیورسٹیوں کو سیکولر اداروں نے سیکولر تعلیمات کی غرض سے قائم کیا تھا"۔[۵۶] لہٰذا ان درس گاہوں کا ماحول قدرتی طور پر کلیسا کے خلاف تھا۔ بولونیا یونیورسٹی میں تو دینیات کا شعبہ بھی نہ تھا۔ پیڈوا یونیورسٹی فکر جدید کا سب سے بڑا مرکز تھی۔ فلورنس میں چھ ٹکنیکل اسکول قائم تھے جن میں طلبا کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی۔ سالرنو یونیورسٹی طبی تعلیم کے لئے پورے یورپ میں مشہور تھی۔ ان یونیورسٹیوں کے پڑھے ہوئے نوجوانوں کی معاشرتی قدریں سیکولر ہوتی تھیں اور اُن کا زاویہ نظر بھی کلیسا کے زاویہ نظر سے مختلف تھا۔

دوسرا اہم رُجحان جس سے سیکولر عناصر کو تقویت ملی شرعی قوانین کی جگہ سول قوانین کی بڑھتی ہوئی مقبولیت تھی۔ اس رُجحان کو بھی اٹلی کی جمہوری حکومتوں ہی نے سہارا دیا۔ چونکہ کلیسا کے وضع کردہ فرسودہ قوانین نئی زندگی کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا تیرھویں صدی میں روم، میلان، ویرونا اور بولونیا ہر جگہ لا کالج قائم ہو گئے۔ ان درسگاہوں میں قدیم رومن لا کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ تعلیم کلیسا کے حق میں بڑی مہلک ثابت ہوئی۔ اس کے سبب سے عدالتوں کا کردار بدل گیا اور پادری سینٹ برنارڈ کو فریاد کرنی پڑی کہ "یورپ کی عدالتیں جسٹنین کے قوانین سے گونج رہی ہیں، خدائی قوانین کی آواز کہیں سنائی نہیں دیتی"۔ اور پروفیسر فشر کو جو کلیسا کا حامی ہے اعتراف کرنا پڑا کہ "تیرھویں صدی میں سیاست اور معاشرے پر جتنے فکری اثرات پڑے اُن میں رومن قانون کا اثر سب سے قوی تھا۔ سلطنت اور کلیسا کی کشمکش میں سول قانون کی تعلیم پانے والوں نے کلیسا کے بجائے سلطنت کا ساتھ دیا"۔

اسی زمانے میں فرانس، بلجیم اور برطانیہ میں بھی تجارت اور صنعت و حرفت کو فروغ

---

[۵۶] ایضاً ص ۲۶۰

ہوا۔ ماسیلز، پیرس، ایمسٹرڈم، ہمبرگ اور لندن میں صنعتی اور تجارتی اداروں کی تعداد بڑھنے لگی سیکولر درسگاہیں قائم ہوئیں اور پرانی یونیورسٹیوں میں بھی جو کلیسا کے زیر اثر تھیں سیکولر خیالات کا چرچا شروع ہوگیا۔ برطانیہ میں آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں پر ہنوز کلیسا کا غلبہ تھا لہٰذا اصول قانون کی تعلیم کے لئے لندن کے کاروباری حلقوں نے اپنے شہر میں جداگانہ کالج قائم کئے جو آج تک INN و "سرائے" کہلاتے ہیں۔ ہمارے ملک کے بیرسٹر وہیں سے سند لیتے ہیں۔

زندگی کی اس طرز نو میں جس کی داغ بیل سرمایہ داری نظام نے ڈالی فکر کہن کا پیوند نہیں لگ سکتا تھا۔ مگر یورپ کا معاشرہ ہنوز فکر نو کی تخلیق کا اہل نہ تھا۔ اس خلا کو اسپین اور سسلی کے عرب مفکرین نے پُر کیا۔ یورپ میں ذہنی انقلاب لانے کا سہرا اُنہیں کے سر ہے۔ چنانچہ پروفیسر فشر کے سے متعصب مورخ کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ "۱۲ ویں صدی میں روشنی کی جو کرنیں یورپ میں پہنچیں وہ یونان سے نہیں بلکہ اسپین کے عربوں کے ذریعہ آئیں" اور پروفیسر فلپ حِتی لکھتا ہے کہ:

"یورپ کے قرونِ وسطیٰ کی فکری تاریخ میں مسلم اسپین نے انتہائی درخشاں ابواب تحریر کئے۔ آٹھویں اور ۱۳ ویں صدی کے دوران عربی بولنے والے ساری دنیا میں تہذیب و تمدن کے مشعل بردار تھے۔ مزید برآں اُنہیں کی کوششوں سے قدیم سائنس اور فلسفہ کی بازیابی ہوئی۔ اُنہوں نے اس علم میں اضافہ کیا اور اس کو دوسروں تک اس طرح پہنچایا کہ مغرب نشاۃ ثانیہ سے آشنا ہوا۔ ان کاموں میں ہسپانوی عربوں کا بڑا حصہ ہے۔ اُنہوں نے یونانی فلسفہ کو مغرب میں منتقل کیا۔ مغربی یورپ میں نئے خیالات کا یہ بہاؤ بالخصوص فلسفیانہ خیالات کا یہ زبردست بہاؤ عہد تاریک کے اختتام کی ابتدا کا موجب بنا۔" ۵؎

۵؎ Phillip Hitti : History of the Arabs, P. 880, 887

حقیقت یہ ہے کہ علم و حکمت کا کارواں بڑی پُر پیچ راہوں سے گزرا ہے۔ یونانی فکر و فن کا اثاثہ پہلے بطلیموسی فرمانرواؤں کے عہد میں (تیسری صدی قبل مسیح) اسکندریہ منتقل ہوا۔ اس خزانے سے شام و عراق کے یہودی اور عیسائی علماء نے فیض پایا۔ تب عباسیوں کے زمانے میں یونانی تصنیفات اور خلاصوں کے ترجمے عربی میں ہوئے۔ ان ترجموں سے مسلمان حکماء اور اطبا نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ عباسیوں کے زوال کے بعد علم و حکمت کا یہ سرمایہ ہسپانوی عربوں کو ورثے میں ملا۔ انہوں نے اس دولت کو محفوظ رکھنے پر اکتفا نہ کی بلکہ اپنی تحقیقی اور تخلیقی کاوشوں سے اس میں بیش بہا اضافے کئے۔ وہ خزانے کے سانپ بھی نہ بنے بلکہ انہوں نے اہل مغرب کو اس دولت سے مستفید ہونے کے مواقع فراہم کئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے مغرب کی درس گاہیں عربی تصنیفات کے لاطینی ترجموں کی روشنی سے منور ہو گئیں۔ سچ یہ ہے کہ یورپ میں سیکولر خیالات کو فروغ دینے میں عرب مفکرین نے بڑا تاریخی کردار ادا کیا ہے۔

جس طرح نویں صدی عیسوی یونانی، سُریانی اور سنسکرت تصنیفات کے عربی ترجموں کی صدی تھی اُسی طرح بارہویں اور تیرھویں صدی (۱۱۲۵ ـ ۱۲۸۰ء) کو عربی سے لاطینی میں ترجمے کا زمانہ کہتے ہیں۔ اسپین میں اُن دنوں یوں تو بیشمار اہل قلم موجود تھے جو عربی، لاطینی اور فرانسیسی زبانوں پر پورا عبور رکھتے تھے لیکن ترجمہ کرنے والوں میں سرفہرست نام اطالوی عالم جیرارڈ آف کیری مونا (۱۱۱۴ء ـ ۱۱۸۷ء) کا ہے۔ علم کی پیاس اُس کو طلیطلہ لائی اور پھر وہ وہیں کا ہو رہا۔ جیرارڈ نے اسّی کتابیں عربی سے لاطینی میں منتقل کیں۔ ان میں بطلیموس کی المجسطی، خوارزمی کی حساب الجبر والمقابلہ، بوعلی سینا کی قانون الطب (جو مغربی یونیورسٹیوں میں صدیوں تک داخل نصاب رہی) حکیم ابوبکر رازی کی کتاب سِرّ الاسرار (جو ڈھائی سو سال تک کیمسٹری کی سب سے مستند کتاب سمجھی جاتی رہی) اور جابر ابن افلاح کی کتاب الہیات قابل ذکر ہیں۔

ان کے علاوہ الجاحظ کی کتاب الحیوان، ابوبکر رازی کی کتاب الطب المنصوری (جو دس جلدوں میں تھی) خوارزمی یا صابی ثابت کی کتاب نجوم، ابن ہیثم اور ابن باجہ کی

تصنیفات اور المجادی کی کتاب جو یونانی، ایرانی اور ہندی طب کی قاموس تھی لاطینی زبان میں ترجمہ ہوئیں بعض عرب حکما براہ راست لاطینی زبان میں لکھتے تھے مثلاً ابو جعفر احمد بن محمد غفیقی جو قرطبہ کا مشہور طبیب تھا۔ اُس نے الادویہ مفردہ، عربی، بربر اور لاطینی تینوں زبانوں میں لکھی۔ اس کتاب کے سلسلے میں غفیقی نے اسپین اور افریقہ کے دورے کئے اور آٹھ سو سے زیادہ مفردات کے نام اور اُن کے خواص اکھٹا کئے۔ یہ سب حکما جن کا ہم نے ذکر کیا ہے پیشے کے اعتبار سے طبیب تھے یعنی اپنے عہد کے سائنسداں تبھی تو پروفیسر لانگے مشہور جرمن مفکر ہمبولٹ کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ " عربوں کو طبیعیاتی سائنسوں کا حقیقی بانی سمجھنا چاہیئے "

قرون وسطیٰ کے جن مسلمان حکما نے مغربی فکر کو سب سے زیادہ متاثر کیا اُن میں ابو بکر رازی (وفات ۹۲۵ء) اور ابن رُشد (۱۱۲۶ء - ۱۱۹۸ء) کے نام سرفہرست ہیں رازی رے (تہران) کا رہنے والا تھا مگر بغداد منتقل ہو گیا تھا۔ وہ نہایت آزاد خیال اور روشن فکر سائنس داں تھا۔ البیرونی اُس کی ۵۶ تصنیفات کا ذکر کرتا ہے لیکن اُس کی کتابوں کی تعداد سو سے بھی زیادہ ہے (۳۳ نیچرل سائنس پر، ۲۲ کمسٹری پر، ۱۷ فلسفہ پر، ۱۴ مذہبیات پر، ۱۰ ریاضی پر، ۸ منطق پر، ۶ مابعدالطبیعیات پر اور ۱۰ متفرقات) رازی کی تصنیفات پہلے جیرارڈ نے لاطینی میں ترجمہ کیں پھر بادشاہ چارلس آف انجو کے حکم سے تیرھویں صدی میں ترجمہ ہوئیں۔ یورپ میں اُس کا نام RHAZE تھا۔ وہ کثرت مطالعہ کی وجہ سے آخری عمر میں اندھا ہو گیا تھا۔

رازی اسلاف پرستی کے سخت خلاف ہے۔ وہ منقولات کی حاکمیت کو نہیں تسلیم کرتا بلکہ عقل اور تجربے کو علم کا واحد ذریعہ سمجھتا ہے۔ اُس کی سوچ کا انداز عوامی تھا۔ وہ کہتا تھا کہ عام لوگ بھی اپنے مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور سائنسی سچائیوں کے ادراک کے اہل ہیں۔ اُس کا قول تھا کہ ہم کو فلسفہ اور مذہب دونوں پر تنقید کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ وہ معجزوں کا منکر تھا کیونکہ معجزے قانون قدرت کی نفی کرتے ہیں اور خلاف عقل ہیں۔ وہ مذاہب کی صداقت کا بھی چنداں قائل نہیں کیونکہ مذاہب عموماً حقیقتوں کو

چھپاتے ہیں اور لوگوں میں نفرت اور عداوت پیدا کرتے ہیں۔ وہ معاشرے کے بارے میں افلاطون کی کتاب تماؤس کے ارتقائی تصور سے اتفاق کرتا ہے اور اقتصادی پہلو کو اہمیت دیتے ہوئے تقسیم کار کی افادیت پر زور دیتا ہے۔

رازی ارسطو کا پیرو نہیں ہے بلکہ اپنے آپ کو ارسطو سے بڑا مفکر سمجھتا ہے۔ وہ ارسطو کی "طبیعیات" کو رد کرتا ہے اور دیمقراطیس اور اپیقورس کے ایٹمی فلسفے کے حق میں دلیلیں دیتا ہے۔ اُس کے خیال میں تمام اجسام مادی ایٹموں پر مشتمل ہیں اور خلا میں حرکت کرتے رہتے ہیں۔ ارسطو کے برعکس وہ خلا کے وجود بالذات کو تسلیم کرتا ہے۔ اُس کی رائے میں پانچ قوتیں ابدی اور لافانی ہیں: خدا، روح، مادّہ، زمان و مکان۔ وہ کہتا تھا کہ سائنس میں حرف آخر کوئی نہیں بلکہ علوم نسلاً بعد نسلٍ ترقی کرتے رہتے ہیں۔ لہٰذا انسان کو لازم ہے کہ اپنے دماغ کی کھڑکیاں کھلی رکھے اور منقولات کے بجائے حقیقی واقعات پر بھروسہ کرے ۵ھ

طبیب تو ابن رشد بھی تھا۔ لیکن یورپ میں اُس کی شہرت کی وجہ فلسفہ تھا بالخصوص ارسطو کی شرحیں۔ ابن رشدیت بارھویں صدی سے سولہویں صدی تک یورپ میں سب سے غالب مدرسۂ فکر تھا حالانکہ عیسائی پادری اس کے سخت خلاف تھے۔ ابن رشد کی تعلیمات کا لُب لباب یہ تھا کہ کائنات اور مادہ ابدی اور لافانی ہے (۲) خدا دنیاوی امور میں مداخلت نہیں کرتا (۳) عقل لافانی ہے اور علم کا ذریعہ ہے۔

ارسطو کی تصانیف بالخصوص "طبیعیات" اور "مابعد الطبیعیات" پر ابن رشد کی شرحیں پیرس پہنچیں تو کلیسائی عقاید کے ایوان میں ہل چل مچ گئی۔ معلم اور متعلم دونوں مسیحی عقیدۂ تخلیق، معجزات اور روح کی لافانیت پر علانیہ اعتراض کرنے لگے۔ حالات اتنے تشویش ناک ہو گئے کہ ۱۲۱۰ء میں پیرس کی مجلس کلیسا نے ارسطو کی تعلیمات بالخصوص ابن رشد کی شرحوں کی اشاعت ممنوع قرار دے دی مگر کسی نے پروا نہ کی لہٰذا ۱۲۱۵ء میں پوپ

5. Cambridge History of Islam. Vol. II. P. 801, Cambridge ۵ھ

نے پوری عیسائی دنیا میں ان کتابوں پر پابندی لگا دی۔ پابندیوں کی وجہ سے ابن رُشد کی مقبولیت اور بڑھ گئی۔ پوپ اسکندر چہارم نے رُشدیت کے ابطال کے لئے پادری البرٹس مگنوس سے ایک کتاب لکھوائی مگر وہ بھی قریب قریب ہر مسئلے پر بو علی سینا کا اقتباس پیش کرتا ہے اور مسلمان متکلمین کے حوالے دیتا ہے۔ ۱۲۶۹ء میں ابن رُشد سے منسوب تیرہ مقولوں کی تعلیم مذہب کے خلاف قرار پائی ان میں سے بعض یہ ہیں: سب انسانوں کے دماغ کی ساخت یکساں ہے۔ دنیا لافانی ہے۔ آدم کی تخلیق افسانہ ہے۔ انسان اپنی مرضی میں آزاد ہے۔ اور اپنی ضرورتوں سے مجبور، خدا کو روزمرہ کے واقعات کا علم نہیں ہوتا اور انسان کے اعمال میں خدا کی مرضی شامل نہیں ہوتی۔ مگر ابن رُشدیت کی مقبولیت کم نہ ہوئی۔ تب ۱۲۷۷ء میں ابن رشد کے ۲۱۹ مقولوں کے خلاف فتوی صادر ہوا مثلاً تخلیق محال ہے، مُردے کا جسم دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتا۔ قیامت کا اعتقاد فلسفیوں کو زیب نہیں دیتا۔ فقہائے مذہب کی باتیں قصہ کہانیاں ہیں۔ دینیات سے ہمارے علم میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ دین مسیحی حصول علم میں حارج ہے۔ مسرت اسی دنیا میں حاصل ہو سکتی ہے نہ کہ آخرت میں۔

فرانس میں رُشدیت کا سب سے بڑا علم بردار پیرس یونیورسٹی کا پروفیسر سیگر (۱۲۳۵ء - ۱۲۸۱ء) تھا۔ اُس پر ۱۲۷۷ء میں مذہبی عدالت میں مقدمہ چلا اور عمر قید کی سزا ملی۔ اسیری کے دن اُس نے روم میں گذارے اور وہیں قتل ہوا۔ ان سختیوں کے باوجود ابن رشد کے خیالات ذہنوں کو متاثر کرتے رہے یہاں تک کہ ول ڈیورنٹ کے بقول ۱۳ویں صدی کے وسط میں ابن رُشدیت تعلیم یافتہ طبقے کا فیشن بن گئی[۹] اور ہزاروں افراد ابن رشدیت کے اس خیال سے اتفاق کرنے لگے کہ قوانین قدرت کے عمل میں خدا بالکل مداخلت نہیں کرتا۔ کائنات لافانی ہے اور جنت دوزخ عوام کو بہلانے کے بہانے ہیں۔

معتزلہ کے زیر اثر فرانس میں ایسے مفکر بھی پیدا ہونے لگے جو کہتے تھے کہ خدا نے کائنات کی تخلیق کے بعد نظام کائنات کو قوانین قدرت کے سپرد کر دیا ہے لہذا معجزہ

۹ـ 9. Will Durant . The Age of Faith, P [illegible]

محال ہے کیونکہ معجزوں سے قوانین قدرت کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ اُن کا دعوےٰ تھا کہ دعاؤں تعویذوں سے عناصر قدرت کے عمل میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ التجاؤں سے طوفان کو رد کیا جا سکتا ہے، نہ بارش لائی جا سکتی ہے اور نہ بیماریوں کا علاج ہو سکتا ہے۔ اُن کا یہ بھی کہنا تھا کہ نباتات اور حیوانات کی شکل قسمیں عمل تخلیق کا کرشمہ نہیں بلکہ قدرتی ارتقا کا نتیجہ ہیں اور یہ عقیدہ کہ قیامت کے دن مُردے جی اٹھیں گے درست نہیں کیونکہ روح اور جسم دونوں فانی ہیں۔ اس کے ساتھ قدیم یونانی فلسفی ایپی قورس (۳۴۱-۲۷۰ ق م) اور اُس کے روحانی شاگرد لُوکری شیش (۹۹-۵۵ ق م) کا ایٹمی فلسفہ مقبول ہونے لگا اور یہ خیال عام ہوا کہ حقیقی دنیا یہی ہے۔ آخرت محض افسانہ ہے۔

یورپ میں سائنسی تجربوں کا دَور عربی تصانیف کے لاطینی ترجموں کے بعد شروع ہوا۔ اُس دَور کے سائنس دانوں میں سب سے ممتاز روجر بیکن (۱۲۱۴ء-۱۲۹۴ء) ہے تحصیل علم کے شوق میں وہ آکسفورڈ سے فرانس، اٹلی اور غالباً اسپین بھی گیا۔ وہیں وہ مسلمان سائنسدانوں کے خیالات سے واقف ہوا۔ وہ اسلامی سائنس اور فلسفہ کے احسانات کا اعتراف اپنی کتابوں میں بار بار کرتا ہے۔ روجر بیکن کے نزدیک علم و آگہی کا واحد ذریعہ تجربہ ہے۔ "جو شخص مظاہر قدرت کی سچائیوں تک بلا شک وشبہ پہنچنا چاہتا ہو اُس کو لازم ہے کہ تجربوں پر وقت صرف کرے۔ کیونکہ نیچری سائنس میں تجربہ ہی واحد ثبوت فراہم کرتا ہے"۔ آکسفورڈ واپس جا کر اُس نے ابن ہیثم کی بصریات پر تجربے شروع کئے تو کلیسا کی طرف سے اُس کی باقاعدہ نگرانی ہونے لگی اور پادری بونا وَن ترا (۱۲۲۱ء-۱۲۷۴ء) نے دھمکی دی کہ "علم و حکمت کا درخت بہتوں کو شجر حیات سے گمراہ کر دیتا ہے اور جہنم کے ہولناک عذابوں کی تمہید ہوتا ہے"۔ اِس جرم کی پاداش میں کہ "تمہاری تحریروں میں عجیب و غریب خیالات کا اظہار ہوتا ہے" روجر بیکن کو مذہبی عدالت کے حکم سے قید کر دیا گیا۔ اور وہ پندرہ سال بعد رہا ہوا۔

چودھویں صدی میں قومی ریاستوں کے قائم ہونے سے سیکولر خیالات خوب پھلے پھولے۔ قومی ریاستوں کو کلیسا کی گرفت سے آزاد ہونے کے لئے جن دلیلوں کی ضرورت تھی وہ

سیکولر مفکر ہی فراہم کر سکتے تھے۔ مثلاً پیڈوُا یونیورسٹی کے اُستاد مارسی لیوتے انٹی کی شہری ریاستوں کو نمونہ بنا کر ۱۳۲۴ء میں سیکولر ریاستوں کا ایک مبسوط نظریہ پیش کیا۔ اُس نے شرعی قوانین اور انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا کہ شہریوں کے حقوق اُن کے عقائد سے متعین نہیں ہوتے لہٰذا کسی شخص کو اُس کے مذہب کی بنا پر سزا نہیں ملنی چاہیئے۔ کلیسا کی قائم کردہ مذہبی عدالتوں پر یہ کھلا حملہ تھا۔

کلیسا کا زوال اب دور نہیں تھا۔ چنانچہ جلد ہی ایسی تحریکیں اٹھیں اور پے در پے ایسے اہم واقعات پیش آئے جو سیکولر خیالات کے حق میں بے حد سازگار ثابت ہوئے: یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا ظہور، مارٹن لوتھر، کالون اور زونیگلی وغیرہ کی پوپ کے خلاف بغاوتیں، برطانیہ میں ہنری ہشتم کا رومن کلیسا سے تصادم، سائنسی ایجادوں میں اضافہ، صنعت و حرفت کا بڑے پیمانے پر فروغ، امریکہ اور ہندوستان کی دریافت اور اس کی وجہ سے بین الاقوامی تجارت و صنعت میں اضافہ، برطانیہ میں خانہ جنگی اور جمہوریت پسندوں کے ہاتھوں بادشاہ چارلس اول کا قتل، اُلوہی استحقاق ملوکیت کے نظریے سے عام بیزاری اور پارلیمانی نظام سے وابستگی غرضیکہ معاشرتی اور سیاسی شعبوں میں سیکولر میلان عام ہو گیا۔ سترھویں صدی میں جو عقلیت کا عہد کہلاتا ہے سیکولر رجحانات کو مزید تقویت ملی۔ اسی بنا پر پروفیسر آرنلڈ ٹوائن بی نے لکھا ہے کہ سترھویں صدی مغربی زندگی پر سیکولرازم کی بالادستی کی صدی ہے۔ سیکولرازم ہی کے طفیل مغربی معاشرے میں معاشی مفاد نے اور تحقیق و تفتیش کے دائرے میں سائنس نے مذہب کی جگہ لے لی[۱۰]

اٹھارویں صدی یورپ میں صنعتی انقلاب، سیاسی انقلاب اور روشن خیالی کے عروج کی صدی تھی۔ والٹیئر، روسو، مان ٹس کیو، اولباخ، ایلواتیس، دیدرو، کانٹ بیشمار ایسے مفکر پیدا ہوئے جنہوں نے معاشرتی اقدار و افکار کا رُخ ہی بدل دیا۔ اور جب عوام کی

---

10. Arnold Toynbee : A Historian's Approach to Religion, P 184, طبع New York, 1956

انقلابی جدوجہد (امریکہ اور فرانس میں) شروع ہوئی تو سیکولر خیالات نے عملی پیراہن پہن لیا۔

امریکی جنگ آزادی کی قیادت وہاں کے صنعت کاروں اور تاجروں نے کی تھی۔ ان طبقوں پر اور ان کے فکری نمائندوں پر۔ جیمس میڈیسن، تھامس جیفرسن، ٹام پین اور بنجامن فرینکلن کے علاوہ برطانوی سیاسی مفکر جان لاک اور فرانسیسی خرد افروزوں کا گہرا اثر تھا۔ انہوں نے امریکی ری پبلک کی بنیاد سیکولر اصولوں پر رکھی۔ چنانچہ امریکہ کا نیا آئین جو ۱۷۸۹ء میں منظور ہوا خالص سیکولر آئین تھا۔ یہ آئین ہنوز رائج ہے۔ اس کے مطابق اقتدار اعلیٰ کا سرچشمہ ملک کے باشندے ہیں۔ آئین کی دفعہ چھ کے مطابق ریاست کے کسی عہدے کے لئے مذہب کی کوئی شرط نہیں۔ آئین کی سیکولر نوعیت کی مزید تشریح کی غرض سے صدر میڈیسن کی تحریک پر کانگرس نے ۱۷۹۲ء میں آئین میں پہلی ترمیم منظور کی جس میں طے پایا کہ "کانگرس مذہب کے قیام یا مذہب کی آزادی پر پابندی کے سلسلے میں کوئی قانون پاس نہیں کرے گی"۔ صدر جیفرسن نے اس ترمیم کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ "امریکی قوم کے اس فیصلے کو میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں جس میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ مقننہ مذہب کے قیام یا مذہبی رسوم کی ادائیگی کی ممانعت کے بارے میں کوئی قانون وضع نہیں کرے گی۔ اس طرح انہوں نے ریاست اور کلیسا کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی ہے"۔

تاریخی اعتبار سے امریکہ عہد جدید کی پہلی سیکولر ریاست ہے مگر جس سماجی انقلاب کی وجہ سے سیکولر اداروں اور فکروں کے اثرات یورپ اور ایشیا میں نمایاں ہوئے وہ فرانس کا عظیم انقلاب تھا۔ اس کے باعث یورپ میں ملوکیت، فیوڈل ازم اور کلیسا کی بالادستی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی اور دنیا سرمایہ داری نظام کے عہد میں داخل ہو گئی۔

سرمایہ داری نظام ہر اعتبار سے جاگیری نظام کی ضد ہوتا ہے۔ یہ تضاد یورپ میں اس وقت کھل کر سامنے آیا جب بین الاقوامی تجارت کے بحری راستے دریافت ہوئے۔ جاگیری عہد میں آلات پیداوار، ہل بیل، ہنسیا، ہتھوڑا، چرخہ کھڈی۔ یہی ذرائع پیداوار

(زمین) کی مانند افراد کی ذاتی ملکیت ہوتے ہیں لہٰذا زرعی اور صنعتی پیداوار بہت محدود ہوتی ہے۔ چنانچہ انگریز، ولندیزی اور پرتگال بیوپاریوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہی تھا کہ پیداوار کس طرح بڑھائی جائے۔ اُن کو ہندوستان، لنکا، جاوا، اور ملایا وغیرہ میں مسالہ جات و مصنوعات سونے چاندی کے عوض نقد خریدنی پڑتی تھیں کیونکہ مغربی مصنوعات کی مقدار بہت کم تھی۔ اور کوالٹی کے لحاظ سے بھی وہ مشرقی بازاروں میں فروخت کے قابل نہیں ہوتی تھیں۔ وہاں تو فیکٹریوں اور کارخانوں کے لئے مزدور بھی نہیں ملتے تھے کیونکہ کھیتی باڑی کرنے والے لوگ فیوڈل نوابوں کی زمینوں سے بندھے تھے۔ اُن کو شہروں میں جاکر کام کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اس کے علاوہ جاگیرداروں اور نوابوں نے تجارتی مال کی نقل و حرکت پر طرح طرح کی پابندیاں لگا رکھی تھیں۔ جن کی موجودگی میں تجارت ترقی کر ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ تھے وہ اقتصادی تضادات جو جاگیری نظام کو نیست و نابود کئے بغیر حل نہیں ہو سکتے تھے۔

مگر جاگیریت فقط پسماندہ طریقۂ پیداوار ہی کی علامت نہیں ہوتی بلکہ ایک فرسودہ ضابطۂ حیات کی نشان دہی بھی کرتی ہے۔ لوگوں کا رہن سہن، سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز، اُن کی سماجی اور اخلاقی قدریں، رسم و رواج اور تعصبات و میلانات سب جاگیری ضابطوں کے ماتحت ہوتے ہیں۔ ان ضابطوں کی گرفت معاشرے پر اتنی سخت ہوتی ہے کہ اِن کو توڑے بغیر جاگیری دور کے طریقۂ پیداوار کو بدلا نہیں جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب کے سرمایہ دار طبقوں کو مطلق العنان ملوکیت کے علاوہ جو جاگیری نظام کا مرکز تھی جاگیری عہد کے ضابطۂ حیات سے بھی لڑنا پڑا۔ سیکولرازم یعنی جمہوریت اور مساوات، آئینی اور نمائندہ حکومت، فکر و ضمیر کی آزادی، سائنسی سوچ، اور شہری حقوق کی جدوجہد جاگیریت اور سرمایہ داری کے درمیان نظریاتی جنگ ہی کی مختلف شکلیں تھیں۔ اس جنگ میں ملوکیت کے علم برداروں کی طرح کلیسا نے بھی ظلم و استبداد کا ساتھ دیا۔ اور ہر روشن خیال، خرد افروز اور ترقی پسند تحریک کی شدت سے مخالفت کی مگر تاریخ کے دھارے کو نہ ملوکیت روک سکی نہ کلیسائیت۔ فرانس میں زبردست انقلاب آیا جس نے ملوکیت، نوابیت اور کلیسا یعنی جاگیری نظام کے تینوں

ستون گرا دیے۔ اس کے بعد یورپ کے قریب قریب ہر ملک میں معاشرے اور ریاست کی تشکیل سیکولر خطوط پر ہونے لگی۔ لیکن سیکولرازم کو پوری طرح رواج پانے میں ایک صدی لگی اور مغربی قوموں نے بڑی جدوجہد کے بعد پہلی بار وہ حقوق حاصل کئے جو سیکولرازم کی جان ہیں مثلاً تحریر و تقریر کی آزادی ضمیر و فکر کی آزادی۔ پریس کی آزادی، تنظیمیں بنانے کی آزادی۔ اور اختلاف رائے کی آزادی۔ ورنہ جاگیری دَور میں تو کسی نے ان حقوق کا نام بھی نہ سُنا تھا۔

یورپ اور امریکہ میں سیکولر ریاستوں کے قیام سے لوگ لامذہب نہیں ہو گئے۔ نہ گرجا گھر ڈھئے اور نہ پادریوں کی تبلیغی سرگرمیوں میں چنداں فرق آیا البتہ ہر شخص کو پہلی بار اس بات کا موقع ملا کہ وہ دوسرے مسائل کی مانند مذہبی مسائل پر بھی بلاخوف و خطر غور کرے اور جو عقائد و رسوم خلافِ عقل نظر آئیں اُن کو رَد کر دے۔ سیکولرازم کے رواج پانے سے کلیسا کی قائم کی ہوئی خوف و دہشت کی فضا بھی ختم ہو گئی۔ کلیسائی دَور میں لوگوں کو راہ راست پر لانے کے لئے بڑی بھیانک قسم کی جسمانی ایذائیں دی جاتی تھیں اور اُن کو توبہ کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ سیکولرازم کے دَور میں یہ وحشیانہ مظالم بند کر دیئے گئے اور پادری حضرات کو بھی اپنا طرز عمل بدلنا پڑا۔ اب وہ لوگوں سے اخلاق و محبت سے پیش آنے پر مجبور ہوئے اور ڈرانے دھمکانے کے بجائے اُن کو عقلی دلیلوں سے اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرنے لگے۔

۲

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ ۲۰ مئی ۱۴۹۸ء کی وہ ساعت کبھی نہ بھولے گی جس وقت پرتگالی جہاز رانوں نے واسکوڈی گاما کی قیادت میں ساحل مالابار پر لنگر ڈالے اور کالی کٹ کے راجہ زمورن سے تجارتی تعلقات قائم کئے۔ پرتگالیوں نے جلد ہی گوا پر قبضہ کر لیا جو سلطنت بیجاپور کی اہم بندرگاہ تھی۔ اور رفتہ رفتہ دمن، دیو، سالسٹ، بسین، چول، بمبئی اور

بنگال میں ہگلی کے بھی مالک ہو گئے۔ اُنہوں نے گوا میں اپنا پریس لگایا جس میں مذہبی کتابیں چھپتی تھیں اور لوگوں کو زبردستی عیسائی بنانے لگے۔ مقامی باشندوں بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ اُن کا سلوک نہایت ظالمانہ تھا کیونکہ اُن کی آمد سے پیشتر بحرِ ہند کی تجارت صدیوں سے عربوں کے ہاتھ میں تھی۔ بالآخر وہ اپنے تجارتی حریفوں کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے۔ اور بحرِ ہند میں اُن کا عمل دخل اتنا بڑھا کہ سولھویں سترھویں صدی میں مغل شہزادوں شہزادیوں اور عمائدینِ سلطنت کو بھی حج و زیارت کے لئے پرتگالی جہازوں ہی میں سفر کرنا پڑتا تھا۔ اس کے باوجود مغلوں کو اپنی بحری طاقت بڑھانے کا خیال نہ آیا۔ وہ اُنہوں نے پرتگالیوں کی سیاسی ریشہ دوانیوں کو درخورِ اعتنا سمجھا۔ پرتگیز پادریوں نے چھاپے خانہ کا نمونہ شہنشاہ اکبر کو دکھایا تھا مگر اس دوراندیش فرماں روا نے بھی اس انقلابی ایجاد کی اہمیت و افادیت کو محسوس نہ کیا اور یہ کہہ کر ٹال دیا کہ پریس لگا تو ہمارے خوش نویسوں کی روزی ماری جائے گی۔

انگریزوں نے پرتگالیوں کے سو سال بعد ہندوستان کا رُخ کیا۔ اُنہوں نے ۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء کو لندن میں ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی۔ اُن کا تجارتی نمائندہ۔ کپتان ہاکنس ۱۶۰۸ء یہاں آیا اور جہانگیر کے دربار میں حاضر ہوا۔ مگر انگریزوں کو پانچ سال کی دوڑ دھوپ کے بعد ۱۶۱۳ء میں سورت میں فیکٹری (تجارتی کوٹھی) کھولنے کی اجازت ملی۔ آہستہ آہستہ اُنہوں نے مغل بادشاہوں سے مختلف مراعات حاصل کر لیں اور احمد آباد، بھڑوچ، آگرہ، لکھنؤ، مسولی پٹم، ہگلی، قاسم بازار، پٹنہ اور مدراس میں بھی اُن کی فیکٹریاں کھل گئیں۔ رفتہ رفتہ اُنہوں نے شاہی دربار میں بھی رسوخ پیدا کر لیا۔ ڈاکٹر برنیئر اورنگ زیب کے عہد میں بارہ سال دہلی میں رہا۔ وہ نواب دانش مند خاں کا طبیب تھا۔ برنیئر کی سرگزشت سے پتہ چلتا ہے کہ اُس نے نواب کو فرانس کے روشن خیال مفکروں بالخصوص ڈیکارٹ اور گیسنڈی کا فلسفہ بھی پڑھایا تھا مگر نئی روشنی کی یہ ٹمٹماتی لو برنیئر کے جاتے ہی بجھ گئی اور اس چراغ سے دوسرا کوئی چراغ نہ جلا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے بمبئی اور مدراس میں قدم جمانے کے بعد جلد ہی محسوس کر لیا

تھا کہ مرکزی حکومت کی کمزوری اور صوبوں کی خود مختار حکومتوں کی بدنظمیوں کی وجہ سے ملک میں جو ابتری پھیلی ہوئی ہے اُس کے پیشِ نظر تجارت کے تحفظ و فروغ کے لئے سیاسی اقتدار حاصل کرنا نہایت ضروری ہے چنانچہ سرجارج آک زنڈن گورنر سورت نے ۱۶۶۹ء میں کمپنی کے ڈائرکٹروں کو مشورہ دیا تھا کہ "حالات کا اب یہی تقاضہ ہے کہ آپ اپنی تجارت کا انتظام بزورِ شمشیر کریں" اور کمپنی نے اس تجویز پر عمل کرتے ہوئے ۱۶۸۷ء میں مدراس کے گورنر کو لکھا تھا کہ "ایسی سول اور فوجی حکومت قائم کی جانے اور دونوں شعبوں کی کفالت کے لئے آتنی آمدنی کا بندوبست کیا جائے جو ہندوستان میں ایک وسیع اور پائدار برطانوی مقبوضہ کی بنیاد بن سکے"۔ واضح رہے کہ یہ یادداشت اُس زمانے کی ہے جب شہنشاہ اورنگ زیب مدراس سے چند سو میل کے فاصلے پر دکن فتح کرنے میں مصروف تھا اور مغلیہ سلطنت بظاہر متحد و مستحکم تھی۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد سلطنت کا شیرازہ جس طرح بکھرا اُس کی جبر تنگ داستان سے ہر شخص واقف ہے۔ چنانچہ انگریزوں نے پہلے حیدرآباد دکن کا رُخ کیا اور وہاں حسب ساز شوں کے ذریعہ آصف جاہی خاندان کو ہمیشہ کے لئے اپنا تابعدار بنا لیا۔ پلاسی اور بکسر کی لڑائیوں کے بعد کمپنی بنگال، بہار اور اُڑیسہ کی بھی مالک ہو گئی اور ۱۷۶۵ء میں شاہ عالم ثانی (۱۷۵۹ء-۱۸۰۶ء) نے فرمان کے ذریعہ ان صوبوں کے دیوانی کے اختیارات کمپنی کو سونپ کر کمپنی کے قبضہ مخالفانہ کی توثیق بھی کر دی۔ تسخیرِ ہند کا عمل شروع ہو گیا۔

اس بیرونی اقتدار نے یوں تو مقبوضہ علاقوں کی معاشرتی زندگی کے سبھی شعبوں پر اثر ڈالا لیکن روایتی تہذیب و تمدن کے تین عناصر خاص طور پر متاثر ہوئے (۱) عدالتی نظام (۲) تعلیمی نظام (۳) فکری اور اعتقادی نظام۔

مغلوں کے عہد میں حکومت کا نظم و نسق دیوانی اور نظامت دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ محکمۂ دیوانی کے سپرد مالگذاری اور محصولات کی وصولی تھی اور اُن مقدمات کا فیصلہ جن کا تعلق وراثت، زمینوں کے جھگڑے، لین دین کے معاہدوں اور شادی بیاہ سے ہوتا

تھا۔ دیوانی کے مالیاتی شعبوں میں اکثریت ہندو کائستھوں کی تھی جن کو فارسی آتی تھی اور جو حساب کتاب میں بھی ماہر تھے مسلمان عموماً ان پیشوں کو حقارت سے دیکھتے تھے۔ اس طرزِ عمل کا خمیازہ اُن کو انگریزوں کے عہد میں بھگتنا پڑا۔ دیوانی عدالتوں میں ہندوؤں کے مقدموں کے فیصلے دھرم شاستر کی رُو سے پنڈت کرتے تھے اور مسلمانوں کے فیصلے شریعت کے مطابق قاضی۔ ناظم دراصل صوبے کا گورنر ہوتا تھا۔ شاہی فوج اُس کے ماتحت تھی۔ صوبے میں امن وامان قائم رکھنا، شاہی قوانین کو نافذ کرنا اور نظم ونسق کی نگرانی کرنا اُسی کی ذمہ داری تھی۔ فوجداری کے قوانین (قتل، ڈاکہ، چوری، بلوہ فساد وغیرہ) جو حنفی فقہ پر مبنی تھے ہندو مسلمان دونوں کے لئے یکساں تھے۔ لہٰذا فوجداری عدالتوں کے حاکم مسلمان ہوتے تھے۔ اور فوجداری کے دوسرے محکموں میں بھی اکثریت مسلمانوں کی ہوتی تھی۔

جہاں تک تعلیمی نظام کا تعلق ہے، ۱۸ویں صدی میں ہندوستان کیا دنیا کے کسی حصے میں بھی رعایا کی تعلیم ریاست کی ذمہ داری نہیں سمجھی جاتی تھی۔ ہندوؤں کے راج میں راجے مہاراجے اور دھن دولت والے پاٹھ شالوں کو جو عموماً مندروں سے ملحق ہوتے تھے زمینیں دان میں کر دیتے تھے۔ تاکہ پاٹھ شالوں کا خرچ چلتا رہے۔ ان کے علاوہ کاشی، متھرا، ہردوار اور دوسری تیرتھ گاہوں میں بڑے بڑے وِدوان پنڈت اور سادھو سنت بھی تھے جو اپنے چیلوں کو وید، پُران، بھگوت گیتا اور دھرم شاستر کی شکسا دیتے تھے۔ مسلمان بادشاہوں کی پُرانی روایت بھی یہی تھی۔ وہ ممتاز علما اور معلّمین کو مکتبوں، مدرسوں کے مصارف کی خاطر "مددِ معاش" کے طور پر زمینیں دے دیتے تھے۔ (ایک اندازے کے مطابق صوبۂ ٹھٹھہ کی تقریباً ایک تہائی زمینیں علما کو مفت ملی ہوئی تھیں) علم دوست شہزادے اور اُمرا بھی اپنے خرچ سے مدرسے قائم کرتے رہتے تھے۔ صوفیائے کرام کے اپنے حلقے اور دائرے تھے جن میں مُریدوں کی تعلیم وتربیت اور کھانے رہنے کا انتظام مفت تھا۔ پہلا سرکاری مدرسہ سلطان شہاب الدین غوری نے ۱۱۹۱ء میں اجمیر میں قائم کیا تھا۔ پھر بختیار خلجی نے بنگال میں بہت سے مدرسے کھولے۔ سلطان التتمش نے ۱۲۲۷ء میں اُچھ میں اور ۱۲۳۷ء

میں دہلی میں مدرسے قائم کئے[۲۴] مغلوں کے دَور میں ملتان، ٹھٹھہ، سیالکوٹ، جونپور پٹنہ اور دہلی تعلیم کے بڑے مرکز تھے لیکن شاید ہی کوئی شہر یا بستی ایسی تھی جہاں مدرسے اور مکتب موجود نہ ہوں۔

مسلمانوں کے عہد میں ذریعہ تعلیم فارسی تھا۔ مکتبوں میں حروف ہجا کی پہچان سکھائی جاتی تھی، لکھنے کی مشق لکڑی کی تختیوں پر سرکنڈے کے قلم اور چاول یا گیہوں کو جلا کر گھر کی بنی ہوئی سیاہی سے ہوتی تھی۔ لہٰذا تعلیم کے مصارف برائے نام تھے۔ حروف شناسی کے بعد بچوں کو بغدادی قاعدہ کی گردانیں اور پارۂ عم کی چند سورتیں یاد کرادی جاتی تھیں اور فارسی کے کچھ مصادر، الفاظ بھی پڑھا دیئے جاتے تھے۔ شاید گلزار دبستان قسم کی کوئی آسان کتاب تھی۔ مدرسوں کے نصاب میں جہاں اعلیٰ تعلیم کا انتظام تھا فقہ، اصول فقہ، بلاغت نحو، علم کلام، تصوف اور تفسیر کی کتابیں داخل تھیں جو صدیوں پہلے ایران و عراق میں لکھی گئی تھیں۔ زیادہ زور فقہ پر دیا جاتا تھا کیونکہ عدالتوں میں ملازمت کے لئے فقہ سے واقفیت ضروری تھی۔ اکبر کے عہد میں جہاں اور بہت سی اصلاحیں ہوئیں وہاں پرانے تعلیمی نظام کے پہلو بہ پہلو سیکولر تعلیم کو رواج دینے کی کوشش بھی کی گئی۔ چنانچہ مفتی انتظام اللہ شہابی آئین اکبری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اکبر کے عہد میں ایسی درسگاہیں بھی تھیں جن میں "طالب علموں کو ریاضی، اخلاقیات، زراعت، مساحت، جیومیٹری، نجومیات، اصول حکومت، طب، منطق، کمسٹری، طبیعیات اور تاریخ کی تعلیم دی جاتی تھی"[۲۵] ڈاکٹر عابد حسین لکھتے ہیں کہ

> "اکبر نے بہت سے سرکاری اسکول کھولے جن میں ہندو اور مسلمان لڑکوں کو ایک ساتھ فارسی میں تعلیم دی جاتی تھی۔ مضامین خالص

---

۲۴ 24. Dr. Ziaul Haq Muslim Religious Education in Indo-Pakistan, Islamic Studies, P 277 Islamabad, 1975

۲۵ 25. History of Freedom Movement, Vol II, P. 172, Karachi 1960

سیکولر ہوتے تھے مثلاً منطق، اخلاقیات، جیومیٹری، طبیعیات، طب
سیاسیات، تاریخ اور فارسی ادب" ۲۶؎

مگر سیکولر تعلیم کی پالیسی کو اکبر کے جانشینوں نے ترک کر دیا اور روایتی تعلیم پھر سے رائج ہو گئی۔ البتہ اورنگ زیب کو مروجہ نصاب تعلیم کی فرسودگی کا احساس تھا۔ اس کا اندازہ اورنگ زیب کی ایک تقریر سے ہوتا ہے جو اُس نے اپنے سابق استاد کے روبرو کی تھی۔ موصوف اورنگ زیب سے جب وہ بادشاہ ہوا تو اپنی حق اُستادی کا انعام مانگنے آئے تھے۔ اورنگ زیب نے اُن کی جغرافیہ دانی اور کمال علم تاریخ کا پول کھولنے کے بعد کہا کہ

> کیا اُستاد کو لازم نہ تھا کہ دنیا کی ہر ایک قوم کے حالات سے مجھے مطلع کرتا مثلاً اُن کی حربی قوت سے، اُن کے وسائل آمدنی اور طرزِ جنگ سے، اُن کے رسم و رواج اور مذاہب اور طرزِ حکمرانی سے اور اُن خاص خاص اُمور سے جن کو وہ لوگ اپنے حق میں زیادہ مفید سمجھتے ہیں بہ تفصیل مجھ کو آگاہ کرتا اور علم تاریخ مجھے ایسا سلسلہ وار پڑھاتا کہ میں ہر ایک سلطنت کی جڑ بنیاد اور اسباب ترقی و تنزل اور اُن حادثات و واقعات اور غلطیوں سے سے واقف ہو جاتا جن کے باعث اُن میں ایسے بڑے بڑے انقلابات آتے رہے ہیں...... اور باوجودیکہ بادشاہ کو اپنی ہمسایہ قوموں کی زبانوں سے واقف ہونا ضروری ہے بجائے ان کے آپ نے مجھ کو عربی لکھنا پڑھنا سکھایا اگرچہ اس زبان کے سیکھنے میں میری عمر کا ایک بڑا حصہ ضائع ہوا...... آپ نے بغیر یہ سوچے کہ ایک شہزادے کو زیادہ تر کن کن علوم کی ضرورت ہے فقط صرف و نحو اور ایسے فنون کی تعلیم کو جو ایک قاضی کے لئے ضروری ہیں مقدم جانا اور ہماری جوانی کے ایام کو بے فائدہ اور لفظی بحثوں کے پڑھنے پڑھانے میں ضائع کیا" ۲۷؎

---

26. Dr. Abid Husain : The National Culture of India, P. 71. Bombay, 1961 ۲۶؎

۲۷؎۔ عہد اورنگ زیب از میر نثر مترجمہ خلیفہ عبدالحسین صفحات ۲۳۱، ۲۳۲ کراچی ۱۹۵۰ء

مگر افسوس ہے کہ ملا نظام الدین سہالوی نے جو نصاب تعلیم سلطان ذی فہم کے حکم سے مرتب کیا (درس نظامی) اُس میں اُن علوم کا ذکر تک نہیں جن کی افادیت پر سلطان نے اپنی تقریر میں زور دیا تھا بلکہ انہیں علوم پر اصرار کیا گیا جن پر سلطان معترض تھا۔ مثلاً منقولات میں تجوید یا قرأت، تفسیر، حدیث، فقہ اور اُصول فقہ، فرائض (وراثت) کلام اور تصوف۔ معقولات میں صرف و نحو، بلاغت، عروض، منطق، حساب، ہیئت، حکمت اور مناظرہ۔ مفتی انتظام اللہ شہابی اس نظام تعلیم کے بڑے ثناخواں ہیں مگر اُن کو بھی دبی زبان سے یہ اعتراف کرنا پڑا کہ "ہر چند کہ اسلام نے قرون وسطیٰ میں عظیم مفکر اور سائنسدان پیدا کئے مگر (درس نظامی میں) ان علوم کی عدم موجودگی حیرت انگیز ہے۔ اسلام کے ممتاز مفکر — الکندی، الفارابی، ابن سینا، البیرونی اور ابن رشد وغیرہ سرے سے غائب ہیں"۔ لُطف یہ ہے کہ ہمارے دینی مدارس میں ابھی تک اِسی قسم کا فرسودہ نصاب رائج ہے۔

اسلامی فکر میں جمود کا بنیادی سبب تو یہ تھا کہ خود مسلم معاشرہ جمود کا شکار ہو گیا تھا۔ تلاش و تحقیق، تجربہ اور مشاہدہ، اجتہادی تفکر اور نامعلوم کو معلوم کرنے کے شوق کی پرانی روایت کو علماء دین اور صوفیاء کرام نے نہ صرف ترک کر دیا تھا بلکہ وہ قرون وسطیٰ کے روشن خیال مسلمان مفکروں کو کافر، ملحد اور زندیق کے لقب سے نوازتے تھے اور اُن کی تصنیفات کا مطالعہ ممنوع کر دیا گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ارباب علم منقولات کی دلدل میں ایسے پھنسے کہ پھر کبھی نکل نہ سکے۔ بس مکھی پر مکھی مارتے رہے۔ پُرانی کتابوں کی شرحیں اور حاشیے لکھتے رہے بلکہ حاشیوں پر حاشیے۔ نہ اپنی بصیرت و آگہی میں اضافہ کیا نہ بدنصیب قوم کی اور بقول اقبال یہ اُمت خرافات میں کھو گئی۔ چنانچہ گذشتہ سات سو سال کے طویل عرصے میں مسلمان حکومتوں کی سرپرستی کے باوصف کسی بزرگ کے قلم سے ایسی ایک طبع زاد تصنیف بھی نہ نکلی جس کو ہم آج دنیا کے سامنے فخر سے پیش کر سکیں۔ اس گروہ زُہاد سے اگر کوئی ثابت نکلا ہے تو وہی "رندان قدح خوار" جن کا شعری کلام ہنوز زندہ ہے۔

تاریخ کی کتابیں بیشمار لکھی گئیں لیکن اُن کے لکھنے والے بھی فلسفہ تاریخ سے نابلد تھے۔ وہ واقعات نقل ہی درج کرتے رہے۔ اُن کو ابن خلدون کی ہوا تک نہیں لگی ہے۔ کیا عجب کہ انہوں

نے ابن خلدون کا نام بھی نہ سنا ہو۔

شاہ عالم نے دیوانی اختیارات کمپنی کو سونپتے وقت جو تحریر شرط لکھ دی تھی کہ صوبوں کے نظم و نسق میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی یعنی دفتری زبان فارسی ہوگی اور عدالتوں کا پرانا نظام بھی بدستور قائم رہے گا لہٰذا گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز (۱۷۷۴ء۔ ۱۷۸۵ء) کو ایسے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی فوراً ضرورت پڑی جو ملکی قوانین سے بخوبی واقف ہوں۔ چنانچہ اُس نے اپنی یادداشت میں لکھا کہ

"ہماری پالیسی ہے کہ دیوانی اور فوجداری کی اہم اسامیوں پر اور پولیس کے عہدوں پر مسلمانوں کو مقرر کیا جائے۔ یہ فرائض عربی اور فارسی زبانوں اور اسلامی قوانین کی مخصوص اور جامع لیاقت ہی سے ادا ہو سکتے ہیں ۔ مگر یہ علوم اور علما آہستہ آہستہ ناپید ہوتے جا رہے ہیں ...... یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلم اقتدار کے زوال کے بعد مسلمان خاندان تباہ و برباد ہو گئے ہیں اور وہ اپنی اولاد کو تعلیم دینے کی استطاعت بھی نہیں رکھتے"[۲۸]

وارن ہیسٹنگز نے "اِن اسباب کی بنا پر ۱۷۸۱ء میں مدرسہ عالیہ (کلکتہ مدرسہ) قائم کیا تاکہ مسلمانوں کو نظم و نسق میں شرکت کا پورا پورا موقع ملے"۔ اُس نے ضلع ۲۴ پرگنے کی کچھ آراضی بھی مدرسے کے مصارف کے لئے مخصوص کر دی۔

وارن ہیسٹنگز ہندوستان میں عرصے سے مقیم تھا۔ وہ فارسی زبان پر پورا عبور رکھتا تھا اور مشرقی علوم و اُلسنہ کا بڑا دلدادہ تھا۔ اُس کی خواہش تھی کہ برطانوی طرزِ حکومت اور ہندوستانی تہذیب میں کسی نہ کسی طرح مفاہمت اور ہم آہنگی پیدا کی جائے تاکہ کمپنی کو اپنے مقاصد کے حصول میں دشواری نہ ہو۔ اُن دنوں اتفاق سے کمپنی کے اعلیٰ عہدیداروں میں بھی ایک حلقہ ایسا تھا جو وارن ہیسٹنگز کے خیالات سے اتفاق کرتا تھا اور مشرقی علوم اور زبانوں سے گہری دلچسپی رکھتا تھا مثلاً سر ولیم جونس جج سپریم کورٹ، سر چارلس ولکنس،

---

[۲۸] ۔ منقول از ڈاکٹر ضیاء الحق ص ۲۷۹

نے تھے نیل بال ہیڈ، سر جان شور جو بعد میں گورنر جنرل ہوا، فرانسس گلیڈون، جان کارنگ،
جان گل کرسٹ، جوناتھن ڈن کن اور ولیم جیمز پرنس وغیرہ

سر ولیم جونس ۱۷۸۳ء میں سپریم کورٹ کا جج ہو کر کلکتہ آیا اور دس سال بعد، ۴۸ سال کی عمر میں وہیں وفات پا گیا۔ اُس نے ہندوستان آنے سے پہلے ہی عبرانی، یونانی، لاطینی، عربی، فارسی، فرانسیسی، ہسپانوی، اطالوی، جرمن، ترکی اور چینی زبانوں میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ یہاں آ کر اُس نے سنسکرت بھی سیکھ لی اور اپنے لسانی نظریوں کی بدولت دنیا میں بڑا نام پیدا کیا (اُس نے زبانوں کے تقابلی مطالعے سے یہ ثابت کیا کہ سنسکرت فارسی اور یورپین زبانیں ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں) اُس نے فقہ کی کتاب السراجیہ اور دھرم شاستر کا انگریزی میں ترجمہ شائع کیا اور ۱۷۸۴ء میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال قائم کی جو اب تک موجود ہے۔ سوسائٹی کا مقصد اُس کے بقول "انسان اور نیچر اور نیچر جو کچھ ایشیا میں پیدا کرتا ہے اور انسان جو کچھ اپنی محنت سے تخلیق کرتا ہے اس کا مطالعہ اور تحقیق تھا" ۲۹؎

سر چارلس ولکنس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے بنگالی، اردو اور ناگری کے ٹائپ بڑی محنت و کاوش سے خود تیار کئے۔ فورٹ ولیم کالج کی اُردو کتابیں اُسی کے بنائے ہوئے نستعلیق ٹائپوں میں چھپتی تھیں۔ سر چارلس اور دوسرے مستشرقین نے جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا، ادب، گرامر، لغت، قانون، تاریخ، فقہ اور مذہب کی بہ کثرت کتابیں فارسی، عربی اور سنسکرت سے انگریزی میں ترجمہ کیں اور یہاں کے معاشرتی حالات کے بارے میں انگریزی میں طبع زاد کتابیں بھی لکھیں۔

وارن ہسٹینگز اور سر ولیم جونس وغیرہ کی مشرقی علوم اور زبانوں سے دلچسپی نقطہ کمپنی کی انتظامی ضرورتوں کا تقاضہ نہ تھی بلکہ یہ دلچسپی ۱۸ویں صدی کے انقلابی عہد میں اہلِ مغرب کا مزاج بن گئی تھی۔ پرتگالی، برطانوی، فرانسیسی کمپنیوں کی تجارتی سرگرمیوں کے تذکرے،

۲۹؎ 29. S.N. Mukherji : Sir William Jones, P. 82, Cambridge, 1968

کے مشرقی منڈیوں کی تلاش میں ان کمپنیوں کے گماشتوں کی دوڑ دھوپ کی داستانوں نے سیاحوں اور طالع آزماؤں کے سفرناموں نے مشرق کی دولت مندی کے چرچوں نے اور یہاں کی پُراسرار تہذیب کی جھوٹی سچی حکایتوں نے مغرب کے دلوں اور دماغوں کو مسحور کر دیا تھا۔ فارسی کی تقلید میں گوئٹے کا "دیوان"، شیلی کی "اسلام کی بغاوت" بائرن کی نظمیں، سوئفٹ کا "گلیورز کا سفر" (۱۷۲۶ء) رابن سن کروسو کے تجربات، اور گویا کی تصویریں، والٹیر کے افسانے اور فرانسیسی روشن خیالوں کی تصنیفات، اسلامی مفکرین کی تحسین و تعریف غرضیکہ یوں محسوس ہوتا تھا گویا یورپ والوں کو ایک نئی دنیا ایک نئی حقیقت کا انکشاف ہو گیا ہے۔ وارن ہیسٹنگز، سر ولیم جونس اور کمپنی کے بیشتر حکام اسی مشرق زدہ ذہنیت کے پروردہ تھے۔ ۱۸ ویں صدی میں کمپنی کی انتظامی پالیسی پر انہیں عناصر کا غلبہ رہا۔

لیکن ان "اورینٹلسٹوں" کے مقابل کمپنی کے ملازمین میں ایک حلقہ اُن افراد کا تھا جو ہندوستانیوں کو انگریزی زبان اور ولائتی تہذیب کے ذریعہ "مہذب" بنانے پر مُصر تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہاں برطانوی قوانین نافذ ہوں، یہاں کی سرکاری زبان انگریزی کر دی جائے اور اسکولوں میں انگریزی پڑھائی جائے۔ ان خیالات کا اظہار سب سے پہلے کمپنی کے ایک افسر چارلس گرانٹ نے کیا۔ اُس کی رائے میں "سماجی بُرائیاں اور اخلاقی خرابیاں نتیجہ ہیں گہری جہالت اور وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی لاعلمی کا اور یہ نقص انگریزی تعلیم ہی سے دور ہو سکتا ہے۔" اُس کی بات جب یہاں کسی نے نہ سُنی تو اُس نے انگلستان جا کر اپنی تجویزیں کمپنی کے ڈائرکٹروں کے رُوبرو پیش کیں مگر کمپنی کے ڈائرکٹر بھی ہندوستانیوں کو انگریزی تعلیم دلوانے کے سخت خلاف تھے چنانچہ ۱۷۹۲ء میں جب انگریزی کے ٹیچروں کو ہندوستان بھیجنے کی تجویز رکھی گئی تو ایک ڈائرکٹر نے کہا کہ "ہم اپنی حماقت سے امریکہ میں اسکول اور کالج کھول کر ملک کھو چکے ہیں اور اب ہم اس حماقت کو ہندوستان میں دہرانا نہیں چاہتے۔"

سنہ - سید احمد خاں از خلیق احمد نظامی ص ۱۲ ۱۹۷۱ء نئی دہلی بحوالہ جے۔ سی۔ مارشمین

البتہ انگریز پادری اور انگریزی زبان کے اخبار جو وارن ہسٹینگز کے سخت مخالف تھے انگریزی زبان کی ترویج و اشاعت کے حق میں تھے۔ پادریوں کا انگریزی زبان میں تعلیم دینے کا تجربہ بمبئی اور مدراس میں کامیاب ہو گیا تھا لہٰذا انہوں نے بنگال میں بھی جگہ جگہ اپنے اسکول کھولے، چھاپے خانے قائم کئے اور تبلیغی کتابیں شائع کرنے لگے۔ انہوں نے سی رام پور میں کاغذ سازی کا کارخانہ بھی قائم کیا۔ یہ کاغذ سستا اور اچھا ہوتا تھا اس لئے اخباری ضروریات کے لئے موزوں تھا۔ پادری انگریزی زبان کے ساتھ مغربی علوم کی بھی تعلیم دیتے تھے مسلمانوں نے جو بجا طور پر انگریزوں سے ناراض تھے اور اُن کے ہر اقدام کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے مشن اسکولوں میں پڑھنا یا انگریزی سیکھنا گوارا نہیں کیا۔ مگر ہندو لڑکے انگریزی اسکولوں میں پڑھنے لگے۔ یہ تعلیم آگے چل کر اُن کے بہت کام آئی اور وہ مسلمانوں پر سبقت لے گئے۔

اخبار کو معاشرہ کا چوتھا ستون کہا جاتا ہے۔ کیونکہ لوگوں کے سیاسی اور سماجی شعور کی تشکیل میں اخبار بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جابر حکمراں پریس سے ہمیشہ خائف رہتے ہیں اور سب سے پہلے پریس کی آزادی سلب کرتے ہیں۔ ہندوستان میں پہلا اخبار جو انگریزی میں تھا۔ ۱۷۸۰ء میں ہکی نامی ایک انگریز نے کلکتہ سے شائع کیا تھا۔ اس ہفتہ وار اخبار کا نام "بنگال گزٹ" تھا (اس سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی نے سرکاری طور پر ایک انگریزی اخبار "انڈیا گزٹ" کے نام سے ۱۷۷۴ء جاری کیا تھا مگر اس میں فقط کمپنی کی خبریں چھپتی تھیں) ہکی ایسٹ انڈیا کمپنی اور اُس کے ملازمین کا جانی دشمن تھا اور اُن کی سیہ کاریوں اور زر اندوزیوں کے قصے خوب نمک مرچ لگا کر بیان کرتا تھا اسی کی پاداش میں وہ دو بار قید ہوا اور بالآخر ملک بدر کر دیا گیا۔ بنگال گزٹ کے بعد جلد ہی کلکتہ، بمبئی اور مدراس سے تقریباً ایک درجن ہفت روزہ انگریزی اخبارات شائع ہونے لگے۔ ان اخباروں میں ہندوستان کے علاوہ سمندر پار کی خبریں بھی ہوتی تھیں جو لندن سے آنے والے اخباروں سے نقل کی جاتی تھیں۔ انگریزی اخباروں کے اجراء سے ہندوستانیوں میں اخبار بینی کا شوق اور اخبار نویسی کا مذاق پیدا ہوا۔ اور وہ

بین الاقوامی حالات سے بھی واقف ہوئے گے (یاد رہے کہ یہ زمانہ انقلاب فرانس کا تھا وارن ہسٹنگز اور لارڈ کارنوالس کے زمانے میں اگرچہ اکا دکا آزاد خیال انگریز ایڈیٹروں پر سختیاں ہوئیں اور وہ ملک بدر کئے گئے لیکن پریس آزاد رہا مگر لارڈ ویلزلی نے انقلاب فرانس کے حالات سے خوف زدہ ہو کر خود اپنے ہم وطنوں کے پریس کی آزادی چھین لی اور ۱۷۹۹ء میں سخت سنسر شپ نافذ کر دی۔ انگریز ایڈیٹروں نے بہتیرا احتجاج کیا اور پارلیمنٹ میں سنسر شپ کے خلاف تقریریں بھی ہوئیں مگر سنسر شپ قائم رہی البتہ لارڈ ہسٹنگز (۱۸۱۳ء - ۱۸۲۳ء) نے ۱۸۱۷ء میں سنسر شپ ختم کر دی۔ تب ہندوستانیوں کو بھی دیسی زبانوں میں اخبار جاری کرنے کا حوصلہ ہوا سب سے پہلے دیسی اخبار بنگلہ زبان میں نکلے۔ اور ان کی تعداد میں بہت جلد اضافہ ہو گیا چنانچہ ۱۸۳۰ء میں کلکتہ سے بنگلہ کے تین روزنامے، ایک دو روزنہ، دو تین روزہ، سات ہفت روزہ دو پندرہ روزہ اور ایک ماہانہ پرچے شائع ہوتے تھے [۳۱]

فارسی میں پہلا اخبار ۱۸۲۲ء میں شائع ہوا اور اردو میں ایک سال بعد۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ فارسی کے پہلے اخبار "مراۃ الاخبار" کے مالک و ایڈیٹر راجہ رام موہن رائے اور اردو کے پہلے اخبار "جام جہاں نما" کے ایڈیٹر و مالک منشی سدا سکھ دونوں غیر مسلم تھے۔ راجہ رام موہن رائے نے مراۃ الاخبار کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ انگریزوں کے اخبار تو موجود ہیں مگر۔

> ان سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو انگریزی سے واقف ہیں لیکن ہندوستان کے سب حصوں کے لوگ انگریزی نہیں جانتے۔ جو انگریزی سے نابلد ہیں وہ یا تو انگریزی دانوں سے اخبار پڑھوا کر سنتے ہیں یا خبروں سے بالکل بے خبر رہتے ہیں۔ اس خیال سے مجھ حقیر کو فارسی میں ایک ہفتہ وار اخبار جاری کرنے کی خواہش ہوئی ہے۔ دیسی برادری

۳۱۔ 31. W.H. Cary : The Good Old Days of Hon'ble John Company, Vol. I, P. 236, Simla, 1882

کے سب معززین اس زبان سے واقف ہیں۔ اس اخبار کی ذمہ داری لینے سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ عامتہ الناس کے سامنے ایسی چیزیں پیش کی جائیں جن سے اُن کے تجربوں میں اضافہ اور اُن کی معاشرتی ترقی ہو سکے۔ ارباب حکومت کو رعایا کا صحیح حال بتلایا جائے اور رعایا کو اُن کے حاکموں کے قانون اور رسم و رواج سے آگاہ کیا جائے تاکہ حکمرانوں کو اپنی رعایا کی تکلیفیں دور کرنے کا موقع ملے اور رعایا کی دادرسی ہو سکے۔"۳۲

راجہ رام موہن رائے کمپنی کے عہد میں برصغیر کے سب سے بڑے مصلح قوم عربی فارسی کے عالم اور مغربی تمدن کے پاسدار تھے۔ وہ ۲۲ مئی ۱۷۷۴ء کو رادھا نگر بنگال میں پیدا ہوئے۔ اُن کا خاندان پانچ پشتوں سے صوبے کے مغل حاکموں سے وابستہ تھا۔ رواج کے مطابق اُن کی ابتدائی تعلیم بھی عربی فارسی میں ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے اُن کو پٹنہ بھیج دیا گیا جو اُن دنوں اسلامی تعلیمات کا بڑا مرکز تھا۔ وہاں اُنہوں نے قرآن شریف، فقہ، اسلامی دینیات اور علم مناظرہ پر عبور حاصل کیا نیز اُن کو ارسطو کے عربی تراجم اور معتزلہ کی تصانیف کے مطالعے کا بھی موقع ملا۔ اُنہوں نے صوفیوں کی کتابیں بھی پڑھیں اور وحدت الوجود کے فلسفہ سے اتنے متاثر ہوئے کہ بُت پرستی کی مخالفت اُن کی زندگی کا مشن بن گئی۔ اُنہوں نے سولہ برس کے سن میں ایک کتاب "تحفتہ الموحدین" فارسی میں لکھی (دیباچہ عربی میں تھا) اور ہندو بُت پرستی پر سخت اعتراضات کئے۔ اتفاق سے کتاب کے مسودہ پر اُن کے باپ کی نظر پڑی تو وہ آگ بگولہ ہو گئے اور کشیدگی اتنی بڑھی کہ رام موہن رائے کو گھر چھوڑنا پڑا۔ اس کے باوجود رام موہن رائے کو باپ کے جذبات کا اتنا احترام تھا کہ رسالے کو اُن کی زندگی میں شائع نہیں کیا۔

۳۲ہ ہندوستانی اخبار نویسی مصنفہ محمد عتیق صدیقی صہ ۱۵۱ انجمن ترقی اردو علی گڑھ ۱۹۵۷ء

راجہ رام موہن رائے کو برطانوی اقتدار سے سخت نفرت تھی لیکن کلکتہ میں قیام کے دوران جب اُن کو انگریزی قوانین اور طریقِ حکومت کے مطالعہ کا موقع ملا تو انہوں نے محسوس کر لیا کہ "غیر ملکی غلامی کا طوق" انگریزی تعلیم اور مغربی علوم کی تحصیل کے بغیر گلے سے اتارا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا انہوں نے انگریزی زبان سیکھی جس سے واقفیت کے باعث مغربی علم و حکمت کے دروازے اُن پر کھل گئے۔ وہ پندرہ برس تک کمپنی سے وابستہ رہے مگر ۱۸۱۵ء میں پنشن لے لی اور سارا وقت سماجی کاموں میں صرف کرنے لگے۔ وہ ذات پات کی تفریق، بُت پرستی اور ستی کے بے حد خلاف تھے چنانچہ ہندو مذہب میں اصلاح کی غرض سے انہوں نے برہمو سماج کی تنظیم قائم کی اور ہندو معاشرے میں جو برائیاں پیدا ہو گئی تھیں اُن کے خلاف سخت مہم شروع کر دی۔

۱۸۱۳ء میں جب پارلیمنٹ نے کمپنی کے چارٹر کی تجدید کی تو "ادب کی بحالی اور ترقی اور صاحبِ علم ہندوستانیوں کی حوصلہ افزائی اور برطانوی مقبوضات ہند کے باشندوں کو سائنسی علوم سے روشناس کرنے اور ان کو فروغ دینے کی خاطر ایک لاکھ روپیہ سالانہ کی رقم مخصوص کر دی گئی۔" مگر کمپنی کے حکام نے دس سال تک اس ہدایت کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ البتہ ۱۸۲۳ء میں جب پہلی بار تعلیمی کمیٹی بنی تو اُس نے ۱۸ ویں صدی کی روایت کے مطابق یہ رقم مشرقی علوم و اَلسنہ پر خرچ کرنا چاہی اور کلکتہ مدرسہ کی طرز پر ایک سنسکرت کالج قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ راجہ رام موہن رائے نے اس تجویز کی شدت سے مخالفت کی۔ انہوں نے گورنر جنرل لارڈ ایمہرسٹ کے روبرو جو محضر پیش کیا وہ ترقی پسند ہندوستانی حلقوں کی نئی ذہنیت کی پوری پوری ترجمانی کرتا ہے۔ راجہ رام موہن رائے (راجہ کا خطاب اُن کو اکبر شاہ ثانی نے دیا تھا مگر انگریزوں نے اس خطاب کو کبھی تسلیم نہیں کیا) نے اس تاریخی دستاویز میں لکھا تھا کہ "سنسکرت کالج کے طالب علم وہی دو ہزار برس پرانی دقیانوسی باتیں سیکھیں گے جن میں رعونت آمیز اور کھوکھلی موشگافیوں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اگر برطانوی پارلیمنٹ کی منشا ہے کہ یہ ملک اندھیرے میں رہے تو سنسکرت نظامِ تعلیم سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا لیکن حکومت کا مقصد چونکہ دیسی آبادی کی اصلاح و ترقی ہے لہٰذا ایسے

کسی روشن خیال اور آزاد نظامِ تعلیم کو فروغ دینا زیادہ مناسب ہوگا جس میں ریاضی، نیچرل فلسفہ کیمسٹری علم الابدان اور دوسری مفید سائنسیں پڑھائی جائیں۔ مجوزہ رقم سے یورپ کے تعلیم یافتہ لائق اور فاضل استاد ملازم رکھے جائیں، اور کالج کو ضروری کتابیں، آلات اور دوسری چیزیں فراہم کی جائیں"۔

لارڈ ایمہرسٹ نے راجہ رام موہن رائے کی یہ تجویزیں نامنظور کر دیں اور سنسکرت کالج قائم ہوگیا۔ لیکن بعض روشن خیال افراد نے مشنریوں کی مدد سے مغربی طرز کے کئی اسکول اور کالج کھولے اور انگریزی کتابوں کی اشاعت و فروخت کی غرض سے ایک "اسکول بک سوسائٹی" بھی قائم کی۔ بک سوسائٹی نے دو سال کے عرصے میں ۳۱ ہزار سے زائد انگریزی کتابیں فروخت کیں جب کہ سرکاری کمیٹی تین برس میں عربی اور سنسکرت کی اتنی جلدیں بھی فروخت نہ کر سکی کہ طباعت کے اخراجات تو الگ رہے گودام کا دو مہینہ کا خرچ ہی ادا ہو جاتا۔ برصغیر میں افکار تازہ کی نمود اگر سب سے پہلے بنگالیوں میں ہوئی تو یہ ان کی صحافتی اور تعلیمی سرگرمیوں ہی کا فیض تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ لوگ اندھیرے سے نکلنے کے لئے بیتاب ہیں اور پرانے علوم و السنہ اُن کے ذوق کی تسکین کرنے سے قاصر ہیں۔

اسی اثنا میں انگریزوں نے ۱۸۰۳ء میں آگرہ اور دہلی کو بھی فتح کر لیا۔ اکبر شاہ ثانی کو کمپنی سے آٹھ لاکھ سالانہ پنشن ملنے لگی۔ اور دہلی میں برطانوی عملداری شروع ہوگئی۔ لہٰذا وہاں بھی انگریزی زبان اور مغربی علوم کا چرچا ہونا قدرتی بات تھی۔ یہ خدمت دہلی کالج نے سرانجام دی۔ دہلی کالج ابتدا میں روایتی طرز کا ایک مدرسہ تھا جس کو نظام الملک آصف جاہ کے بیٹے نواب غازی الدین نے ۱۷۹۲ء میں قائم کیا تھا۔ ۱۸۲۵ء میں کمپنی کی تعلیمی کمیٹی کی ہدایت پر مدرسہ کو کالج میں تبدیل کر دیا گیا۔ پانچ سو روپیہ ماہانہ امداد مقرر ہوئی اور ایک انگریز مسٹر ٹیلر دو سو روپے ماہانہ تنخواہ پر اس کے پرنسپل بنائے گئے۔ تین سال بعد دہلی کے ریذیڈنٹ کمشنر سرچارلس مٹکاف کی سفارش پر انگریزی جماعت کا بھی اضافہ ہوگیا۔ مولوی عبدالحق مرحوم کے بقول کالج میں انگریزی کے اضافے

سے لوگوں میں جو بےچینی پھیلی اور ہندو مسلمان دونوں نے اس کی مخالفت کی۔ دونوں بزرگوں کا یہی خیال تھا کہ یہ ہمارے نوجوانوں کے مذہب بگاڑنے اور اندر ہی اندر عیسائی مذہب کے پھیلانے کی ترکیب ہے۔ یہی مشکل بنگال میں بھی آئی تھی لیکن وہاں راجہ رام موہن رائے جیسا روشن خیال اور زبردست رہنما موجود تھا سو وہاں یہ آندھی اٹھی تو سہی مگر چند ہی روز میں بیٹھ گئی۔ وہاں مخالفت برہمنوں سے شروع ہوئی تھی تو یہاں مسلمان پیش پیش تھے..... مسلمان طلبا کی تعداد انگریزی شعبے میں اکثر کم رہی[33] سچ ہے اجداد کے فکری جمود کی سزا اولاد کو کئی نسلوں تک ملتی رہتی ہے۔ مولوی عبدالحق مرحوم دہلی کالج کی روز افزوں مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اگرچہ ابتدا میں انگریزی جماعت کے قیام کی بہت کچھ مخالفت ہوئی مگر تین ہی سال (یعنی ۱۸۳۱ء میں) انگریزی پڑھنے والوں کی تعداد تین سو تک پہنچ گئی۔ یہ زمانے کی ہوا تھی"۔ اسی اثنا میں دہلی میں کئی مشن اسکول اور آگرہ اور بریلی میں مشن کالج بھی قائم ہو گئے جن میں مغربی علوم انگریزی زبان میں پڑھائے جانے لگے۔

دہلی کالج خالص سیکولر درس گاہ تھی۔ وہاں ہندو مسلمان عیسائی سب کے لئے نصاب ایک ہی تھا۔ کالج کو معلم متعلم کسی کے دینی عقاید سے کوئی سروکار نہ تھا۔ نہ کسی مذہب کی طرفداری کی جاتی تھی اور نہ کسی کی دل آزاری۔ انگریزی شعبے میں تو ظاہر ہے کہ انگریزی زبان و ادب اور مغربی علوم ہی پڑھائے جاتے تھے مگر مشرقی شعبے میں بھی روایتی نصاب کے علاوہ اصول حکومت و وضع قوانین، ضابطۂ دیوانی، الجبرا، ہیئت، ریاضیات، پیمائش، حرکیات، میکنکس، سکونیات، کمسٹری، طبیعیات، مساوات، اقلیدس، علم المناظر، اخلاقی سائنس، تاریخ، جغرافیہ اور نیچرل فلسفہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔

مشرقی شعبے میں یہ مضامین اردو میں پڑھائے جاتے تھے لیکن ان موضوعات پر

---

[33] مرحوم دہلی کالج از مولوی عبدالحق ص ۱۵-۱۶۔ کراچی ۱۹۶۲ء

اُردو میں کتابیں موجود نہ تھیں۔ اس کمی کو پورا کرنے کی غرض سے کالج کے پرنسپل مسٹر تبروس کی تحریک پر (وہ اُردو میں شعر بھی کہتے تھے) ۱۸۴۳ء میں دہلی میں انجمن اشاعت علوم بذریعہ السنہ ملکی کا قیام عمل میں آیا۔ اس انجمن کا مقصد مغربی علوم کی کتابوں کا انگریزی سے اُردو میں ترجمہ یا خلاصہ تیار کرنا تھا۔ مولوی عبدالحق مرحوم نے انجمن کے شائع کردہ تراجم و تالیفات کی جو فہرست دی ہے اُس میں متذکرہ بالا تمام موضوعات پر کتابیں شامل ہیں۔ ان کتابوں سے یہ فائدہ ہوا کہ مشرقی شعبے کے طلبا کے علاوہ دوسرں کو بھی جو انگریزی نہیں جانتے تھے مغربی افکار سے واقفیت کا موقع ہاتھ آگیا۔

دہلی کالج کے ہم پر بڑے احسانات ہیں۔ اسی درس گاہ کی بدولت شمالی ہند کے مسلمان پہلی بار جدید مغربی علوم سے باقاعدہ طور پر رُوشناس ہوئے اور کالج کے اساتذہ اور طلبا نے مغربی علوم کی کتابیں اُردو میں ترجمہ کر کے ثابت کر دیا کہ اُردو میں اجنبی خیالات کے اظہار کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ کالج کی ان خدمات کو سراہتے ہوئے مولوی عبدالحق مرحوم لکھتے ہیں کہ "یہی وہ پہلی درسگاہ تھی جہاں مغرب و مشرق کا سنگم قائم ہوا۔ اس طالب نے خیالات کے بدلنے، معلومات میں اضافہ کرنے اور ذوق کی اصلاح میں جادو کا کام کیا اور ایک نئی تہذیب اور نئے دَور کی بنیاد رکھی اور ایک نئی جماعت ایسی پیدا کی جس میں سے ایسے پختہ، روشن خیال اور بالغ نظر انسان اور مصنف نکلے جن کا احسان ہماری زبان اور ہماری سوسائٹی پر ہمیشہ رہے گا۔" کالج کے اساتذہ میں مولوی امام بخش صہبائی، مولوی سبحان بخش، شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین سائنس کی کتابوں کے مولف ماسٹر رام چندر، ماسٹر پیارے لال (جو غالب کے دوست اور قصص ہند، رسوم ہند، تاریخ انگلستان، دربار قیصری وغیرہ کے مصنف اور رسالہ اتالیف پنجاب لاہور کے ایڈیٹر تھے) اور شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ اور طلبا میں جنہوں نے اُردو ادب میں شہرت پائی۔ ڈپٹی نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزاد، مولوی کریم الدین مصنف تعلیم النساء، گلستان ہند، تذکرہ شعرائے ہند، تذکرہ النساء اور میر ناصر علی ایڈیٹر صلائے عام قابل ذکر ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کا تو قول تھا کہ

* معلومات کی وسعت، رائے کی آزادی، تمام ریشن (درگزر) گورنمنٹ کی سچی خیرخواہی اجتہاد علیٰ بصیرۃ یہ چیزیں جو تعلیم کے عمدہ نتائج ہیں اور جو حقیقت میں شرطِ زندگی ہیں اُن کو میں نے کالج ہی میں سیکھا اور حاصل کیا اور میں اگر کالج میں نہ پڑھتا تو بتاؤں کیا ہوتا؟ مولوی ہوتا، تنگ خیال، متعصب، اکھل کھرا، اپنے نفس کے احتساب سے فارغ، دوسروں کے عیوب کا متجسس، برخود غلط سے

ترک دنیا بہ مردم آموزند

خویشتن سیم و غلہ اندوزند

(دوسروں کو ترک دنیا کی تعلیم دیتے ہیں اور خود دولت اور غلہ جمع کرتے رہتے ہیں) مسلمانوں کا نادان دوست، تقاضائے وقت کی طرف سے اندھا بہرا۔ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ○ مَا اَصَابَنِيْ مِنْ حَسَنَةٍ فِي الدُّنْيَا فَمِنَ الْكَالِجِ (دین اور دنیا کی جو اچھائیاں میں نے حاصل کی ہیں وہ کالج ہی کا فیض ہیں)

یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ انگریزی زبان اور مغربی علوم کی تعلیم سے عام مسلمانوں کی ذہنیت بدل گئی یا وہ مغربی تہذیب و تمدن کے گرویدہ ہو گئے البتہ ایک حلقہ ضرور پیدا ہوا جو صدق دل سے محسوس کرتا تھا کہ اسلام کو مغرب کے سیکولر علوم اور سیکولر اداروں سے کوئی خطرہ نہیں ہے اور یہ کہ عزت و آبرو سے جینا ہے تو پرانی ڈگر کو ترک کرکے اپنی طرزِ زندگی اور طرزِ فکر میں اصلاح کرنی ہوگی۔

اسی دوران میں کمپنی کے کردار اور اس کی حکمت عملی میں بھی انقلاب انگیز تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اب وہ ایک سامراجی طاقت تھی جو دو تہائی ہندوستان پر قبضہ کر چکی تھی اور بقیہ علاقوں پر تسلط جمانے کی فکر میں تھی۔ لہٰذا کمپنی کو اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کی خاطر یہ طے کرنا تھا کہ اس وسیع و عریض سلطنت کا نظم و نسق کن اصولوں پر استوار کیا جائے۔ قوانین کی نوعیت اور عدالتوں کا نظام کیا ہو۔ حکومت کی سرکاری زبان کون سی ہو۔ اسکولوں میں

ذریعہ تعلیم فارسی ہو یا انگریزی اور نصاب تعلیم مشرقی ہو یا مغربی۔ کمپنی کے اعلیٰ حکام اُن دنوں دو صفوں میں بٹ گئے تھے۔ بالآخر بڑی جرح و بحث کے بعد لارڈ میکالے کی تجویز منظور ہوئی جو کٹر مغرب نواز تھا اور گورنر جنرل لارڈ ولیم بنٹنک نے ۱۸۳۵ء میں فیصلہ صادر کیا کہ حکومت کی سرکاری زبان آئندہ فارسی کے بجائے انگریزی ہوگی البتہ دفتروں اور عدالتوں میں دلیسی زبانوں میں بھی لکھا پڑھی کی اجازت ہوگی۔ ملازمتوں میں ترجیح انگریزی والوں کو دی جائے گی۔ اسکولوں اور کالجوں میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہوگی اور طلبا کو انگریزی ادب اور مغربی علوم پڑھائے جائیں گے۔ مغلیہ عہد کا قانون ضابطۂ فوجداری تین سال قبل ہی منسوخ کر دیا گیا تھا اور اُس کی جگہ برطانوی قانون نافذ ہو گیا تھا۔ لارڈ میکالے پادریوں کی تبلیغی سرگرمیوں کے بھی خلاف تھا۔ اُس کی رائے تھی کہ جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے حکومت کو کسی مذہب کی حوصلہ افزائی نہیں کرنی چاہیئے بلکہ بالکل غیر جانب دار رہنا چاہیئے لہٰذا طے پایا کہ سرکاری اور امدادی درسگاہوں میں تعلیم سیکولر ہوگی۔

سرکاری درس گاہوں میں تعلیم کو سیکولر کر دینے کی پالیسی کو ہندو مسلمان دونوں فرقوں کے روشن خیال حلقوں نے سراہا چنانچہ سر سید احمد خاں نے "مذہب اور عام تعلیم" کے عنوان سے جو مضمون ۱۸۷۱ء میں شائع کیا اُس میں وہ حکومت کے فیصلے کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"ہندوستان میں گورنمنٹ کی رعایا مختلف مذاہب کی ہے اور وہ خود ان سے مختلف مذہب رکھتی ہے اور اس سبب سے وہ کسی قسم کی مذہبی تعلیم کو شامل نہیں کر سکتی تھی۔ ہم نہایت سچے دل سے کہتے ہیں کہ گورنمنٹ نے جس قدر ناطرفدار طریقہ تعلیم کا اور مذہبی خیالات سے بچا ہوا اور اچھوتا اختیار کیا ہے اور جس قدر سعی اور کوشش ہندوستان کی تعلیم میں گورنمنٹ نے کی ہے وہ دونوں بے مثل اور بے نظیر ہیں، اور غالباً اس وقت دنیا کے پردے پر اس کا نظیر موجود نہیں ہے مگر اس پر بھی جو امر عام تعلیم کی ترقی کا مانع ہے اُس کا رفع کرنا

گورنمنٹ کی قدرت سے باہر ہے۔ وہ یہ کرسکتی تھی کہ اپنے تئیں مذہبی
تعلیم سے بالکل علیحدہ رکھے مگر یہ نہیں کرسکتی تھی کہ تمام مذاہب
ہندوستان یا کسی خاص مذہب یا مذہبوں کی تعلیم اختیار کرے" ۳۴

مگر کمپنی کی سیکولر پالیسی مخلصانہ نہ تھی بلکہ سیاسی مصلحتوں پر مبنی تھی۔ چنانچہ لارڈ منٹو کی تنبیہ کے باوجود کمپنی پادریوں کی تبلیغی سرگرمیوں کی برابر حوصلہ افزائی کرتی رہی۔ انگریز حکام مشن والوں کی مالی امداد کرتے، اُن کو اپنی کوٹھیوں میں وعظ کے لئے بلاتے اور اپنے ملازموں کو پادریوں کی تقریریں سننے پر مجبور کرتے تھے۔ سرسید نے اپنی مشہور تصنیف "اسباب بغاوت ہند" (۱۸۵۹ء) میں کمپنی کے غیر سیکولر طرز عمل پر تفصیل سے لکھا ہے اور واقعات کے حوالے دے کر بتایا ہے کہ کس طرح قحط زدہ یتیم بچوں کو عیسائی بنایا جاتا تھا، کس طرح گورنمنٹ کے تنخواہ یافتہ پادری ہندوؤں اور مسلمانوں کی مقدس شخصیتوں کا ذکر اپنی تقریروں اور تحریروں میں نہایت ہتک اور نفرت سے کرتے تھے اور کس طرح مشن اسکولوں میں بچوں سے امتحان عیسائی مذہب کی کتابوں میں لیا جاتا تھا۔ سرسید نے کلکتہ کے لاٹ پادری ایڈمنڈ کی ایک گشتی چٹھی کا حوالہ بھی دیا ہے جس میں سرکاری ملازمین کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ عیسائی مذہب اختیار کرلیں "میں سچ کہتا ہوں کہ ان چٹھیات کے آنے کے بعد خوف کے مارے سب کی آنکھوں میں اندھیرا آگیا۔ پاؤں کے تلے کی زمین نکل گئی، سب کو یقین ہوگیا کہ ہندوستانی جس وقت کے منتظر تھے وہ وقت اب آگیا۔ اب جتنے سرکاری نوکر ہیں اول اُن کو کرستان ہونا پڑے گا اور پھر تمام رعیت کو" ۳۵

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان اگرچہ براہ راست تاج برطانیہ کے زیر نگیں ہوگیا مگر حکومت ہند کی مشن نواز پالیسیوں میں فرق نہ آیا البتہ ملک کے قوانین اور ضابطوں کو سیکولر بنانے پر زیادہ توجہ دی جانے لگی۔ ۱۸۵۹ء میں ضابطہ دیوانی وضع ہوا۔ دوسرے

---

۳۴ مقالات سرسید جلد ۸ صفحہ ۱۰۵ ۔ لاہور ۱۹۶۲ء

۳۵ اسباب بغاوت ہند ضمیمہ حیات جاوید از مولانا حالی ص ۹۲۰ ۔ لاہور ۔ سن ندارد

برس قانون تعزیرات ہند اور قانون ضابطہ فوجداری نافذ کیا گیا۔ ۱۸۶۴ء میں دیوانی عدالتوں سے مسلمان قاضی اور ہندو پنڈتوں کو چھٹی مل گئی اور ہندو مسلم سول قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے کے فرائض سرکاری مجسٹریٹوں کے سپرد کر دیئے گئے۔ ۱۸۷۲ء میں قانون شہادت نافذ ہو گیا۔ صوبوں میں ہائی کورٹ اس سے پہلے قائم ہو چکے تھے۔ یہ تمام قوانین مغرب میں رائج سیکولر اصولوں کی روشنی میں تیار کئے گئے تھے۔

مگر انگریزوں نے ہندوستانی سیاست کو سیکولر خطوط پر ترقی کرنے کا کبھی موقع نہ دیا۔ بلکہ پہلے دن سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین نفاق اور بدگمانیوں کے بیج بونا شروع کر دیئے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو"۔ اُن کی پالیسی کا سنگ بنیاد بن گیا یہ نئی پالیسی مغلوں کی حکمت عملی کی عین ضد تھی۔ مغل حکمرانوں نے اپنی سیاست کی بنیاد ہندو مسلم اتحاد پر رکھی تھی۔ انہوں نے دونوں فرقوں کو آپس میں لڑانے کی کبھی کوشش نہیں کی بلکہ ایسے معروضی حالات پیدا کئے جن میں دونوں ایک دوسرے کے قریب آئیں، ایک دوسرے کے عقاید و جذبات کا احترام کریں۔ جو اقدار زیست مشترک ہوں اُن کو فروغ دیں اور جن اقدار سے آپس میں عداوت یا دشمنی بڑھنے کا اندیشہ ہو اُن سے حتی الوسع پرہیز کریں۔ مغلوں نے اُن فسادی عناصر کو بھی سختی سے دبایا جو ہندو مسلمانوں کے درمیان خلیج کو بڑھاتے تھے۔ اس کے برعکس انگریزوں نے ایسے معروضی حالات پیدا کئے جن میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی اختلافات کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ برصغیر میں سیکولرازم کی نشوونما میں رکاوٹ ڈالنے والی دراصل خود حکومت برطانیہ کی سیکولر دشمن سیاسی پالیسی تھی۔

۳

برصغیر میں سیکولر خیالات اپنی نئی شکل میں ہر چند کہ جدید طرز کی صنعت و حرفت مغربی انداز کے نظم و نسق اور مغربی علوم کی انگریزی زبان میں تعلیم کی وجہ سے پھیلے لیکن سیکولر خیالات یہاں پہلے بھی موجود تھے البتہ اُن کی نوعیت مختلف تھی کیونکہ معاشرتی

حالات اور فکری تقاضے مختلف تھے۔ مثلاً اُردو۔ فارسی کے کلاسیکی ادب میں بالخصوص شاعری میں جو ہمارے جذبات و احساسات کا آئینہ ہے سیکولر فکر کی روایت بہت پرانی ہے۔ اِس طرزِ فکر کے ہدف معاشرے کے وہ عناصر تھے جو جبر و استبداد کی علامت بن گئے تھے اور انسان دشمنی، تعصب اور تنگ نظری کے اظہار میں وہی کردار ادا کرتے تھے جو قرونِ وسطیٰ میں مغربی کلیسا کا تھا۔ ہمارا شاید ہی کوئی شاعر ہو جس نے اسلامی تعلیمات کی پیروی کرنے کے باوصف کوہ آستین ملّاؤں کی دراز دستیوں پر، زاہدِ زشت خو کی کوستاکیوں پر، پیرانِ سالوس کی شعبدہ بازیوں پر، مفتیانِ شرع کی اقتدار پرستیوں پر، محتسبوں کی تردامنیوں پر، واعظوں کی لن ترانیوں پر اور فقیہانِ شہر کی ریاکاریوں پر لعن طعن نہ کی ہو کیونکہ اُس دور میں سیکولر خیالات و جذبات کے ابلاغ کی یہی صورت ممکن تھی۔

مگر جس تہذیب و تمدن کا عمل دخل ۱۹ویں صدی میں ہو رہا تھا اُس کے مطالبے کچھ اور تھے۔ اِن مطالبوں پر مرزا غالب نے دہلی کالج سے بھی پہلے لبیک کہی۔ مرزا غالب (۱۷۹۷ء، ۱۸۶۹ء) اُن بیدار مغز اور صاحب نظر ہستیوں میں تھے جن کی نگاہیں موت کے ملبوں میں زندگی کے اُبھرتے ہوئے آثار دیکھ لیتی ہیں۔ وہ بقول خود اُن "آزادوں" میں تھے جن کو ماضی کے مٹنے کا غم بیش از یک نفس نہیں ہوتا کیونکہ ؎

برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

عام خیال یہ ہے کہ غالب میں جدید سیکولر رجحانات کلکتہ کے قیام کے دوران اُبھرے جہاں اُن کو اپنی پنشن کے سلسلے میں تقریباً دو سال رہنا پڑا تھا (۱۸۲۷ء تا ۱۸۲۹ء) لیکن واقعہ یہ ہے کہ مغرب کا جادو اُن پر بنگال جانے سے پہلے اثر کر چکا تھا۔ البتہ اُن کے مغرب نواز طرزِ فکر و احساس میں پختگی کلکتہ میں مغربی معاشرت کا مشاہدہ کرنے سے آئی۔ اُن کو یقین ہو گیا کہ مشرق کا معاشرتی نظام دم توڑ چکا ہے اور انگریز جو نظام اپنے ساتھ لائے ہیں وہ بڑا توانا اور جاندار ہے۔

مرزا غالب کے گھرانے نے ۱۸۰۳ء ہی میں جب کہ غالب کی عمر فقط چھ سال تھی۔ انگریزوں کی ماتحتی قبول کر لی تھی۔ لارڈ لیک نے آگرہ فتح کرنے کے بعد غالب کے چچا

اور سرپرست مرزا نصراللہ بیگ خاں کو چار سو سواروں کا بریگیڈیر مقرر کر دیا تھا اور وہ پرگنے بطور معاش دیدئے تھے۔ مرزا کے نانا بھی میرٹھ میں کمپنی کی فوج میں معزز عہدے پر مامور تھے اور آگرے کے عمائدین میں شمار ہوتے تھے۔ اور مرزا کی شادی بھی لوہارو خاندان میں ہوئی تھی جو انگریزوں کا بڑا خیرخواہ تھا۔ غالب نے ۱۸۱۱ء میں جب دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرلی تو اُن کو انگریزوں سے راہ و رسم بڑھانے کے زیادہ مواقع ملے۔ انہوں نے مسٹر ایڈمنسٹن، مسٹر فریزر اور دوسرے انگریزی حکام سے اگرچہ حصول منفعت کی خاطر دوستانہ تعلقات قائم کئے تھے لیکن اس میل جول نے بھی اُن کے مزاج و مذاق کو ضرور متاثر کیا۔ اس کے علاوہ معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص بھی مغلیہ تہذیب کی زبوں حالی کا موازنہ انگریز حاکموں کی شان و شوکت سے کرکے اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کہ شمع مشرق عنقریب بجھنے والی ہے اور ان تلوں میں اب تیل نہیں رہا ہے

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہل بزم
جب غم ہی جانگداز ہو تو غم خوار کیا کریں

یہ جانگدازی ایک معاشرتی نظام کے عالم نزع کا المیہ تھی۔ مگر غالب کو موت سے کبھی اُلفت نہیں ہوئی، نہ انہوں نے مُردہ پرستی کو کبھی پسند کیا (مُردہ پروردن مبارک کار نیست)

جو میلانات دہلی میں ہنوز زیر تشکیل تھے وہ کلکتہ میں تکمیل پا گئے۔ غالب نے کلکتہ کی آب و ہوا کی جو تعریف کی ہے وہ تو خیر اُن کی شاعرانہ ہٹ دھرمی ہے کیونکہ آب و ہوا کے اعتبار سے کلکتہ ہندستان کا شاید سب سے خراب شہر تھا اور اب بھی ہے۔ وہاں کی گرمی، حبس، اُمس اور غلاظت کے خیال ہی سے بدن کانپنے لگتا ہے البتہ جس چیز نے غالب کو چکا چوند کر دیا ہوگا وہ کلکتہ کی مغربی طرز معاشرت تھی، انگریزوں کے ٹھاٹھ باٹھ تھے۔ شہر کی خوش حالی اور گہما گہمی تھی اور ہنستی شور مچاتی زندگی تھی۔ جبکہ دہلی کے اُجڑے دیار میں ہر طرف ویرانی اور مفلسی برستی تھی۔ دکن کا الہ آباد

تھا نہ رہے گا۔ پیٹ خالی، جیب خالی اور چہروں پر ہوائیاں اڑتی ہوئی۔ غالب جیسا حساس ذی ہوش شخص زمین و آسمان کے اس فرق کو اگر دیکھتا تو حیرت ہوتی۔ اپنے ایک عزیز علائی تفضل حسین کو کلکتہ کی ثنا و صفت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"کلکتہ کیا شہر گونا گوں و مالا مال ہے کہ جادۂ مرگ کے سوا ہر پیشے کا ہنر مند وہاں موجود ہے اور تقدیر کے علاوہ جو چاہو بازار میں سستے داموں مل سکتا ہے۔" (فارسی)

اور دہلی واپس آکر کلکتہ کے ایک دوست کو لکھتے ہیں کہ

"کلکتہ کی خاک نشینی دوسرے مقام کی تخت نشینی سے بہتر ہے۔ خدا کی قسم بال بچوں کا بکھیڑا نہ ہوتا تو میں کب کا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہیں پہنچ جاتا۔" (فارسی)

فارسی کے ایک قطعہ میں "ساقی، بزم آگہی" (ساقی بزم عشق نہیں) سے مختلف مسائل پر گفتگو ہو رہی ہے۔ باتوں باتوں میں بنارس اور پٹنہ کا ذکر آتا ہے تو ساقی ان شہروں کی بڑی تعریف کرتا ہے۔ تب میں نے کلکتہ کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا کہ کلکتہ کو آٹھویں اقلیم کہنا مناسب ہوگا۔ میں نے پوچھا اور وہاں کے آدمی۔ وہ بولا ہر ملک اور ہر فن کے"

حال کلکتہ باز جستم، گفت	باید اقلیم ہشتمیں گفتن!
گفتم آدم بہم رسد در وی	گفت از ہر دیار، از ہر فن

غالب کو اخبار بینی کا شوق بھی کلکتہ کے قیام کے دوران پیدا ہوا۔ ان کے ادراک و آگہی میں اس سے بھی اضافہ ہوا ہوگا۔ کلکتہ سے ان دنوں فارسی کے دو ہفت روزہ اخبار نکلتے تھے۔ ایک منشی سدا سکھ کا "جام جہاں نما" دوسرا راجہ رام موہن رائے کا مراۃ الاخبار۔ جام جہاں نما میں تو قتیل کے شاگردوں سے مرزا کی ادبی بحثوں کی روداد بھی چھپتی تھی جو غالب کی نظر سے یقیناً گذری ہوگی۔ مراۃ الاخبار اس شخص کے خیالات کا نقیب تھا جو غالب ہی کی طرح موحد تھا اور جس کا کیش بھی ترک رسوم تھا کیا عجب

کہ وحدت الوجود پر اُن کا ایمان مراۃ الاخبار کے مطالعے سے اور مستحکم ہوا ہو۔

مرزا غالب نے نثر نویسی کا جو نیا اسلوب اختیار کیا وہ بھی خالص مغربی تھا۔ مقفا مسجع پیرایہ بیان کے بجائے جو اُس وقت کا عام دستور تھا، سہل اور رواں تحریر، مکتوب علیہ کو بے تکلفی سے مخاطب کرنا اور خطوں کو مکالمہ بنا دینا حتیٰ کہ لفافے پر پتہ بھی جدید طریقہ پر لکھنا ان سب باتوں میں انگریزوں کے مذاق اور مشرب کا رنگ صاف نمایاں ہے۔ وہ صحیح معنی میں مردِ آزاد تھے۔ مذہبی تعصبات سے مبرا، رسوم و قیود کی بندشوں سے گریزاں، رنگ و نسل کی تفریق کے منکر، دینِ بزرگاں کی پیروی سے بیزار، تجدد کے گرویدہ اور توہمات سے متنفر، ایسے فراخدل اور روشن خیال شخص کو مغربی تمدن کی خوبیوں کی تہ تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی ہوگی۔

اُنہوں نے سید احمد خاں کی تصحیح کردہ "آئینِ اکبری" پر جو منظوم تقریظ لکھی اُس کے مطالعے کے بعد تو غالب کی روشن خیالی کے بارے میں کسی شک وشبہے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہ جاتی۔ یہ واقعہ ۱۸۵۵ء کا ہے۔ اُس وقت تک سید احمد خاں کو کمپنی کی ملازمت کرتے سولہ سترہ برس گذر چکے تھے مگر اُن کی سوچ ہنوز روایتی تھی۔ تقریظ کی تمہید میں غالب سید احمد خاں کی تعریف کرتے ہیں کہ ایک "دیدۂ بینا" نے "کہنگی" کو نیا لباس پہنایا ہے لیکن آئینِ اکبری کی تصحیح اُن کی "ہمت والا" کے لئے باعث "ننگ و عار" ہے۔ "اُنہوں نے اس شغلے سے اپنا دل بیشک خوش کیا۔ مگر میں "آئینِ ریا" کا دشمن ہوں لہٰذا اُن کے اس کام پر آفریں نہیں کہہ سکتا کیونکہ میں تو تخلیقِ نو کا جویا ہوں"۔ اور اب میں "آئین" سے ہٹ کر ایک بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ آنکھیں کھولو اور اِس "دیرِ کہن" میں

صاحبانِ انگلستاں را نگر	صاحبانِ انگلستان کو، اور
شیوہ و اندازِ اینان را نگر	اُن کے شیوہ و انداز کو دیکھو
تا چہ آئیں ہا پدید آوردہ اند	انہوں نے کیسے کیسے آئین وضع کیے ہیں اور ایسے آئین
آنچہ ہرگز کس ندید، آوردہ اند	جن کو کسی نے پہلے کبھی نہ دیکھا یہاں لائے ہیں
زیں ہنرمنداں ہنر بیشی گرفت	اُن سے ہنرمندوں نے ہنر کے اُصول سیکھے ہیں
سعی بر پیشینیاں پیشی گرفت	اور اپنے اجداد سے بھی آگے نکل گئے ہیں

حق ایں قوم است آئیں داشتن	آئین پر عمل کرنا اس قوم کا حق ہے۔
کس نیارد ملک بے دیں داشتن	کسی اور کو ملک کو اس سے بہتر چلانا نہیں آتا۔
داد و دانش را بہم پیوستہ اند	انہوں نے عدل اور دانائی کو ملا دیا ہے
ہند را صد گونہ آئیں بستہ اند	اور ہندستان کو سوگنا ملک آئین بنا دیا ہے۔
آتشے کز سنگ بیروں آورند	لوگ پتھر سے چنگاری پیدا کرتے ہیں (چقماق کو رگڑ کر)
ایں ہنرمنداں ز خس چوں آورند	مگر یہ ایسے ہنرمند ہیں کہ تنکے سے آگ نکالتے ہیں (دیا سلائی)
تا چہ افسوں خواندہ اند اینان بر آب	انہوں نے پانی پر نہ جانے کیا جادو کر دیا ہے کہ
دود کشتی را ہمی راند در آب	کہ دھواں کشتی کو پانی میں ہانکتا ہے۔
گہ دخاں، کشتی بہ جیحوں می برد	بھاپ کبھی جہاز کو سمندر میں لے جاتی ہے
گہ دخاں، گردوں بہ ہاموں می برد	اور کبھی چیزوں کو بلندی سے زمین پر لے آتی ہے
از دخاں زورق بہ رفتار آمدہ	بھاپ کی قوت سے کشتی رفتار پکڑتی ہے اور اس کے سامنے
باد و موج ایں ہر دو بیکار آمدہ	ہوا اور پانی کی لہریں دونوں بے بس ہو جاتی ہیں۔
نغمہ، بے زخمہ از ساز آورند	یہ لوگ ساز سے بلا دستانے کے دُھن نکال لیتے ہیں۔
حرف چوں طائر بہ پرواز آورند	اور حروف کو پرندوں کی پرواز عطا کرتے ہیں
ہیں، نمی بینی کہ ایں دانا گروہ	کیا تم نے نہیں دیکھا کہ یہ دانا گروہ
در دو دم آرند حرف از صد کروہ	لفظوں کا پیغام لمحوں میں سو کوس تک پہنچا دیتا ہے۔ (تار برقی)

می زنند آتش بہ باد اندر ہمی	ہوا اگیس (کو اس طرح آگ دکھاتے ہیں کہ
می درخشد باد چون اخگر ہمی	ہوا انگارے کی طرح دہکنے لگتی ہے (گیس کی روشنی)
رو بہ لندن کاندران رخشندہ باغ	لندن پر نظر ڈالو۔
شہر روشن گشتہ در شب بے چراغ	جو رات کے وقت بلا چراغ کے جگمگاتا رہتا ہے۔
کاروبار مردم ہشیار بین	ہوشیار انسانوں کے کاروبار کو دیکھو
در ہر آئیں صد نو آئیں کار بین	ایک آئین میں سینکڑوں نئے آئین کی کارفرمائی دیکھو۔
پیش ایں آئیں کہ دارد روزگار	اس آئین کے آگے
گشتہ آئینِ دگر تقویم پار	دوسرے آئین پرانی جنتری کی حیثیت رکھتے ہیں۔
ہست، اے فرزانۂ بیدار مغز ؟	اے میرے بیدار مغز عاقل
در کتاب این گونہ آئین ہائے نغز	کیا تمہاری کتاب (آئین اکبری) میں ایسی دانائی کی باتیں ہیں ؟
چون چنین گنج گہر بیند کسے	اگر کسی کو موتیوں کا خزانہ دکھائی دے تو
خوشہ زاں خرمن چرا چیند کسے	وہ کھلیان میں سے ایک بالی کیوں چُنے۔
مبدا فیاض را مشمر بخیل	فیض کے سرچشمے کو کنجوس مت جانو
نور می ریزد طلب بازان نخیل	خرمے کے درخت سے سورج رسیلے پھل ٹپکاتا ہے۔
مُردہ پروردن مبارک کار نیست	مُردہ پروری اچھا مشغلہ نہیں
خود بگو، کان نیز جز گفتار نیست	تم خود ہی کہو کہ کیا یہ سب باتیں ہی باتیں نہیں ہیں۔

اس نظم میں مرزا غالب سید احمد خاں کو اشارۃً کنایۃً مغربی تہذیب کو

اپنانے کا مشورہ نہیں دیتے۔ اُن کو انگریزوں کی پوشاک خوراک سے کوئی دلچسپی نہیں، نہ وہ صاحبان عالی شان کی طرزِ بود و باش سے مرعوب ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں کہتے کہ اپنی مادری زبان ترک کر کے انگریزی زبان اختیار کر لو اس لئے کہ غالبؔ کو اپنی مشرقی تہذیب پر بڑا ناز تھا اور انہوں نے آخر وقت تک اپنی مشرقی قدروں کو جی جان سے نباہا۔ البتہ وہ ہماری سوچ کا انداز بدلنا چاہتے ہیں۔ وہ "کہنگی" اور مُردہ پرستی کے سخت دشمن ہیں۔ اپنی مشہور غزل میں جو کلکتہ سے واپسی پر ۱۸۳۰ء میں کہی گئی تھی فرماتے ہیں کہ ؎

رفتم، کہ کہنگی ز تماشا بر افگنم
در بزمِ رنگ و بو نمطی دیگر افگنم
در وجد اہلِ صومعہ ذوقِ نظارہ نیست
ناہید را بہ زمزمہ از منظر افگنم

میں گیا تا کہ زندگی سے کہنگی کو خارج کر دوں
اور اس دنیا میں ایک دوسرا طریقہ رائج کروں
زاہدوں کے وجد حقیقت شناسی کے ذوق سے
خالی ہیں۔
لہٰذا میں اپنے زمزموں سے زہرۂ فلک کے
اقتدار کو ختم کرتا ہوں۔

دیر کہن کیا، وہ تو "قاعدۂ آسمان" کو بھی بدل دینا چاہتے ہیں (بیا کہ قاعدۂ آسماں بہ گردانیم) فیوڈلزم کی جدید اصطلاح سے اُن کے کان اگرچہ آشنا نہیں لیکن کہنگی سے اُن کی مُراد یقیناً فیوڈلزم کا فرسودہ نظام تھا۔ البتہ وہ مغربی تمدن کے حامی ہیں اور مغرب میں جو نئی نئی صنعتی ایجادیں ہوئی تھیں سید احمد خاں کو اُن کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔ کوئلہ اور بھاپ سے چلنے والی مشینیں، تار برقی، گیس، دیا سلائی وغیرہ لیکن غالبؔ کی نظر میں ان چیزوں سے بھی زیادہ اہم مغرب کا آئینِ نو یعنی نظامِ مملکت ہے جو عدل و انصاف کے اصولوں پر مبنی ہے۔ ۱۸ ویں صدی میں سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد ملک میں جو طوائف الملوکی، لاقانونیت اور افراتفری پھیلی اُس کے پیشِ نظر مرزا غالبؔ برطانیہ کے نافذ کردہ آئینِ نو کی طرفداری کرنے میں یقیناً حق بجانب تھے۔ اس نئے آئین کے آگے آئینِ اکبری کی حیثیت واقعی پرانی جنتری سے زیادہ نہ تھی۔

سید احمد خاں کو غالبؔ کی یہ بے لاگ تنقید پسند نہیں آئی لہٰذا انہوں نے تقریظ

کو کتاب میں شامل نہیں کیا۔ وہ انگریزوں کے وفادار ضرور تھے مگر اُن کے خیالات ابھی تک قدیم دائرے میں محدود تھے اور جو کتابیں اُنہوں نے اس دور میں لکھیں وہ یا تو روایتی انداز کی تھیں یا ایسے مذہبی موضوعات پر رسالے لکھے جو وہابی اندازِ فکر سے متاثر تھے نیز مناظرانہ انداز کے تھے۔[1] سید احمد خاں کا یہ اندازِ فکر غدر کے بعد بھی ۱۸۶۲ء تک قائم رہا۔

سید احمد خاں (۱۸۱۷ء۔ ۱۸۹۸ء) دہلی کے ایک ممتاز خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اُن کے والد سید متقی (وفات ۱۸۳۸ء) بادشاہ کے مقربین خاص میں تھے۔ اُن کے نانا خواجہ فریدالدین (وفات ۱۸۲۸ء) بڑے عالم فاضل بزرگ تھے۔ کمپنی نے اُن کو سات سو روپے ماہانہ پر کلکتہ مدرسہ کا ناظم مقرر کر دیا تھا۔ انگریز اُن کی فراست و ذکاوت سے اتنے متاثر تھے کہ اُنہوں نے خواجہ فریدالدین کو دو بار سفارت پر بھیجا، پہلے ایران پھر برما۔ ۱۸۱۵ء میں اکبر شاہ ثانی نے اُن کو وزیر مال و خزانہ مقرر کیا مگر درباری سازشوں سے تنگ آکر اُنہوں نے بالآخر استعفیٰ دے دیا۔ سید احمد خاں کا بچپن اسی لائق اور مدبّر نانا کے گھر میں گذرا۔ اُن کے سوانح نگار کا کہنا ہے کہ سید احمد خاں کا آنا جانا شاہی دربار میں بھی ہوتا تھا اور وہیں اُن کو راجہ رام موہن رائے جیسے عظیم ہندوستانی رہنما کو دیکھنے کا موقع ملا۔ سید احمد خاں اپنے نانا کے تذکرے کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ "راجہ رام موہن رائے نہایت لائق اور ذی علم اور متین مہذب و با اخلاق شخص تھے۔ وہ دلی میں آئے اور بادشاہ کی ملازمت کی اور اُن کو راجہ کا خطاب بادشاہ کی طرف سے دیا گیا اور آخر کار وہ بادشاہ کے وکیل ہو کر لندن بھیجے گئے۔ راقم نے اُن کو متعدد بار دربار شاہی میں دیکھا ہے (اُس وقت سر سید کی عمر ۱۲، ۱۳ برس سے زیادہ نہ تھی) اور دلی کے لوگ یقین کرتے تھے کہ اُن کو مذہب اسلام کی نسبت زیادہ رجحان خاطر ہے۔ شکلے راجہ رام موہن رائے کے انہیں اوصاف کی شہرت سن کر اکبر شاہ ثانی نے اُن کو

[1] سید احمد خاں از پروفیسر خلیق نظامی صہ ۲۵ نئی دہلی ۱۹۷۱ء

[2] مقالات سر سید جلد ۱۶ صہ ۲۱۳ – ۱۴ – لاہور ۱۹۶۵ء

دہلی بلوایا تھا اور لندن اپنا سفیر بنا کر بھیجا تھا کہ وہ بادشاہ کی پنشن میں اضافے کی کوشش کریں۔ راجہ رام موہن رائے پنشن میں تین لاکھ روپیہ سالانہ اضافہ کروانے میں کامیاب ہو گئے مگر واپسی سے پہلے برسٹل میں بیمار پڑے اور وفات پا گئے۔ اُن کی لاش وہیں دریا کنارے نذر آتش کر دی گئی۔ افسوس ہے کہ ہماری نئی نسل عربی فارسی کے اس عالم، بُت پرستی کے دشمن اور سلطنت مغلیہ کے وفادار خادم کے نام سے بھی واقف نہیں البتہ بچوں کی کتابوں میں ہمارے ہیرو کون ہیں؟ احمد شاہ ابدالی جس ظالم نے سرحد، پنجاب اور سندھ کے مسلمانوں کو درجنوں بار حملہ کر کے لوٹا اور قتل کیا!

سید احمد خاں ۱۸۳۸ء میں دہلی کے صدر امین کے دفتر میں سر رشتہ دار ہوئے۔ چند ماہ بعد اُن کو کمشنر آگرہ کے دفتر میں نائب منشی کا عہدہ مل گیا۔ تین سال بعد وہ مین پوری میں منصف مقرر ہوئے پھر فتح پور سیکری، دہلی، بجنور، مراد آباد، غازی پور، علی گڑھ اور بنارس میں مختلف اعلیٰ عہدوں پر مامور رہے۔ بجنور میں غدر کے زمانے میں اُنہوں نے انگریزوں کی جان بچانے کی کوشش میں کئی بار اپنی جان خطرے میں ڈالی۔ مراد آباد میں انہوں نے قحط زدگان کی خدمت بڑے خلوص اور خوش اسلوبی سے کی۔ ۱۸۶۳ء میں انہوں نے غازی پور میں ایک سائنٹفک سوسائٹی بنائی تاکہ مغربی علوم کی کتابوں کا انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کیا جائے۔ غازی پور ہی میں اُنہوں نے ایک اسکول کھولا جس میں انگریزی بھی پڑھائی جاتی تھی۔ ۱۸۶۹ء میں وہ لندن گئے اور وہاں کے طرز تعلیم کا بالخصوص آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی کے طریقۂ تعلیم کا بغور مطالعہ کیا۔ لندن ہی میں اُنہوں نے اپنے خیالات اور منصوبوں کی اشاعت کے لئے ایک رسالہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا اور ۱۸۷۰ء میں لندن سے واپس آتے ہی رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ ۱۸۷۲ء میں اُنہوں نے مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کی خاطر ایک کالج قائم کرنے کی اسکیم شائع کی اور ۱۸۷۵ء میں ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ میں قائم کر دیا۔ دوسرے سال وہ پنشن لے کر علی گڑھ آ گئے اور ۱۸۹۸ء میں وہیں وفات پائی۔

سر سید کو "تقلید مغربی" کے طعنے دینا ہمارے نام نہاد "جدیدی" ادیبوں کا شعار

ہو گیا ہے۔ وہ سرسید کے طرز عمل کا ذکر اس حقارت سے کرتے ہیں گویا جدید دی حضرات کی اپنی زندگی مغربی تہذیب اور مغربی خیالات کے خلاف جدوجہد میں گذری ہے اور مغربی تہذیب نے ان کو چھوا تک نہیں ہے۔ حالانکہ مغربی تہذیب کے گندے انڈے ہی اُن کے فکر کی غذا ہیں۔ ہائی ڈیگر اور کیر کے گارد جیسے پرستاران مرگ اور حریفان عقل اُن کے پیر ہیں۔ اور ان کے قلم رینڈ ایلاء ٹیمز اور اُنسنز یو، ایلیٹ اور جارج آڈیل، کامیو اور کرو چے کی مدح و ثنا کرتے نہیں تھکتے۔ سرسید نے مغرب کی روشن خیالیوں سے رشتہ جوڑا تھا، مگر ہمارے یہ بزرجمہر مغرب کی ہر انسانیت دشمن تحریک کا خیر مقدم کرتے ہیں اور ہر ظلمت پرست کو بانس پر چڑھاتے ہیں۔

سرسید نے مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کا اُس وقت بیڑا اُٹھایا جب زمین مسلمانوں پر تنگ تھی اور سانحہ؟ اُن کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ وہ توپوں سے اُڑائے جاتے تھے، سولی پر لٹکائے جاتے تھے، کالے پانی بھیجے جاتے تھے۔ اُن کے گھروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی تھی۔ اُن کی جائدادیں ضبط کر لی گئی تھیں۔ نوکریوں کے دروازے اُن پر بند تھے اور معاش کی تمام راہیں مسدود تھیں۔

سرسید نے اپنا نصب العین کتابوں سے تیار نہیں کیا تھا بلکہ اس کے پیچھے اُن کا تیس سال کا وسیع تجربہ اور ہندوستان کے معروضی حالات کا گہرا مطالعہ تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اصلاح احوال کی اگر جلد کوشش نہیں کی گئی تو مسلمان "سائیس خانساماں، خدمتگار اور گھاس کھودنے والوں کے سوا کچھ اور نہ رہیں گے"۔ سرسید نے محسوس کر لیا تھا کہ اونچے اور درمیانہ طبقوں کے تباہ حال مسلمان جب تک باپ دادا کے کارناموں پر شیخی بگھارتے رہیں گے، غیر اسلامی رسوم و رواج کو ترک نہیں کریں گے، توہم پرستیوں ہی کو اصل اسلام سمجھ کر مولویوں کے پیچھے بھاگیں گے اور انگریزی زبان اور مغربی علوم سے نفرت کرتے رہیں گے اُس وقت تک بدستور ذلیل و خوار ہوتے رہیں گے۔ اُن کو کامل یقین تھا کہ مسلمانوں کی ان ذہنی اور سماجی بیماریوں کا واحد علاج انگریزی زبان اور مغربی علوم کی تعلیم ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر وہ تمام عمر جدوجہد کرتے رہے۔

سرسید نے سوادِ تعلیمِ جدید کے لئے دو محاذ قائم کئے۔ ایک تنظیمی مورچہ، دوسرا تبلیغی مورچہ۔ اُن کی تنظیمی کوششوں کا شاہکار ایم۔اے۔او کالج تھا جو ترقی کر کے مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہوا اور جس کے فیض سے ہزاروں لاکھوں مسلمان انگریزی زبان اور مغربی علوم سے بہرہ اندوز ہوئے اور اب بھی ہو رہے ہیں۔ اپنے خیالات کی نشر و اشاعت اور مسلمانوں کی ذہنی تربیت کی خاطر انہوں نے تہذیب الاخلاق جاری کیا جو اپنے وقت کا سب سے بااثر رسالہ تھا۔ انہوں نے اپنی پُرخلوص سرگرمیوں سے نہ صرف بیشمار ہمدرد پیدا کئے بلکہ ۱۹ویں صدی کے قریب قریب سبھی ممتاز ادیبوں اور دانشوروں کا علمی تعاون بھی حاصل کر لیا۔ نواب محسن الملک، مولانا شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا حالی جو اُردو ادب کے ستون ہیں بزمِ سرسید ہی کے شب چراغ تھے۔

سرسید نے جس جوش اور ولولے سے انگریزی زبان اور مغربی علوم کی حمایت کی اُسی جوش اور ولولے سے عربی مدارس اور مروّجہ مذہبی تعلیم کی مخالفت کی۔ اور واضح کر دیا کہ فی زمانہ یہ مذہبی تعلیم مسلمانوں کے لئے بے مصرف ہی نہیں مضرت رساں بھی ہے۔ مروّجہ مذہبی تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ

"اب میں نہایت ادب سے پوچھتا ہوں کہ جو جو کتب مذہبی اب تک ہمارے ہاں موجود ہیں اور پڑھنے پڑھانے میں آتی ہیں اُن میں سے کون سی کتاب ہے جس میں فلسفۂ مغربیہ اور علوم جدیدہ کے مسائل کی تردید یا تطبیق مسائل مذہبیہ سے کی ہو۔ وجود سماوات سبع کی ابطال پر جو دلیلیں ہیں اُن کی تردید کس کتاب میں لکھی ہے۔ اثباتِ حرکتِ زمین اور ابطالِ حرکتِ دَوری آفتاب پر جو دلیلیں ہیں اُن کی تردید کس سے جا کر پوچھیں۔ عناصر اربع کا غلط ہونا جو اب ثابت ہو گیا ہے اُس کا کیا علاج کریں...... پس ایسی حالت میں ان (مذہبی) کتابوں کا نہ پڑھنا اُن کے پڑھنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ ہاں اگر مسلمان مردِ میدان ہیں اور اپنے مذہب کو سچا سمجھتے ہیں تو بے دھڑک میدان میں آویں اور جو کچھ ... ...

کے ساتھ کیا تھا وہ فلسفۂ مغربیہ اور علوم محققۂ جدیدہ کے ساتھ کریں۔
تب اُن کا پڑھنا پڑھانا مفید ہوگا ورنہ اپنے منہ میاں مٹھو کہہ لینے سے کوئی
فائدہ نہیں۔" [۳۸]

مگر علماءِ دین میں اس چیلنج کو قبول کرنے کی اہلیت ہی نہ تھی کیونکہ "کیا مقلد، کیا اہلِ حدیث سب تقلید کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں اور اُن میں مادۂ اجتہاد و تحقیق معدوم ہو گیا ہے بس ہر ایک اپنی لکیر پر فقیر ہے اور کولہو کے بیل کی مانند اُس حلقے میں چکر کھاتا جاتا ہے جس حلقے میں اُس کو آنکھ بند کرکے ہانکا تھا۔" [۳۹]

سرسید کا موقف یہ تھا کہ منقولات کی اندھی تقلید کرنے کے بجائے ـــــ جو مولویوں کا شیوہ ہے ـــــ ہم کو اپنے ہر عقیدے ہر فکر کو عقل و فہم کی کسوٹی پر کسنا چاہیے کیونکہ "عقل ہی وہ آلہ ہے جس سے تمام باتوں کی اصلیت کا علم ہوتا ہے اور انسان سچائیوں کی تہ تک پہنچتا ہے۔" [۴۰] مگر عقل کو علم کہاں سے فراہم کیا جائے؟ سرسید جواب دیتے ہیں کہ پُرانی مذہبی کتابیں اور درسگاہیں تو اس قابل نہیں البتہ جدید سائنسی علوم سے ہماری عقل کو مناسب غذا مل سکتی ہے۔ کیونکہ سائنسی سوچ عقل کے مطابق ہے اور قوانینِ قدرت اور مظاہرِ قدرت کی سچی تشریح کرتی ہے۔ سائنس کے انکشافات اور نظریات نے، سائنس کی دریافتوں اور ایجادوں نے کائنات کی اصل حقیقت ہم پر واضح کر دی ہے۔ پس ہم کو لازم ہے کہ اپنے عقاید و افکار کا محاسبہ مغربی علوم کی روشنی میں کریں۔ سائنسی علوم سے انہوں نے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا کہ قوانینِ قدرت کو کوئی ماورائی طاقت نہیں بدلتی نہ اُن میں مداخلت کرتی ہے بلکہ دنیا میں جو کچھ وقوع پذیر ہوتا ہے خواہ اُس کا تعلق مادّی اشیاء سے ہو یا انسانی معاشرے سے اُس کے اسباب دُنیاوی ہوتے ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کے دُنیاوی مسائل دعا تعویذ، نذر نیاز، مَنّتوں، چڑھاووں سے یا درگاہوں کی چوکھٹ چومنے، چلّے

---

[۳۸] مقالات سرسید جلد اول ص ۹۷ - ۹۸ - طبع ۱۹۶۲ء
[۳۹] ایضاً ص ۲۷۳
[۴۰] ایضاً جلد ۵ ص ۲۵۱ - طبع ۱۹۶۲ء

کاٹنے اور زر پرست پیروں کی جھولیاں بھرنے سے حل نہیں ہوں گے بلکہ اُن کی نجات توہمات کے اس طلسم کو توڑنے ہی میں ہے۔ ہم مغربی علوم و افکار، اور مغربی تہذیب و تمدن کو اپنا کر ہی دوسری قوموں کی طرح دنیا میں سرفراز و سرخرو ہو سکتے ہیں۔

مسلمانوں کے روائتی عقاید کی اساس قرآن اور احادیث ہیں مگر سرسید کے علم کلام میں احادیث کی گنجائش بہت کم ہے۔ اُن کے خیال میں احادیث کی نقل و روایت سے مسلمانوں میں تفرقے پیدا ہوئے اور گمراہیاں پھیلیں۔ وہ اپنی تائید میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے فیصلوں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں کو جمع کر کے کہا کہ تم رسول خدا صلعم کی بہت حدیثیں بیان کرتے ہو اور اُن میں اختلاف کرتے ہو اور تمہارے بعد کے لوگ بہت زیادہ اختلاف کریں گے پس تم رسول اللہ صلعم سے کوئی حدیث نہ بیان کیا کرو۔ جو کوئی تم سے کچھ پوچھے تو کہہ دو کہ ہم میں اور تمہارے میں اللہ کی کتاب یعنی قرآن ہے —— کہا جاتا ہے کہ خود حضرت ابوبکرؓ نے جس قدر حدیثیں جمع کی تھیں وہ جلا دی تھیں۔"

"حضرت عمرؓ نے بھی بہت دفعہ اور بہت لوگوں کو آنحضرتؐ سے حدیثوں کی روایت کرنے سے منع کیا اور کہا کہ حسبنا کتاب اللہ، یہاں تک کہ ایک دفعہ اُنہوں نے بڑے عالم اور فقیہہ تین صحابیوں کو یعنی ابن مسعودؓ، ابو دردا اور ابو مسعود انصاری کو اس لئے کہ وہ آنحضرت صلعم سے بہت سی حدیثیں روایت کرتے تھے قید کر دیا۔" [۲۱]

اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے سرسید لکھتے ہیں کہ

"اس کے بعد زُہاد اور شائقین فی الخیرات پیدا ہوئے اور اَوروں کو بھی زہد و ریاضت و عبادت پر ترغیب دلانے کو اور قیامت کے

---

[۲۱] ایضاً جلد اوّل ص ۱۹۱ بحوالہ تذکرۃ الحفاظ جلد اوّل ص ۳ و ص ۲۶۶

عذاب کا ڈر جتلانے کو روایات ضعیف اور موضوع کے رواج پر مائل ہوگئے اور چھوٹے چھوٹے اعمال سے جنت الفردوس کا ملنا اور ادنیٰ ادنیٰ معصیت پر جہنم میں داخل ہونے کا وعظ کرنے لگے۔ یہ سب رطب ویابس کتابوں میں جمع ہوگیا ہے۔"

سرسید نے قرآنی آیات کی تاویل عقلی اور سائنسی بنیادوں پر کی۔ اُن کا کہنا تھا کہ "خدا کی بات اور سائنس کا کام ایک ہونا چاہئے" [۴۲] اُن کے نزدیک "خدا کا قول یعنی مذہب اور خدا کا فعل یعنی فطرت، موجودات دونوں ایک ہیں" [۴۳] دونوں میں تضاد نہیں ہوسکتا۔ قدما نے بھی اسی اُصول کی پابندی کی تھی اور موجودات عالم کے جو تصورات اُن کے زمانے میں حقائق ثابتہ کا درجہ رکھتے تھے انہیں کی روشنی میں قرآن کی تفسیریں لکھی تھیں۔ چونکہ حقائق ہستی کی جو تفصیلات قرآن میں بیان ہوئیں قریب قریب وہی تورات و انجیل میں موجود تھیں اور عربوں کے عام عقاید بھی وہی تھے لہٰذا ان مفسرین نے آیات قرآنی کے باطنی معنی و مفہوم پر غور کرنے کے بجائے اُن کے ظاہری معنی و مفہوم پر اکتفا کی۔ سرسید کا موقف یہ تھا کہ چونکہ موجودات عالم کے علم نے اب بہت ترقی کرلی ہے اور بیشتر پرانے مفروضات غلط ثابت ہوچکے ہیں لہٰذا ہم کو آیات قرآنی کی تشریح ان نئی معلومات کی روشنی میں کرنی چاہیئے۔ اِس کے برعکس علماء دین فرماتے تھے کہ موجودات عالم کی جو تشریح سائنس داں کرتے ہیں وہ قرآن سے ٹکراتی ہے۔ مگر کلام خدا چونکہ غلط نہیں ہوسکتا لہٰذا سائنس کی تشریحات لامحالہ غلط ہیں۔ سرسید نے اس منطق کو تسلیم نہیں کیا۔ وہ کہتے تھے کہ موجودات عالم کی سائنسی تشریحیں سچی اور ثابت شدہ ہیں لہٰذا ہم کو کلام خدا کے معنی و مفہوم انہیں سچائیوں سے متعین کرنے ہوں گے۔ چنانچہ اُنہوں نے کائنات کی تخلیق، آدم و حوا کا ہبوط، آسمان، انبیاء، وحی اور الہام کی اصل حقیقت، فرشتے، جن اور شیطان، لوح و قلم،

[۴۲] ایضاً جلد اوّل صـــ ۹۰

[۴۳] ایضاً جلد اوّل صـــ ۲۰۰

نوشتۂ تقدیر، جینوں و معاد، حشر و نشر، جبر و اختیار، معراج معجزہ اور کرامات، نماز، دعا وغیرہ کی عقلی تشریحیں کیں۔ حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت نوحؑ اور دوسرے نبیوں کے قصوں میں جو واقعات قانونِ قدرت کے خلاف معلوم ہوتے ہیں جیسے ید بیضا، عصا کا اژدہا بن جانا، فرعون کے لشکر کا غرق ہونا۔ خدا کا موسیٰ سے کلام کرنا، پہاڑ پر تجلی کا ہونا، گوسالۂ سامری کا بولنا، مَن و سلویٰ کا اُترنا، یا عیسیٰؑ کا گہوارے میں کلام کرنا، مُردوں کو زندہ کرنا اور اندھوں کوڑھیوں کو چنگا کرنا، ان باتوں کی تاویل بھی سرسید نے نئے انداز میں کی۔ قرآن میں چور کی سزا ہاتھ کاٹنا لکھا ہے مگر سید احمد خاں کہتے تھے کہ یہ سزا لازمی نہیں ہے "کیونکہ لازمی ہوتی تو فقہا اُس کو مالِ مسروقہ کی ایک خاص مقدار کے ساتھ مشروط نہ کرتے اور نیز صحابہ کے وقت میں متعدد موقعوں پر سارق کو صرف قید کی سزا دی جاتی۔" مولانا حالی نے حیاتِ جاوید میں ۱۸ اُن اُمور کی نشان دہی کی ہے جن کے بارے میں سرسید نے مروجہ اسلامی عقاید سے اختلاف کیا اور ان کی سائنسی اور عقلی تشریحیں پیش کیں۔

سرسید کی سوچ سیکولر تھی۔ وہ دینی اُمور کو دنیاوی اُمور سے الگ کر کے دیکھتے تھے۔ اُنھوں نے اس موضوع پر اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے ایک مضمون بھی لکھا تھا۔ بحث کی ابتدا وہ توریتِ موسوی سے کرتے ہیں جس میں دنیاوی احکام کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اور یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ "حضرت موسیٰؑ کے تمام دُنیوی احکام مثل ایک انسان کے احکام کے ہیں جو بہ صلاح بعض دانش مندوں کے اور بطور انتظام مناسب وقت و حالاتِ قوم کے دیے گئے ہوں۔" مگر "بنی اسرائیل نے تمام دنیاوی احکام کو جو درحقیقت مذہب سے کچھ علاقہ نہیں رکھتے تھے مذہب میں شامل کر لیا اور پھر اُس کے مقاصد کو چھوڑ کر صرف لفظی معنوں کی پیروی کرنا بحیثیت یہودی مذہب قرار پایا۔"[۲۲]

فقہائے اسلام نے بھی دینی اور دنیاوی اُمور کو آپس میں گڈمڈ کر کے جو غلطی کی اُس

[۲۲] مقالاتِ سرسید جلد ۵ صـ ۱-۳

کا تذکرہ کرتے ہوئے سرسید لکھتے ہیں کہ "عرب کی تمام قوموں کا یہ طریقہ تھا کہ جس کو شیخ یا سردار قوم قرار دیتے تھے، تمام دُنیاوی اُمور میں بھی اُسی کی اطاعت کرتے تھے اور اُسی کے حکم پر چلتے تھے۔ پس بطور قدرتی امر کے ضروری تھا کہ تمام قوم عرب آنحضرت صلعم کو اپنا دنیاوی سردار بھی قرار دیں اور آنحضرت صلعم کو بھی مجبوراً دنیاوی سرداری اختیار کرنی لازم تھی مگر جس طرح کہ حضرت موسیٰؑ میں دو منصب جدا جدا جمع ہو گئے تھے اُسی طرح آنحضرت صلعم میں بھی دو جداگانہ منصب جمع تھے۔

"دُنیاوی سرداری کے متعلق آنحضرت صلعم بھی مثل حضرت موسیٰؑ کے اپنے صحابہ کے مشورے سے اور ضرورت و مصلحت وقت کے لحاظ سے احکام صادر فرماتے تھے اور یا تو یہودیوں کی پیروی سے یا اُسی لازمی نتیجے سے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا آنحضرت صلعم نے بھی دُنیاوی اُمور کی نسبت جو کچھ کیا یا فرمایا بطور ربانی احکام کے سمجھا گیا اور لوگوں نے "وانتم اعلم بامور دنیاکم" کو یک لخت بھلا دیا۔

"مسلمان عالموں نے قدم بہ قدم یہودیوں کی پیروی کی اور تمام دُنیاوی احکام کو جو درحقیقت مذہب سے کچھ علاقہ نہیں رکھتے تھے مذہب میں شامل کر لیا اور پھر یہودیوں کی تقلید سے اُس کے مقاصد کو چھوڑ کر صرف لفظی معنوں کی پیروی کو بحیثیت مذہب اسلام قرار پایا۔" ۵۵

اس کے بعد سرسید اُن علماء پر گرجتے برستے ہیں جن کے مذہب میں "دو اُنگل اونچی ازار پہننے سے جنت ملتی ہے اور دو اُنگل نیچی پہننے سے دوزخ میں ڈالا جاتا ہے۔" غرضیکہ انسانوں کی بدبختی کی جڑ دُنیاوی مسائل کو دینی مسائل میں جو ناقابل تغیر و تبدل ہیں شامل کر لینا ہے۔" وہ اپنی سیکولر سوچ پر اس سختی سے قائم ہیں کہ کہہ دیتے ہیں کہ "دنیاوی معاملات کو دینی معاملات میں ملا لینا تجربوں سے ہے۔ کیونکہ "دینی احکام کا نیچر دنیاوی احکام معاشرت سے بالکل مختلف ہے ..... اُمور معاشرت و تمدن جو روز بروز تبدیل ہوتے جاتے ہیں پس وہ داخل احکام مذہبی نہیں ہو سکتے۔" ۵۶

---

۵۵ ایضاً ص ۲۰۳ ۔ ۵۶ ایضاً ص

اور مضمون کا خاتمہ وہ ان فقروں پر کرتے ہیں کہ "قرآن کا ہر ایک لفظ احکام مذہبی سے علاقہ نہیں رکھتا۔ اگر میں اپنے ہم نام مُلّا احمد جونپوری کی تفسیر آیات احکام ہی کو تسلیم کر لوں تو صرف پانسو آیات احکام اس میں ہیں اور درحقیقت اتنی بھی نہیں۔ پس دُنیاوی اُمور کا قرآن مجید میں ذکر ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ دنیاوی معاملات بھی مذہب میں داخل ہیں۔"

سر سید کے مضامین تہذیب الاخلاق میں شائع ہونے لگے تو قدامت پرست حلقوں میں کہرام مچ گیا۔ اور "اسلام خطرے میں ہے" کی دہائی دی جانے لگی۔ بس پھر کیا تھا سر سید پر ہر سمت سے تہمتوں اور دشنام طرازیوں کے تیر برسنے لگے۔ کسی نے کہا سید احمد خاں کرسٹان ہو گیا ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ ملحد، نیچری، کافر اور دجّال لائق قتل ہے۔ اُس کے کالج کے لئے چندہ دینا اور لڑکوں کو وہاں پڑھنے کے لئے بھیجنا ناجائز ہے۔ تہذیب الاخلاق کے جواب میں کئی اخبار نکالے گئے اور اشتہار جاری کئے گئے کہ سید احمد خاں سے کوئی نہ ملے نہ اُن کے ساتھ کھانا کھائے اور جو ایسا کرے گا وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ مولویوں نے اس پر بھی اکتفا نہ کی بلکہ مولوی امداد العلی نے ملک کے بڑے بڑے شہروں کے علماء دین سے فتوے جمع کئے اور ایک رسالہ "امداد الآفاق برجم اہل النفاق بہ جواب پرچہ تہذیب الاخلاق" چھاپ کر تمام ہندوستان میں مفت تقسیم کیا۔ مولوی عبد الحیٔ فرنگی محل اپنے فتوے میں لکھتے ہیں کہ

"وجود شیطان اور اجنّہ منصوص قطعی ہیں اور منکر اس کا شیطان ہے۔ بلکہ اُس سے بھی زائد ——— اور وجود آسمان منصوص قرآنی ہے منکر اُس کا مبتلائے وسواس شیطانی ہے۔ مذہب نیچر خدا جانے کیا بلا ہے ہر متشرّع اور متدیّن کو اُس کے قبول سے اِبا ہے ۔۔۔۔ ہر مسلمان کو حق جل شانہ، اتباع شریعت محمدیہ پر قائم رکھے اور مذہب نیچر اور مشرب بدتر سے محفوظ رکھے۔ جو شخص مخرّب دین، ابلیس لعین کے وسوسے سے صورتِ اسلام میں تخریبِ دینِ محمدی کی فکر میں ہے اور بنام تجدید مذہب

جدیدہ افساد شریعت اُس کی منظورِ نظر ہے، جو چیزیں کہ اُس کے نزدیک موجبِ تہذیب ہیں اہلِ سُنت کے نزدیک باعثِ تخریب ہیں۔" ^۲۴۵^

اگرچہ دِلّی، رام پور، امروہہ، مُراد آباد، بریلی، لکھنؤ، بھوپال وغیرہ کے ساٹھ عالموں، مولویوں اور واعظوں نے کفر کے فتووں پر دستخط کئے تھے مگر، صرف خدا کی طرف سے اس کی تصدیق اور تصویب باقی رہ گئی تھی سو مولوی علی بخش خاں نے یہی پوری کر دی۔ انہوں نے حجاز جا کر مکّے کے چاروں فقہوں کے چاروں مُفتیوں سے سرسید کے خلاف فتویٰ حاصل کیا جس میں اِن مُفتیوں نے سرسید کے لئے "ضرب وحبس" کی سزا تجویز کی تھی۔ مدینہ منورہ کے مفتی احناف شیخ محمد امین بالی نے اپنے فتوے میں سرسید کی سزا اور بڑھادی اور اُن کو واجب القتل قرار دے دیا لیکن خیریت گذری کہ سید احمد خان ہندوستان میں تھے۔ اگر عثمانی سلطنت کی رعیت ہوتے تو شاید قتل کر دیئے جاتے۔ مولانا حالی حیاتِ جاوید میں لکھتے ہیں کہ مولویوں کے اشتعال دلانے پر بعض سرپھروں نے سرسید کو قتل کرنے کی تیاری بھی کرلی تھی مگر ارادے کو عمل میں لانے کی نوبت نہیں آئی البتہ گالیوں اور دھمکیوں کے خطوط سرسید کے پاس آخر وقت تک آتے رہے۔

سرسید کے سیکولر خیالات کو وہ مقبولیت نصیب نہیں ہوئی جس کی اُن کو توقع تھی۔ اس کی بڑی وجہ حالات کی ناسازگاری تھی۔ سیکولر خیالات صنعتی نظام کے ماحول میں جڑ پکڑتے اور بار آور ہوتے ہیں نہ کہ فیوڈل ماحول میں چنانچہ سیکولر خیالات اور اداروں نے کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں جہاں صنعتی ماحول تھا نسبتاً زیادہ ترقی کی۔ جب کہ سرسید اُس خطے میں سیکولرازم کی تبلیغ کر رہے تھے جو خالصتاً فیوڈل تھا اور جہاں کے مسلمانوں کی فکری اور تہذیبی قدریں بھی فیوڈل تھیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ سیکولرازم کا نازک پودہ اِس سرزمین سے از خود نہیں اُگا تھا بلکہ سات سمندر پار سے یہاں لایا گیا تھا۔ اور لانے والے بھی غیر ملکی آقا تھے جن کی اچھی باتیں بھی لوگوں کو بُری لگتی تھیں اور جن کی طرف سے

---

^۲۴۵^ منقول از حیاتِ جاوید مصنفہ مولانا حالی صد ۶۲۹۔ لاہور دسن ندارد

ہر دم یہ خدشہ رہتا تھا کہ ؎

ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

کالجوں اور اسکولوں میں انگریزی تو مجبوراً پڑھنا پڑتی تھی کہ اس کے بغیر سرکاری نوکری نہیں مل سکتی تھی نہ کاروبار چل سکتا تھا لیکن لوگ مغربی خیالات کو قبول کرنے پر مجبور نہ تھے۔

مزید برآں سرسید کی تعلیمی پالیسی بڑی ناقص تھی۔ اُن کی نظر میں آکسفورڈ اور کیمبرج مثالی یونیورسٹیاں تھیں جن میں اُونچے طبقے کے نوجوان تعلیم پاتے تھے اور بعد میں پارلیمنٹ کے رکن، وزیر، سفیر یا سول سروس کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے تھے۔ سرسید بھی چاہتے تھے کہ ایم۔ اے۔ او کالج کی روش یہی ہو اور مسلمان طلبا وہاں سے نکل کر ڈپٹی کلکٹر، جج اور کپتان پولیس بنیں۔ کامرس، انجینئرنگ اور ڈاکٹری جیسے آزاد پیشوں کی طرف اُن کا ذہن کبھی نہیں گیا حتیٰ کہ انہوں نے ٹیچرس ٹریننگ کالج بھی قائم نہ کیا۔ اس فروگذاشت کا سبب ممکن ہے کہ وسائل کی کمی ہو لیکن ہم کو اُن کی تحریروں میں بھی صنعتی نظام کی اہمیت اور افادیت کا ذکر نہیں ملتا۔ نہ وہ لوگوں کو فیکٹریاں اور ملیں لگانے کی تلقین کرتے ہیں نہ اُن کو تجارت یا ٹیکنیکل علوم و فنون کی ضرورت کا احساس ہے۔ ان باتوں کا اگر کہیں ذکر ہے تو برسبیل تذکرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ سرسید نے مغربی تہذیب ہی کو مغربی تمدن سمجھ لیا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ مسلمانوں نے اگر انگریزی زبان سیکھ لی اور مغربی تہذیب اپنا لی تو اُن کے اقتصادی اور سیاسی مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے (مسلمانوں سے اُن کی مراد اونچے اور درمیانہ طبقے کے افراد تھے) اس لحاظ سے وہ مرزا غالب کی فکری سطح تک بھی نہیں پہنچ سکے جنہوں نے سرسید کو مغربی تمدن کو قبول کرنے کا مشورہ دیا تھا اور صنعتی نظام کی خوبیاں بتائی تھیں، انگریزوں کے طرز طعام و لباس کی ثنا خوانی نہیں کی تھی۔

برطانوی حکومت ہند کی غیر مشروط اطاعت و فرمانبرداری سرسید کا مسلک تھی۔ وہ برابر یہی کوشش کرتے رہے کہ مسلمان ملکی سیاست سے دور رہیں اور کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جو انگریزوں کی ناراضگی کا باعث ہو۔ نہ کالج کے طالب علموں کو بھی سیاسی مسائل میں دلچسپی

بینے اور سیاسی بحثوں میں اُلجھنے سے سختی سے منع کرتے تھے۔ احتیاط کی حد یہ تھی کہ تہذیب الاخلاق کا داخلہ بھی کالج میں بند تھا۔ طرفہ تماشا یہ کہ انہوں نے ایک انگریز مسٹر بک کو کالج کا پرنسپل مقرر کر رکھا تھا جو نہایت قدامت پرست شخص تھا۔ اس کو سرسید کے مزاج میں اور اُن کی سیاسی پالیسی وضع کرنے میں بڑا دخل تھا۔ غالباً اُسی کے مشورے سے سرسید نے مسلمانوں کو ملکی سیاست اور نئے تمدنی دھارے سے الگ رہنے کا مشورہ دیا اور جو سیکولر اور لدے نئے ماحول میں نشوونما پا رہے تھے اُن میں شرکت سے باز رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علی گڑھ سے انگریزی داں تو کھیپ کے کھیپ نکلے مگر روشن خیال شاذ و نادر۔ غالب اکثریت اُن لوگوں کی تھی جن کی ذہنیت غلامانہ تھی اور غلامانہ ذہنیت سے روایت پرستی کو تقویت ملتی ہے نہ کہ سیکولرازم کو۔

علی گڑھ تحریک کی ان خامیوں کے باوجود ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمان سیکولر فکر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ علم سیاست مدن کے اُصولوں سے پہلی بار واقف ہوئے: ری پبلک کیا ہے، جمہوریت کس کو کہتے ہیں، اقتدار اعلیٰ سے کیا مراد ہے۔ تقسیم اختیار کے اعتبار سے ریاست کے عناصر ثلاثہ کون کون سے ہیں، مجلس قانون ساز کے حقوق و فرائض کیا ہیں اور اس کا انتخاب کیسے ہوتا ہے۔ حقِ رائے دہی کیا شے ہے۔ نمائندہ حکومت کیسے بنتی ہے، قومی حقِ خود ارادیت کے کیا معنی ہیں، وفاقی اور وحدانی ریاستوں میں کیا فرق ہے، صوبائی خود مختاری کی تعریف کیا ہے۔ بنیادی حقوق کیا ہیں اور کیسے حاصل کئے جاتے ہیں، سیاسی پارٹیاں کیوں اور کیسے تشکیل پاتی ہیں یہ سوالات سیکولر علوم سے آگہی کی بدولت لوگوں کے ذہنوں میں اُبھرے اور سیکولر علوم اور سیکولر اداروں کے تجربے ہی نے ان سوالوں کے جواب فراہم کئے۔ نہ وید اور پُران نے رہبری کی، نہ توریت و انجیل نے اور نہ امام غزالی اور امام فخرالدین رازی نے۔ سیکولرازم کے نام سے چڑھنے والے ہمارے سیاست داں حضرات یہ محسوس نہیں کرتے کہ اُن کے نطق و دلب سے نکلا ہوا ہر سیاسی کلمہ سیکولر فکر ہی کی ترجمانی کرتا ہے ورنہ اہلِ مشرق کے فرشتوں کو بھی ان باتوں کی خبر نہ تھی۔

، صورت احوال یہ ہے کہ یہ حضرات کل تک بڑے فخر سے دعویٰ کرتے تھے کہ ان تصورات کا مرجع و منبع اسلام ہے اور مسلمانوں ہی نے یہ باتیں یورپ والوں کو سکھائیں آج بڑی ڈھٹائی اور بے شرمی سے اپنے ہی دعووں کی تردید کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ باتیں غیر اسلامی ہیں۔ اسلام کا اپنا مخصوص سیاسی نظام ہے جس کی اساس امیر کی اطاعت ہے خواہ امیر نے اقتدار بزور شمشیر کیوں نہ حاصل کیا ہو اور مجلس شوریٰ ہے خواہ مجلس شوریٰ کو کسی فرد واحد ہی نے کیوں نہ نامزد کیا ہو۔ ہم گھوم پھر کر ایک صدی پیچھے پہنچ گئے ہیں جب وائسرائے ہند اپنی کونسل نامزد کیا کرتا تھا۔ اور سر سید مسلمانوں کو حکومت ہند کی اطاعت کا سبق پڑھایا کرتے تھے۔

سیکولر فکر کی جمہوری قدروں کے بارے میں ہم نے ابھی ابھی جو دعوے کئے وہ تاریخی حقیقتوں پر مبنی ہیں چنانچہ مسٹر الطاف گوہر کو بھی ہر چند کہ وہ سیکولرازم کے سخت مخالف ہیں اعتراف کرنا پڑا ہے کہ

"سیکولر معاشرے کے ممتاز ادارے (۱) وہ مقننہ ہے جو آزاد اور غیر جانب دارانہ الکشن کے عمل کے ذریعہ وجود میں آئے (۲) وہ عدلیہ ہے جس کو مرکزی اور خود مختاری مرتبہ حاصل ہو (۳) وہ انتظامیہ ہے جو عدلیہ اور عدالتی حاکمیت کی اطاعت کرتی ہو (۴) وہ پریس ہے جو رائے عامہ کے اظہار و تشکیل کا مقبول حربہ ہے۔"[۴۸]

موصوف کی رائے میں یہ ادارے سیکولرازم کا "اعلیٰ نصب العین ہیں .... جن کے لئے سیکولر سوسائٹی نے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔" مگر ان کو مغرب کی سیکولر سوسائٹیوں سے شکوہ ہے کہ انہوں نے اپنے نصب العین سے بے وفائی کی بالخصوص مشرق میں جہاں سامراجی طاقتوں نے سیکولر اصولوں پر عمل نہیں کیا۔ اغیار کا گلہ شکوہ بجا و درست لیکن آزادی کے بعد پاکستان میں ان اصولوں سے جو بے وفائیاں اپنوں نے کیں ان کا شکوہ

---

[۴۸] 48. Translation from Quran, P. 21, Lahore, 1975

ہم کس سے کریں۔ الطاف گوہر صاحب ایک زمانے میں پاکستان کے سیکرٹری اطلاعات اور فیلڈ مارشل ایوب خان کی ناک کے بال تھے۔ اُن کے "عشرۂ ترقی" کے دوران سیکولر سوسائٹی کے ممتاز اداروں کو جس بیدردی سے نیست و نابود کیا گیا اُس سے مسٹر الطاف گوہر سے زیادہ کون واقف ہوگا۔ ملکی آئین کی منسوخی، مارشل لاء کا نفاذ، اسمبلیوں اور وزارتوں کی برطرفی، شہری حقوق کی ضبطی، اخباروں پر کڑی سنسر شپ، ہزاروں بے قصور افراد کی گرفتاری اور اسیریوں، دانش وروں اور صحافیوں کے ضمیر کی خرید و فروخت ؎

مجھے یاد ہے وہ ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مسٹر الطاف گوہر نے اپنے ایک مقالے میں مغرب کے اخلاقی اور روحانی انحطاط پر بڑی تفصیل سے تبصرہ کیا ہے۔ اُن کی رائے ہے کہ "سیکولر سوسائٹی اور سیکولر ادارے شکست و ریخت کی حالت میں ہیں"[۴۹] سرمایہ داری نظام کے داخلی تضاد اور دیوالیہ پن کی وجہ سے مغربی معاشرے میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں الطاف گوہر صاحب نے اُن کی ذمہ داری سیکولرازم کے سر تھوپ دی ہے۔ کوئی اُن سے پوچھے کہ بندہ نواز سیکولرازم کے جن اصولوں کے آپ خود معترف ہیں سرمایہ دار طبقہ اگر اُن سے "غداری"[۵۰] کرتا ہے تو اس میں سیکولرازم کا کیا قصور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغرب کے اخلاقی اور روحانی انحطاط کا بنیادی سبب ہی یہ ہے کہ وہاں کا سرمایہ داری نظام سیکولرازم سے غداری کر رہا ہے۔ اگر زوال مغرب کا باعث سیکولر خیالات ہوتے تو وہ اخلاقی یا روحانی خرابیاں جن میں مغرب مبتلا ہے سوشلسٹ ملکوں اور عوامی جمہوریتوں میں بھی عام ہوتیں۔ کیونکہ یہ معاشرے تو زیادہ ہی سیکولر ہیں۔ مگر کیا کسی نے سنا کہ سوویت یونین یا چین یا ویت نام یا کیوبا یا ہنگری وغیرہ میں بھی مغرب کے سرمایہ دار ملکوں کی طرح نائٹ کلب اور جوئے خانے کھلے ہوئے ہیں یا عیاشی کے اڈے قائم ہیں یا عورتیں سڑکوں پر کھڑی اپنے جسم کا سودا کرتی رہتی ہیں یا بیسواؤں کے محلے آباد ہیں یا غنڈے بدمعاش چرس پی کر راہگیروں کو لوٹتے

۴۹۔ 49. The Challenge of Islam : Ed. Altaf Gauhar, P. 298. London, 1978

مانتے ہیں، یا سرمنڈے لونڈے کالے لوگوں پر چھرے چاقو سے حملے کرتے ہیں گولیاں چلاتے ہیں اور اُن کے گھروں مکانوں کو آگ لگاتے ہیں۔ کیا کبھی کسی نے سُنا کہ وہاں بھی بینکوں پر دن دہاڑے ڈاکے پڑتے ہیں اور رات کے وقت سنسان سڑکوں پر چلنا خطرناک ہے کیا کبھی کسی نے سُنا کہ سوشلسٹ ملکوں میں بھی جرائم پیشہ گروہ پولیس سے مل کر سیاہ کاروبار چلاتا ہے۔ کیا سوشلسٹ ملکوں میں بھی لوگ ذریعہ معاش کی بے یقینی کے باعث ضبطِ تولید پر مجبور ہوتے ہیں۔ کیا وہاں بھی لاکھوں کروڑوں بیشتے کتنے لوگ ذہنی اور اعصابی بیماریوں میں مبتلا ہیں یا نرخ بالا کرنے کی غرض سے گیہوں، آلو اور کافی کے ذخیرے ضائع کردئیے جاتے ہیں۔ کیا وہاں بھی کروڑوں بے روزگاروں کی "محفوظ فوج" جنگ کا ایندھن بننے کی خاطر موجود ہے۔ کیا ان ملکوں میں بھی ہر پانچویں ساتویں برس اقتصادی بحران آتا رہتا ہے اور مہنگائی اور افراطِ زر نے لوگوں کی زندگی اجیرن کردی ہے۔

اگر ان سوالوں کا جواب نفی میں ہے اور لازماً نفی میں ہوگا تو ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ الطاف گوہر صاحب نے مشرق و مغرب کے سرمایہ دار حلقوں سے اپنے گہرے روابط کی وجہ سے اصل مجرم یعنی سرمایہ دارانہ نظام کی نشان دہی سے گریز کیا ہے اور سیکولرازم کو قصوروار ٹھہرایا ہے۔

مسٹر الطاف گوہر فرماتے ہیں کہ (۱) سیکولرازم اور اسلام میں کوئی شے مشترک نہیں ہے (۲) سیکولرازم اسلام کی مکمل ضد ہے کیونکہ سیکولرازم خدا، الہام اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتی (۳) سیکولرازم کا بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ دنیا میں مادی خوش حالی انسانی مسرت کا اہم ذریعہ ہے[ا]

ہم فاضل مضمون نگار سے پوچھتے ہیں کہ جناب والا جب آپ یہ کہتے ہیں کہ اسلام اور سیکولرازم میں کوئی چیز مشترک نہیں تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اسلام منتخب شدہ مقننہ کے خلاف ہے یا اسلام آزاد عدلیہ کے خلاف ہے یا اسلام منتخب شدہ انتظامیہ

[ا] ایضاً ص ۲۹۹، ۳۰۰

کے خلاف ہے یا اسلام پریس کی آزادی کے خلاف ہے یا اسلام شہریوں کے بنیادی حقوق اور جمہوریت کے خلاف ہے۔ کیونکہ سیکولرازم کے بنیادی اصول آپ کے قبول ہی نہیں مگر آپکا جواب اثبات میں ہے تو آپ کے اسلام اور سیکولرازم میں واقعی کوئی چیز مشترک نہیں ہے مگر جس اسلام کی آپ وکالت کر رہے ہیں وہ تیل کے مالکوں اور اُن کے ضمیر برداروں کا اسلام ہو تو ہو عام مسلمانوں کا اسلام ہرگز نہیں ہے۔

جہاں تک خدا، الہام اور آخرت پر ایمان کا تعلق ہے تو عرض یہ ہے کہ سیکولرازم کا دائرۂ فکر و عمل مذہبی عقاید سے متصادم نہیں بلکہ الگ ہے۔ سیکولرازم کو کسی فرد جماعت یا معاشرے کے مذہبی عقاید سے کوئی سروکار نہیں۔ سیکولرازم کا مسلک وہی ہے جو سر سید کا ہے یعنی دینی اُمور اور دنیاوی اُمور کے تقاضے اور دائرۂ کار جُدا جُدا ہیں لہٰذا نہ ریاست کو اپنے باشندوں کے مذہبی عقاید میں مداخلت کرنی چاہئے اور نہ مذہب کو ریاستی اُمور میں دخل دینا چاہئے۔

اس کلیہ کی بنا پر سیکولر ریاست کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ فرد اور جمعیت کو مذہبی آزادی کی پوری پوری ضمانت دے اور اس بات کا خیال رکھے کہ کوئی گروہ یا طبقہ کسی دوسرے کی مذہبی آزادی کو غصب نہ کرنے پائے۔ سیکولر ریاست میں ہر شخص بلالحاظ مذہب مساوی درجے کا شہری ہوتا ہے۔ سیکولر ریاست کسی شہری کے مذہبی معاملات میں دخیل نہیں ہوتی نہ کسی کو مذہبی عقاید کی پابندی کرنے یا نہ کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ سیکولر ریاست آئینی طور پر کسی مذہب سے وابستہ بھی نہیں ہوتی نہ کسی مخصوص فرقے کے عقاید کو فروغ دیتی ہے۔ اس تصور کے پیشِ نظر فرد، ریاست اور مذہب کے مابین رشتوں کی تین جوڑیاں بنتی ہیں[۵۱]

۱ : فرد اور مذہب

۵۱

51. Donald E. Smith : India as a Secular State, P. 5. Princeton, U.S.A., 1963

فرد، ریاست اور مذہب کے رشتوں کی اس بحث کے لئے راقم مسٹر ڈونلڈ اسمتھ کا

ممنون ہے

۲ : فرد اور ریاست

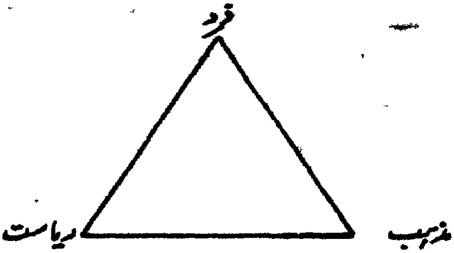
۳ : مذہب اور ریاست

۱ : فرد اور مذہب پر غور کرتے وقت بقیہ دونوں رشتوں کو نظر انداز کرنا پڑے گا۔ یہ رشتہ ریاست کے وجود میں آنے سے ہزاروں برس پہلے بھی موجود تھا اور آج بھی دنیا کے بعض گمنام گوشوں میں ایسے قبیلے ہیں جن کا کوئی نہ کوئی مذہب ضرور ہے مگر اُن کی زندگی میں ریاست کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ اُن کو نہ ریاست کے وجود کی پروا ہے نہ وہ ریاستی قوانین کے تابع ہیں۔ یہودی مذہب، دین مسیحی اور اسلام کی تاریخ بھی شاہد ہے کہ فرد اور مذہب کا رشتہ ریاست سے منسلک نہیں ہے۔ شریعت موسوی اُس وقت نازل ہوئی جب بنی اسرائیل صحرائے سینا میں خانہ بدوشی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور اسرائیلی ریاستوں کا نام و نشان نہ تھا۔ گوتم بدھ نے چھٹیں صدی قبل مسیح میں بدھ مت کا پرچار شروع کیا لیکن پہلی بدھ ریاست تین سو سال بعد اشوک اعظم نے قائم کی۔ عیسائی مذہب کی تاریخ بھی یہی ہے۔ چنانچہ پہلی عیسائی ریاست حضرت مسیح کے تین سو سال بعد فلسطین سے سینکڑوں میل دور قسطنطنیہ میں قائم ہوئی۔ خود اسلام کا ظہور کسی ریاست کا مرہونِ منت نہیں بلکہ مکے میں تو جہاں آنحضرت صلعم نے اسلام کا اعلان فرمایا اسلام کے دشمنوں کا غلبہ تھا۔ مسلمانوں نے ہندوستان پر سات سو سال حکومت کی لیکن دہلی، یوپی اور بہار میں مسلمانوں کی آبادی ۱۴ فی صد سے کبھی آگے نہ بڑھی۔ اگر اسلام کا دار و مدار ریاست کی قوت قاہرہ پر ہوتا تو کم از کم شمالی ہند میں ہندو مذہب کا کوئی نام لیوا باقی نہ رہتا۔ انڈونیشیا، ملایا، سری لنکا، برما، تھائی لینڈ اور فلپائن میں مسلمان کروڑوں کی تعداد میں آباد ہیں مگر وہ ریاست کے دباؤ سے تو مسلمان نہیں ہوئے۔ انگریزوں نے یہاں ڈیڑھ دو سو سال تک راج کیا لیکن وہ کے فی صد ہندوستانیوں کو عیسائی بنا پائے۔ پس معلوم ہوا کہ مذہب کا دار و مدار ریاست پر نہیں ہے۔ اگر مودودی صاحب اسلام کے لئے ریاست کی قوت قاہرہ کو ضروری سمجھتے ہیں تو وہ مذہب اور ریاست دونوں کی تاریخ سے ناواقفیت کا ثبوت دیتے ہیں۔

اگر ہم ریاست اور مذہب کے رشتے سے صرفِ نظر کر لیں تو فرد کی مذہبی آزادی کا تصور نمایاں ہو جاتا ہے۔ ریاست اس رشتے سے بے تعلق ہو جاتی ہے۔ ریاست کے ہر باشندے کو اختیار ہوتا ہے کہ جس مذہب کو چاہے قبول کرے اور جس کو چاہے رد کر دے۔ اگر کوئی شخص خدا، الہام اور آخرت پر یقین رکھتا ہے تو شوق سے رکھے۔ ریاست کو اُس سے بازپرس کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ ریاست کسی خاص مذہبی رسم یا مذہبی فریضے کی حمایت یا مخالفت میں قانون نافذ کرنے کی مجاز نہیں ہوتی البتہ اُس کو یہ حق ضرور ہوتا ہے کہ امن عامہ کے تحفظ یا حفظانِ صحت کے اصولوں کے پیشِ نظر مذہبی رسوم کی ادائگی کے ضابطے مقرر کرے مثلاً سفر حج کے ضابطے، مذہبی جلسوں جلوسوں کی نگرانی یا دل آزار تقریروں تحریروں کی ممانعت مگر ریاست کو مذہبی تنظیموں پر یا مذہبی عقاید کی تبلیغ و اشاعت پر پابندیاں عاید کرنے کا حق نہیں ہوتا۔

فرد اور ریاست کے رشتے پر غور کرتے وقت ہم کو تیسرے عنصر یعنی مذہب کو نظر انداز کرنا پڑے گا۔ ریاست میں فرد کی حیثیت شہری کی ہوتی ہے اور اُس کے شہری حقوق مذہبی عقاید سے متعین نہیں ہوتے۔ ریاست کی نظر میں ہندو مسلمان عیسائی پارسی شہری ہونے کی حیثیت سے برابر ہوتے ہیں۔ ریاست کسی ایک مذہب کے شہری کو دوسرے مذہب کے شہری پر فقط مذہب کی بنا پر ترجیح نہیں دے سکتی نہ ایسے قانون وضع کر سکتی ہے جس سے ایک مذہب والوں کو فائدہ اور دوسروں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ ریاست کسی مذہب سے امتیازی سلوک بھی نہیں کر سکتی نہ ایسا نصاب تعلیم جاری کر سکتی ہے جس سے کسی مخصوص مذہب یا فرقے کی جانب داری یا مخالفت مقصود ہو اور نہ کسی فرقے پر کوئی مخصوص ٹیکس لگا سکتی ہے۔

فرد، ریاست اور مذہب کے رشتوں کی شکل ایک مثلث کی سی ہے جس کا بالائی سرا فرد کی نمائندگی کرتا ہے اور زیریں گوشے ریاست اور مذہب کی نمائندگی کرتے ہیں۔



مذہب کی آزادی کا تعلق فرد سے ہے لہٰذا ریاست کا پہلو اس سے خارج ہے۔ فرد کے شہری حقوق کا تعلق ریاست سے ہے لہٰذا مذہب کا پہلو اس سے خارج ہے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب ریاست مذہب سے جدا ہو۔ ریاست اور مذہب میں جتنا قریبی تعلق ہوگا فرد کی مذہبی اور شہری آزادیاں اُسی نسبت سے متاثر ہوں گی۔ اس کے برعکس مذہب ریاست سے جتنا دور ہوگا مذہب اور ریاست دونوں کو آزادی سے ترقی کرنے کے اُتنے ہی زیادہ مواقع ملیں گے۔

مسٹر الطاف گوہر کے اس الزام کو کہ سیکولرازم کے نزدیک دُنیاوی خوش حالی انسانی مسرت کا اہم ذریعہ ہے ہم اقراری مجرم بن کر بخوشی تسلیم کرتے ہیں مگر مجرموں کے کٹہرے میں ہم اکیلے نہ ہوں گے بلکہ کروڑوں فاقہ کش مسلمان ہمارے ساتھ ہوں گے وہ سب لوگ جن کی دلی آرزو ہے کہ دنیا میں آرام اور عزت و آبرو کی زندگی بسر کریں مگر جن کے شب و روز روٹی، روزگار کی تلاش میں گذرتے ہیں، جن کے بچے تعلیم سے محروم ہیں اور جن کے پاس نہ سر چھپانے کی جگہ ہے نہ دوا علاج کے لئے دام ہیں۔ ہماری صفوں میں وہ بزرگ ہستیاں بھی ہوں گی جنہوں نے اپنی زندگی مسلمانوں کی دُنیاوی حالت درست کرنے کی کوششوں میں گذار دیں۔ ہمارے ساتھ سرسید بھی ہوں گے اور علامہ اقبال بھی اور مسٹر محمد علی جناح بھی۔

شکر ہے کہ محکوم ملکوں کے مسلمانوں کی سوچ مسٹر الطاف گوہر کی مابعد الطبیعاتی سوچ سے مختلف تھی ورنہ الجزائر اور لیبیا، شام و یمن، ایران اور انڈونیشیا کبھی آزاد نہ ہوتے نہ پاکستان وجود میں آتا کیونکہ ان ملکوں میں آزادی کی جنگ مسلمانوں کی

دنیا سنوارنے اور اُن کو خوش حالی اور ترقی کے مواقع فراہم کرنے کے لئے لڑی گئی تھی نہ کہ عاقبت درست کرنے کی خاطر۔ اگر بنیادی زندگی کی مسرت و شادمانی مقصود نہ ہوتی تو آزادی کی کیا ضرورت تھی۔ ہم انگریزوں کے غلام تھے مگر اُنہوں نے ہم کو شرعی احکام پر عمل کرنے سے کبھی نہیں روکا نہ اسلام کی تبلیغ پر پابندی لگائی۔ اُنہوں نے ہم کو خدا، الہام اور آخرت پر یقین رکھنے سے منع نہیں کیا۔ نہ کبھی یہ کہا کہ تم نماز پڑھنا، روزے رکھنا اور حج کرنا ترک کر دو۔ پھر مسلمانوں نے تحریک پاکستان میں کیوں حصہ لیا۔ پاکستان کیوں بنایا۔

کہا جاتا ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے۔ یہ شوشہ جماعت اسلامی نے چھوڑا ہے جو تحریک پاکستان کے سخت خلاف تھی اور پاکستان کو ناپاکستان کہتی تھی۔ چنانچہ جسٹس محمد منیر مرحوم نے اپنی کتاب FROM JINNAH TO ZIA میں جماعت اسلامی کی ابلہ فریبیوں کی خوب قلعی کھولی ہے اور بتایا ہے کہ جماعت اسلامی نے اپنے ماضی کے داغ دھونے اور نئی نسل کو (جس کو تحریک پاکستان کا ذاتی تجربہ نہیں) گمراہ کرنے کی خاطر یہ نعرہ ۱۹۵۳ء میں وضع کیا تھا۔ ورنہ مسلم لیگ کی دستاویزیں اور قائداعظم اور تحریک پاکستان کے دوسرے ممتاز رہنماؤں کے بیانات گواہ ہیں کہ تحریک پاکستان ایک سیاسی تحریک تھی جو قومی حق خودارادیت کی بنیاد پر شروع کی گئی تھی اور جس کا مطالبہ تھا کہ مسلمانوں کے اکثریتی علاقوں میں مسلمانوں کو اپنی خود مختار ریاستیں بنانے کا حق دیا جائے۔ مگر قومی حق خودارادیت مغرب کا خالص سیکولر نظریہ ہے جو وہاں ۱۸ ویں صدی میں قومی ریاستوں کے وجود کے دَوران وضع ہوا۔ اِسی نظریے کے مطابق اٹلی، یونان، جرمنی، فرانس، ہالینڈ، بلجیم اور امریکہ غرضیکہ بے شمار مغربی ریاستیں وجود میں آئیں۔ اسی نظریے کے مطابق پہلی جنگ عظیم کے بعد مجلس اقوام نے یورپ میں ہنگری، چیکوسلواکیہ، رومانیہ، بلغاریہ اور یوگوسلاویہ کی نئی ریاستیں قائم کیں اور دوسری جنگ عظیم کے بعد ایشیا اور افریقہ میں درجنوں قومی ریاستیں بنیں۔ قوموں کے حق خود اختیاری کا تصور نہ عیسائی مذہب پیش کرتا ہے اور نہ اسلام۔ اسلام تو اُمّت واحدہ کا قائل ہے جو قوم، نسل، رنگ، زبان

اور جغرافیائی سرحدوں کی تفریق سے زیادہ وسیع اور ارفع تصور ہے۔

پاکستان کا تصور خواہ سر سید احمد خاں کے ذہن کی تخلیق ہو یا علامہ اقبال اور مسٹر محمد علی جناح کی سوچ کا نتیجہ، ان میں سے ہر ایک کا مقصد برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی اور ثقافتی خود مختاری تھی۔ انہوں نے مسلمانوں کی دنیاوی فلاح و بہبود کے پیش نظر آزاد پاکستان کا خواب دیکھا تھا۔ اسی بنا پر ہم تحریک پاکستان کو سیکولر تحریک کہتے ہیں۔

علامہ اقبال کا لقب "مفکر پاکستان" ہے۔ وہ اپنے خطبہ صدارت میں جو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد میں پڑھا گیا تھا فرماتے ہیں کہ

"جہاں تک میں مسلم ذہن پڑھ سکا ہوں مجھ کو یہ اعلان کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی کہ مستقل فرقہ وارانہ سمجھوتے کی خاطر ہندوستانی مسلمان کا اگر یہ حق تسلیم کر لیا جائے کہ وہ اپنی تہذیب و روایت کی روشنی میں آزاد اور مکمل ترقی کا مجاز ہے تو وہ ہندوستان کی آزادی کے لئے سب کچھ داؤں پر لگا دے گا ——— میں چاہوں گا کہ پنجاب، صوبۂ سرحد، سندھ اور بلوچستان ایک ریاست میں ضم کر دیئے جائیں، خواہ سلطنت برطانیہ کے اندر خود مختاری، خواہ سلطنت سے باہر۔ میری نظر میں کم از کم شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کی تقدیر یہی ہے ——— ہندوؤں کو یہ ڈر نہ ہونا چاہیئے کہ ان خود مختار مسلم ریاستوں کے معنی ان میں کسی قسم کی مذہبی حکومت کے قیام کے ہوں گے۔"

اپنے اسی موقف کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مفکر پاکستان نے ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو مسٹر جناح کو لکھا تھا کہ شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو حق خود ارادیت کی مستحق قوم کیوں نہ سمجھا جائے کیونکہ ہندوستان میں اور ہندوستان کے باہر دوسری قوموں کا بھی یہی حال ہے۔ قرارداد پاکستان اسی طرز فکر کی آخری شکل تھی۔ چنانچہ مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس میں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قوموں کے حق خود ارادیت ہی کی بنا پر یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ

جغرافیائی اعتبار سے ملحق وحدتوں کی اس طرح حد بندی کی جائے
کہ جن علاقوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں جیسے ہندوستان کے شمال مغربی
اور مشرقی منطقوں میں ان کو ملا کر آزاد ریاستوں کی تشکیل کی جائے جن
میں شامل ہونے والی وحدتیں خود مختار اور اقتدار اعلیٰ کی مالک (مساوی)
ہوں ۔"

مسٹر جناح نے اپنی تقریروں اور اخباری بیانوں میں مسلمانوں کی قومی انفرادیت کی بار بار تشریح کی ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ "ہم ایک قوم ہیں، ہماری مخصوص تہذیب ہے۔ زبان، ادب، آرٹ اور فن ہیں، اسماء و اصطلاحات ہیں، قدریں اور پیمانیں ہیں، قانون و اخلاق کے ضابطے، رسوم اور جنتری، تاریخ و روایات اور مذاق اور آرزوئیں ہیں۔ مختصر یہ کہ زندگی کے بارے میں ہمارا مخصوص نقطۂ نظر ہے۔ لہٰذا قانونِ قوم کے ہر قاعدے سے ہم ایک قوم ہیں۔" ۵۲

پاکستان میں سیکولر نظام کے حق میں سب سے دلنشیں آواز قائداعظم کی وہ تقریر تھی جو انہوں نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو آئین ساز اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں کی تھی۔ اس تقریر میں انہوں نے حاضرین سے اپیل کی تھی کہ وہ اپنے پرانے اختلافات کو بھول جائیں اور "رنگ، ذات اور عقیدے" کے فرق کو نظر انداز کر کے "اول و آخر پاکستان کے شہری" کی حیثیت سے مل کر کام کریں۔

"ہم کو اسی جذبے کے تحت مل کر کام کرنا چاہیے۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ اکثریتی فرقے اور اقلیتی فرقے کے زاویوں کا فرق مٹ جائے گا۔ کیونکہ مسلمانوں میں پٹھان ہیں، پنجابی ہیں، شیعہ ہیں، سنی ہیں اور ہندوؤں میں برہمن، وشنو اور کھتری ہیں۔ اور پھر بنگالی اور مدراسی ہیں۔ اگر آپ مجھ سے پوچھیں تو میں یہی کہوں گا کہ ہندوستان کے حصولِ آزادی میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی فرق رہا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو ہم کب کے آزاد

۵۲
52. Gunar Myrdal : Asian Drama, Vol. I, P 233, London, 1968

پہنچ چکے ہوتے۔ لہٰذا ہمیں اس سے سبق سیکھنا چاہیئے۔ اب آپ آزاد ہیں۔ آپ مندر میں جانے کے لئے آزاد ہیں۔ آپ مسجد میں جانے کے لئے آزاد ہیں ۔۔۔۔ آپ کسی مذہب، کسی ذات، کسی عقیدے کے بھی ہوں اُمورِ ریاست کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کچھ مدت پہلے انگلستان کے حالات ہندوستان کے موجودہ حالات سے بھی کہیں بدتر تھے۔ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ایک دوسرے کو اذیت پہنچاتے رہتے تھے۔ آج بھی بعض ملک ایسے ہیں جن میں بعض طبقوں کے ساتھ امتیازی برتاؤ ہوتا ہے۔ اور پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم اس عہد میں کام نہیں شروع کر رہے ہیں۔ ہم ایسے عہد میں کام شروع کر رہے ہیں جب ایک فرقے اور دوسرے فرقے کے درمیان کوئی فرق، کوئی امتیازی سلوک نہیں ہے۔ ہم اس بُنیادی اُصول کے تحت کام شروع کر رہے ہیں کہ ہم سب شہری ہیں اور ایک واحد ریاست کے مساوی شہری ہیں۔ انگلستان کے لوگوں کو زندگی کی حقیقتوں سے سابقہ پڑا تھا اور حکومت نے اُن پر جو ذمہ داریاں عائد کی تھیں ان کو پورا کرنا تھا۔ اور وہ اس آگ میں سے قدم بہ قدم گزرے۔ آج آپ یہ کہنے میں حق بہ جانب ہوں گے کہ (وہاں) رومن کیتھولکوں اور پروٹسٹنٹوں کا وجود نہیں ہے۔ جو موجود ہے وہ یہ حقیقت ہے کہ ہر شخص ایک شہری ہے اور برطانیہ عظمیٰ کا مساوی شہری ہے اور وہ سب اپنی قوم کے رُکن ہیں۔

" میرا خیال ہے کہ ہم سب کو یہی نصب العین اپنے سامنے رکھنا چاہیئے اور آپ دیکھیں گے کہ جُوں جُوں وقت گزرتا جائے گا ہندو، ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے۔ مذہبی مفہوم میں نہیں، کیونکہ وہ ہر شخص کا ذاتی عقیدہ ہے بلکہ سیاسی معنی میں، بہ حیثیت ریاست کے شہریوں کے۔"

قائداعظم جب یہ کہتے ہیں کہ اُمورِ ریاست میں مذہبی عقیدوں کا دخل نہیں ہونا چاہیئے تو ظاہر ہے کہ وہ سیکولر ریاست ہی کا مفہوم پیش کر رہے ہیں۔ انہوں نے بار بار انگلستان کا جو ذکر کیا ہے تو وہ پاکستانیوں کو یہ بات ذہن نشین کروانا چاہتے تھے کہ جس طرح انگلستان میں مختلف فرقوں کے لوگ آباد ہیں اور اپنے اپنے عقیدوں کی پیروی کرتے

ہیں مگر مذہب ریاستی اُمور میں دخیل نہیں ہوتا اسی طرح یہاں بھی مذہب کو ریاستی اُمور میں مداخلت نہیں کرنی چاہیئے۔ اور نہ ریاستی اُمور کا تصفیہ مذہبی بنیادوں پر ہونا چاہیے۔

قائداعظم کی سوچ کا انداز سیکولر تھا۔ ان کا آبائی پیشہ تجارت تھا۔ اُن کی تعلیم کراچی، بمبئی اور لندن کے تجارتی شہروں میں ہوئی تھی۔ اُن کو جاگیریت اور مُلائیت سے دُور کا بھی تعلق نہ تھا اور نہ اس خرافات سے اُن کا کوئی مفاد وابستہ تھا بلکہ برطانوی طرزِ فکر و سیاست کی لبرل روایتیں ان کا مزاج بن گئی تھیں۔ چنانچہ تحریک پاکستان کے دوران انہوں نے اس بات پر بار بار زور دیا تھا کہ پاکستان تھیوکریسی نہیں بلکہ ایک ماڈرن جمہوری ریاست ہوگا۔ اگر وہ کچھ دنوں اور جیتے تو شاید سیکولر قدروں کو پامال کرنا آسان نہ ہوتا مگر موت نے اُن کو مہلت نہ دی۔

قائداعظم کے بعد جو حضرات برسراقتدار آئے جاگیری نظام اور اُس کی قدروں سے اُن کا بڑا گہرا رشتہ تھا بلکہ وہ خود نواب اور جاگیردار تھے۔ انہوں نے جمہوریت کو فروغ کی اجازت ہی نہ دی اور نہ خرد مندی کی حوصلہ افزائی کی بلکہ مذہب کی آڑ لے کر نہایت فرسودہ رسوم و توہمات اور رجعت پرست نظریات کی ترویج و اشاعت شروع کر دی۔ وہ مُلاؤں، پیروں اور سجادہ نشینوں سے سازباز کرنے لگے۔ عرسوں، میلاد شریف کے جلسوں، عزاداری کی مجلسوں اور قوالی کی محفلوں میں دن دُونی رات چوگنی ترقی ہونے لگی۔ قبر پرستی عام ہوئی اور مزاروں کی آرائش و زیبائش پر لاکھوں روپے خرچ ہونے لگے۔ ملک میں مویشیوں کی شدید قلت تھی پھر بھی جانوروں کی بے دریغ قربانی پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی۔ اخبار، ریڈیو، ٹی وی غرض کہ ابلاغ کے ذرائع اس مُہم میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں مصروف ہوگئے۔ زرعی پیداوار گھٹتی رہی مگر جاگیری نظام کو منسوخ کر کے زمین کاشتکاروں میں تقسیم کرنے کا کسی کو خیال نہ آیا۔ ابتدا میں تو جمہوری آئین اور بنیادی حقوق کا زبان سے اقرار ہوتا رہا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد یہ تکلف بھی بالائے طاق رکھ دیا گیا اور ملک میں فوجی ڈکٹیٹر شپ قائم ہوگئی۔

بعض حلقوں کا خیال ہے کہ سیکولرازم سوشلزم ہی کا دوسرا نام ہے اور اشترا

کوچہ گرد اپنے سوشلسٹ نظریوں کو سیکولرازم کے چور دروازے سے داخل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جدید سیکولرازم اور سائنسی سوشلزم دونوں صنعتی نظام کے بطن سے نکلے ہیں اور دونوں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں مثلاً سائنسی اندازِ فکر اور سائنسی طرزِ تعلیم پر اصرار، جاگیری نظام کی مخالفت اور صنعتی نظام کی حمایت، جمہوری حکومت اور اقتدارِ اعلیٰ کا غیر مابعد الطبیعیاتی تصور، شہری حقوق کا احترام، آزادیٔ فکر اور ریاست و مذہب کی خود مختاری وغیرہ۔
مگر ان مشترک اقدار کے باوجود دونوں کے اقتصادی نظریات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہر چند کہ کسی سیکولر ریاست کو سوشلزم کے اقتصادی اصولوں کے اختیار کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے لیکن واقعہ یہ ہے سیکولرازم کا رجحان عموماً سرمایہ داری نظام کی جانب رہا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ سیکولرازم دراصل بورژوا جمہوریتوں کا سیاسی نظریہ ہے۔ اگر بینک، فیکٹریاں، ملیں، کانیں، زمینیں اور صنعتی اور تجارتی کارپوریشن چند افراد کی ذاتی ملکیت ہوں اور سرمایہ دار طبقہ محنت کشوں کی قوت محنت کا آزادانہ استحصال کرتا ہے تو بھی سیکولرازم کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ سیکولرازم کو نہ محنت کشوں کی طبقاتی جدوجہد سے کوئی دلچسپی ہے نہ اُن کو برسرِ اقتدار لانا اُس کے لائحہ عمل میں شامل ہے۔ اس کے برعکس سوشلزم دولت آفرینی کے ذرائع کو جن پر استحصالی طبقوں کا قبضہ ہے قومی ملکیت میں تبدیل کرنے کا مطالبہ کرتا ہے تاکہ ان کا انتظام محنت کشوں کی چُنی ہوئی حکومت اور چُنے ہوئے نمائندوں کے سپرد ہو اور معاشرے کی تنظیم اس اصول پر ہو کہ جو محنت کرے گا وہ کھائے گا، یعنی سوشلسٹ معاشرے میں بچوں، بوڑھوں اور بیماروں سے قطع نظر کسی مفت خورے گروہ کی گنجائش نہ ہوگی یہی بنیادی فرق ہے جس کی وجہ سے بیشتر سیکولر ریاستوں کا اقتصادی نظام سرمایہ دارانہ ہے بلکہ بعض ریاستوں کا حاکم طبقہ تو سوشلزم کا شدت سے مخالف ہے مثلاً امریکہ، برطانیہ جنوبی افریقہ، انڈونیشیا اور ترکی وغیرہ

سوشلزم کو سیکولرازم کی سپر بھی درکار نہیں ہے۔ سوشلزم کے بازو اتنے قوی ہیں

کہ اُس کو اپنی ڈیڑھ سو سال کی تاریخ میں سیکولرازم کی بیساکھی لگانے کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئی۔ آج آدھی دنیا میں معاشرے اور ریاست کی تعمیر نو اگر سوشلسٹ نظریات کے مطابق ہو رہی ہے تو یہ سیکولرازم کا فیض نہیں بلکہ محنت کشوں کی جدوجہد کا ثمر ہے۔ سوشلزم کے بڑھتے ہوئے اخلاقی وقار کا اندازہ اِس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بہت سے ملک جو دراصل سوشلسٹ نہیں ہیں وہ بھی خود کو سوشلسٹ کہتے ہیں مثلاً یونان، فرانس، سویڈن، ڈنمارک، ناروے، شام و عراق، چین اور ہندوستان، برما اور سری لنکا حتیٰ کہ مصر بھی۔ آخر ہٹلر کی فاشسٹ پارٹی کا نام بھی "نیشنل سوشلسٹ" پارٹی تھا۔

پاکستان گذشتہ ۳۰، ۳۲ برس سے سیاسی اور اقتصادی بحرانوں کا شکار ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ یہاں زندگی کے ہر شعبے میں فیوڈل عناصر اور فیوڈل اقدار کا غلبہ ہے۔ حالانکہ فیوڈلزم مدت ہوئی اپنی افادیت کھو چکا ہے اور اب اُس میں عصرِ حاضر کے تقاضوں سے عہدہ برا ہونے کی صلاحیت باقی نہیں۔ وہ ایک پیر تسمہ پا ہے جس کو گردن پر سے اُتارے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ یہ اُسی وقت ممکن ہے جب جمہوری اُصولوں کو فروغ کا موقع ملے اور معاشرے کی از سرِ نو تنظیم سیکولر خطوط پر کی جائے۔ اس تاریخی منصب کو ملک کے روشن خیال عناصر عامتہ الناس کے عملی تعاون ہی سے پورا کر سکتے ہیں۔

بشکریہ مکتبہ دانیال، کراچی

مختار زمن ـ

اقبالی مجرم

تمام پاکستانیوں کی طرح میں بھی اپنے کو عاشقانِ اقبال میں شمار کرتا ہوں۔ میں نے حضرت علامہ مرحوم کو کبھی نہیں دیکھا۔ البتہ محترم علی بخش عفی عنہ کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کیں۔ حضرت کے کوٹ کی زیارت کی، چھڑی اور چشمے کے درشن کئے۔ حضرت کی لکھی ہوئی ان تمام قوالیوں کے ریکارڈ جمع کئے۔ جنہیں کتابت کی غلطی سے لوگ نظمیں، غزلیں اور قطعات وغیرہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

جب علامہ مرحوم کی صد سالہ برسی شروع ہوئی تو گویا میرے لئے ایک نیا پیغام زندگی لائی۔ چنانچہ میں نے طے کیا کہ ہر جلسے میں شرکت کروں گا اور ہر پروگرام کو غور سے سنوں گا۔ اور ہر تصویر کو تکتا ہی رہوں گا ؎

عاشقوں کی نگہ شوق کہیں تھکتی ہے

ایک دن کا حال بیان کرتا ہوں تاکہ اندازہ ہو جائے کہ میرے شب و روز کیونکر گذرتے رہے۔

صبح کو آنکھ کھلی تو ریڈیو کھولا۔ قوال یہ قوالی گا رہے تھے ؎

جو صنم کدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی "ہری ہری"

آ ہے ہری ہری، وا ہے ہری ہری

خواجہ ہری، ہری۔ ہاں ہاں ہری ہری

اقبال پڑھ کر طبیعت واقعی ہری ہو گئی۔ اتنی دیر میں اخبار آ گیا۔ اس میں نہایت اہم مضامین تھے۔ تحقیق کی خوب داد دی گئی تھی۔ چنانچہ مضامین کاٹ کر تراشوں کے رجسٹر میں چپکائے، مضامین کچھ اس قسم کے تھے "عقاب سال خوردہ اقبال کا اثر" ——— "اقبال کی نظر میں مستقبل کی ریاست پاکستان کا میزانیہ" ——— "قصبہ گوجنگی میں پانچواں یوم اقبال" ——— گھر محلے کے اسکول میں اسی روز پہلا یوم اقبال منایا جا رہا تھا۔ وہاں پہنچا تو طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ بچے یونیفارم پہنے ہال میں بیٹھے تھے، ایک نہایت تیز طرار بارعب بزرگ جو عربی، فارسی اور فلسفے کے اسکالر ہیں انھیں لکچر پلا رہے تھے۔ لکچر کا عنوان تھا "فلسفۂ مابعد الطبیعات میں حکیم نطشے کی وحدت تھیوری اور علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کا آہنگِ بلند"، عنوان سے ہی، طبیعت میں بالیدگی پیدا ہو گئی اور ذہن غیر مرئی دھند میں کھو گیا۔ جوشِ خطابت میں جب مقرر صاحب اسٹیج کے ایک کونے سے اُچک کر دوسرے کونے تک جاتے، پھر یہ سوچ کر کہ مائیکروفون دور ہو گیا۔ ایک دم پلٹتے تو بچے خوشی سے پاگل ہو جاتے۔ یہ علامہ کے کلام معجز نظام کا کرشمہ تھا کہ مقرر خود شاہین بچہ معلوم ہو رہا تھا۔ اسی کردار کی ضرورت بھی ہے ؎

جھپٹ کر پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

لکچر سن کر مجھے بڑا اطمینان اور خوشی محسوس ہوئی۔ شروع سے ہی بچوں کو اگر اس قسم کے لکچر دیئے جائیں اور شاہین وغیرہ کے کردار کے عملی نمونے بھی ان کے سامنے پیش کئے جائیں تو قوم کا بیڑا پار ہے مثلاً حکیم نطشے۔ برگساں۔ میک ڈوگل۔ شوپنہار۔ روسی اور سنائی کے فلسفے کی خوبیاں اور خرابیاں حضرت علامہ کے فلسفے کی روشنی میں بچپن ہی سے ذہن نشین کرا دی جائیں تو یقین جانیئے کہ آگے چل کر قوم میں کتنے ہی خالد و طارق پیدا ہو جائیں گے ——— اللہ تبارک و تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اب یہ سلسلہ شروع ہو چلا ہے اور بچوں کی طرف خاص توجہ دی جا رہی ہے۔ اسکول کے اسی جلسے میں ایک عجیب واقعہ بھی رونما ہوا۔ ایک احمق بچے "فلسفۂ مابعد الطبیعات میں حکیم نطشے کی وحدت

جھری؟ اور علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کا آہنگ بلند ہے جیسے اہم موضوع پر بحث کرتے ہوئے گیا۔ تیلا پتلا سا دھوا صاحب بغل خالی ہو رہے تھے، ان سے جنا نیکو لی ہے حضرت کا ان کو کبھی ہائی کیا کرتے تھے۔ بیٹھتے ہی دیکھتے جب ... پیدا ہوا۔ وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے ؎

تو محراب و منبر سو گیا کون؟

ایک دم سے بچھلے پہلے تو دی اور پھر اپنے بید کو طلب کیا اور نعرۂ حق لگایا ع

خطا نہ ہو تو کیسی ہے کا سبے بنیاد

اور اس کے بعد بچے کو دھکا دے ڈالا، پھر پسینہ پونچھا اور با آواز بلند یہ شعر پڑھتے ہوئے اپنی نشست پر آن بیٹھے ؎

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

سبحان اللہ، جزاک اللہ، حضرت علامہ کا مدعا کیا خوب سمجھے عالم باعمل ایسے ہی ہوتے ہیں۔ یہ جلسہ بڑی دیر تک جاری رہا اور بڑی عمدہ تقریریں ہوئیں اور حضرت علامہ کے اچھے اچھے اشعار سننے میں آئے۔ شام کو گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ حضرت علامہ کے فارسی کلام کے بارے میں بھی پروگرام نشر ہوگا۔ یہ پروگرام بڑا جنت نگاہ اور فردوس گوش ثابت ہوا۔ ایک صاحبہ دنبالے دار سرمہ لگائے جھلمل جھلمل بلاؤز پہنے، شہد کی مکھیوں کے چھتے کا جوڑا باندھے، کانوں میں فٹ بھر کے آویزے اور صراحی دار گردن میں زمرد کا گلوبند چمکاتی ہوئی آئیں۔ وہ ایک جگہ کھڑی ہوگئیں مگر گاتے وقت شرقاً غرباً لہراتی رہیں۔ انھوں نے یہ اشعار گائے ؎

بہل اے دخترک ایں دلبری ہا
مسلماں را نہ زیبد کافری ہا
منہ دل بر جمال غازہ پرورد
بیاموز از نگہ غارت گری ہا

میری فارسی کمزور ہے، میں اس لفظ کو ہمیشہ "بہل" پڑھتا تھا۔ ان کی زبانی شعر سن کر معلوم ہوا کہ دختر کو "بہلانے" کے لئے یہ پوری نظم لکھی گئی ہے۔ موصوفہ تین مصرعے تو پڑھ گئیں مگر آخری مصرعے پر جب وہ بار بار مسکراتیں، بھائی بتاکر بیٹیوں کے تیر چلاتیں تو معلوم ہوتا کہ واقعی ماہر مصرعۂ چہارم ہیں اور حضرت علامہ کے کہنے پر خشوع و خضوع کے ساتھ عمل کر رہی ہیں

قوال اور موسیقار جب حضرت علامہ کا اردو فارسی کلام مع ترجمہ سنا چکے تو پھر نہایت دقیق لیکچروں اور مباحثوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ مشتاق یوسفی نے لکھا ہے کہ فی مکعب انچ جتنی بد صورتی ٹیبل ویژن پر نظر آتی ہے کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ چنانچہ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور نہایت غور سے دقیق مضامین کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش شروع کر دی۔ میں اپنے ذہن کو حضرت علامہ کی عظیم شخصیت پر مرکوز کئے رہا۔ معلوم نہیں کہ میں اونگھ گیا، یا دن بھر حضرت کا ذکر سنتے سنتے "تصور شیخ" میں گم ہو گیا۔ خدا جانے یہ خواب تھا یا حقیقت تھی بالکل یہ محسوس ہوا کہ حضرت علامہ کے حضور میں حاضر ہوں۔ حضرت جنت میں اپنے سونے کے محل کے سامنے چاندی کے تاروں سے بنی ہوئی چارپائی پر بیٹھے یاقوت کا حقّہ گڑگڑا رہے ہیں۔ رنگین طیور، خوبصورت درختوں پر بیٹھے کلام اقبال سنا رہے ہیں۔ حوریں دف بجا رہی ہیں۔ شہد کی نہر دریائے نیکر کی طرح آہستہ آہستہ بہہ رہی ہے۔ لیکن اقبال کے "حرف شیریں" کے مقابلے میں شہد کیا چیز ہے؟

میں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور حضرت علامہ کی توجہ اپنی طرف منعطف کرانے کے لئے ان کا شعر بآواز بلند پڑھا ؎

اے امامِ عاشقانِ دردمند
یاد ہے مجھ کو ترا حرفِ بلند

حضرت نے میری طرف دیکھا۔ میرے لمبے بال بکھرے ہوئے اور پتلون کی مخلوط نسل مرکب اور تنگ ... ہیٹ، اونچی ایڑی اور چھڑی نوک کے جوتے جو گن بوٹ سے مشابہ

تھے ایسے اور استفسار فرمایا کہ میں کہاں کی مخلوق ہوں۔ عرض کیا ــــ حضور کے
تصور کردہ ملک پاکستان سے آیا ہوں ــــ انھوں نے فرمایا کہ ــــ وہاں کیا
حال ہے بھئی ــــ

عرض کیا ــــ "حضرت کے ارشاد کے عین مطابق ترقی معکوس ہو رہی ہے"
تیوری پر بل پڑا، بولے "کیا مطلب؟"
میں نے کہا کہ آپ ہی نے اس خواہش کا اظہار فرمایا تھا کہ پیچھے کی طرف
لوٹ جاؤ ؎

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

یہ سننا تھا کہ حضرت علامہ میری طرف غور سے دیکھنے لگے۔ غالباً وہ بھی ہماری
ترقی پر حیرت زدہ ہوئے ــــ پوچھنے لگے کہ "ملتِ اسلامیہ پاکستان نے کون کون
سے منصوبے مکمل کر لئے ہیں؟"

عرض کیا "حضرت سڑکیں بہت بنائیں، پھر ان میں گڑھے پیدا کئے تاکہ تعمیری کام
جاری رہے، بند بھی باندھے۔ مگر حضرت کے کلام کی خاطر یہ انتظام بھی کیا کہ جوئے کہستاں سیل
اور پہاڑوں کے دل چیرتی رہے اور کام جاری رہے، بجلی بھی بناتے ہیں مگر اس کے
بجھانے کا بھی خاص انتظام کرتے ہیں تاکہ پھر بنانے کا موقع ملے۔ اسکولوں، کالجوں کی
عمارتیں بھی پوری نہیں بناتے، مردم سازی کا کام جاری ہے مگر یہ کام بھی ناتمام رکھتے
ہیں، آپ سے ہم شرمسار نہیں، مقصد حاصل کرنے سے برابر پرہیز جاری ہے تاکہ حصول
مقصد کی کوشش جاری رہے۔ حضور والا نے حضرت خضر علیہ السلام کی جو سنت بتائی تھی
قوم اس پر عمل پیرا ہے یعنی ؎

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

حضرت علامہ نے پھر مجھے بڑے غور سے دیکھا۔ جلد جلد حقہ گڑگڑانے لگے کچھ بولے

نہیں۔ اس سے میری ہمت بندھی، سوچا کہ علامہ کو پاکستان کے بارے میں تمام پہلوؤں سے مطلع کردوں تاکہ وہ خوش ہو جائیں کہ جس قوم کے لئے انھوں نے یہ ملک بنایا تھا وہ اُن کے کہنے پر چل رہی ہے۔ احسان فراموش نہیں ہے۔ ہر سال اقبال ڈے مناتی ہے اور اس سال تو صد سالہ جشن کا غلغلہ ہے۔ چنانچہ میں بولتا رہا اور وہ دم بخود سنتے رہے۔

میں نے عرض کیا کہ ہم نے تعلیم میں بڑی کاوش کی ہے۔ حضرت نے شکایت فرمائی تھی سہ

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا اِلٰہ اِلّا اللہ

اس لئے ہم نے تمام مدرسوں کو بند کر دیا یا تومیا لیا۔ لا اِلٰہ کا نعرہ اب کہیں کہیں شناخت کے لئے سیاسی پلیٹ فارموں پر ضرور لگایا جاتا ہے اور نہایت کارآمد ثابت ہوتا ہے ــــــ اب طلبہ کے بحرِ مواج میں اتنا " اضطراب " ہے کہ طوفان کا سا سماں ہے۔ علم کی انتہا ہو چکی ہے، ہر شخص بے تاب ہے۔ اس بے تابی کے نظارے ہڑتالوں، جلسوں، بائیکاٹوں کی صورت میں دیکھے جا سکتے ہیں ــــــ حضرت ہی کا ارشاد ہے سہ

علم کی انتہا ہے بے تابی
اس مرض کی مگر دوا ہوں میں

حضور والا کا اشارہ دل کی طرف تھا۔ چنانچہ دل والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ لوگ اسے پھینکتے ہیں، چراتے ہیں، مسلتے ہیں، ٹکڑے کرتے ہیں اور ہر مرض کی دوا کوٹ چھان کر اس سے تیار کر لیتے ہیں۔

حضور نے عشق پر زور دیا تھا اور صدہا جنوں اشعار اس موضوع پر عطا فرمائے تھے۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہو گی کہ اب عشق ہی ہمارا کُل وقتی مشغلہ ہے۔ دفتروں، دکانوں، کالجوں، سڑکوں، پُل کے نیچے، کھیت کے اندر، اُجالے میں اندھیرے میں، لوگ ہر جگہ، ہر وقت، ہر موسم میں عشق کی کسی نہ کسی کیفیت میں پائے جاتے ہیں۔ کبھی اظہار کرتا کرتے ہوئے کبھی کڑھتے کُڑھاتے ہوئے ــــــ کبھی رقیبان سے کہتے کہ ہمارے ہمار

غرضیکہ ایک مسئلہ ملی یا اتحاد دین حضور کے لئے پاکستان سے ہنگروں میں ثابت ہوا کہ حضور نے صحیح کہا تھا ؎

جنوں کے مضراب سے نغمہ تارِ حیات
عشق ہے نورِ حیات، عشق ہے نارِ حیات

جناب غالب نے یہ بھی فرمایا تھا ؎

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں

اطلاعاً عرض ہے کہ یہ حضرات زیادہ تر پاکستان کے رہنے والے ہوتے ہیں۔

حضور نے پیش گوئی کی تھی ؎

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا

یہ بالکل صحیح ثابت ہوئی، اب دیدارِ یار کی حالت یہ ہے کہ اس سے مفر نہیں۔ آپ پڑھنے جائیں، پڑھانے جائیں، گھر کا سودا لینے یا کرنے جائیں، ریل سے چلیں، یا ہوا پر اڑیں، دیدارِ یار ہر جگہ ہوتا رہتا ہے، حضور کی دعا سے قیس کی "قیسیت" بھی ——— "اندازِ لیلائی" کے ساتھ بڑھ رہی ہے اس لئے اب حضور کو یہ شکایت نہیں ہوگی ؎

تیرا اے قیس کیونکر ہو گیا سوزِ دروں ٹھنڈا
کہ لیلیٰ میں تو ہے اب تک وہی اندازِ لیلائی

حضور نے لیڈر کی صفات گنوا کر نصیحت فرمائی تھی کہ اگر یہ صفات موجود ہیں تو لیڈری فوراً کر لی چاہیئے۔ مثلاً حاصل روزہ اور پابند نماز ہونا ضروری نہیں ——— شیوۂ اربابِ ریا میں کمال ضروری ہے ——— دل میں لندن کی ہوس اور لب پہ ذکر حجاز، جھوٹ مصلحت آمیز، اندازِ تملق سراپا اعجاز ہونا ضروری ہے "دیر حکام" کو "مقامِ محمود" سمجھے، عید کے دن مسجد میں نظر آئے۔ "اثر دعا سے طبیعت میں گداز" کا اظہار کرے، اخباروں میں اپنی تشہیر کرائے ——— ان صفات میں ہم بھی سے کم نہیں ہیں، آپ نے فرمایا تھا ؎

جتنے اوصاف ہیں لیڈر کے وہ ہیں تجھ میں سبھی
تجھ کو لازم ہے کہ ہو اُٹھ کے شریکِ تگ و تاز
غمِ صیاد نہیں اور پر و بال بھی ہیں
پھر سبب کیا ہے نہیں تجھ کو دماغِ پرواز

حضرت کی یہ نصیحت کارگر ثابت ہوئی۔ لاریب اب تو لیڈر کو دماغِ پرواز بہت زیادہ ہو گیا ہے، بلکہ بہت سے دماغ تو اتنے اونچے پہنچ گئے کہ ملتے ہی نہیں

حضور والا کی نصیحتیں اور اقوال کو کہاں تک گنواؤں۔ ایک نظم تو اکسیر کا کام دیتی ہے اور اس سے بہتوں کا بھلا ہوا ہے۔ آپ نے جو دو مصرعے فرمائے تھے وہ اب ہمارا مسلک ہے ؎

کر تو بھی حکومت کے وزیروں کی خوشامد
دستور نیا اور نئے دور کا آغاز
معلوم نہیں، ہے یہ خوشامد کہ حقیقت
کہہ دے کوئی اُلّو کو اگر "رات کا شہباز"

ہم اسی پر عمل کرتے ہیں۔ اسی سے وارے نیارے ہوتے ہیں۔

حضور والا نے شراب کے بارے میں بعض ایسی باتیں فرمائی تھیں کہ قوم نے گرہ میں باندھ لی ہیں۔ ہم نے اب شراب خانوں پر پابندی لگا دی ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ دوست چپکے سے جمع ہوئے، خود ہی بوتل کھولی، خود ہی سوڈا ملایا، خود ہی پیش کر دیا۔ ساقی گری کا کام گھر کے گھر ہی میں چل جاتا ہے۔ ہم نے بڑی کوشش سے حضور کی یہ شکایت دور کر دی ہے ؎

وائے نادانی کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا
مے بھی تو مینا بھی تو ساقی بھی تو محفل بھی تو

چنانچہ اب مے نوشی عام زندگی کی ہو گئی ہے اور دوسرے چند در چند وجوہ بھی ہیں لہٰذا حکومت نے مگر پھر سے پابندی لگا دی اور جیسا کہ آں جناب نے فرمایا تھا ؎

پھر یہ غوغا ہے کہ لا ساقی شرابِ خانہ ساز
دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خموش

چنانچہ اب دیہات وغیرہ میں شراب خانہ ساز کی بھٹیاں خوب چل رہی ہیں۔ یہ ہماری قومی گھریلو صنعت ہے۔ امید ہے کہ ہم برآمد بھی کرنے لگیں گے بلکہ چند سال میں فرانس اور انگلستان کی بھٹیاں سرد ہو جائیں گی اور مغرب کی یہ استعمالی لعنت دور ہو جائے گی۔ اپنی چیز پھر اپنی ہے۔ ہماری شراب کے کنٹر اتنے خوبصورت تو نہیں جیسے مغرب سے آتے تھے۔ لیکن تاثیر ایسی ہے کہ گھونٹ حلق سے اترتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ سینے میں چھری اترتی چلی جا رہی ہے۔ یہ بھی حضرت کے حکم کی تعمیل ہے۔ یاد ہوگا فرمایا تھا۔

شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو
شمشیر کی مانند ہو تیزی میں تری مے

ماشاء اللہ چشم بد دور آزادی کے بعد ہم لوگ بھی آزاد قوموں کی طرح بے حد مصروف ہو گئے ہیں، دفتروں اور بازاروں میں گہما گہمی رہتی ہے۔ سفید و سیاہ سب قسم کے مارکیٹ تیز ہیں۔ لوگوں کے پاس اپنے پرانے روایتی کاموں کے لئے وقت نہیں ہے۔ ہم کئی جنگیں لڑ چکے ہیں، مگر بے فائدہ رہیں۔ اب جنگ زرگری میں مصروف ہیں۔ اچھی مفید چیز ہے اور ہم اس کے ماہر ہیں۔ اب حضور کو وہ شکایت نہیں ہو گی جو ترکی کے مجاہد کو ہوئی تھی اور آپ نے اس موقع پر فرمایا تھا۔

ہزار کام ہیں مردانِ حر کو دنیا میں
انھیں کے ذوقِ عمل سے امتوں کا نظام
طویل سجدہ اگر ہیں تو کیا تعجب ہے
ورائے سجدہ غریبوں کو اور ہے کیا کام

اب ہم غریب بھی نہیں اور ہمارے یہاں مردانِ حر بھی بہت ہیں۔ اس لئے بعض سینئر ایگزیکٹو، معروف افسران بالا دست، اور بڑے بزنس مین، صنعت کار قسم کے

لوگوں کے سر اتنی ذمہ داریاں آپڑی ہیں کہ طویل تو کیا مختصر سجدوں کے لئے بھی وقت نہیں ملتا۔ امام لوگ بھی مصروف ہوگئے ہیں اور دوسرے دھندوں میں پھنسے رہتے ہیں ـــــــ مقتدیوں کے ذہن میں دفتری امور، بازار کے بھاؤ، مخالفین سے نمٹنے (جسے اشٹریگ بھی کہتے ہیں) اور ذوی القربیٰ کی امداد کرنے کے اتنے مسائل ہیں کہ نماز کے لئے وقت نہیں ملتا۔ یوں بھی مسلمان کا ہر کام ہی عبادت ہے اس لئے نماز کی چنداں ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی اور حضور خود ہی فتویٰ دے چکے ہیں ؎

تیرا امام بے حضور، تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گذر ایسے امام سے گذر۔

اب میں حضرت کو پاکستان کی خارجہ پالیسی، خاندانی منصوبہ بندی اور چند دوسرے امور کے بارے میں کچھ باتیں بتاؤں گا جنھیں سن کر آپ خوش ہوں گے ـــــــ اکثر مردوں کے پاس اب کاریں ہیں۔ بے کار نہیں ساور زن تہی آغوش ......

میں اپنی بات شروع ہی کرنے والا تھا اور اس وقت حضرت علامہ بالکل خاموش نہایت سنجیدہ بلکہ دم بخود سے تھے۔ میں خوش ہو رہا تھا کہ حکیم مشرق کو یہ بتاؤں گا کہ قوم ان کے نسخے گھول کر پی گئی ہے اور اب وہ اقبال کو اتنی اچھی طرح سمجھتی ہے کہ وہ خود بھی اپنے کو نہ سمجھتے تھے ؎

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

میں سلسلۂ عرض داشت آگے بڑھانے ہی والا تھا کہ علامہ کے چہرے پر ایک جلالی کیفیت پیدا ہوئی۔ مجھے کچھ ڈر سا لگا۔ یا الٰہی کیا گستاخی ہوگئی ۔ اتنے میں علامہ نے آواز دی۔

"علی بخش"

علی بخش کہیں شاخ طوبیٰ کے نیچے بیٹھے تھے۔ انھوں نے جواب دیا۔

"آیا شیخ جی"

…تو میں نے کہا

"مولا بخش"

کیا دیکھتا ہوں کہ میاں مولا بخش ایک موٹا سا ڈنڈا لیے چلے آتے ہیں —— میں ہڑبڑا کر اٹھا۔ ٹی وی پر علامہ کا یہ شعر گایا جا رہا تھا ؎

احکام ترے حق ہیں، مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

تو کیا ہم کلامِ اقبال کی بھی تاویلیں کرنے کا جرم کر رہے ہیں؟ —— اگر ایسا ہے یعنی ہمارے یہاں "سب چلتا ہے"، تو پھر بلاشبہ ہم اقبال مجرم ہیں۔

بشکریہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی

رشید امجد

چپ فضا میں تیز خوشبو

ریکارڈنگ ہال کی تیز روشنی میں ساری چیزیں تیرتی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں۔
اس کا اپنا آپ وجود کی تنگنائے سے نکل کر اوپر اٹھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

سامنے والا کیمرہ مین ٹرالی کو آگے پیچھے کر کے زاویے درست کرتا ہے۔ دو نمبر کیمرہ نے اس کے ساتھ والے کو کور کرنا ہے، تین نمبر کیمرے نے لمبے شاٹ لئے ہیں اور ٹائیٹل کو کور COVER کر کے منظر ایک نمبر کیمرے کو منتقل کر دینا ہے، پروڈیوسر باری باری تینوں کیمروں کے فوکس سے ان کی ترتیب ٹھیک کرنے کے لئے کرسیوں کو آگے پیچھے سرکاتا، میز کو ذرا ٹیڑھا کرتا ہے پھر کہتا ہے ۔۔۔ "آپ سمجھ گئے نا، جب ایک نمبر کا کیمرہ مین انگلی سے دائرہ بنائے گا تو پروفیسر صاحب آپ گفتگو شروع کریں گے، بالکل نیچرل طریقے سے، بغیر کسی تمہید کے، ٹائیٹل کے لانگ شاٹ کے فوراً بعد دو نمبر کیمرہ آپ کا کلوز اپ لے گا، لیکن آپ نے براہ راست کیمرہ کی طرف نہیں دیکھنا بائیں طرف والی روشنی کو دیکھ کر نفی میں سر ہلانا ہے ۔۔۔ اسے نوے کے زاویے پر لائیں۔"

نیلی وردی والا روشنی مین لمبی سی چھڑی سے لائٹ کو آگے پیچھے کر کے زاویہ درست کرتا ہے۔
پروڈیوسر ایک نمبر کیمرے سے ان کی ترتیب چیک کرتا ہے اور اس کی طرف منہ کر کے کہتا ہے ۔۔۔ "پروفیسر صاحب آپ نے کرسی کے ہتھوں کو اتنی مضبوطی سے کیوں پکڑ رکھا ہے۔"

وہ کیسے بتائے کہ اگر اس نے ہتھیاں چھوڑ دیں تو اس کا سارا جسم کرسی کی گرفت سے نکل کر فضا میں تیرنے لگے گا، لیکن کچھ کہے بغیر گرفت ڈھیلی کر دیتا ہے۔ اور پاؤں پر بوجھ ڈال کر زمین کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔

پروڈیوسر [illegible] راست چاروں طرف دیکھتا اور کہتا ہے ۔۔۔ "میں کنٹرول روم میں جا رہا ہوں [illegible] وہاں سے آپ پروفیسر صاحب جناب آپ ۔۔۔

پروڈیوسر کنٹرول روم میں چلا جاتا ہے۔
ایک منٹ ـــ دو منٹ
پھر تین آوازیں ایک ساتھ گونجتی ہیں۔

SILENT —— SILENT —— SILENT

ریکارڈنگ حال میں سے زندگی رینگ رینگ کر باہر نکل جاتی ہے، اور موت دبے پاؤں اندر داخل ہوتی ہے۔
گہری گھپ خاموشی۔
وہ تھوک سے گلا تر کرتا ہے۔
لمحہ لمحہ گزرتا ہے ـــ ٹک، ٹک، ٹک۔
ایک ہاتھ کا آہستہ آہستہ بلند ہوتا ہے، انگلی اٹھتی ہے، دائرہ بننے لگتا ہے،
وہ بولنے کے لیے منہ کھولتا ہے۔
لیکن ـــ لیکن آواز نہیں نکلتی۔
پسینہ کی لہر سارے جسم کو اپنے اندر لپیٹ لیتی ہے۔
وہ منہ کھولتا ہے ـــ جملہ یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے، کیا عمدہ جملہ سوچا ہوا تھا۔
مگر ایک لفظ یاد نہیں آتا۔ منہ سے آواز ہی نہیں نکلتی۔
تیز روشنیاں چاروں طرف سے ٹوٹے پڑ رہی ہیں۔
لمحہ لمحہ گزر رہا ہے۔
بولنے کی کوشش ـــ آواز نہیں۔
گفتگو اس سے شروع کرنا ہے، پھر ساتھ والے سے سوال کر کے اسے شامل کرنا، اور پھر
تیسرے ساتھی سے سوال ـــ لیکن بات شروع ہو تو بات نا،
بولنے کی ایک اور کوشش
تھوک سے گلا تر کر کے ٹوٹے ہوئے جملوں کو جوڑنے کی کوشش۔
لیکن آواز نہیں۔
کن انکھیوں سے ساتھ والوں کو دیکھتا ہے، دونوں اس کی طرف دیکھ رہے ہیں

سلانور ڈاکر ایک بے ربط سا جملہ بولنے کی کوشش۔
لیکن ہونٹ سرسرا کر رہ جاتے ہیں۔
پروڈیوسر ابھی دوڑتا ہوا آئے گا ـــــ "یہ کیا ہو رہا ہے ؟"
بس آتا ہی ہوگا۔

چیزیں آتی جاتی رہتی ہیں، کائنات کا سلسلہ ہی عجیب ہے، چیزیں جنم لیتی ہیں، اور پھر کسی بلیک ہول میں گم ہو جاتی ہیں۔ ہر روشنی کے پیچھے ایک بلیک ہول ہے، ہر سانس ہی ایک بلیک ہول ہے کہ ہر سانس کے پیچھے موت کی دستک ہے۔ چھوٹی چھوٹی دستکیں، اور پھر ایک لمبی اونچی دستک، وقت ہی ایک بلیک ہول ہے جو بالآخر ہر شے کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔

وہ بولنے کے لیے منہ کھولتا ہے لیکن آواز۔
لفظ گم ہو گئے ہیں۔

بیوی کہتی ہے ـــــ "پروگرام کا چیک اڈوپن کروالینا، دس بارہ روپے رہ گئے ہیں، اور ابھی تو چار پانچ دن باقی ہیں"۔

بیٹی ماں کے پہلو سے سر نکالتی ہے ـــــ "ابو گڑیا جاپانی والی ـــــ آپ نے وعدہ کیا تھا نا، اب پروگرام ملے گا تو ـــــ"

بیٹا توتلی آواز میں کہتا ہے ـــــ "ابّا ـــــ ابّا"
وہ آنکھیں جھپکاتا ہے،
ریکارڈنگ روم میں موت کی سی خاموشی ہے۔

موت تو ایک خوشبو ہے جو دھیرے دھیرے ہر چیز پر نشہ طاری کر دیتی ہے اور اس نشہ کے عالم میں ہم چپکے سے ایک دائرے سے نکل کر دوسرے دائرے میں داخل ہو جاتے ہیں، اور یہ عجیب بات ہے کہ جسم کے سارے حصے فوری طور پر نہیں مرتے۔ بعض حصے موت کے کئی دن بعد تک زندہ رہتے ہیں۔ بال اور ناخن قبر میں بھی بڑھتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں ذہن کے بعض حصے بھی موت کے کئی دن بعد تک اپنا کام کرتے رہتے ہیں، یہ بھی کیا عذاب ہے کہ آدمی چلا ہے لیکن اس کے ذہن کے کچھ حصے کام کر رہے ہیں اور وہ خود اپنی آخری رسوم دیکھ رہا ہے اچانک یا حادثاتی موت کی شکل میں تو بہت سے حواس اور کبھی کبھی وجود کا سرمئی ہیولا بھی کئی دن تک موجود رہتا ہے لیکن پھر ایک چپ

گررہا ہے۔

وہ جب کبھی منہ سے نکلنے کے لئے پھڑپھڑاتا ہے۔ بولنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن آواز نہیں نکلتی۔

آواز کے لئے کبھی من چلا سوچا ہوا تھا، وہ جملا کیا تھا، وہ ترکیب اور جملہ، لیکن لفظ تو اس سے دور بھاگ گئے ہیں،

بولنے کی کوشش ۔۔ آواز؟؟

پسینے کے قطرے سارے چہرے پر بہتے جا رہے ہیں،

عینک کے اوپر سے لڑکیاں گر رہی ہیں۔

کائنات بھی ایک جسم ہے۔ جیسے ہمارا یہ جسم جس کے اندر کئی دنیائیں آباد ہیں جراثیموں سے بھری ہوئی دنیائیں، اور ہمارا ذہن ان سب کو، پورے جسم کو کنٹرول کرتا ہے، کائنات بھی ایک جسم ہے اور ہم اس کے اندر کے چھوٹے چھوٹے جراثیم ہیں، اس کا بھی ایک ذہن ہے ایک ماسٹر مائنڈ۔

گھنٹی کی آواز کے ساتھ ہی لڑکے کندھے جھٹک کر اس کی باتوں کو واپس اس کے منہ پر دے مارتے ہیں،

سٹاف روم میں ایک ساتھی کہتا ہے ۔۔۔ "یار ذرا حساب کر کے تو بتاؤ نئے سکیلوں سے کتنا فرق پڑے گا؟"

"نئے سکیل؟"

"آج کا اخبار نہیں دیکھا، پے کمیشن کی سفارشات۔"

"لیکن یہ تو صرف سفارشات ہیں، اصل تو خدا جانے کیا ہوگا؟"

"تو کیا ۔۔۔ دل خوش کرنے میں کیا نقصان ہے؟"

پروڈیوسر کہتا ہے ۔۔۔ "پروفیسر صاحب بات آپ شروع کریں گے۔ جونہی ایک نمبر آنگلی سے دائرہ بنائے آپ ۔۔۔"

وہ بولنے کی مسلسل کوشش کر رہا ہے، لیکن آواز نہیں نکلتی۔

معلوم نہیں آواز گم ہو گئی ہے یا لفظ ختم ہو چکے ہیں۔

آواز ایک پرندہ ہے۔

لفظ اس کی پکار۔
سوچ ہفت رنگ فضا۔
نہیں شاید ـــــ
لفظ ایک پرندہ۔
آواز پکار۔
سوچ ـــــ
نہیں نہیں ـــــ شاید یوں۔
سوچ ایک پرندہ۔
لفظ اس کی چہکار۔
اور آواز ـــــ؟

آواز نہیں نکلتی، کوشش کے باوجود آواز نہیں نکلتی۔

بھاری غرانے والی خاموشی ریکارڈنگ ہال میں ٹہل رہی ہے۔

تیز روشنیاں ـــــ کیمروں کے آگے پیچھے ہوتی بے آواز ٹرالیاں۔

فضا ایک انتہائی حساس مووی کیمرے کی طرح ہر حرکت، ہر آواز کو ریکارڈ کر رہی ہے۔ فضا میں ازل سے اب تک کی ہر حرکت، ہر آواز محفوظ ہے اور اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے۔ کیا معلوم اس لمحہ کائنات کے کسی حصے میں اس کی تصویر بھی ری کاسٹ ہو رہی ہو، اسے یہ بھی کیا معلوم کہ اس لمحہ جو کچھ ہو رہا ہے، اس پہ بیت رہا ہے وہ ری کاسٹ ہے اور اصل منظر کہیں اور ہو ـــــ ہزاروں نوری سالوں کے فاصلہ پر کسی جگہ، وہ اس لمحہ یا اس سے ہزاروں سال پہلے موجود ہو اور یونہی بولنے کی کوشش میں بار بار منہ کھول رہا ہو اور آواز نہ نکلتی ہو۔

لفظ بے وفا ہو گئے ہوں۔

وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ بے وفا ہو جاتا ہے۔ عمر بھی، دن بھی، یادیں بھی، بس سب کچھ پاس سے گزر جاتا ہے ـــــ اور آدمی ہاتھ بڑھا بڑھا کر ہی رہ جاتا ہے ـــــ لیکن پروگرام کے بعد سے چیک فرد اور پن کراتا ہے، کسی کے سامنے نہیں، بس کسی بہانے سے کچھ دیر کے لئے رک جاتا ہے اور جب در سب دوست چلے جائیں تو ـــــ

لیکن پروگرام ریکارڈ ہو تو تب نا ـــــ پروڈیوسر تو ابھی کنٹرول روم سے پیچھے

ہی والا ہے ـــــ کیا ہو رہا ہے، آپ بولتے کیوں نہیں؟"

وہ پھر بولنے کے لئے، کچھ کہنے کے لئے منہ کھولتا ہے۔

پہلی میں ابھی چار دن باقی ہیں بلکہ پانچ دن، تنخواہ تو دو ہی کو ملے گی نا

اور چیک ادر پن ـــــ

لیکن بولنے کی ہر کوشش بے کار

آواز ساتھ چھوڑ گئی ہے ـــــ پتھرا ہو گیا

کیا کہے؟ ـــــ کیسے کہے؟

کتنے عمدہ عمدہ جملے سوچ کے آیا تھا

ابھی گفتگو شروع کرنا ہے اور اختتام بھی ـــــ

پروڈیوسر نے کہا تھا ـــــ "جب آخری دو منٹ رہ جائیں گے تو نمبر ایک دو بارہ انگلی سے دائرہ بنائے گا۔ بس آپ بات نیچرل طریقے سے اچک لیں اور پانچ چھ اختتامی جملے کہہ کر ختم کر دیں

لیکن ابھی تو ابتدائی جملے بھی نہیں کہے گئے، اختتام کب اور کیسے ہوگا؟ وہ ہر بات کہنے کی کوشش کرتا ہے۔

مسلسل بولنے کی کوشش میں ہونٹ پھڑپھڑانے لگے ہیں۔ ایک آخری کوشش کے طور پر وجود کا سارا زور لگا کر، ساری توانائیاں اکٹھی کر کے بولنے کے لئے منہ کھولتا ہے ـــــ لیکن آواز نہیں نکلتی، ہونٹوں کی سرسراہٹ کے ساتھ ساتھ اس کا وجود سکڑنے لگتا ہے، ریکارڈنگ ہال چھوٹے سے بلیک ہول کی طرح اسے اپنے اندر گم کر رہا ہے ـــــ اسے تیزی سے اپنے اندر سمیٹ رہا ہے۔ وہ ہاتھ پیر مارتا ہے، خود کو اس کی کشش سے بچانے کی کوشش کرتا ہے لیکن بے سود، بلیک ہول اسے تیزی سے اپنی طرف کھینچے چلا جاتا ہے، ایک گھنی تاریکی تیزی سے اس کے قریب آتی جاتی ہے، تیز روشنیاں ـــــ پلک جھپکنے میں بجھ جاتی ہیں اور ریکارڈنگ ہال مختلف آوازوں سے گونجنے لگتا ہے پروڈیوسر بھاگتا ہوا اندر آتا ہے اور کہتا ہے۔

"واہ وا ـــــ کمال ہو گیا، بہت اچھی ریکارڈنگ ہوئی ہے، یہ پروگرام تو بہت پسند کیا جائے گا"

اور وہ بڑبڑا کر اس کا منہ دیکھے جاتا ہے! ☐

بشکریہ مکتبہ "الفاظ" علی گڑھ


سنکارا 200 فی صد ٹانک
اس کا نصف
100 فی صد
دوسرے ٹانکوں کے برابر
سنکارا سے آپ کو تمام ضروری وٹامن اور معدنی اجزا ملتے ہیں، جو آپ کی تندرستی اور توانائی کے لیے ضروری ہیں۔
اس میں وٹامن اے، بی ۱، بی ۲، سی، ڈی ۲، نیاسینامائڈ، کیلشیم گلیسروفاسفیٹ اور سوڈیم وغیرہ شامل ہیں۔
اور دوسرا نصف
100 فی صد
اپنی مثال آپ
ضروری وٹامنوں وغیرہ کے ساتھ سنکارا کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں چھوٹی الائچی، بڑی الائچی، لونگ، دھنیا، دارچینی، تیزپات، گلاب کے پھول، بالچھڑ اور تلسی جیسے اجزا بھی شامل ہیں جو نظام ہضم کو طاقتور بناتے ہیں اور جن کی مدد سے آپ کی روزمرہ خوراک کی تمام غذائیت جسم میں پہنچ کر آپ کی صحت اور طاقت کو بڑھاتی ہے۔ اس طرح آپ سنکارا سے دوہرا فائدہ حاصل کرتے ہیں۔
سنکارا
آپ کے جسم کو
۲۰۰ فی صد طاقت پہنچاتا ہے
cinkara
cinkara
cinkara
ہمدرد

Regd. No. 21887/71 No. 54, Jan-April 1984

ASRI ADAB

D-7, Model Town, DELHI-110009.